اردو کا کلاسیکی ادب

مقالات سر سید

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیرت طیبہ
کے متعلق بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات

جلد یازدہم حصہ اول

مرتبہ

مولانا محمد اسماعیل، پانی پتی

مقالات سرسید

سرسید کے ادبی کارناموں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمایاں حیثیت ان کی مضمون نگاری اور مقالہ نویسی کو حاصل ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے اور سب سے اعلیٰ مضمون نگار تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں مضامین اور طویل مقالے بڑی تحقیق و تدقیق، محنت و کاوش اور لیاقت و قابلیت سے لکھے اور اپنے پیچھے نادر مضامین اور بلند پایہ مقالات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ چھوڑ گئے۔

ان کے بیش بہا مضامین جہاں ادبی لحاظ سے وقیع ہیں، وہاں وہ پر از معلومات بھی ہیں۔ ان کے مطالعے سے دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور مذہبی مسائل اور تاریخ عقدے حل ہوتے ہیں اخلاق و عادات کی اصلاح کے لیے بھی وہ بے نظیر ہیں اور سیاسی و معاشرتی لحاظ سے بھی نہایت فائدہ مند ہیں۔ نیز بہت سے مشکل سوالوں کے تسلی بخش جوابات بھی ان میں موجود ہیں سرسید کے ان ذاتی عقائد اور مذہبی خیالات کے متعلق بھی ان سے کافی روشنی ملتی ہے جو اپنے زمانے میں زبردست اعتراضات کا ہدف رہے ہیں ان مضامین میں علمی حقائق بھی ہیں اور ادبی لطائف بھی، سیاست بھی

ہے اور معاشرت بھی، اخلاق بھی ہے اور موعظت بھی، مزاح بھی ہے اور طنز بھی، درد بھی ہے اور سوز بھی، دلچسپی بھی ہے اور دلکشی بھی، نصیحت بھی ہے اور سرزنش بھی غرض سرسید کے یہ مضامین و مقالات ایک سدا بہار گلدستہ ہیں جن میں ہر رنگ اور ہر قسم کے خوشبودار پھول موجود ہیں۔

یہ مضامین سرسید نے جن اخباروں اور رسالوں میں وقتاً فوقتاً لکھے، وہ مدت ہوئی عام نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور کہیں ان کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ پرانے اخبارات ورسائل کے فائل کون سنبھال کر رکھتا ہے۔ سرسید کی زندگی میں کسی کو اس کا خیال بھی نہ آیا کہ ان تمام بیش قیمت جواہرات کو جمع کر کے فائدہ عام کے لیے شائع کر دے۔ صرف دو ایک نہایت ہی مختصر مجموعے شائع ہوئے مگر وہ بھی بے حد تشنہ اور نامکمل، جو نہ ہونے کے برابر تھے۔

سرسید کے انتقال کے بعد نصف صدی کا طویل زمانہ گزر گیا مگر کسی کے دل میں ان مضامین کے جمع کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا اور کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوا آخر کار مجلس ترقی ادب لاہور کو ان بکھرے ہوئے بیش بہا جواہرات کو جمع کرنے کا خیال آیا مجلس نے ان جواہرات کو ڈھونڈنے اور ان کو ایک سلک میں پرونے کے لیے مولانا محمد اسماعیل پانی پتی کا انتخاب کیا جنھوں نے پرانے اخبارات اور قدیم رسالوں کے فائلوں کی تلاش میں دور و نزدیک کے سفر کیے فراہمی مواد کے لیے ان کے بوسیدہ اور دریدہ اوراق کو غور و احتیاط

سے پڑھنے کے بعد ان میں سے مطلوبہ مواد فراہم کرنا بڑے بکھیڑے کا کام تھا، مگر چونکہ ان کی طبیعت شروع ہی سے دقت طلب اور مشکل پسند واقع ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے یہ ذمہ داری باحسن طریق پوری کی چنانچہ عرصہ دراز کی اس محنت و کاوش کے ثمرات ناظرین کرام کی خدمت میں ''مقالات سرسید'' کی مختلف جلدوں کی شکل میں فخر واطمینان کے جذبات کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اس کے متعلقات پر بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات

ہندوستان کے صوبہ یو پی کے ایک لفٹننٹ گورنر سر ولیم میور نے ایک یورپین پادری پی فنڈر کی فرمائش پر ایک بہت ضخیم کتاب لائف آف محمد (Life of Mohammad) کے نام سے چار جلدوں میں لکھی جو پہلی مرتبہ 1861ء[1] میں شائع ہوئی چھپتے ہی اس کتاب کی انگلینڈ اور ہندوستان میں بڑی شہرت ہوئی اور کہا گیا کہ ”آج تک مسلمانوں کے نبی کے متعلق انگریزی میں ایسی بے مثل کتاب کوئی نہیں چھپی“ سر سید نے یہ کتاب بڑے شوق سے منگوائی اور جب اس کے مضامین انہوں نے پڑھوا کر سنے تو ان کا دل جل کر کوئلہ ہو گیا۔ کیوں کہ اس کتاب میں مذہبی تعصب اور ناواقفیت کی بنا پر سر ولیم میور نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے متعلق نہایت رکیک، غلط اور بے بنیاد الزامات لگائے تھے اس پر سر سید نے ارادہ کر لیا کہ اس کتاب کا جواب لکھا جائے اور نہایت تحقیقی

1اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن 1876ء میں چھپا۔

اور مستند بیانات سے ثابت کیا جائے کہ پاکوں کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس دامن ہر الزام سے پاک اور ہر اعتراض سے بری ہے اور کوئی سچا الزام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ہرگز نہیں لگ سکتا۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ تحقیقی جواب دینے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی ہندوستان کے کتب خانے ان سے محروم تھے اور وہ صرف انگلینڈ کی لائبریریوں سے مل سکتی تھیں اس لیے سرسید نے 1869ء میں لندن کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر کتابیں فراہم کرنے کے بعد اس کتاب کے جواب کا ایک حصہ نہایت تحقیق و تدقیق اور تشریح و وضاحت کے ساتھ مرتب کیا یہ جواب بارہ مختلف اور مبسوط مقالات پر مشتمل تھا اور بے انتہا محنت اور کاوش اور بڑی تلاش و تجسس کے بعد لکھا گیا تھا ہر مقالہ کو سرسید نے ''خطبہ'' کا نام دیا تھا، جن کے عنوانات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1الخطبة الاولی فی جغرافیه جزیرة العربیه وامم العرب العاربه والمستعربه

(یعنی ملک عرب کا جغرافیہ اور اس کی قوموں کا حال)

2الخبطة الثانیه فی مراسم العرب و عاداتهم قبل الاسلام

(یعنی اسلام سے قبل عربوں کی رسمیں اور ان کی عادتیں)

3 الخطبة الثالثه فی الادیان المختلفه التی کانت فی العرب قبل

الاسلام

(یعنی اسلام سے پہلے عرب کے مختلف مذاہب وادیان کا
ذکر)

4الخطبة الرابعه فی ان الاسلام رحمة للانسان و جنة الادیان
الانبیاء با وضح البرهان

(یعنی اسلام انسان کے لیے رحمت ہے اور تمام انبیاء کے
مذاہب کی پشت وپناہ)

5الخطبة الخامسه فی حالات کتب المسلمین

یعنی مسلمانوں کی مذہبی کتابوں (کتب حدیث، کتب سیر،
کتب تفسیر اور کتب فقہ) کے بیان میں

6الخطبة السادسه فی الروایات فی الاسلام

(یعنی مذہب اسلام کی روایتوں کی اصلیت اور ان کے رواج
کی ابتدا)

7الخطبة السابعه فی القرآن وهو الهدیٰ والفرقان

(یعنی قرآن کریم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کس طرح
نازل ہوا)؟

8 الخطبة الثامنه: احوال بیت الله الحرام والسوانح اللتی مضت
فیها قبل الاسلام

(یعنی خانہ کعبہ اور اس کے گذشتہ حالات اسلام سے قبل)

9 الخطبة التاسعه فی حسبه و نسبه علیه الصلواة والسلام

(یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کے بیان

میں)

10 الخطبة العاشره فی البشارة المذکورة فی التوراة والانجیل

(یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات کے بیان میں

جوتوریت اورانجیل میں مذکور ہیں)

11الخطبة الحادی عشر فی حقیقة شق الصدر و ما حیة المعراج

(یعنی شق صدر کی حقیقت اورمعراج کی ماہیت کے بیان

میں

12الخطبة الثانی عشر فی ولادته وطفولیة علیه الصلواه والسلام

(یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش اورحضورت

کے بچپن کے حالات (12 برس کی عمر تک)

جب سرسید نے اردو میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بارہ مقالات مفصل طور پر مرتب اور مدون کر لیےتو ان کا ایک خلاصہ انگریزی میں تیار کروایا اور اس کو وہیں لندن میں 1870ء میں نہایت مشکل اورناگزیر حالات میں چھپوا دیااس کا نام انہوں نے Essays on the life of Mohammad (آں حضرت کی سیرت کے متعلق مضامین) رکھا مگر اردو کے مضامین اس وقت نہ چھپ سکےاوران کا مسودہ سرسید کے پاس پڑا رہالندن سے واپسی کے بعدبھی سرسیدان مضامین کو جوانگریزی کی نسبت بہت زیادہ مفصل اورمکمل تھے، نہ چھپوا سکےاور 17 سال یونہی

گزر گئے 1887ء میں سرسید کو ان مضامین کے شائق کرنے کا خیال آیا چناں چہ ''تصنیفات احمدیہ'' کے سلسلہ میں ان بارہ مقالات کو بھی سرسید نے چھاپ کر شائع کر دیا۔ مگر ان مقالات کا یہ اڈیشن آج کل قطعاً نایاب اور ناپید ہے۔ اتفاق سے مجھے یہ مقالات پرانی کتابوں کے ایک تاجر کے ہاں سے مل گئے جو ایک علمی تبرک کے طور پر میری لائبریری میں محفوظ ہیں ان مقالات کی اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1 سرسید سے پہلے کسی مسلمان نے عیسائیت کی تردید میں کوئی مقالہ عیسائیوں کے مرکز میں بیٹھ کر انہی کی زبان میں نہیں لکھا تھا۔

2 مناظرانہ رنگ کی عام کتابوں کے برخلاف ان مقالات کی زبان بجائے مخاصمانہ کے ناصحانہ اور بجائے سب وشتم کے متین و سنجیدہ ہے۔

3 اس قسم کے دوسرے مضامین کے مقابلہ میں ان مقالات کا طریق استدلال بہت زیادہ بہتر اور اعلیٰ ہے جن میں ہر مسئلہ پر نہایت سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور معقول دلائل سے ہر بات کو ثابت کیا گیا ہے۔

4 ان مقالات میں عیسائیوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے سرسید نے عام الزامی طریقہ کو چھوڑ کر ہر اعتراض کا تحقیقی جواب دیا ہے جس سے سرسید کی تحریر میں بڑا زور اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔

اب میں وہ مقالات ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جن کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اسلامی لٹریچر پر سرسید کی نظر کس قدر وسیع تھی اور وہ کس عمدگی اور سلاست کے ساتھ اپنے ماضی الضمیر کو ظاہر کر سکتے تھے ان مضامین کی تمہید بھی سرسید ہی کی لکھی ہوئی ہے جو بجائے خود ایک مکمل مضمون ہے

(محمد اسماعیل پانی پتی)

☆☆☆☆☆☆

تمہید

(نوشتہ سر سید احمد خاں)

مذاہب اور ان کی نیرنگی:

عجائبات دنیا میں سب سے زیادہ عجیب وہ خیال ہے جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں مذہب اس امتیاز کا نام ہے جو انسانوں کے افعال سے علاقہ رکھتا ہے اور جس کے سبب انسانوں کے افعال اچھے یا برے یا نہ اچھے نہ برے خیال کیے جاتے ہیں، کیوں کہ اگر انسان کے افعال میں یہ تمیز نہ ٹھہرائی جاوے تو کسی مذہب کا وجود باقی نہیں رہتا۔

مذہب کیا چیز ہے؟

وہ تمام خیالات جو انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ یقین جو انسان کسی چیز پر رکھتا ہے، اس کا منشا ان خیالات اور یقین کے سوا کچھ اور چیزیں ہوتی ہیں جو ان خیالات اور یقین کے اسباب سمجھی جاتی ہیں، مگر تعجب یہ ہے کہ وہ خیال جس کو مذہب کہتے ہیں، بغیر

کسی خارجی اسباب کے اور بغیر تجربہ اور امتحان کے اور بدون کسی معقول ثبوت کے یکایک دل سے اٹھتا ہے اور اس لیے وہی اس کا مخرج سمجھا جاتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ کسی آنکھوں دیکھی چیز پر بھی نہیں ہوتا۔

اس تعجب پر اور تعجب یہ ہے، کہ اس بن دیکھی چیز، اور ان سمجھی بات اور بے دلیل خیال کا لوگوں کی طبیعت پر ایسا سخت اثر ہوتا ہے، کہ وہ اثر انسان کے تمام افعال پر اور قدرتی جذبات پر، جو انسان میں خدا نے پیدا کیے ہیں، غالب ہو جاتا ہے اور جو جوش اور ولولہ اس ازخود پیدا ہوئے خیال سے انسانوں کی طبیعتوں پر ہوتا ہے، کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا گو کہ اس دوسری چیز کے صحیح اور یقینی ہونے کے لیے کیسی ہی عمدہ عمدہ دلیلیں اور کیسے ہی قطعی ثبوت موجود ہوں۔

اگر وہ خیال تمام انسانوں میں مختلف نہ ہوتا، تو شاید یہ کہا جا سکتا کہ تمام عالم کا اس پر یقین رکھنا ہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے، مگر تعجب تو یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر فرقہ، بلکہ ہر فرد و بشر میں وہ خیال ایسا مختلف رہا ہے کہ کسی ایک پر بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اس پر تعجب یہ ہے کہ ہر شخص کو یہی یقین ہے کہ میرا ہی خیال اور سب کے خیالوں سے بالکل صحیح اور بالکل سچا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح یونانی اپنے خدا اور دیوتا پر اور مسلمان و یہودی اپنے ایک خدا پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں، اسی طرح ہندو اور مصری اپنے تینتیس کروڑ دیوتاؤں پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں۔

کیا یہ مسئلہ کہ تمام چیزیں ایک ہی کل کے جزو یا اس کی عین یا وہ بمنزلہ جان اور یا بمنزلہ جسم کے ہیں، صحیح ہے؟ کیا یہ سب مختلف چیزیں جو ہم کو دکھائی دیتی ہیں، سب ایک ہیں؟ کیا نور و ظلمت اور کالا اور سفید دونوں یکساں ہیں جیسا کہ ایک عارف باللہ کہتا ہے؟

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یا یہ مسئلہ صحیح ہے کہ تمام چیزوں کا اسی سے ظہور ہے، وہی ظلمت کا باعث اور وہی نور کے ظہور کا سبب ہے وہی آسمانوں پر کڑکا تا ہے اور وہی زمینوں پر برسا تا ہے، وہی ستاروں کو چمکا تا ہے اور وہی پھولوں کی کلیوں کو کھلا تا ہے اسی کا جلوہ بہشتوں کی کہاوت اور اسی کا پردہ دوزخوں کی آفت ہے غمگین دل کا غم، شاداں دل کی شادی اسی سے ہے، وہ کسی جگہ نہیں اور سب جگہ ہے، وہ کسی میں نہیں اور سب میں ہے، عابد کے نورانی سینے اور فاسق کے بریاں دل اور معشوق کے عاشق کش ابرو اور عاشق کی گریاں چشم، سب میں اس کی یکساں جگہ ہے جس طرح کہ وہ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، اسی طرح سے وہ باریک سے بال میں بھی ہے وہ سب کو دیکھتا ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے، مگر اس کا جاننا یا علم ہم سے دو درجہ کم ہے کیوں کہ وہاں ماضی اور استقبال نہیں ہے بہر حال اس بن دیکھی جناب اور ان سمجھی ذات کو جو کہو، سو کہو۔ مگر ان تمام مشکلوں پر ہم کو یہ مسلمانی مسئلہ کہ

انا عندظن عبدی بی

اور بھی مشکل میں ڈالتا ہے۔

ربی انت عند ظنی رحیم فارحم علی

پھر ہم کو زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے، کہ یہ تمام مختلف خیالات جو لوگوں کے دلوں

میں ہیں اور جو مذہب کہلاتے ہیں، ایک ہی مخرج سے یعنی دل سے نکلے ہیں اور دل کے اس فعل کا جس سے یہ خیال پیدا ہوتے ہیں، اعتقاد نام رکھا جاتا ہے، پس اگر مدار مذہب کا اعتقاد ہو، تو ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔

کیا وجہ تمیز کی ہے، اس سچی دلی پرستش میں جو ابراہیم کے باپ نے ایک بت کی کی، اور اس سچے دل کے خیال میں جس سے ابراہیم نے اپنے باپ کے اس بت کو توڑا۔

ایک ہی واقعہ حضرت مسیح کے قتل کا ہے، جو کالوری کی پہاڑی میں بیت المقدس کے پاس گزرا ان بے رحم قاتلوں نے اپنی دانست میں جو کچھ کیا، مذہبی نہایت سچے اور مستحکم اعتقاد اور دل کے کپ کپا دینے والے ایمانی جوش سے کیا، پس ان دو گروہوں میں سے جو نہایت سچے دل سے اس کو نہایت ہی نیک کام سمجھتے ہیں اور جو نہایت پاک دلی سے اس کو نہایت ہی بد کام جانتے ہیں، کون سی چیز تفرقہ کرنے والی ہے۔

کیا وجہ تمیز کی ہے سینٹ پال کی اس حالت میں، جب کہ وہ دلی اعتقاد اور دین کے جوش سے ان لوگوں کا ساتھی تھا، جنھوں نے سینٹ اسٹیفن شہید کو سنگسار کیا، اور اس حالت میں جب کہ اس نے اپنے سچے دلی اعتقاد سے حضرت مسیح کو مانا۔

کیا چیز ہے، جس سے ہم عمرؓ کی اس حالت میں تمیز کریں، جب کہ اس نے لات و منات پر سچا دلی اعتقاد رکھ کر امین عرب کے قتل پر کمر باندھی اور اس حالت میں جب کہ اس نے نہایت سچی دلی تصدیق سے کہا کہ

اشھدان محمداً رسول اللہ

یہ وہی عجیب خیال ہے، جو دونوں طرف برابر نسبت رکھتا ہے اور جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں پس ایسی دو جہتیں چیز کی جو ضدین میں برابر نسبت رکھتی ہو، کسی جہت پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں، البتہ ان تمام خیالوں میں سچا خیال، یا تمام مذہبوں میں سچا مذہب

وہی ہوسکتا ہے جو ضدین میں برابر نسبت رکھنے کے نقص سے پاک ہو۔

مذہب کی حقیقت

مذہب کیا چیز ہے؟ وہ ایک سچا اصول ہے کہ جب تک انسان اپنے قوائے جسمانی اور عقلی پر قادر ہے، اس کے تمام افعال ارادی، جوارح ،نفسانی وروحانی کا اسی اصول کے مطابق ہونا چاہیے، پھر اگر وہ اصول ایسے ہیں کہ صرف کسی قسم کے اعتقاد پر مبنی ہیں تو اگر متعدد لوگوں کا متضاد اصولوں پر کسی وجہ سے اعتقاد ہے،تو ایک کو سچا یا صحیح اور دوسرے کو جھوٹا یا غلط کہنے کی بجز تحکم کے اور کوئی وجہ نہیں ،سچا مذہب وہی ہوسکتا ہے جس کی سچائی نہ کسی اعتقاد پر، بلکہ حقیقی سچائی پر مبنی ہو کیوں کہ مذہب اعتقاد کی فرع نہیں ہے، بلکہ سچائی مذہب کی اصل یعنی عین مذہب ہے اور اعتقاد اس کی فرع ہے، پس جب کہ ہم مختلف مذہبوں میں سے سچے مذہب کو پرکھنا چاہیں تو دیکھیں کہ وہ سچے اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔

سچے مذہب کو پرکھنے کا سچا اصول کیا ہے۔

سچا اصول کیا ہے؟ جہاں تک کہ انسان اپنے قوائے عقلی سے جان سکتا ہے، وہ بجز قدرت یا قانون قدرت کے اور کچھ نہیں ،جس کی نسبت اسلام کے بانی نے یہ فرمایا کہ

” ماتری فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر ھل تریٰ من فتور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیمک البصر خاسئا وھو حسیر“

قدرت یا قانون قدرت کیا ہے؟ وہ وہ ہے،جس کے بموجب ان تمام چیزوں مادی

یا غیر مادی کا جو ہمارے اردگرد ہیں، ایک عجیب سلسلہ انتظام سے وجود ہے اور ہمیشہ انہی کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا ہے، بغیر خطا کے اسی طرح پر ہوتا ہے اور اسی طرح پر ہوگا پس وہی سچ ہے اور جو اصول اس کے مطابق ہیں وہی سچے اصول ہیں، نہ وہ جن کی بنا ایک فانی قابل سہو دخطا وجود، یعنی انسان کے اعتقاد پر منحصر ہو۔

قدرت ہم کو صرف اپنے وجود اور اپنے سلسلہ انتظام اور اپنے تعلقات ہی کی جو بے انتہا مخلوق میں پایا جاتا ہے، سچائی نہیں دکھلاتی، بلکہ اس سے ایسے بھی اصول پائے جاتے ہیں، جس سے ہم اپنے افعال ارادی جسمانی اور روحانی کی بھلائی اور برائی بھی جان سکتے ہیں اور جو کہ قدرت سچی اور کامل ہے، تو ضرور ہے، کہ وہ اصول بھی سچا اور کامل ہو اور یہی سچا اور کامل اصول یا یوں کہو، کہ وہ مذہب جس کے اصول اس کے مطابق ہیں وہی سچا مذہب ہونے کا مستحق ہے۔

یہ مت سمجھو کہ ہم قدرت یا قانون قدرت ہی کو مسبب یا اخیر سبب اس تمام کارخانہ کا سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی خالق نہ ہو، جیسے کہ دھریوں کا مذہب ہے، نعوذ باللہ منھا بلکہ قدرت کو تو ہم ایک قانون کہتے ہیں، جس کا کوئی بنانے والا ہے اور اسی لیے ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ ایک ہی مسبب اور ایک ہی اخیر سبب پر ختم ہوتا ہے، جس پر تمام چیزوں کی ہستی منحصر ہے۔ وہ جس کی ان پہچان ذات کو ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں ناموں سے لوگ پکارتے ہیں او میرے پیارے خدا! تم پردہ میں تو ہو، پر سب پر ظاہر ہو ایسے جھوٹ موٹ کے پردہ سے کیا فائدہ۔

رشک آیدم و گر نہ نقابت کشود مے
دست ترا گرفتہ بعالم نمود مے

معاذ اللہ توبہ توبہ میں نے کیا کہا کہیں کافر تو نہیں ہو گیا

" الھی انت عبدی وانا ربک استغفر الله انت ربی وانا عبدک"

پس آدمی کو چاہیے کہ اس کارخانہ قدرت سے اس کے بنانے والے کو اور اس کی راہ کو یا اس کی راہ بتانے والے کو تلاش کرے کہ یہی سیدھا راستہ چلنے کا ہے۔

مذہب کی تمثیل اور اس کی نسبت علماء کے اختلاف کا بیان

مذہب کی تمثیل میں علماء اسلام رحمہ اللہ علیہم اجمعین نے کیسی کیسی غلطیاں کی ہیں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں۔ بعضوں نے ملک اور غلام کی تمثیل دی ہے اور فرمایا ہے کہ مذہب اور شریعت کو مصالح قدرت اور اعمال کو اس کے بدلہ یعنی جزا اور سزا سے کچھ فائدہ نہیں، شاید ان لوگوں کا خدا ایسا ہو جو لغو کام کرنے کو کہے میرا تو خدا ایسا نہیں، وہ تو نہایت دانا اور سب سے بڑا حکیم مطلق ہے اس کی تو کوئی بات بھی حکمت اور منفعت سے خالی نہیں۔

اس رائے کو تو شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی غلط ٹھہرایا ہے۔ چناں چہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ

قد یظن ان احکام الشریعة غیر متضمنة لشئی من المصالح وانه لیس بین الاعمال و بین ما جعل الله جزاء لها مناسبة وان مثل التکلیف بالشرائع کمثل سید اراد ان یختبر طاعة عبده فامره برفع حجرا ولمس شجر مما لا فائدة فیه غیر الاختیار فلما اطاع او عصی جوزی بعلمه و هذا ظن فاسد تکذبه المنة واجماع القرون المشهود لها بالخیر

بعض عالموں نے مالک اور بیمار غلام سے مذہب کی تمثیل دی ہے، جس پر مالک نے اس کے علاج کے لیے اپنا مصاحب مقرر کیا ہو اور اس مصاحب کے حکم کو ماننا باعث نجات اور نہ ماننا باعث درکات ٹھیرایا ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اسی رائے کو صحیح قرار دیتے ہیں، چناں چہ وہ لکھتے ہیں، کہ

"وظهر مما ذكرنا ان الحق فی التكليف بالشرائع ان مثله، كمثل سيد مرض عبيده فسلط عليهم رجلا من خاصة ليستقيم دواء فان اطاعو اله اطاعوا السيد ورضی عنهم سيد هم واثابهم خيرا وبخوا من المرض وان عصوه عصوا السيد واحاط بهم غضبه و جازهم اسوء الجزاء وهلكوا من المرض"

مگر میں اس کو نہیں مانتا اور پوچھتا ہوں کہ دوا کا کرنا باعث نجات کا تھا یا مصاحب کے حکم کا ماننا تھا؟ اگر بے حکم مصاحب کے بھی وہ دوا کرتا تو نجات پاتا یا نہیں، ضرور پاتا، اس لیے کہ اس دوا سے نجات پانا قدرت کا قانون تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا۔

بعضے عالموں نے مذہب کی تمثیل ایسے طبیب سے دی ہے جو نہ خود کسی چیز کو امرت بناتا ہو اور نہ کسی کو ھلاھل ٹھیراتا ہو۔ بلکہ ہر چیز میں قدرت نے جو اثر رکھا ہے اسی کو بتاتا ہو تاکہ جو لوگ صحیح ہیں اپنے حفظ صحت کے اصول جانیں اور جو بیمار ہیں وہ حصول صحت کی دوا کو پہچانیں اور مذہب بہ نسبت اس کے کہ صرف بیمار غلاموں ہی کے لیے ہو، سب کے لیے عام ہو جائے۔

افسوس کہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس رائے کو نہیں مانتے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ

" وانه ليس الامر علىٰ ماظن من احسن الاعمال وقبحها بمعنى استحقاق العامل الثواب والعقاب عقليان من كل وجهه وان الشرع وظيفة الاخبار عن خواص الاعمال علىٰ ماهى عليه دون انشاء الا يجاب والتحريم بمنزلة طبيب يصف خواص الادوية وانواع المرض فانه ظن فاسد تمجه السنة بادى الرائے."

مگر جو اسی کو مانتا ہوں اور اسی کو سچا اصول سمجھتا ہوں جو قانون قدرت کے بالکل مطابق ہے اور کتاب وسنت دونوں کو اسی کا موید پاتا ہوں جو علم مذہب اسلام کی بنیاد ہیں۔

دنیا کا سچا مذہب

پس جہاں تک کہ سچے مذہب کی میں تحقیق کر سکا، میں نے اسلام ہی کو سچا مذہب پایا اور امید ہے کہ جو لوگ سچائی کو دوست رکھتے ہیں وہ ہمیشہ صفائی اور سچائی سے اسلام کی سچائی کی تحقیقات کریں گے۔

اسلام صحیح طور پر کن مجموعہ احکام کا نام ہوسکتا ہے؟

مگر ایک مشکل یہ پیش ہے کہ جب اسلام کا نام لیا جاتا ہے تو لوگ اس مجموعہ احکام کو جواب احکام مذہبی سمجھے جاتے ہیں، مذہب اسلام خیال کرتے ہیں ہاں مجازاً تو ان پر مذہب اسلام کا اطلاق ہوسکتا ہے، مگر حقیقتاً وہ مجموع من حیث المجموع بہ معنی حقیقی مذہب اسلام کہلانے کا مستحق نہیں ہے موجودہ مسائل مذہب اسلام میں دو قسم کے اصول واحکام شامل

ہیں ایک وہ جن کو خود شارع نے صاف صاف بیان کیا ہے جو احکام منصوصہ کہلاتے ہیں اور ایک جن کو عالموں اور مجتہدوں نے اپنے ذہن کی خوبی اور اپنے علم کی روشنی سے باستدلال دلالت النص یا اشارۃ النص یا قیاس کے قائم کیا ہے، جو اجتہادیات کہلاتے ہیں اور جو بجز ایک قابل سہو وخطا وجود کی رائے کے اور کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے۔ پس ان دونوں قسم کے مسائل میں تمیز نہ کرنے سے آدمی طرح طرح کی سخت غلطیوں میں پڑ جاتے ہیں اور یہ وہی ترک امتیاز ہے کہ جب مسلمان اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا نام تقلید رکھتے ہیں اور جب غیر مذہب کے لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کو ایک حقیر نام تعصب یا جہل مرکب یا ضلالت سے موسوم کرتے ہیں

فاعتبرو ایا اولی الا بصار

پہلی قسم کے احکام بھی جن کا نام احکام منصوصہ ہے، دو قسم کے احکام ہیں، ایک وہ جو اصلی احکام ہیں اور بلا شبہ وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق بلکہ اس کی جان ہیں اور دوسرے وہ جو ان اصلی احکام کی حفاظت اور ان کے بقاء اور قیام کے لیے ہیں پس جو کوئی مذہب اسلام کی سچائی ان سچے قدرتی اصولوں سے پرکھنی چاہے تو اس کو ان دونوں قسم کے احکام کی اور ان میں سے ہر ایک کے درجہ اور رتبہ کی تمیز کرنی لازم ہے۔

علاوہ مذکورہ بالا دو قسموں کے ایک تیسری قسم بھی احکام مذہب اسلام میں ہے، جو ذو معنین عبارتوں یا ناکامل سند یا مشتبہ سندوں سے قائم ہوئے ہیں ان میں سے پہلی قسم تو اجتہادیات میں داخل ہے اور دوسری قسم مذہب اسلام میں کچھ وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی گو اس پر اس وجہ سے کہ اس میں کچھ نقصان نہیں ہے، عمل ہوتا ہو۔

پس یہ سچا مذہب اور وہ شخص جس کی معرفت ہم کو اس کی تعلیم ہوئی، ہمارے بے انتہا ادب اور نامحدود ثنا وصفت کا مستحق ہے اور بلا شبہ اسی خطاب کے لائق ہے کہ

انت احسب الی یا رسول الله من نفسی التی بین جنبی

چناں چہ ہم کو بہت بڑی خوشی اور مبارکی اسی بات کی ہے کہ ہم نے اس کو نہ خدا سمجھا اور نہ خدا کا بیٹا نہ کوئی فرشتہ، بلکہ ایک وحی بھیجا ہوا انسان جانا مگر اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانا

بابی انت و امی یا رسول الله

دل	و	جانم	فدایت	یا	محمد
سر	من	خاک	پایت	یا	محمد

یاایها الذین آمنوا صلوا علیه وسلموا تسلیما

مسلمانوں اور عیسائیوں کی لکھی ہوئی کتب سیر

آں حضرتؐ کی زندگی کے حالات جن کو مسلمان سیر اور انگریز لیف (لائف) کہتے ہیں، صرف دین دار مسلمان عالموں ہی نے نہیں لکھے، بلکہ غیر مذہب کے علماء اور مورخین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ دونوں افراط وتفریط میں پڑ گئے، پہلوں کی آنکھوں میں تو کمال روشنی کے سبب چکا چوند آ گئی اور پچھلوں کی آنکھیں بجلی کی چمک سے بند ہو گئیں، پہلے تو شراب محبت کی سرشاری میں بات سے بھٹک گئے، اور پچھلے اس رستہ کی ناواقفی سے منزل تک نہ پہنچے پہلے تو یہ بھولے وہ کس کا بیان کرتے ہیں اور پچھلوں نے اسی کو نہ جانا، جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

کسی مشہور محدث نے بجز ایک کے جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے، کوئی خاص کتاب آں حضرتؐ کی زندگی کے حالات میں نہیں لکھی، لیکن تمام محدثین نے جن کی سعی اور کوشش

کا دنیا پر بہت بڑا احسان ہے، اپنی اپنی کتابوں میں ان حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے جو آں حضرتؐ کی زندگ کے حالات سے متعلق ہیں پس وہی حدیث کی کتابیں ہیں جن سے کم و بیش آں حضرتؐ کی زندگی کے حالات صحیح صحیح دریافت ہو سکتے ہیں اور جن کو معقول طرح پر ترتیب دینے سے اور صحیح کو غلط سے تمیز کرنے سے ایک معتبر تذکرہ آپ کی زندگی کا جمع ہو سکتا ہے۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے جو 209 ہجری مطابق 824ء میں پیدا ہوا اور 279 ھجری مطابق 892ء میں انتقال کیا، اپنی مشہور کتاب جامع ترمذی کے سوا ایک اور کتاب بھی آں حضرتؐ کے حالات میں لکھی ہے جو ''شمائل ترمذی'' کے نام سے مشہور ہے، مگر اس میں آپ کی زندگی کے تمام حالات مندرج نہیں ہیں، بلکہ وہ خاص خاص باتیں اور عادتیں جو بالتخصیص نفس نفیس آں حضرتؐ سے متعلق تھیں، مذکور ہیں۔

با ایں ہمہ جس قدر حدیثیں آں حضرت کے حالات سے متعلق، ان مشہور حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں، وہ اس قابل نہیں ہیں کہ جن کو ہم مثل کتاب اللہ کے بے غور اور بلا تحقیقات اندھا دھوندی سے مان لیں، بلکہ ہم پر واجب ہے کہ ان تمام حدیثوں کو خواہ وہ بخاری کی ہوں یا مسلم کی اور جامع ترمذی کی ہوں یا شمائل ترمذی کی، قبل ان کے سچا قبول کرنے کے ان کی سچائی اور صحت کی تحقیقات ان اصول و قواعد کے ساتھ کر لیں جو اس کے لیے مقرر ہیں، اور جن کو ہم نے ایک جداگانہ خطبہ میں بیان کیا ہے اور اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو سخت غلطیوں میں پڑیں گے، کیوں کہ بے سند حدیث مسلمانوں کے مذہب میں کوئی وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی کتاب تحفہ اثنا عشریہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں، ''حدیث بے سند گوزشتر است'' مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم مصنف ہیں جنہوں نے اس ضروری اور نہایت ضروری اصول کی پیروی کی ہو۔

ان حدیث کی کتابوں کے سوا جن کا ابھی ذکر ہوا اور بہت سی کتابیں ہیں جو خاص آں حضرتؐ کے حالات کے لیے لکھی گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں ان کے سوا اور بھی حالات ہیں اور یہ کتابیں عموماً کتب سیر کے نام سے موسوم ہیں ان میں سے کتب مفصلہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

ابن اسحاق، ابن ہشام، طبقات کبیر المشہور بہ واقدی، طبری، سیرت شامی، ابوالفدا، مسعودی، مواہب لدنیہ 1، ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں، جو انہی سے بنائی گئی ہیں ان کتابوں میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔

یہ سب کتابیں تمام سچی اور جھوٹی روایتوں اور صحیح وموضوع حدیثوں کا مختلط مجموعہ ہیں، جن میں صحیح اور غلط، مشتبہ اور درست اور جھوٹی اور سچی کسی کا کچھ امتیاز نہیں، اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں، ان میں اس قسم کا اختلاط اور زیادہ ہے قدیم مصنفوں اور اگلے زمانہ کے مورخوں کی تصنیفات سے زیادہ غرض یہ تھی کہ ہر ایک قسم کی وایتوں اور افواہوں کو جو ان کے زمانہ میں پھیل رہی تھیں، ایک جگہ جمع کر لیں اور اس بات کی تحقیقات اور تصحیح کہ کون سی ان میں کی بالکل صحیح ہے اور کون سی غلط اور کس میں زیادتی یا کمی ہوئی ہے اور کس میں مضمون کے سمجھنے اور واقعہ کے بیان میں غلط فہمی ہوئی ہے، آئندہ وقت یا آئندہ نسلوں پر منحصر رکھیں مگر افسوس یہ ہے کہ پچھلی نسلوں نے بہ عوض اس کے کہ تحقیقات مطلوبہ کرنے سے اپنے بزرگوں کے مقصد کی تکمیل کرتے، انہی کتابوں کو اپنی تصنیفات جدید کا ماخذ

1 علاوہ ازیں طبقات ابن سعد، تاریخ ابن اثیر اور تاریخ ابن خلدون کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جا سکتا ہے اور تاریخ یعقوبی کا بھی یہی ماخذ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہیں (محمد اسماعیل پانی پتی)

ٹھہرایا اور اس لیے ان پچھلے مصنفوں کی تصنیفوں میں بھی وہی نقص پیدا ہوا جو ان قدیم مصنفوں کی تصنیفوں میں تھا۔ غرض کہ اب فن سیر کی تمام کتابیں، کیا قدیم کیا جدید، مثل ایسے غلہ کے انبار کے ہیں جس میں سے کنکر، پتھر، کوڑا کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا اور ان میں تمام صحیح و موضوع، جھوٹی اور سچی، سند اور بے سند، ضعیف و قوی، مشکوک و مشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈمڈ ہیں۔

سر ولیم میور صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ ''آں حضرتؐ کے حالات زندگی کی تین کتابیں ہشامی، واقدی، طبری ایسی ہیں کہ جو شخص دانش مندی سے آں حضرتؐ کے حالات لکھے گا، تو اپنی تحریر کے لیے انہی کتابوں کو سند گردانے گا'' مگر صاحب ممدوح نے اس بات کو بیان نہیں فرمایا کہ ان کتابوں میں (1) کسی قدر ایسی روایتیں ہیں جن سے آنحضرتؐ کو کچھ بھی علاقہ نہیں (2) کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے (3) کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کی خصلت نہ کسی مذہبی مسئلہ کے سبب، بلکہ اخلاقی نقصانوں کے سبب مشتبہ اور ان کی راست بیانی مشکوک یا مطعون ہے (4) کس قدر ایسی ہیں جن کے بیان کرنے والے بالکل لامعلوم شخص ہیں (5) کس قدر ایسی ہیں جن کی تحقیق یا تصدیق نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے نہایت گرم جوشی سے واقدی کی قدر و منزلت کو اس کی اصلی حقیقت سے بہت بڑھا دیا ہے۔ جس کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ ارقام فرماتے ہیں کہ ''ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی تعریف اس کی حد سے زیادہ کی ہے'' مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے صاحب ممدوح نے بھی واقدی کی کم قدر نہیں کی اور اوروں پر ترجیح دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی، اس لیے کہ انہوں نے بھی آں حضرتؐ کی زندگی کے تمام حالات کو اسی کتاب سے لکھا ہے اور اسی کی سند پر مذہب اسلام کے برخلاف تمام راویوں کو قائم کیا ہے۔

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے وہ تو حاطب اللیل یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا ہے اس کی غلط روایتوں اور جھوٹے قصہ کہانیوں اور بے سند باتوں سے تمام علماء نے اس کو نا معتبر ٹھہرایا ہے۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے ''شرح مواہب لدنیہ'' میں میزان سے واقدی کی نسبت یہ جملہ نقل کیا ہے

الواقدی محمد بن عمر بن الواقدی الاسلمی المدنی الذی استقر الا جماع علی وھنہ

کسی کے کہنے اور سننے پر کیا موقوف ہے، خود اس کی کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت کے لائق نہیں، بجز اس کے کہ جو افواہاً اس نے سنا اور جو آواز چڑیا کی خواہ کوے کی اس کے کان میں آئی وہ اس نے لکھ دی۔ کوئی طریقہ تحقیق کا اور کوئی رستہ تنقیح کا اس نے اختیار نہیں کیا۔ پس کیا وہ کتابیں ایسی ہیں جو مذہب اسلام کی بنیاد سمجھی جا سکتی ہیں اور کیا وہ مخالف مذہب اسلام کا ان کی کتابوں کی سند پر مذہب اسلام یا اس کے واعظ میں عیب نکال کر اور اپنے آپ کو فتح مند سمجھ کر خوش ہو سکے گا

ان ھذا الشئی عجاب

البتہ ابوالفدا کی کتاب کسی قدر اچھی ہے اور جہاں تک ہو سکے اعتبار کے لائق ہے اس نے اپنی کتاب احتیاط سے لکھی ہے، اگرچہ تحقیق و تنقیح کے رستہ کو اس نے اختیار نہیں کیا الا اس بات پر کوشش کی ہے کہ کوئی موضوع یا مشتبہ یا لغو روایت اس میں نہ داخل ہونے پاوے، مگر با ایں ہمہ یہ کہنا کہ اس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس میں کوئی روایت موضوع یا مشتبہ نہیں ہے، حد اعتدال سے آگے بڑھ جانا ہے۔

مسلمان مورخوں کے سوا جن کا اوپر ذکر ہوا، عیسائی مورخوں نے بھی مذہب اسلام اور اس کے واعظ کی نسبت بہت سی کتابیں لکھیں مگر افسوس ہے کہ ابتدائے زمانہ کی تصنیف

شدہ کتابیں مثل کتب مصنفہ وینیل، لوتھر، ملانگ تھن، سیپال ھیم، دی ھر بی لاٹ، مجھ کو دست یاب نہیں ہوئیں۔ مگر جو کچھ اور کتابوں سے ان کا حال معلوم ہوا، وہ اسی قدر ہے کہ ان کتابوں میں بجز سخت کلامی اور بدزبانی کے اور کچھ نہیں ہے۔

ان مصنفوں کے سوا مراکشی صاحب کا ذکر نہایت حیرت انگیز ہے وہ ایک ایسا سخت متعصب مصنف ہے کہ اس کا دل اپنے بغض و کینہ کے اظہار اور نفرت انگیز جھوٹے طعن و تشنیع اور بدزبانی سے کبھی نہیں بھرا مگر مجھ کو جو حیرت ہوئی وہ اس بات سے ہوئی کہ ''کوارٹرلی رویو'' کے ایک آرٹیکل کے مصنف نے اس کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''مراکشی پر جو یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ باطن میں اسلام کا معتقد ہو گیا تھا، وہ الزام کچھ بے وجہ نہ تھا'' کے امراکش با وصف اس قدر تعصب کے مثلی ''برھر خورد'' صاحب کے آخر کو مسلمان ہو گیا تھا اگر ایسا ہوا تو میں ذمہ وار ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ اس نے اسلام اور واعظ اسلام کی نسبت کہا سنا سب نسیاً ومنسیاً ہو گیا

لان الاسلام یھدم ما کان قبلہ من معیۃ اللہ

ڈین پریڈی صاحب بھی انہی مورخوں میں سے ہیں جن پر مذہب اسلام نہایت شاق گذرتا تھا جب کوئی مسلمان اتفاقاً ان صاحب کی کتاب کو پڑھتا ہے تو مذہب اسلام سے ان کی ناواقفیت پر جو ان کی کتاب کے ہر ورق سے ٹپکتی ہے بن ھنسے رہ نہیں سکتا۔

ان مورخوں کے سوا ھا تیجر گیگزری لنڈ او کلی صاحب نے بھی مذہب اسلام اور آں حضرتؐ کے حالات میں کتابیں لکھی ہیں، مگر افسوس ہے کہ میں ان کی محنتوں سے مستفید نہ ہو سکا۔

گوتھ صاحب اور اماری صاحب اور نالڈ انک صاحب اور دواری صاحب نے جو کتابیں اس مضمون پر لکھی ہیں، ان کی نسبت مذہب اسلام کے آرٹیکل کا مصنف جو ''کواٹرلی

رویو“ میں چھپا ہے، یہ لکھتا ہے کہ ”ان مورخوں نے بہت سی دنیا کو یہ بات سکھلا دی کہ مذہب اسلام ایک شگفتہ اور تر و تازہ چیز ہے اور ہزاروں نمرود جوھروں سے بھرپور ہے اور محمدؐ گوان کی خصلت کو کیسا ہی سمجھا جاوے، انسانیت کی سنہری کتاب میں اپنے لیے جگہ حاصل کی ہے۔“

نہایت مشہور عیسائی مورخوں میں، جنہوں نے آں حضرتؐ کے حالات لکھے ہیں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب ہیں، ان کی کتاب انگریزی زبان میں بمقام الہ آباد 1851ء میں چھپی ہے مگر وہ کتاب بہ سبب غلطیوں کے جو اس کے مضمون کی صحت میں ہیں، کچھ اعتبار کے لائق نہیں ہے علاوہ اس کے ایک اور خرابی انہوں نے اس کتاب میں یہ کی ہے کہ اس کا طرز بیان نہایت مبالغہ آمیز اختیار کیا ہے۔ ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصّبات اور یک طرفہ رائے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی قسم کے مصنف کو، اور بالتخصیص ایک مورخ کو، کسی طرح زیبا نہیں ہے، اپنے اس کلام کی تصدیق کے لیے ان کی کتاب میں سے ایک فقرہ نقل کرتا ہوں، جس سے ان کے تعصب کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس فن میں انہوں نے کتاب لکھی ہے اس سے بھی ماشاءاللہ وہ بتہ ہی خوب واقف تھے وہ لکھتے ہیں کہ ”اسلام محمدؐ کا ایجاد نہیں ہے وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہوسکتا مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اسی کے ایجاد ہیں“

نعوذ بالله من هذه الا قاويل كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون لا كذربا

اسی کتاب کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ لکھتے ہیں، کہ ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کی کتاب ایسے وقت میں میرے پاس پہنچی جب کہ میں اسی مضمون کی تحصیل اور تلاش کر رہا تھا

اور جیسا کہ میں نے اپنی کتاب کے بعض مقامات میں ثابت کیا ہے، اس کے مضامین کی بنیاد غلطی پر معلوم ہوتی ہے چناں چہ انھوں نے محمدؐ کے ما قابل زمانہ کے عرب کا اور خاص محمدؐ کا اور ان کی خصلت کا جو حال لکھا ہے، وہ سب غلط راویوں پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے ایک اور کتاب جرمنی زبان میں آں حضرتؐ کے حالات میں لکھی ہے جو چھ جلدوں میں ہے، مگر افسوس ہے کہ جرمنی زبان نہ جاننے کے سبب اس کتاب سے جس قدر قدرے قلیل فائدہ حاصل کر سکتا، اس سے بھی محروم رہا، صرف اس قدر ہوا کہ میرے ایک جرمن دوست نے مجھ کو اطلاع دی کہ اس کے مصنف نے ابن اسحاق اور واقدی سے زیادہ تر مطالب اخذ کیے ہیں اور جو کہ میں ان مصنفوں کی کتابوں سے واقف ہوں، جن سے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مطالب اخذ کیے، اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ کتاب بھی مثل اور کتابوں کے، جن کو عیسائی مورخوں نے تصنیف کیا ہے، اس تحقیق اور تلاش سے معرا ہو گی جو صفائی دل سے کی جاتی ہے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب انھی کتابوں سے لکھی ہے جن میں صحیح اور غلط اور مشتبہ اور لغو روایتیں سب گڈ مڈ ہیں۔

مگر کوارٹرلی ریویو کے آرٹیکل کا مصنف جو غالباً جرمن ہے، اس کتاب کی نسبت یہ رائے لکھتا ہے کہ ''جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے، ان میں سے ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب کو جو مصنفوں میں اول درجہ رکھتا ہے، ہم نے اس لیے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے، اس لیے کہ اس کتاب میں وہ تمام مطالب ناظرین کے سامنے موجود کر دیے گئے ہیں جن سے پڑھنے والا اپنی رائے آپ قائم کر سکے۔''

سر ولیم میور کی کتاب (لائف آف محمدؐ)

عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ وہ کتاب ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال خوبی کے ساتھ لکھی ہے یہ کتاب چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے اور بہت خوب صورت ٹیپ اور خوش وضع تقطیع میں چھپی ہے۔ اس لائق اور فائق مصنف کو مثل مغربی علوم کے مشرقی علموں میں بھی بڑی واقفیت حاصل ہے اور اس لیے ان کی یہ کتاب تمام تربیت یافتہ یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے، اور وہ اسی قدر و منزلت کے لائق ہے۔ یورپ کے عالموں اور عالموں کی مجلسوں نے بھی اس کتاب کے سبب ان کی ایسی قدر کی ہے، جس کے درحقیقت وہ مستحق تھے مگر قطع نظر اس نقص کے جو اس کتاب میں ہے، کہ اس کی بنیاد گویا بالکل واقدی پر ہے جو مسلمانوں میں درجہ اعتبار نہیں رکھتا اور اس کی روایتیں زیادہ معتبر اور ایسی محقق نہیں ہیں کہ مسلمان ان پر یقین لاویں، جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں، ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ جس منشاء اور مطلب سے سر ولیم میور صاحب نے یہ کتاب لکھی، وہ اس لیے پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ منشاء اس کتاب میں نقصان رہ جانے کا اور واقعات کا اصلی تحقیقات تک نہ پہنچنے کا بہت بڑا سبب ہوا ہے چناں چہ سر ولیم میور صاحب خود ارقام فرماتے ہیں کہ ''اس کتاب کا لکھنا اور مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کی تحصیل اول اس غرض سے اختیار کی گئی کہ پادری پی فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی، اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لیے مناسب ہو، ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جاوے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہیں چناں چہ میں نے اسی منشاء سے مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کو پڑھا اور اس کتاب کو لکھا۔''

لیکن میں نہایت افسوس سے یہ بات کہتا ہوں کہ باوجودیکہ سر ولیم میور صاحب

نہایت نیک طبیعت ہیں اور بڑی قابل توصیف لیاقتیں رکھتے ہیں، اس پر بھی ان کی طبیعت پراس غرض اور منشاء کا جس سے وہ کتاب لکھنی شروع کی، ایسا اثر پیدا ہوا جیسا کہ ایسی حالت میں اوروں کی طبیعت پر پیدا ہونا قیاس کا مقتضا ہے اور اسی سبب سے اسلام کی دل چسپ اور سیدھی سادھی عمدہ باتیں بھی ان کو بری اور بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں اور یہ اثر ان کی طبیعت کا ایسا تھا کہ اس کے سبب سے ان کی کتاب پڑھنے والے اپنے ذہن میں ان کی تحریر کو ایک زیادتی سمجھتے تھے، لیکن جیسا اکثر ہوتا ہے ویسا ہی اس میں بھی ہوا کہ اس حد اعتدال سے متجاوز تحریر نے خود اپنے مقصود کو کھو دیا اور وہ مطلب حاصل نہ ہوا جس کے لیے پادری پی فنڈر صاحب نے سر ولیم میور صاحب سے اس کتاب کے لکھنے کی خواہش کی تھی، بلکہ برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوا کہ جس شخص کو پادری پی فنڈر صاحب نے تاریکی کا فرشتہ بنانا چاہا تھا، وہ روشنی کا فرشتہ نکل آیا۔

جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی، تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا مگر جب ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آں حضرتؐ کے حالات کی نہایت سیدھی سادھی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح لکھنا مقصود اور مرکوز خاطر تھا تو ان کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا مگر جو نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے اور اپنے دینیات اور الہیات سے محض ناواقف تھے ان میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی برے پہلو پر لے جا کر لکھا ہے تو فی الواقع ان کی اصلیت کیا ہے۔

میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں میں نے ارادہ کیا کہ آں حضرتؐ کے متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھی جاوے کہ جو جو باتیں صحیح

اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح صحیح سندوں سے بہ خوبی ثابت ہیں ان کو بہ خوبی چھان بین کر اور امتحان کر کر ترتیب سے لکھا جاوے اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جاوے اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور حمقاء کو دام تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں ان کو علیحدہ بہ ترتیب لکھا جاوے اور انہی کے ساتھ ان کے غلط اور ان کے نامعتبر ہونے کا ثبوت اور ان کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جاویں۔ مگر میں اپنے اس ارادہ کو بہت سے موانعات کے سبب سے جن میں سب سے بڑا اپنی فکر معاش میں مبتلا رہنا اور اس سے بھی بڑا کسی کا میرے ارادہ کے مدد و معاون نہ ہونا تھا، پورا نہ کر سکا اور علاوہ اس کے اس کام کے لیے بہت سی پرانی کتابیں جن کو قدیم مصنفوں نے تصنیف کیا ہے، درکار تھیں جو مجھ کو بہ سبب برباد ہو جانے قدیم کتب خانوں کے دستیاب نہ ہو سکیں اور یہ بھی ایک قوی سبب اس ارادہ کے پورا نہ ہونے کا ہوا مگر اس پر بھی مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین اور مسائل مذہب اسلام اور آں حضرت کے حالات پر کچھ کچھ لکھتا رہا چناں چہ انہی تحریروں میں یہ بارہ مضمون ہیں جو بہ عنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں۔

ایڈورڈ گین اور جان ڈیون پورٹ اور کارلائل کی رائے اسلام کی نسبت

اگر چہ میں نے اس تمہید میں چند عیسائی ایسے مورخوں کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے آں حضرت کے حالات اور اصول مذہب اسلام کا انصاف سے فیصلہ نہیں کیا مگر ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مورخوں کا ذکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا، جنہوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آں حضرت کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے اگر چہ بعض مقامات میں انہوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کیے ہیں لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے، بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے پس یہ ایک غلطی سمجھ کی تو ہے الا وہ عیب جو تعصب اور تنگ حوصلہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے، وہ نہیں ہے بہ ہر حال یہ قابل ادب شخص ایڈورڈ گبن قدیم روم کی سلطنت کا مشہور مورخ اور گاڈفری ہیگنز (رحم اللہ تعالیٰ) ارٹامس کارلیل اور جان ڈیون پورٹ سلمہا اللہ تعالیٰ ہیں، جن ے علم اور لیاقتوں کی تعظیم و قدر ہمیشہ ہوتی رہے گی اب میں ان صاحبوں میں سے تین صاحبوں کی رائے جو انہوں نے آں حضرت اور مذہب اسلام کی نسبت لکھی ہے، اپنے اس دیباچہ میں لکھتا ہوں اور گاڈفری ہیگنز کی رائے خطبات میں متعدد جگہ لکھی گئی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ لکھتے ہیں ”کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسند اور حقیر بت پرستی کے بدلہ جس میں اس کے ہم وطن (یعنی اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے، خدائے برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کیں۔ مثلاً اولاد کشی کو موقوف کیا، نشے کی چیزوں کے استعمال کو اور قمار بازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہے منع کیا ہے۔ بہتایت سے کثرت ازدواج کا اس وقت میں رواج تھا اس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا غرض کہ ایسے بڑے اور سرگرم مصلح کو ہم فریبی ٹھہرا

سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی۔نہیں ایسا نہیں کہہ سکتے بے شک محمدؐ بجز دلی نیک نیتی اور ایمان داری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتدائے نزول وحی سے جو خدیجہ سے بیان کی اخیر دم تک جب کہ عایشہ کی گود میں شدت مرض میں وفات پائی، مستعد نہیں رہ سکتے تھے، جو لوگ ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور جو ان سے بہت ربط وضبط رکھتے تھے ان کو بھی کبھی ان کی ریا کاری سے شبہ نہیں ہوا اور کبھی انہوں نے اپنے نیک برتاؤ سے تجاوز نہیں کیا۔''

بے تک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو اپنے خالق پر بھروسہ ہو اور جو ایمان اور رسم ورواج میں بہت بڑی اصلاح کرے حقیقت میں صاف صاف خدا کا ایک آلہ ہوتا ہے اس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے اور وفادار خادم ہو گذرے ہیں، اگرچہ ان کی خدمتیں کامل نہ تھیں، اسی طرح محمدؐ کو بھی ہم خدا کا ایسا سچا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے خدا تعالیٰ کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی، جیسی اوروں نے جو مثل آوروں کی خدمت کے پوری اور کامل نہ تھی اس بات پر کیوں یقین نہ کیا جاوے کہ اس کو زمانہ اور اپنے ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے کے لیے اور ان کی حالت کے مناسب ان کو ملکی اور اخلاقی امور میں نصیحت کرنے کے لیے خدا نے بھیجا تھا، اور وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔

ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں، کہ ''محمد کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک صاف ہے قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے، مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی، انسانوں کی، ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شے طلوع ہوتی ہے، غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہوتی ہے، اور جو قابل زوال ہے، وہ معدوم ہو جاتی ہے اس نے اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا، جس کی

نہ ابتدا ہے نہ انتہا، نہ وہ کسی شکل میں محدود، نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اس کو تشبیہہ دے سکیں وہ ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے بغیر کسی اسباب کے موجود ہے اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو حاصل ہے، وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا ہے اور اس کے پیرووں نے ان کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے بہت درستی کے ساتھ ان کی تشریح اور تصریح کی ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو، مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے، جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ جب ہم نے اس نا معلوم چیز (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا، تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیے کیا چیز باقی رہی، وہ اصل اول (یعنی ذات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچی، چناں چہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے۔''

مسٹر ٹامس کارلیل صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمدؐ ایک پرفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے، اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرتی جاتی ہیں، جو جو جھوٹ باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (یعنی عیسائیوں) نے اس انسان (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت قائم کی تھیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں، چناں چہ ایک یہ بات مشہور ہے، کہ پاکرک صاحب نے جب گروٹیس صاحب سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے، کہ محمدؐ نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا، کہ

وہ ان کے کان میں سے میل نکالا کرتا تھا، اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے، جو ان کے پاس وحی لایا کرتا ہے، تو اس قصہ کی کیا سند ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں" حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے ایسے قصوں کو بالکل چھوڑ دیا جاوے جو جو باتیں اس انسان (یعنی محمد صلعم) نے اپنی زبان سے نکالیں بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بہ منزلہ ہدایت کے قائم ہیں، ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اسی طرح خدا نے پیدا کیا ہے، جس طرح ہم کو پیدا کیا۔ اس وقت جتنے آدمی محمدؐ کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں، کہ جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اس پر مر گئی کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے، جیسا ایک بازی گر کا ہوتا ہے[1] میں اپنے نزدیک ہر گز ایسا خیال نہیں کر سکتا، بلکہ میں بہ نسبت اور چیزوں کے اس پر جلد یقین کرتا ہوں، اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر زور آور ہوں اور رواج پکڑ جاویں اور مسلم ٹھیر جاویں، تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی کیا سمجھے گا اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں، بہت ہی افسوس کے قابل ہیں، اگر ہم کو خدا کی سچی

1 میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت بھی اسی پر نہایت مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کر رہے ہیں اور جن ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی ان ملکوں کے لوگوں نے بھی ان کی باتیں سن کر ان کو قبول کیا اور اب بھی کہ اس کے بانی کو دنیا کے گئے ہوئے بارہ سو برس ہو گئے ہر ایک ملک میں اور ان ملکوں میں بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہے، ہزاروں نئے لوگ اس پر بغیر کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر و حکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام کو قبول کرتے ہیں تو کیا وہ ایسا چھوٹا کھیل ہے، جیسا کہ ایک بازی گر کا ہوتا ہے نہیں بلکہ اس کے سچ ہونے کا ہر

ایک کے دل پر یقین ہوتا ہے۔ سید احمد

مخلوقات کا علم کچھ حاصل کرنا منظور ہوتو ہم کو ایسی باتوں پر یقین کرنا ہر گز نہیں چاہیے وہ باتیں ایسے زمانہ میں پھیلی تھیں، جب کہ توہمات کو بہت دخل تھا اور انہیں توہمات کے سبب خیال تھا کہ آدمی کی روحیں غمگین خرابی میں پڑی ہوئی ہیں، جو ان کی ہلاکت کا سبب ہے میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے آدمی نے ایک مذہب قائم کیا اور کوئی اس سے زیادہ بد اور ناخدا پرست خیال دنیا میں نہیں پھیلا بھلا یہ کب ہوسکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ اور اینٹ اور اور مصالح کی حقیقت کو سچ نہ جانے اور پختہ مکان بنالے، وہ پختہ مکان کا ٹھیکو ہوگا بارہ سو برس تک اس کو کب قیام ہوسکتا ہے اور اٹھارہ کروڑ آدمی اس میں کب رہ سکتے ہیں بلکہ اب تک وہ مکان کبھی کا سر کے بل گر پڑا ہوتا ضرور ہے کہ ایک آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت کے مطابق کرے اور قدرت کے سامانوں کی حقیقت کو سمجھے اور اس پر عمل کرے، ورنہ قدرت سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں یہ ہر گز نہیں ہوسکتا، جو جو قانون اور قاعدے خاص ہیں، وہ خاص ہی رہتے ہیں، عام نہیں ہوجاتے۔ افسوس ہے کہ کوئی شخص مثل کاگ لسٹرو یا اور ایسے ہی بہت سے دنیا کے سر برآوردہ لوگوں کے چند روز کے لیے اپنے قند فطرت سے کامیاب ہوجاتے ہیں، مگر ان کی کامیابی ایک جعلی ھنڈوی کی مانند ہوتی ہے، جس کو وہ اپنے نالائق ہاتھوں سے جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں، اور اوروں کو اس کے سبب سے نقصان پہنچاتے ہیں مگر قدرت آگ کے شعلوں اور فرانسیسی ہنگاموں اور اسی قسم کے اور غضب ناک ظہور سے ظاہر ہوکر یہ بات بہت غضب اور قہر سے دنیا پر ظاہر کردیتی ہے کہ جعلی ھنڈویاں جعلی ہی ہیں''

راقم

سید احمد

بمقام لنڈن محلّہ میکلن برگ اسکوئیر مکان نمبر 21

1870 عیسوی مطابق 1227 ھجری

☆☆☆☆☆☆

(1) جغرافیہ ملک عرب اور اس کی اقوام وقبائل

رب اجعل ھذا البلد امنا واجنبی و بنی ان نعبد الاصنام

عرب کی وجہ تسمیہ

عرب یا وہ جزیرہ نما جو جزیرۃ العرب کہلاتا ہے۔بحر احمر کے مشرق کی طرف واقع ہے اور یہاں سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے اس بات کا ٹھیک ٹھیک متحقق ہونا کہ اس ملک کا نام عرب کیوں کر اور کس زمانہ میں رکھا گیا نہایت مشکل ہے لیکن کتاب اول ملوک باب (10) ورس 15، میں جہاں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کی ملاقات کا ذکر ہے اس ملک کو عرب کے نام سے بیان کے اگیا ہے یہ واقعہ 3000 دنیوی یا 1005 قبل حضرت مسیح کے گزرا تھا مگر ہماری رائے میں یہ جزیرہ حضرت سلیمان کے زمانہ کے بہت پہلے سے عرب کے نام سے کہلایا جاتا تھا کیوں کہ اس کا ذکر کتاب ملوک میں اس طرح پر کیا گیا ہے کہ گویا ایک بہت معروف اور مشہور ملک کا نام ہے کتاب توریہ متی باب (1) ورس (7) و باب (2) ورس (8) میں لفظ عربہ پایا جاتا ہے مگر جو باتیں 1ے کہ اس جزیرہ نما کی وجہ تسمیہ میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے وہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے جو خود اس لفظ سے نکلتی ہے اور جو اس ملک کی طبعی بناوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے لفظ عربہ کے معنی وادی یا بیابان کے ہیں اور جو کہ ایک بڑا حصہ جزیرہ عرب کا بالکل بیابان ہے اور وادی کے نام سے مشہور ہے اسی وجہ سے

کل جزیرہ کا نام عرب ہوگیا لفظ عربہ کا ہر قصبہ کے نام کے پہلے بہ طور ایک عام صفت کے لگایا جاتا تھا اور اسی طرح عربات[2] جو اس کی جمع ہے اس جزیرہ کے ایک حصہ پر بولا جاتا تھا جیسا کہ کتاب توریہ ثنی باب (34) ورس (1,8) میں آیا ہے بعض مورخ از راہ جرأت یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک گانوں 3 موسوم کی وجہ سے جو تہامہ کے

1 بعض لوگ عرب کے نام کو لفظ عربہ کی طرف جس کے معنی ہموار بیابان کے ہیں اور جو صوبہ تہامہ کا ایک ضلع ہے منسوب کرتے ہیں اور بعض لوگ لفظ عیبر کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کے معنی خانہ بدوش کے ہیں کیوں کہ زمانہ سابق میں عرب خانہ بدوش تھے اس صورت میں اس کا اشتقاق لفظ عبرانی سے جس کی یہی وجہ تسمیہ ہے ثابت ہوتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ لفظ عبری مصدر عرب سے نکلا ہے جس کے معنے نیچے جانے کے ہیں اور اس سے وہ ملک مراد ہے جس میں سمٹک یعنی اولاد سام بن نوح کو جو دریائے فرات کے کنارہ پر رہتی تھی آفتاب غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا بوکارٹ صاحب کے نزدیک لفظ عرب ایک فی شین لفظ سے جس کے معنی اناج کے بالوں کے ہیں مشتق ہوا ہے لفظ عربہ ایک عبری لفظ بھی ہے جس کے معنی بنجر زمین کے ہیں اور توریت میں شام اور عرب کی حد فاصل کے طور پر بارہا بولا گیا ہے (چیمبرز انسائیکلو پیڈیا صفحہ 344) (سید احمد)

2عربات بالتحریک جمع عربة وهی بلاد العرب (مراصد الاطلاع جلد2صفحه245)

3عربة قریة فی اول وادی نخلة من جهة مکة (ایضاً صفحه246)

نزدیک واقع ہے اس تمام جزیرہ کا یہ نام پڑ گیا مگر یہ رائے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ممکن ہے کہ لفظ عربہ جو کسی گانوں کے نام کے پہلے محض بہ حیثیت ایک جز ممیّزہ کے استعمال کیا جاتا ہو اور رفتہ رفتہ اس کے اصلی نام کے قائم مقام ہوگیا ہو۔

حدود اربعہ

عرب کی حدود اربعہ یہ ہیں مغرب میں بحر احمر، مشرق میں خلیج فارس و خلیج عمان، جنوب میں بحر ہند

شمالی حد کی توریت کے مطابق تعیین

شمال کی جانب اس کی سرحد بابل اور شام سے ملی ہوئی ہے اور اس کو آبنائے سویس مصر سے علیحدہ کرتی ہے یہ جزیرہ نما شمال اور مغرب کی جانب کنعان سے ملا ہوا ہے، جو بنی اسرائیل کا وطن ہے اور جس کو متقدمین یونانی فنشیا اور متوسط زمانہ کے لوگ فلسطین یا ارض مقدس کہتے تھے اور بالفعل سیریا یعنی شام کے نام سے مشہور ہے اسی زمین کی نسبت خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد سے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا لیکن جو کہ ان دونوں ملکوں کی اس سمت میں بیابان حائل ہیں اس لیے قبل اس کے کہ عرب کی شمالی اور مغربی حد معین کرنے کی کوشش کی جاوے ''ارض موعود'' کی جنوبی اور مشرقی حد کو محقق کرنا چاہیے جب کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری اولاد کو ایک ملک عطا کروں گا اس وقت حضرت ابراہیم اس مقام پر رہتے تھے جو درمیان (بیت، ایل اور عی) کے واقع ہے جیسا کہ سفر تکوین باب (13) ورس (3) میں مذکور ہے اگرچہ خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت ابراہیم کو وہ ملک جس کے دینے کا وعدہ کیا تھا دکھلا دیا تھا، لیکن اس کی ٹھیک ٹھیک حدیں نہیں بتائی تھیں جیسا کہ سفر تکون باب (13) ورس (14,15) سے

ظاہر ہوتا ہے مگر جب خدا تعالیٰ نے دوبارہ اپنے وعدے کی تجدید کی اس وقت حضرت ابراہیم کو صرف اس کی دو حدیں بتلائیں جیسا کہ سفر تکوین باب (15) ورس (18) میں لکھا ہے کہ خدا نے ابراہیم سے کہا کہ اس زمین کو نہر مصر سے نہر بزرگ تک جو نہر فرات ہے تیری ذریت کو دوں گا۔

مگر تعجب ہے کہ اس کے بعد کتابہائے مقدس کے کسی لکھنے والے نے دریائے مصر کو ''ارض موعود'' کی سرحد نہیں قرار دیا جس کی وجہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ برخلاف اس کے بیر شبع 1 کو ہر جگہ اس کی حد جنوبی قرار دیا ہے، اور جب کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بیابان مواب میں ''ارض موعود'' دکھلائی تو انہوں نے دیکھا، کہ صوعر 2 اس کی جنوبی سرحد ہے صوعر اور بیر شبع قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہیں، اس واسطے ان دونوں میں سے کوئی جگہ بلا تفرقہ ''ارض موعود'' کی جنوبی سرحد قرار پا سکتی ہے۔

مگر یہ بات بالتخصیص جانی چاہیے، کہ بیر شبع دو 3 تھے

1 کتاب قضاۃ باب 20 ورس 1 شموئیل اول باب 3 ورس 720 شموئیل دوم باب 3 ورس 10 و باب 14 ورس 2,15 ملوک اول باب 4 ورس 25، ملوک دوم باب 23 ورس 8 تواریخ اول باب 21 ورس 2، تواریخ دوم باب 30 ورس 5

3 ہم کو صاف اور صریح خبر ملی ہے (شموئیل دوم باب 24 ورس 7,15) سے کہ بیر شبع یہودیہ کے جنوب میں ادویہ کی جانب واقع تھا اور اس واسطے اس کو وہ بیر شبع نہ سمجھ لینا چاہیے جو گلیلی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہے اور جس کا ذکر جوسفس نے اور حال میں ڈاکٹر رچرڈ سن نے کیا ہے (بائبل سائکلو پیڈیا مولفہ جے بی لاسن ایم اے جلد 1 صفحہ 307)

(بقیہ حاشیہ صفحہ 33 پر)

ایک کا نام صرف بیر شبع 1 تھا اور دوسرے کا نام قریہ بیر شبع یا شبعہ 2 کہا جاتا تھا، یعنی

وہ جگہ جہاں بیابان جرار میں حضرت اسحاق کے نوکروں نے اس وقت جب کہ حضرت اسحاق اور ابی ملک کے باہم عہد و پیمان اور حلف ہوا تھا، ایک کنواں کھودا تھا چناں چہ سفر تکوین باب 26 ورس 32,33 میں لکھا ہے "اور ایسا ہوا کہ اسی دن اسحاق کے نوکر آئے اور اس کنوئیں کا حال جو انہوں نے کھودا تھا بیان کیا اور ان سے کہا کہ ہم کو پانی مل گیا اور انہوں نے اس کا نام شبع رکھا اسی واسطے اس شہر کا نام آج تک بیر شبع ہے۔" اور یہ وہی 3 جگہ ہے، جہاں سے کہ حضرت یعقوب حاران کو روانہ ہوئے تھے اور اسی جگہ 4 حضرت یعقوب کے بیٹے جب کہ وہ مصر کو غلہ لینے جاتے تھے ٹھہرے تھے، اور ایک زمانہ میں یہ شہر گردونواح کے ملک کا پایہ تخت تھا اور شموئیل کے لڑکے وہاں 5 حاکم تھے عاموص 6 نبی نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے، کہ یہاں بت پرستی بہت شائع تھی اور صیاہ 7 مادر یہو یہواش اسی جگہ پیدا ہوئی تھی اور ایلیاہ 8 ملکہ ایزبل کے خوف سے یہاں بھاگ آئی تھی یہ شہر 9 بابل والوں کی گرفتاری

1 سفر تکوین باب 21 ورس 31,32

2 یوشع باب 19 ورس 2

3 سفر تکوین باب 28 ورس 10

4 سفر تکوین باب 26 ورس 1,5

5 شموئیل اول باب 8 ورس 2

6 کتاب عاموص باب 5 ورس 5 و باب 8 ورس 14 و باب 7 ورس 9

7 ملوک دوم باب 12 ورس 1 تواریخ دوم باب 24 ورس 1

8 ملوک اول باب 19 ورس 3

9 نحمیاہ باب 11 ورس 77 و 30

تک ویران نہیں ہوا تھا۔ بعض لوگوں کی یہ رائے ہے، کہ وہ اب ایک نہایت چھوٹا سا

گاؤں رہ گیا ہے اور ایک وسیع ریگستان کے قرب وجوار میں واقع ہے جہاں کہ بجز اطراف سمندر کے آباد کا نام ونشان نہیں ہے بیر شبع جران سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر تھا اور یوسی بیس کے زمانہ میں جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔اس میں ایک رومی فوج رہتی تھی یہ بیر شبع اکتیس درجہ سترہ دقیقہ عرض شمالی پر واقع تھا اور طول شرقی اس کا چونتیس درجہ اور چون دقیقہ کا تھا، پہلا بیر شبع قادیش اور شور کے بیابانوں کے بیچ میں تھا اور حضرت ابراہیم نے اس کو بنایا تھا۔حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کلدانیوں کے شہر کو جس کا نام ''اور کلدانیاں'' تھا چھوڑ کر حاران کو چلے گئے اور وہاں چند روز ٹھہر کر مصر کی طرف چلے گئے اور جب مصر سے واپس ہوئے تو اسی 2 جگہ پر ٹھہرے جہاں کہ پہلے ٹھہرے تھے اور وہاں سے حضرت لوط ان کے ساتھ سے جدا ہو کر وادی 3 اردن کو روانہ ہو گئے اور حضرت ابراہیم نے قادیش اور شور 4 کے بیابانوں میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک 5 کنواں کھودا۔حضرت ابراہیم 6 مدت تک یہاں رہے اور ایک باغ 7 لگایا اور جب حضرت 8 ھاجرہ

1 سفر تکوین باب 11 ورس 31

2 سفر تکوین باب 13 ورس 3

3 سفر تکوین باب 13 ورس 10,11

4 سفر تکوین باب 20 ورس 1

5 سفر تکوین باب 21 ورس 14,15,30

6 سفر تکوین باب 22 ورس 19

7 سفر تکوین باب 21 ورس 23

8 سفر تکوین باب 16 ورس 8 لغایت 14

حضرت ابراہیم کی پہلی بی بی حضرت سارہ سے ناراض ہو کر نکل گئی تھیں، تو اسی جگہ پر

آئی تھیں اوراسی کنوئیں کے پاس ان کو خدا کا فرشتہ دکھائی دیا تھا اوراس لیے انہوں نے اس کنوئیں کا نام بیرلحی روئی یعنی

" بیر للحی المرئی "

رکھا تھا اس کے بعد ایک قحط سالی کے ایام میں حضرت اسحاق نے اس مقام کی سکونت چھوڑ دی اور جرار[1] کو چلے گئے اس میں کچھ شک نہیں کہ قادیش ایک اور جگہ ہے اور جراراس سے بہت دور ہے۔ وہاں کے باشندے حضرت اسحاق سے واقف نہ تھے، اور غالبًا بدطینت اور بدخصلت آدمی تھے اس لیے حضرت اسحاق نے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے ان لوگوں سے اپنی بی بی کی نسبت کہا، کہ یہ میری بہن[2] ہے مگر جب ابی ملک نے حضرت اسحاق کو جرار سے نکال دیا تب انہوں نے بیابان جرار میں بودوباش اختیار کی اور وہاں ایک کنواں کھودا جس کا نام شبع رکھا اور جس مقام پر سکونت اختیار کی تھی اس کا نام قریہ[3] بیر شبع رکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جگہ وہ جگہ ہرگز نہیں ہوسکتی جہاں حضرت ابراہیم نے کنواں کھودا تھا۔

ان باتوں کی اس قدر تفصیل کرنے سے ہمارا منشاء دو چیزوں کے ثابت کرنے کا ہے اوراول یہ کہ عرب کی شمالی حد ملک شام یا ''ارض موعود'' سے ملحق ہوتی ہے اور ''ارض موعود'' کی جنوبی حد حضرت اسحاق والا بیر شبع یا صوعر جس کو بلع[4] بھی کہتے ہیں دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم والا بیرشع

1 سفرتکوین باب 26 ورس 6

2 سفرتکوین باب 26 ورس 17

3 سفرتکوین باب 26 ورس 32

4 سفرتکوین باب 14 ورس 1

قادیش میں ہے جوملک عرب میں واقع ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع اور حضرت اسحاق والا بیر شبع دونوں ایک ہی ہیں ان واقعات پر مبنی ہے جن کو کہ میں ابھی ثابت کروں گا کہ ان پر کسی طرح اعتبار نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلا واقعہ جو ان کی رائے کا موید ہے یہ ہے کہ جب حضرت اسحاق قادیش سے چلے گئے تو فلسطین والوں نے حضرت ابراہیم کے کھودے ہوئے کنوئیں کو مٹی سے بھر کر بند کر دیا اور جب کہ ابی ملک نے حضرت اسحاق کو جرار سے نکال دیا تو حضرت اسحاق نے انہیں کنوؤں کو از سر نو کھودا جو ان کے والد حضرت ابراہیم کے زمانہ میں کھودے گئے تھے، اور جن کو فلسطین والوں نے روک دیا تھا اور انہوں نے ان کنوؤں کے وہی نام رکھے جو ان کے والد نے رکھے تھے مفسرین توریت کا یہ استدلال ابتدائی یا سرسری نظر میں ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور خیال میں آتا ہے کہ بیر شبع ایک ہی ہوگا مگر ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا، سفر تکوین کے چھبیسویں باب کی اٹھارھویں آیت تک توریت میں حضرت ابراہیم کے صرف انہیں کنوؤں کا بیان ہے، جن کو حضرت اسحاق نے پھر کھدوایا تھا۔ مگر اسی باب کی انیسویں آیت سے لے کر آخر باب تک ان قدیم کنوؤں کا مطلق ذکر نہیں ہے۔ بلکہ نئے کنوؤں کا ذکر ہے ان نئے کنوؤں کے نام بھی حضرت اسحاق نے رکھے تھے اول کا نام بیر عشق دوسرے کا نام سطنہ تیسرے کا نام رجوبوث اور چوتھے کا نام سبعہ رکھا تھا اس سے صریح واضح ہے کہ یہ کنوئیں حضرت ابراہیم کے کنوؤں میں سے نہیں تھے پھر اسی باب کی سترھویں آیت کا صاف صاف مضمون یہ ہے کہ حضرت اسحاق نے جرار کی وادی میں اپنا خیمہ نصب کیا اور وہاں آباد ہوئے۔ اور انیسویں اور بیسویں ورس میں بیان ہے کہ حضرت اسحاق کے آدمیوں نے وادی میں کنواں کھودا اور وہاں ایک کنواں جاری پانی کا برآمد ہوا اور جرار کے چرواھوں نے حضرت اسحاق کے چرواھوں سے تکرار کی اور پانی پر اپنا دعویٰ کیا۔ پس جب کہ ان سب آیتوں کا ایک دوسری سے مقابلہ کیا جاوے تو

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کنوئیں وادی جرار میں کھودے گئے تھے نہ وادی قادیش میں ایک اور امر جو مذکورہ بالا لوگوں کی رائے کی تائید کرتا ہے تیئسویں آیت کا یہ مضمون ہے کہ حضرت اسحاق ابی ملک کو چھوڑ کر بیر شبع کو چلے گئے جس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بیر شبع سے مراد حضرت ابراہیم والا بیر شبع ہے کیوں کہ اس وقت تک حضرت اسحاق والے بیر شبع کا وجود بھی نہ تھا لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ جس بیر شبع کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع نہیں ہے بلکہ حضرت اسحاق والا بیر شبع ہے کتب مقدسہ لکھنے والوں کا یہ قاعدہ ہے کہ پچھلے زمانہ کے حالات لکھنے میں جب کسی مقام کا ذکر آتا ہے تو وہ اس مقام کا وہی نام لکھ دیتے ہیں جو زمانہ تحریر میں اس کا نام ہوتا ہے گو کہ اس زمانہ میں جس کا وہ حال لکھتے ہیں اس مقام کا وہ نام نہ تھا بلکہ وجود بھی نہ تھا چناں چہ اکثر مقامات میں انہوں نے بہت سے شہروں اور قصبوں کا جو اس زمانہ کے عرصہ دراز کے بعد وجود میں آئے تھے نام لے کر ذکر کیا ہے اکیسویں باب کی چودھویں آیت میں حضرت ابراہیم والے بیر شبع کا نام مذکور ہے اگر چہ اس وقت تک اس کنوئیں نے وہ لقب حاصل نہیں کیا تھا۔

ملک کی بناوٹ کے لحاظ سے عرب کی تقسیم

عرب علی العموم ایک وسیع مسطح اور ویران ملک ہے مگر جا بجا چند بے انتہا سرسبز و شاداب اقطاع بھی واقع ہیں اور بعض عظیم الشان پہاڑ بھی ہیں جن کی گھاٹیاں تازگی اور

خوش نمائی کے لیے مشہور ہیں اس میں جو سب سے بڑے نقصانات ہیں وہ کثرت سے وادیوں کا ہونا اور پانی کا نہ ہونا ہے میوے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جن میں کھجود نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے جو عرب کے ملک سے مخصوص ہے اور در حقیقت عرب کے لوگوں کی زندگی کا بہت بڑا ذریعہ ہے عرب کے گھوڑے تمام دنیا کے گھوڑوں سے عمدہ اور خوب صورت ہوتے ہیں لیکن عرب کے لیے سب سے زیادہ مفید جانور اونٹ ہے جس کو ریگستان کا جہاز لکھنا بے جا نہیں ہے۔

عرب ٹھیک طور سے دو حصوں میں منقسم ہوسکتا ہے:

1 ایک عرب الحجر یونی کوہستانی عرب جو خاکنائے سوئیس سے لے کر بحر احمر اور بحر عرب تک پھیل رہا ہے 2 دوسرا عرب الوادی یعنی عرب کا مشرقی حصہ مگر بطلیموس [1] پرانے

1 جزیرہ عرب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا موجد بطلیموس خیال کیا جاتا ہے اور وہ تین حصے یہ ہیں عرب الحجر، عرب المعمور، عرب الوادی، عرب الحجر میں تمام شمالی، غربی حصہ شامل تھا۔ عرب المعمور میں غربی اور جنوبی کنارہ، عرب الوادی میں تمام اندرونی حصہ جو اچھی طرح معلوم نہ تھا مگر اس تقسیم کو عرب کے لوگ تسلیم نہیں کرتے اور حال کی تحقیقات کی رو سے بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی چیمبرز ان سائیکلو پیڈیا صفحہ 344 یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بطلیموس نے ملک کو اس کی طبعی حالت کے لحاظ سے تقسیم کیا تھا نہ کہ حد بندی کے لحاظ سے (سید احمد)

جغرافیہ داں نے عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1 عرب الحجر یعنی پتھریلا عرب 2 عرب المعمور یعنی عرب آباداں 3 عرب الوادی یعنی ریگستانی عرب آج کل کے نقشوں میں عرب الحجر میں صرف وہ حصہ ملک کا شامل رکھا گیا ہے جو خلیج سوئیس اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے مگر اس تقسیم کے لیے کوئی معتبر سند نہیں بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق عرب الحجر کو خلیج سوئیس سے لے کر یمن یا عرب المعمور کی حد تک شمار

کرنا چاہیے وہ لوگ جن کے نزدیک بطلیموس نے عرب المعمور لفظ یمن کا ترجمہ کیا ہے بلا شک غلطی پر ہیں۔ کیوں کہ اس پرانے جغرافیہ داں کے زمانے میں عرب الحجر کا جنوبی حصہ گنجان آباد تھا اور تجارت کے لیے مشہور تھا جس کی وجہ سے اس نے تمام جزیرہ کے اس حصہ کا عرب المعمور نام رکھ دیا عربی جغرافیہ دانوں نے جزیرہ عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے تہامہ، حجاز، نجد، عروض، یمن غیر ملکوں کے مورخ اور جغرافیہ دان جو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اس ملک کو حجاز اس سبب سے کہتے ہیں کہ حاجی اور زائروں کا عام مرجع ہے وہ بڑی غلطی پر ہیں کیوں کہ لفظی معنی حجاز کے اس چیز کے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان میں واقع ہو تمام ملک کا یہ نام اس پہاڑ کی وجہ سے پڑ گیا ہے جو شام اور یمن کے درمیان بہ طور حجاب کے واقع ہے عرب بہ لحاظ ان مختلف قوموں کے جو اس زمانے میں آباد ہیں اور ان آبادیوں کے ناموں کے، اور ان آبادیوں کے ملکی حالات کے، اور ان کے باشندوں کے اعتبار سے بے شمار حصوں میں منقسم ہو گیا ہے مگر اس بات کا کہنا کہ یہ حصے ٹھیک کس طرح پر ہیں بغیر اس بات کے اول جان لینے کے کہ یہ قومیں جو ان میں آباد ہیں، کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں اور کہاں کہاں آباد ہوئیں اگر محال نہیں تو غیر ممکن تو ضرور ہے اس لیے ہم حتی الامکان ان امور کی تنقیح کی کوشش کریں گے، ان امور کی نسبت کتب مقدسہ یا عرب کے قرب و جوار کی قوموں کی کتابوں میں بہت کم تذکرہ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کے لکھنے والے صرف ''ارض موعود'' کے حالات لکھنے اور تلاش کرنے میں مصروف رہے اور ان کی تمام ہمت صرف بنی اسرائیل کے حالات لکھنے پر منحصر تھی اور غیر قوموں نے اس ویران اور بے ثمر ملک کی طرف کچھ توجہ نہیں کی۔

اس مضمون کے لکھنے میں جہاں تک کہ ہو سکے گا ہم ان دونوں ذریعوں سے گو کہ ان سے بہت ہی کم حالات معلوم ہوتے ہیں فائدہ حاصل کریں گے اور اس کی تائید میں عرب

کی ملکی روایتوں سے جو قابل اعتبار معلوم ہوتی ہیں غفلت نہ کریں گے۔

عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم

جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے باب میں ہیں وہ نہایت معتبر ہیں کیوں کہ عرب کے لوگ اپنی آبائی رسوم اور اوضاع اور اطوار کے بہ درجہ غایت پابند تھے اور ان کو کبھی ترک کرنا یا تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا قریباً قریباً اپنا فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا جدا جدا نام رکھتا تھا اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلہ کو بہ خوبی جانتا تھا اور اپنے حسب نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا اور جس طرح کہ پرانی قوموں ''سکندنیوین'' اور ''سلٹک'' کے ہاں کڑ کیٹ ہوتی تھی، اسی طرح عرب کی قوموں میں بھی ہوتی تھی جن کا لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کو ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا1۔

جو کچھ کہ میں نے عرب کی ملکی روایتوں کی نسبت بیان کیا ہے اس کی تائید رورنڈ مسٹر فارسٹر کے بیان سے ہوتی ہے انہوں نے عرب کا ایک جغرافیہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زباں زم خاص وعام ہے، تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے کیوں کہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قومی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے ایک اور تعجب انگیز مثال عرب کی اس پابندی کی قدامت اور رفاقت کی کرنیل چنی نے اس طرح بیان کی ہے کہ عجل عربوں کا ایک گروہ بغداد کے قریب خیمہ زن ہوا۔ میں ان کے خیمہ گاہ کی سیر کے واسطے گیا ان خیموں کے بیچ میں شاہی نشان اسپین کا لہراتا ہوا دیکھ کر مجھ کو کمال حیرت ہوئی

اور ایک عربی خیمہ میں تین دھاریوں کی علامتوں کو

1 ہمارے ملک میں جو ہندو قومیں آباد ہیں ان کے حالات پر غور کرنے سے اور اس بات کے دیکھنے سے کہ باوجود اس کے کہ ہزارہا برس اور مختلف حکومتیں ان پر گذر گئیں ہیں مگر ان کی جدا جدا قومیں آج تک ممکن طرح پر محفوظ ہیں اور ہر ایک اپنی قوم اور پنی گوت یعنی قبیلہ سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اور آج تک ان کے معزز لوگوں کے ہاں بھاٹ اور کرکت موجود ہیں عرب کی قدیم قوموں کے حالات کا نقشہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور ہر شخص خیال کرسکتا ہے کہ اسی طرح انہوں نے اپنی قوم اور قبیلہ کو علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھا تھا۔ (سید احمد)

دیکھ کر میں نے ان کا حال دریافت کرنے کی کوشش کی ایک نہایت بڈھے آدمی نے مجھ سے کہا کہ جب کہ ان کے آباؤ اجداد برابر کے ملک میں گئے تھے اور وہاں سے اسپین کی فتح کے واسطے روانہ ہوئے اس وقت خلیفہ نے ان کی خدمات کے بدلے میں قبیلہ عجل کو شاہی نشان اسپین کا بہ طور جھنڈے کے عطا فرمایا تھا ڈین پریڈو نے عرب کی رسم و رواج کی نسبت اس طرح پر لکھا ہے کہ قوم عرب دنیا میں سب سے زیادہ قدیم قوم ہے جو اپنے مورثان اعلیٰ کے زمانہ سے آج تک نسلاً بعد نسل اپنے ملک میں رہتی چلی آئی ہے اور جس قدر کہ عرب اپنی رسم و رواج میں تغیر و تبدل کو ناپسند کرتے ہیں اسی قدر ملک کے ناموں کے بدلنے کو ناپسند کرتے ہیں اسی وجہ سے اکثر مقاموں کے وہی نام بہ دستور چلے آتے ہیں جو ابتداء میں رکھے گئے تھے اسی وجہ سے ملک مصر کے قدیمی دار السلطنت کے رہنے والے جو مصری کہلاتے تھے اور بعد کو زمانہ دراز تک بنام ممفس مشہور رہے، عربوں کے تسلط کے زمانہ سے پھر مصری کہلانے لگے اور جب سے برابر یہ نام چلا آتا ہے یہ مثالیں من جملہ ان بے شمار مثالوں کے ہیں کہ فلسطین میں ایک اور قسم کی قدیمی روایت ہے، جس سے کہ کنیسوں کو کچھ علاقہ نہیں ہے، یعنی عوام الناس میں مقاموں کے قدیمی ناموں کا بہ جنسہ چلا آنا فی الحقیقت

یہ قومی اور دیسی روایت ہے جو کسی طرح پر اجنبی کنیسوں اور اجنبی حکام کے اثر سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ انہوں نے اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ اس کو پیا ہے اور سمٹک زبانوں کی طبیعت میں استحکام کے ساتھ گھر پکڑ گئے ہیں مقامات کے عبری نام انجیل کے زمانے کے بہت عرصہ بعد تک اپنی آرمینیں شکل میں مروج رہے اور باوجود اس کے کہ یونانی اور رومیوں نے اپنی اپی زبانوں کے ناموں کی ترویج کے لیے کوششیں کیں مگر عوام الناس کی زبان پر وہی پرانے نام جاری رہے۔"

غرض کہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل امور سے معلوم ہوسکتا ہے میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدون اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ونسبت با آواز بلند بیان کرے، تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔

کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا۔ بعض اوقات جب کہ کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا جو اب شرع میں بہ لفظ الدیت علی العائلہ مستعمل ہے۔

اس قسم کی رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا غیر ممکن ہو گیا تھا اور اسی بناء پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر کما حقہ اعتبار قائم ہوا اور برقرار رہا۔ اب ہم عربوں کی اس مشہور ومعروف پابندی کو جو اپنی قومی اطوار اور عادات اور اپنے بزرگوں کی رسوم کے ساتھ رکھتے ہیں، بیان کر کے سوال کرتے ہیں کہ اس بات کا یقین کرنا کس طرح سے ممکن ہے کہ ایسی قوم پر جو تغیر وتبدل کے اس قدر برخلاف ہو اور مزیدے برآں قبیلوں کے سخت اختلافات کی نسبت اس قدر محتاط

ہوں مندرجہ ذیل شبہات کرنے کے لیے کافی وجوہ ہیں، یعنی ایسے شبہات کے لیے جن کی تائید کے واسطے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ بنی عملیق اور بنی نبات میں ہم کو ایسو اور اسماعیل کی اولاد صاف صاف نظر آتی ہے اور اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بہ جنسہ چلی آتی ہے بلکہ فتح کے انقلابات اور دوسری قوموں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جن کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے ان کو اپنے نسبت کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برقرار رہی ہو مگر اس معترض کو ہمارے اوپر کے بیان سے ثابت ہو گیا ہو گا کہ یہ امر ناممکن نہ تھا بلکہ در حقیقت اسی طرح پر واقع ہوا، جیسا کہ بیان ہوا ہے۔

حضرت اسماعیل اور حضرت ھاجرہ کی سکونت عرب میں

اب یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ حضرت اسماعیل اور حضرت ھاجرہ کی سکونت کے باب میں ملکی اور قومی دونوں طرح کی روایتیں نہایت معتبر ذریعہ سے ہمارے زمانے تک پہنچی ہیں اور وہ ایسی روایتیں ہیں کہ جن کو تمام قوم نے بلا تامل صحیح مان لیا ہے پھر ہم کس طرح کسی عیسائی طرف دار مصنف (سر ولیم میور) کے محض بے دلیل بیانات کو صحیح اور معتبر تصور کر سکتے ہیں جس کا یہ بیان ہے کہ ”یہ روایت ایک کہانی ہے یا توریت سے اخذ کر کے تحریر کر دی گئی ہے“ مگر جس وقت کہ اس عالی رتبہ مصنف نے یہ بیان کیا ان کو معلوم نہ ہوگا کہ خود توریت ہی سے حضرت ابراہیم کے نسبت کی بابت اس روایت کی تائید ہوتی ہے اس کے بعد مصنف موصوف نے کم سن اسماعیل اور ان کی بے کس ماں کی سکونت کی اصلیت کی

نسبت اس طرح پر قیاس دوڑایا ہے کہ ''بنی اسماعیل اور عمالیق کی قومیں جزیرہ عرب کے شمال اور وسط میں پھیلی ہوئی تھیں غالباً یہی لوگ مکہ کے اصلی متوطن ہوں گے یا زمانہ سابق میں یمن کے شمول میں وہاں آبسے ہوں گے اس کے بعد ایک فرقہ بنی اسماعیل خواہ نباتی خواہ کسی ہم نسل خاندان کا وہاں کے کنوؤں اور کاروانی تجارت کے دل پسند موقع کے لالچ میں وہاں چلا گیا ہوگا اور بہت ذی اختیار ہو گیا ہوگا یہ فرقہ اپنی ابراہیمی نسبت کی پرانی روایتوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا اور مقامی اوھام اور اعتقادات پر خواہ وہ اسی ملک کے ہوں یا یمن سے لائے گئے ہوں ان کو منقش کر دیا ہوگا۔''

ان قیاسی باتوں کی غلطی اس طرح پر ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت اسماعیل کی عمر جب کہ ان کے باپ نے ان کو گھر سے نکالا تھا توریت کے مطابق سولہ 1 برس کی تھی اور یہ عمر ایسی تھی کہ جو روایتیں انہوں نے اپنے والد سے سنی تھیں ان کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد رکھنے کے قابل تھے اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے اور حضرت ابراہیم بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔انجام کار

1 جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی (سفر تکوین باب 16 ورس 12) اور جب حضرت اسحاق پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی (سفر تکوین باب 21 ورس 5) اور حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو حضرت اسحاق کے دودھ چھٹنے کے زمانہ میں گھر سے نکال دیا تھا اس حساب سے حضرت اسماعیل جب کہ جلاوطن ہوئے تھے سولہ برس کے تھے حضرت ابراہیم کا ایک سو پچھترویں برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق دونوں نے مل کر کمپیلا کے غار میں دفن کیا تھا (سفر تکوین باب 25 ورس 9) اس لیے حضرت اسماعیل کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی (سید احمد)

سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ حضرت اسماعیل جن کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی بروقت وفات حضرت ابراہیم اپنے والد کے ان کے پاس موجود تھے، یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہوں گی کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف اقوام عرب میں اس قدر شائع ہیں۔لوگوں کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے پہنچی ہیں اور یہ امور ایسے بدیہی اور ذہن نشین ہونے کے لائق ہیں کہ اگر پھر کوئی شخص براہ جرأت یہ کہے کہ یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہنچی ہیں تو اس کو سن کر کچھ کم تعجب نہ ہوگا مگر تعجب اس بات پر آتا ہے کہ مصنف موصوف نے اپنے قیاسی خیال کے ثابت کرنے کا ادعا کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''مگر ان بنی اسرائیل کو جو توریت پڑھتے ہیں صرف نام اور مقام ہی سے اس نسب کا احتمال عائد ہوتا ہے اور یہودی مصنفوں میں، الہامی ہوں خواہ غیر الہامی ہم کافی اظہار اس امر کا پاتے ہیں کہ ایسا خیال درحقیقت کیا گیا تھا یہ قدرتی استنباط خود ان قوموں میں سے جن سے وہ علاقہ رکھتا تھا قرب وجوار کے یہودیوں کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً شائع ہو گیا ہوگا اور ان بے جوڑ روایتوں کے غیر مکمل آثار کو جو ھنوز ان کے تخیلات اور ان کی عادات اور ان کی زبان میں موجود تھے تقویت دے دی ہوگی۔''

اگرچہ اس رائے کی غلطی اوپر کے بیان سے بہ خوبی ظاہر ہوگئی ہے مگر عرب کی قوموں کی عادت پر خیال کرنے سے اس رائے کی اور غلطی ظاہر ہوتی ہے عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت کے موافق اپنی اصلی روایتوں میں کوئی نئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے بالکل علیحدہ رہتے رہے یہاں تک جب حضرت اسماعیل اور ان کے ہمراہی وہاں آ کر آباد ہوئے تو قدیمی عرب ان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب ''مستعربہ'' سے ان کو ملقب کیا تھا آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہل عرب بنی اسماعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے رہے اور قدیم عرب نے اپنی

قدیمی روایتوں کا ان سے مبادلہ نہیں کیا اور بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہ تھی۔

آنحضرت صلعم نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیاء بنی اسرائیل برحق نبی تھے اور ان پر ایمان لانا چاہیے اس وقت بنی اسرائیل کی اور ان کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہو گئے لیکن جو کہ بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہ تھیں اس وجہ سے عرب کی روایتیں بجائے خود بہ جنسہ برقرار رہیں۔

تمام نئے آباد ہونے والے جو وقتاً فوقتاً عرب میں آباد ہوئے اور قدیم متوطنان عرب نے تین نام حاصل کیے تھے اول عرب البائدہ، یعنی صحرائی عرب، دوم عرب العاربہ، یعنی قدیمی عرب سوم عرب المستعربہ یعنی عرب میں نئے آباد ہونے والے جو بہ سبب زمانہ دراز کی سکونت کے عرب بن گئے تھے یہ تین بڑی تقسیمیں قریب قریب تمام باشندگان عرب پر حاوی ہیں، خانہ بدوش بدووں سے لے کر ان قدرے شائستہ قوموں تک جو کنارہ کے برابر برابر آباد ہیں اور معہذا اقدیم باشندگان عرب اور جدید باشندگان عرب کے درمیان تمیز بھی قائم رکھتے ہیں اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ عرب کے باشندوں کا ان مذکورہ بالا تین عام قسموں کے مطابق علیحدہ علیحدہ بیان کریں۔

☆☆☆☆☆☆☆

اول::

عرب الباشدہ یا خانہ بدوش صحرائی عرب کی قومیں

عرب الباشدہ میں سات شخصوں کی اولاد کی سات مختلف گروہیں شامل ہیں 1 کوش پسر حام پسر نوح کی اولاد 2 عیلام پسر سام پسر نوح کی اولاد 3 لود پسر سام پسر نوح کی اولاد 4 عوص پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد 5 حول پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد 6 جدیس پسر گرش پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد 7 ثمود بسر گرش پسر ارم یسر سام پسر نوح کی اولاد۔

کوش کی اولاد خلیج فارس کے کنارے پر اور اس کے قرب و جوار کے میدانوں میں آباد ہوئی۔

جرھم پسر عیلام بھی اسی طرف جا کر رود فرات کے جنوبی کناروں پر سکونت پذیر ہوا۔

لود کے جوان میں تیسرا مورث اعلیٰ ہے تین بیٹے مسمیان طسم، عملیق، امیم تھے جنہوں نے اپنے آپ کو تمام مشرقی حصہ عرب میں یا یہ سے لے کر بحرین اور اس کے گرد و نواح تک پھیلا دیا۔

عوص پسر عاد اور حول دونوں نے ایک ہی سمت اختیار کی اور جنوب میں بہت دور جا کر حضرت موت اور اس کے قرب و جوار کے میدانوں میں اقامت اختیار کی۔

جدیس پسر گرش پسر ارم پسر سام عرب الوادی میں آباد ہوا۔

ثمود پسر گرش پسر ارم پسر سام نے عرب الحجر میں اور اس میدان میں جو وادی القرے کے نام سے مشہور ہے اور ملک شام کی جنوبی اور ملک عرب کی شمالی حد ہے، رہنا اور قبضہ کرنا پسند کیا۔

عربی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ اپنی تصنیفات میں نسبت عرب البائدہ اور ان کے مقامات سکونت کے لکھا ہے، اس کا انتخاب ذیل میں لکھتے ہیں جن سے ان امور کی جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں تصدیق ہوتی ہے۔

قال القاضه صاعد ابن احمد الاندلسی صاحب قضاء مدینة طلیطلة.... ان العرب البائده فکانت امما ضخمة کعاد و ثمود و طسم و جدیس و لتقادم انقرا ضهم ذهیت ان حقایق اخبارهم و القطعت عنا اسباب العلم بآثارهم

اما جرهم فهم صنفان جرهم الاولی و کانوا علی عهد عادفبا دوا و درست اخبارهم وهم من عرب البائده ابوا الفدا

سکنت بنو طسم المیامة الی البحرین ابوا لفدا سکنت بنو عاد الرمل الی حضر موت ابو الفدا

وبلا دعا یقال لها الاحقاف وهی بلاد متصله بالیمن وبلاد عمان ابو الفدا.

والی عادا خاهم هودا وهو عاد بسن عوص بن ارام بن سام وهم عاد الا ولیٰ کانت منازل قوم عاد بالاحقاف وهی رمال بین عمان و حضرت موت معالم التنذیل

سکنت ثمود الحجر بین الحجاز و الشام ابو الفدا

كـانـت مسـا كـنهـم بـالـحجر بين الحجاز والشام الى وادى القرى معالم التنزيل.

الحجر بالكسر ثم السكون والراء اسم ديار ثمود بوادى القرىٰ بين الـمـديـنة والشـام كانت مساكن ثمود وهى بيوت سخوتة فى الجبال مثل الـغـايـر تسـمـى تـلـك الجبال الا ثاليب كل جبل منقطع عن الاخريطاف حـولـه وقـد نـقرفيه بيوت ونقر على قدر الجبال التى تنقر فيها وهى بيوت فـى غـايه الحسن فيها نقوش و طيقان محكمة الصنعة وفى وسطها بيرالتى كانت تردها الناقة مراصد الا طلاع على اسماء الا مكنة والبقاع

الـحـجـر بكسر الحاء و سكون الجيم والراء ديار ثمود بواد القرىٰ بين المدينة والشام مشترک يا قوت المحموى.

قـال ابن حوقل والحجر بين جبال علىٰ يوم اكثر من خمسة ايام قال و كـانـت ديار ثمود الذين قال الله عنهم و ثمود الذين جابوا الصخر بالواد قـال رايت تلك الجبال و مانحت منها كما اخير الله تعالىٰ و تختون ميں الـجـبـال بيـوتـا فـارهيـن و تـسـمىٰ تلك الجبال الا ثاليب اقول وهى التى يـنـزلهـا حـجـا ج الشـام وهـى عن العلى على تحدو نصف مرحلة من جهة الشام تقويم البلدان.

ووادى الـقرى فهو بادية الجزيرة وما كان من بالس الىٰ ايله مواجها للحجاد معارضا لارض بتوک فهو بادية الشام تقويم البلدان.

اب کہ ہم نے اس مقام پر ایک کامل فہرست سات مختلف اقوام عرب البائدہ کے مورثان اعلیٰ کی لکھ دی ہے اوران مقامات کوبھی بیان کر دیا ہے جہاں جہاں یہ مختلف قومیں

آباد ہوئیں تو اب ہم حتے المقدور ان شعبوں اور شاخوں کی تفصیل بیان کریں گے جو ان قوموں سے پیدا ہوئی ہیں:

اولاً بنی کوش، کسی عرب کے مورخ نے بنی کوش کا کچھ حال نہیں بیان کیا۔ سب کے سب خاموش ہیں اور اس سبب سے ان کے حالات کچھ دریافت نہیں ہوئے اسی بناء پر جارج سیل اور انہیں کی مانند اور انگریزی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ ''کوش کی اولاد عرب میں آباد نہیں ہوئی تھی۔'' نویری نے اپنے جغرافیہ میں ایک یہ فقرہ لکھا ہے

" وملک شر جیل علی قلیس و تمیم"

اس فقیرہ میں نویری نے بنی کوش کا ذکر بہ شمول بنی تمیم کے کیا ہے جس سے وہ حصہ سلطنت کا مراد ہے جو الحارث نے اپنے دوسرے بیٹے شرجیل کو بخشا تھا نویری کے اس فقرہ پر رورنڈ مسٹر فارسٹر یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشرقی مورخ بنی کوش کو عرب کے رہنے والوں میں شمار کرنے سے خاموش نہیں ہیں۔ مگر رورنڈ مسٹر فارسٹر کو اس میں کسی قدر دھوکا ہوا ہے کیوں کہ نویری کے فقرہ سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ بنی قیس اور بنی کوش ایک ہی خاندان میں یعنی حام کی اولاد میں ہیں مشرقی مورخوں نے جو بنی کوش کا کچھ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ ظاہراً یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود مشرقی مورخ دھوکے میں پڑ گئے ہیں کیوں کہ کوش کی اولاد جو مشرق میں آباد ہوئی تھی اور یقطان کی اولاد جو جنوب کی طرف یمن اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہوئے تھے ان دونوں کے ناموں میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے اور اس سبب سے مشرقی مورخوں نے دھوکے کھا کر تمام واقعات و حوادث کو جو بنی کوش سے متعلق تھے بنی یقطان سے متعلق سمجھ لیا اور ان تمام واقعات اور حوادث کو بنی یقطان کی طرف منسوب کر دیا۔

مگر رونڈ مسٹر فارسٹر[1] نے بڑی کوشش اور تلاش سے اور بڑی صحت اور قابلیت سے

نہایت معتبر اور مستند حوالوں سے

1 یہ ایک عام اور مسلم رائے ہے کہ سبا پسو کلاں کوش نے پہلے وہ حصہ وادی القرے کا آباد کیا جو دریائے فرات کے ملحق ہے اور یہ رائے بہ ظاہر وجوہات ذیل پر مبنی ہے ضلع مذکور کا ''خوزستان''، یعنی کوش کے اصلی وطن کے قریب واقع ہونا زمانہ مابعد میں شہر ''سبی'' اور قوم سبا کا سرحد ''خالدیہ'' پر موجود ہونا کوشی ناموں اور خاندانوں، جویلاء، ستباہ، راماہ، دودان، کا خلیج فارس کے کنارہ پر مسلسل سلسلہ میں واقع ہونا اور سب سے اخیر یہ کہ اشعیاہ نبی کی کتاب کے دو مقاموں میں کوش اور ''سبا'' کا ساتھ ساتھ بیان ہونا جس سے پایا جاتا ہے کہ ''سبا'''' خوزستان'' سے ملحق ہے ''راس سنڈم'' کے قریب جس کو بطلیموس نے ''راس اسابی'' کر کے لکھا ہے ہم مسٹر سیل کے نقشہ میں شہر ''کشکان'' جو توریت کے ''کشام'' کے مرادف ہے، پاتے ہیں بحر عمان کے اسی کنارہ پر ''عمنان'' یا ''عمان'' اور ''تامر'' یا ''سیب'' اور ''سوبا'' شہروں کے درمیان میں ہم ایک ساحل پاتے ہیں جس کو ''پلینی'' نے سواحل ''حام جو بالفعل'''' ماحام'' کہلاتا ہے اس خاکنائے کے مقابل کی اطراف پر جو ''راس مسنڈم'' میں منتہی ہوتی ہے اور ''خلیج فارس'' کے دھانہ کے اندر شہر اور ضلع ''رعماء'' جس کو یونانی ترجمہ توریت میں ''رغمہ'' اور بطلیموس نے ''رغامہ'' لکھا ہے پایا جاتا ہے خلیج کے باہر شہر اور ضلع '' دوان'' یا ''دوانہ'' کا پتہ ملتا ہے اور توریت میں جو ''دوان'' چھوٹے بیٹے ''رعماہ'' کا ذکر ہے اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے (فارسٹر صاحب کا جغرافیہ عرب صفحہ 38) (سید احمد)

اس امر کو بیان کیا ہے کہ بنی کوش درحقیقت عرب میں خلیج فارس کے کنارہ کے برابر برابر آباد ہوئے تھے اور مشرقی کنارہ کے مختلف شہروں کے ناموں کا ان ناموں سے مقابلہ کر کے جو بطلیموس نے لکھے ہیں اپنے دعویٰ میں قطعی کامیابی حاصل کی ہے لیکن مصنف موصوف نے جب کہ بنی کوش کو تمام جزیرہ عرب میں اور خصوصاً یمن اور خلیج عرب کے کناروں پر پھیلا

دینے کی کوشش کی ہے تو اس کی دلیلوں میں ضعف آ جاتا ہے اور اسی دھوکے میں پڑ جاتا ہے جس میں مشرقی مورخ پڑ گئے تھے اور اسی سبب سے یمن تک پہنچنے پر اس کی بحث بدرجہ غایت مہمل اور بے معنی ہوگئی ہے اور صرف ایک ناکارہ سلسلہ خیالی اور وہمی استنباطوں کا خیال کی جاسکتی ہے اس لیے ہم کہتے ہیں کہ ''نمرود'' کے سوا جس کا ذکر تنہا کتاب مقدس میں کیا گیا ہے اور اس سبب سے ہم کو یہ مستنبط کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ آباد نہ ہوا تھا باقی اولاد کوش کی جن کے نام سبا، حویلاہ، سبتاہ، رعماہ، سبتکا تھے اور رعما کے بیٹے یعنی شبا اور دوان سب خلیج فارس کے کنارے کنارے آباد ہوئے تھے ہم اس امر سے انکار نہیں کرنا چاہتے کہ کوش کی اولاد میں سے کوئی جزیرہ عرب کے اور اقطاع کی جانب بھی چلے گئے ہوں اور وہاں سکونت اختیار کی ہو، مگر ہم نے رورنڈ مسٹر فارسٹر کی جن دلیلوں کو لغو اور مہمل اور وہمی اور خیالی بیان کیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مصنف موصوف کو بنی کوش کے مقامات سکونت کی تحقیق میں کوئی ایسا مقام مل جاتا ہے جس میں ذرا سی بھی مشابہت کوشی ناموں سے ہجوں میں یا صرف ایک حرف ہی کی مطابقت پائی جاتی ہے تو وہ اس مقام کو کوش کی اولاد کے متعلق کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتا حالاں کہ بنی کوش کے اکثر نام ایسے ہیں جو بنی یقطان کے ناموں سے جو یمن میں رہتے تھے مشابہت تامہ رکھتے ہیں۔

کتب مقدمہ کے لکھنے والوں نے بنی کوش کی وجہ سے تمام ملک عرب کو بنام ارض کوش یا اتھوپیا سے موسوم کیا ہے اور اس امر کے ثابت کرنے کو رورنڈ مسٹر فارسٹر نہایت مضبوط اور قابلانہ دلیلیں پیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ''توریت اور انجیل کے تاریخی جغرافیہ کے انگریزی ترجمہ میں الفاظ'' ''اتھوپیا'' اور ''باشندگان اتھوپیا'' اکثر مستعمل ہوئے ہیں اور ان کی جگہ عبرانی توریت میں اسم معرفہ کوش واقع ہوا ہے اور یہ لفظ کوش جب کہ کتاب مقدس میں اس طرح مستعمل ہوا ہے تو اس سے ہمیش ایشیائی اتھوپیا یعنی عرب مراد لیا گیا ہے نہ کہ افریقی

اتھوپیا، چند مصرح ورسوں کے مقابلہ کرنے سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جاتا ہے چناں چہ کتاب اعداد باب 12 ورس 1 میں لکھا ہے کہ مریام اور ہارون نے حضرت موسیٰ سے اس اتھوپین (عبرانی میں ہے کوشی) عورت سے شادی کی تھی اور کتاب خروج باب 2 ورس 15 اور 21 سے یہ امر محقق ہے (اور ہم حضرت موسیٰ کے دوسرے نکاح کے فرض کرنے کے واسطے کوئی دلیل نہیں پاتے) کہ ایک مدیانی عورت تھی یعنی حضرت ابراہیم کی اولاد میں بنی قطورہ کے سلسلہ میں تھی اور یہ امر بھی متحقق ہے کہ ''مدیان'' یا ''مادیان'' عرب میں بحر احمر کے کنارے پر ایک شہر یا ملک تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی بی بی ایک عرب کی عورت تھی اور اسی وجہ سے عبرانی لفظ کوشی کا ترجمہ لفظ اتھوپین کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا ہے تاوقت یہ کہ اس سے ایشیائی اتھوپیا عرب مرد نہ لیا جاوے۔ کیوں کہ افریقی اتھوپیا اس سے کسی طرح مراد نہیں لیا جا سکتا (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ 12)

ان دلیلوں سے کسی طرح شک اور شبہ نہیں رہتا کہ کتاب مقدس کے انگریزی ترجمہ میں جو لفظ کوش کا اتھوپیا ترجمہ کیا گیا ہے وہ دو مختلف مقاموں پر مستعمل ہوا ہے افریقی اتھوپیا پر اور ایشیائی اتھوپیا یعنی عرب کے ایک حصہ پر یا خود ملک عرب پر اور یہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیوں کہ اس سے کتب مقدمہ کے بہت سے مشکل مقامات کے حل ہونے میں مدد ملے گی۔

ثانیاً

عیلام یا جرھم الاولیٰ جو کہ یہ قوم بنی کوش کے مقابلہ میں کچھ نام آور نہیں ہوئی اس لیے

اس کی نسبت بجز اس کے کہ بنی کوش سے قرابت رکھتی تھی اور انہیں کے ساتھ رہتی تھی اور کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہوا۔

ثالثاً

لود، اس کے تین بیٹے تھے، طسم، عملیق، امیم یہ لوگ بھی عیلام کی اولاد کی مانند کچھ اولوالعزم اور نام آور نہ تھے اس لیے ان کا حال بھی بہت کم معلوم ہے مگر ان کے آثار ساحل خلیج فارس کے بعض مقاموں کے ناموں میں پائے جاتے ہیں مثلاً دریائے عمنان (جس کو پلینی نے عمان لکھا ہے) اور ''ھمائیم'' جو امیم کے نام سے جو لود کا تیسرا بیٹا تھا ماخوذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ قاعدہ ہے کہ الف ھائے ھوز سے بدل جاتا ہے جیسے اود سے ھود اور اجر سے ھاجرہ ہو گیا جو حضرت اسماعیل کی ماں کا نام تھا رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش میں کہ عمنان یا ھمنان زمانہ حال کے عمان سے علاقہ رکھتا ہے غلطی کی ہے کیوں کہ سفر تکوین باب 19 ورس 38 سے پایا جاتا ہے کہ حضرت لود کی چھوٹی بیٹی نے (ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ جن پر بیٹیوں کا لفظ اطلاق کیا گیا ہے وہ حضرت لود کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ لونڈیاں تھیں) بیٹا جنا اور اس کا نام ''بن عمی'' رکھا گیا جس سے بنی عمون کی قوم مشہور ہوئی حال کا عمان ہمارے نزدیک اسی نام سے علاقہ رکھتا ہے۔

رابعاً

عوص اور خامساً حول، ارم کے بیٹے تھے۔ ہم ان دونوں کا بیان بالاشتراک کریں گے

ان کے آثار بھی آج تک ان مقامات کے ناموں میں پائے جاتے ہیں جو خلیج فارس کے کنارے پر یا قرب و جوار کے میدانوں میں واقع ہیں مثلاً عول اور حول ایک ہی نام ہیں رورنڈ مسٹر فارسٹر نے عول کے اشتقاق میں بھی مغالطہ کیا ہے، کیوں کہ ان کا بیان ہے کہ یہ لفظ حویلاہ نام کی ایک مختلف شکل ہے۔

قوم عاد اولیٰ

عاد اولیٰ پسر ''عوص'' نے بہت شہرت حاصل کی اور اس کی اولاد ایک نامی قوم ہوگئی اور تمام مشرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی انہوں نے عالیشان مکان بھی بنائے اور اور قوموں پر تحکم بھی حاصل کیا اس قوم کے آدمی اپنی جسامت اور قوت اور شان میں اور قوموں پر فوق لے گئے تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے:

عرب کے جنوب اور مشرق کے باشندے بہ نسبت اور لوگوں کے تنومند اور قد آور ہوتے تھے ان کی نسبت مسٹر رورنڈ فارسٹر نے ولسٹڈ صاحب کے سفر نامہ ملک عرب سے یہ بیان نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے حجاز کے عربوں اور ان عربوں کی وضع جسمانی میں جو خلیج فارس کے کنارہ جانب غرب پر آباد ہیں ایک بڑا فرق مشاہدہ کیا ہے اعراب سکنائے ساحل خلیج کا حلیہ یہ ہے کہ ان کے چہرے قریب قریب بیضوی کے ہیں کے بال عموماً سیاہ بالکل منڈے ہوئے ہوتے ہیں بھنویں بھی سیاہ ہیں اور کھال چمکتی ہوئی ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی نسبت ان کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہے سواحل بحر احمر کے قرب کے باشندے لاغر اندام اور پستہ قد ہوتے ہیں مگر قوی ہیں چہرہ کسی قدر لمبا رخسارے بے گوشت کے اور سر کے بالوں کو دو لمبی زلفوں کے سوا جو دونوں طرف ہوتی ہیں اور جن کی وہ نہایت درجہ خبرداری

کرتے ہیں اس قدر بڑھاتے جاتے ہیں کہ کمر تک آجاتی ہیں ان کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہوتا ہے۔''

''بیسپی'' سے چار پانچ منزل جنوب اور مشرق کی جانب سرما کے موسم میں اعراب'' دواسر'' رہتے ہیں اور گرمیوں کے موسم میں نجد کے سرسبز چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں جس کی سبب سے قریب قریب سرحد صرف آٹھ منزل ہے۔ یہ لوگ گھوڑے نہیں رکھتے مگر لڑائی میں وھابیوں کی کمک کے لیے تین ہزار شتر سوار بھیجتے ہیں اعراب'' دواسر'' طویل القامت اور قریب قریب سیہ فام ہوتے ہیں (سفرنامہ ملک عرب ضمیمہ جلد 2 صفحہ 385) مگر یہ عجیب اختلاف درازی اور رنگ میں گردونواح کی قوموں سے کچھ اعراب'' دواسر'' ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خلیج فارس کے عربوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اور ان اطراف میں بھی جہاں کے علماء کے نزدیک شہر سبا آباد تھا کرنیل چسنی کا بیان ہے کہ خلیج فارس کے عرب خوش ہیئت ہوتے ہیں اور طویل القامت اور سیہ فام ہونے میں مشہور ہیں اور ان دونوں باتوں میں اقوام خلیج عرب سے بہ درجہا اختلاف رکھتے ہیں (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ 31) مگر رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں کہ صرف بنی کوش ہی طویل القامت تھے غلطی کی ہے کیوں کہ تمام قومیں جو خلیج فارس کے کنارہ پر رہتی تھیں اور جن کو ہم نے عرب البائدہ کے ذیل میں بیان کیا ہے نہایت بلند قامت تھیں زمانہ حال تک بھی خلیج فارس پر ہم دو قسم کے آدمی پاتے ہیں جو درازی قد میں برابر ہیں مگر رنگ میں مختلف ہیں ایک تو سیاہ رنگ کے ہیں اور دوسرے ذرا اجلے رنگ کے ہیں۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر کتاب اشعیاہ بنی کی باب 45 ورس 14 کی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں لکھا ہے کہ'' خداوند چنیں می فرماید کہ معمول مصر و تجارت حبش واھل سبا کہ مردمان بلند قد اند بتو عبور نمودہ از آن تو خواھند بود'' اور اس بات کو کہ بنی کوش سب دراز قد

تھے اسی ورس پر مبنی کرتے ہیں مگر صاحب موصوف نے اس میں دو وجہ سے غلطی کی ہے اول اس وجہ سے کہ جملہ ''مرد مان بلند قد'' سے خواہ نہ خواہ یہ مراد لینی کہ وہ لوگ طویل القامت تھے محض غلط ہے بلکہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ معزز اور اشراف تھے چناں چہ عربی ترجمہ جو اشعیاہ بنی کی کتاب کا ہے اس میں یہی معنی لئے گئے ہیں اور اس کی عبارت یہ ہے

" هذه يقولها العرب تعب مصر و تجارت الحبش و سبايم رجال اشراف يبرون اليك"

دوم اس وجہ سے کہ باشندگان سبا متذکرہ عبارت مذکورہ کا کوش کی اولاد میں ہونا ضرور نہیں ہے کیوں کہ کتب مقدمہ میں بنی سبا کا اطلاق اور قوموں پر بھی ہوا ہے مثلاً بنی سبا جن کا ذکر کتاب ایوب باب 1 ورس 15 میں آیا ہے اور جو دریائے فرات کے بنی سبا سے ہر طرح مشابہت رکھتے ہیں اور بہ لحاظ اپنے آبائی نام کے ہجوں کے قاعدہ کے موافق سبا پسر کلاں کوش کی اولاد نہیں ہے بلکہ ان تین سباؤں میں سے کسی نہ کسی کی اولاد بیان کئے گئے ہیں جن کو حضرت موسیٰ نے من جملہ ان سوخیلوں کے بیان کیا ہے جنہوں نے ملک عرب کو یکے بعد دیگرے آباد کیا تھا۔

عاد کے پیغمبر حضرت ھود

اس قوم کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ نے ایک نبی جن کا نام ھود تھا اور جن کا لقب سفر تکوین باب 11 ورس 14 میں عیبر آیا ہے مبعوث کیا تا کہ خدائے برحق کی عبارت کی ترویج اور بتوں کی پرستش کا استیصال کریں لیکن جب ان لوگوں نے ان کے احکام اور ہدایت سے سرتابی کی تو خدا تعالیٰ کا قہر جوش میں آیا اور تین برس کا قحط ان پر پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ لوگ

اس بات سے آگاہ ہوگئے کہ خدا کے پیغمبر کے احکام سے سرتابی کی یہ سزا ہے اس پریشانی کی حالت میں حضرت ھود پھر تشریف لائے اور بت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی از سر نو ہدایت کی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خدائے رحیم باران رحمت نازل کرے گا۔ مگر وہ اپنی گمراہی پر ثابت قدم رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت طوفان آندھی کا جو اس کے قہر کی نشانی تھی نازل کیا یہ طوفان آندھی کا سات رات اور آٹھ دن تک تمام اس ملک میں ایسے زور شور سے جاری رہا کہ ہزار ہا آدمی ہلاک ہو گئے اور تمام قوم کا باستثنائے ان چند اشخاص کے جنہوں نے حضرت ھود کا کہنا مان لیا تھا قریباً قریباً استیصال کلی ہوگیا اور جو لوگ بچے آخر کو حضرت ھود پر ایمان لے آئے یہ واقعہ سنہ دنیوی کی اٹھارھویں صدی یا بائیسویں صدی قبل حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے واقعہ ہوا تھا۔

جھوٹے قصے جو قوم عاد کی طرف منسوب ہیں

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ قوم عاد کے ہر شخص کا قد بارہ ارش لمبا تھا یعنی اس زمانہ کے جو لوگ ہیں اگر اپنے دونوں ہاتھوں کو سیدھا پھیلا دیں تو ان کی لمبائی سے بارہ گنا زیادہ لمبا قد قوم عاد کا تھا بعض کتابوں میں ان کے قد کے لمبان کا اس سے بھی زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ چلنے میں ان کے پاؤں زانو تک زمین میں دھنس جاتے تھے۔

انہوں نے جو اس ریگستان میں کوئی محل بنایا تھا اس کی نسبت بھی بہت زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور عاد ثانی کی اولاد کے قصہ کو اس قوم کے ساتھ جو عاد اولیٰ کی قوم ہے خلط ملط کر کے اس خیالی باغ کو جس کا نام ایشیائی مورخوں نے ''ارم'' قرار دیا ہے، اسی قوم کی طرف

منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس محل اور باغ کی زمین میں لعل اور یاقوت بچھے ہوئے تھے اور اس کی دیواریں سونے اور چاندی کی تھیں اور درخت زمرد اور یاقوت اور نیلم اور ہر قسم کے بیش بہا جواہروں سے بنائے گئے تھے اور زعفران بجائے گھاس اور عنبر بجائے مٹی کے تھا۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان کے زمانہ خلافت میں ایک شخص اپنا اونٹ ڈھونڈھتا ہوا وہاں چلا گیا اور بے شمار جواہرات وہاں سے رول کر اپنی جھولی میں بھر لایا اور جب معاویہ ابن ابی سفیان نے اس جگہ دوبارہ جانے اور اس جگہ کے تلاش کرنے کا حکم دیا تو بہت سی تلاش کرنے کے بعد بھی وہ جگہ پھر نہ ملی خلیفہ نے کہا کہ خدا تعالیٰ نے اس کو انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ کر لیا ہے۔

بعض کتابوں میں حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت اور اور بعض معتبر اشخاص کی نسبت ایک جھوٹا اتہام کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ بات کہی کہ خدا تعالیٰ نے اس باغ اور محل کو جو قوم عاد نے تعمیر کیا تھا دنیا سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے اور قیامت کے دن وہ بھی من جملہ اور آسمانی بہشتوں کے ایک بہشت ہوگی۔

عاد اولیٰ کی قوم کی بنائی ہوئی عمارات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس قوم نے کوئی عمارت قابل شہرت نہیں بنائی تھی ان کی عمارتیں مثل اور معمولی عمارتوں کے بڑی اور چھوٹی ہر قسم کی تھیں۔

بہت سے مصنفوں اور مورخوں نے جو تمام عاد اولیٰ کی طرف عمارات عالی شان بنانا منسوب کرنے میں غلطی کی ہے اس کی وجہ ظاہراً یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت کے جو ذیل میں مندرج ہے، معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

" الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العباد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد "

یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کس طرح پر کیا، تیرے پروردگار نے ،قوم عاد کے ساتھ جو''ارم'' کی اولاد تھے اور ایسے قد آور تھے کہ ان کی مانند شہروں میں پیدا نہیں کیے گئے تھے۔

لفظ'' ذات عماذ'' سے جوان کا قد آور ہونا مراد لیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسری آیت سے ہوتا ہے، جو ذیل میں لکھی جاتی ہے اور جس میں ان کے مردہ پڑے ہوئے جسموں کو درختوں کے اکھڑے ہوئے تنوں سے مشابہت دی ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

واما عادفا هلكوا بريح صرصرعاتية سخرها عليهم سبع ليال و ثمانية ايام حسوما فترى القوم فيها صرعىٰ كانهم اعجاز نخل خاوية

تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے دوامر کا بہ خوبی ثابت ہوتا ہے ایک یہ کہ'' ارم'' سے مراد'' بنی ارم'' ہے اور'' ارم'' عاد کا دادا تھا، جس طرح کہ بنی ہاشم اپنے دادا ہاشم کے نام سے مشہور ہیں اسی طرح قوم عاد اپنے دادا ارم کے نام سے مشہور تھی اور عاد ارم کہلاتی تھی دوسرے یہ کہ لفظ'' ذات العماذ'' سے ان کا دراز قد اور قوی ہونا مراد ہے جس طرح کہ بعض ملکوں کے لوگ دراز قد اور قوی ہوتے ہیں کوئی خاص عجیب بات ان میں نہیں تھی چناں چہ تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی میں اس طرح پر لکھا ہے۔

" الم تر" تعليم يا محمد" كيف فعل ربک بعاد ارم" هى عماد الاولىٰ فارم عطف بيان اور بدل منع الصرف للعلمية والتانيث " ذات العماد" اى الطوال... " التى لم يخلق مثلها فى البلاد" فى بطشهم و قوت هم " جلالين"

" الم تر كے فعل ربک بعاد"

یعنی اولاد عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح قوم ھود سموا باسم ابیھم کما سمی بنوھاشم باسمہ'' ارم'' عطف بیان لعاد علیٰ تقدیر مضاف ای سبط ارم'' ذات العماذ'' ای ذات البناء

الرفیع القدر والطّوال والرفعۃ والثبات ''بیضاوی''

زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ اس قسم کے پرانے قصوں کو ایک مذہبی قصہ بنا لیتے ہیں اور اس میں عجیب وغریب باتیں ملا کر اس کو تعجب انگیز اور حیرت خیز کر لیتے ہیں جس طرح کہ ملٹن شاعر نے اپنی کتاب پیریڈائز لاسٹ کو ایک عجیب قسم کا مذہبی قصہ بنالیا ہے اسی طرح زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بھی قوم عاد کا ایک قصہ گھڑ لیا ہے جس میں بیان کیا ہے کہ قحط کے دنوں میں قوم عاد نے تین شخص مکہ میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ خدائے تعالیٰ سے مینہ برسنے کی دعا مانگیں ان تینوں میں سے ایک کا نام لقمان تھا وہ تو مسلمان تھا اور باقی دو کافر تھے لقمان کی عمر سات گدوں کی عمروں کے مجموعہ کے برابر تھی اور اسی سبب سے لقمان بڑی عمر ہونے میں ضرب المثل ہو گیا ہے عام لوگوں کا خیال ہے کہ گد کی عمر ہزار برس کی ہوتی ہے اور اس لیے لقمان کی عمر اس وقت سات ہزار برس کی تھی اسی قسم کے اور بہت سے لغو اور بیہودہ قصے عاد کی قوم کی نسبت جاہلوں نے بنا لیے ہیں جن پر اہل علم کو متوجہ ہونا یا مذہبی اعتراضات کی بنا ان قصوں کو قرار دینا نہایت لغو اور بیہودہ بات ہے۔

سادساً

جدیس، سابعاً، ثمود جس کو عاد ثانی کہتے ہیں یہ دونوں گثر پسر ''ارم'' بن سام بن نوح کی اولاد تھے، جن کا بیان ہم ایک ساتھ کرتے ہیں۔

جدیس کا حال بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوا کہ بیابان میں آباد ہوا تھا اور اس کی اولاد بعد انقضائے عرصہ دراز کے مثل دیگر اقوام صحرائی کے معدوم ہو گئی۔

قوم ثمود یا عاد ثانی

اولاد ثمود نے بہت بڑا نام پیدا کیا اور جلد ایک زبردست قوم ہوگئی اور اس حصہ ملک پر جو ''الحجر'' کے نام سے مشہور ہے اور اس میدان پر جو وادی القرے کہلاتا ہے اور جو ملک شام کی جنوبی اور عرب کی شمالی حد بناتا ہے، قبضہ کرلیا ہے قرآن مجید میں اس قوم کا بھی چند جگہ ذکر آیا ہے انہوں نے پہاڑیوں کو کھود کر ان کے اندر گھر بنائے تھے اور نقش ونگار سے مرتب کیے تھے جو اثالیب کے نام سے مشہور ہیں عرب کے لوگ اور چند غیر قوم کے لوگ جنہوں نے عرب میں سفر کیا ہے ان پہاڑی گھروں کی جو پرانے زمانے کی باتوں کی تلاش کرنے والوں کو تشفی دیتے ہیں اور ان قوموں کے حالات جنہوں نے ان کو بنایا ہے بتلانے کو موجود ہیں شہادت دے سکتے ہیں اسی طرح ان پہاڑی گھروں سے قوم ثمود کی تاریخ کے اس حصہ کی جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے بہ خوبی صداقت پائی جاتی ہے۔

حضرت صالح پیغمبر

کچھ زمانہ کے بعد یہ قوم بھی بت پرستی کی طرف مائل ہوئی اس واسطے ان کی فہمائش و ہدایت کے واسطے خدا تعالیٰ نے حضرت صالح بن عبید بن اسف بن ماشج بن عبید بن جادر بن ثمود کو مبعوث کیا بعض لوگ ان پر ایمان لائے اور بہتوں نے ان کا یقین نہیں کیا ان لوگوں نے حضرت صالح سے کہا اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی بتلا! حضرت صالح نے جواب دیا کہ اے میری قوم یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے اس کو چھوٹا پھرنے دو تاکہ خدا کی

زمین پر چرتی پھرے اوراس کو کچھ ایذا امت پہنچاؤ! مبادا تم پراس کے عوض عذاب نازل ہو۔ اس فہمائش کے سبب کچھ عرصے تک ان لوگوں نے اونٹنی کو پھرنے دیا اور کچھ ایذا انہیں پہنچائی۔

کچھ عرصے کے بعد وہاں قحط واقع ہوا اوراس خشک سالی میں پانی کا بھی قحط ہو گیا پانی نہیں ملتا تھا اور جہاں کہیں تھوڑا سا بھی پانی ہوتا تھا تو اونٹنی اپنی طبعی خاصیت سے جو خدا نے اونٹ میں پیدا کی ہے پانی کو تلاش کر لیتی تھی اور پی لیتی تھی یا خراب کر دیتی تھی اور لوگ اس کو روک نہ سکتے تھے حضرت صالح نے کہا کہ ایک دن اونٹنی کو پانی پی لینے دیا کرو اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہو اور دوسرے دن تم لوگ پانی پی لیا کرو اور اونٹنی کو وہاں نہ جانے دیا کرو قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد مختلف نو فرقوں کے سرداروں نے جو اس زمانے کے کافروں کے فرقے تھے حضرت صالح کو مار ڈالنے کا منصوبہ کیا مگر جب وہ اپنے اس بد منصوبہ پر کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے غصے میں آ کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ اس وقت حضرت صالح نے ان سے کہا کہ تین دن تک تم اپنے مکانوں میں چین کر لو۔ بعد اس کے تم ہلاک ہو گے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ جب ہمارے حکم کی تعمیل ہونے کو ہوئی تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے بہ سبب اپنے رحم کے اس روز کی ذلت سے بچا لیا۔ آفت جو ان پر آئی تھی وہ یہ تھی کہ آسمان سے ایک خوف ناک آواز آئی جو غالباً رعد اور زلزلوں کی وہ لوگ اپنے مکانوں میں مردہ اور سرنگوں پڑے ہوئے ملے گویا کہ ان مکانوں میں رہتے ہی نہ تھے یہ واقعہ اسی زمانے میں واقع ہوا تھا جب کہ سدوم اور کمارہ اور ادماب اور زھائین شہر آسمانی آگ سے جلائے گئے تھے یعنی 2107 دنیوی یا 1897 قبل حضرت مسیح کے۔

جھوٹی روایتیں جو قوم ثمود کی نسبت مشہور ہیں

مفسرین اور مورخین کا بیان ہے کہ جو کفار نے حضرت صالح سے ان کی رسالت کے ثبوت میں اس معجزہ کی درخواست کی تھی کہ اگر اس پہاڑی میں سے ایک اونٹنی پیدا ہو اور بہ مجرد پیدا ہونے کے ایک سرخ بالوں کا بچہ جنے اور وہ بچہ اسی وقت ہمارے سامنے بڑی اونٹنی کے برابر ہو کر چرنا پھرے اور ہم اس اونٹنی کا دودھ پئیں تب ہم ایمان لاویں گے۔

یہ روایت محض ساختہ اور مصنوعی ہے اس روایت کے موضوع کہنے سے اس وقت ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم امکان معجزہ سے انکار کریں اور اس پر بحث شروع کریں بلکہ ہم اس وقت صرف سادی طرح سے اس روایت کو اس لیے موضوع کہتے ہیں کہ اس کی صحت پر کوئی سند نہیں ہے اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو ایسے عجیب واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا یا کسی مستند حدیث سے اس کا ثبوت پایا جاتا۔ اسی طرح یہ بھی مصنوعی بات ہے کہ اس اونٹنی سے انسان اور حیوان دونوں ڈرتے تھے اور وہ اونٹنی قوم ثمود کے تمام چشموں اور حوضوں کا پانی ایک گھوٹ میں پی کر سب کو سکھا دیتی تھی کیوں کہ وہ ایسا ملک تھا جہاں کثرت سے پانی میسر ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح یہ ایک لغو روایت ہے کہ اگر چہ قوم ثمود کو بتلا دیا گیا تھا کہ اونٹنی کا قتل کرنا ان کی ہلاکت کا باعث ہوگا، لیکن حضرت صالح نے ان سے یہ بھی پشین گوئی کی تھی کہ تمہاری قوم کا ایک لڑکا جس کا حلیہ ایسا ایسا ہوگا اس اونٹنی کو مار ڈالے گا اور اس طرح پر تمہاری ساری قوم پر تباہی اور بربادی اوے گی۔ اس تباہی سے بچنے کے لیے جس کی پشین گوئی حضرت صالح نے کی تھی لڑکوں کو مار ڈالنا شروع کیا، جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اور اس میں اس نشانی کا شبہ ہوتا تھا جو حضرت صالح نے بتلائی تھی اس لڑکے کو مار ڈالتے تھے مگر وہ لڑکا جس کے ہاتھ سے

اس قوم کا برباد ہونا مقدر میں تھا کسی نہ کسی طور سے بچ گیا اور مارا نہیں گیا۔ جب کہ وہ جوان ہوا تو آخر کار اس نے اس اونٹنی کو مار ڈالا۔

اسی طرح حضرت صالح کے مخالفوں کے مارے جانے کی نسبت ایک بیہودہ روایت آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت صالح کے مخالفوں نے جب ان کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ ان پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گئے جہاں حضرت صالح آیا جایا کرتے تھے، اس غرض سے کہ کوئی عمدہ کمین گاہ تلاش کر کے اختیار کریں۔ خدا تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو زمین پر سے بہت اونچا اٹھا لیا اور جہاں سے وہ پہاڑ اٹھا تھا وہاں ایک غار ہو گیا حضرت صالح کے مخالفوں نے اس غار کو اپنی کمین گاہ کے لیے پسند کیا اور جب کہ وہ اس غار کے اندر جا کر چھپے تو خدا تعالیٰ نے اوپر سے ان کے سروں پر اس پہاڑ کو چھوڑ دیا اور سب کے سب ایک لمحہ میں کچل کر مر گئے۔

اگرچہ ہم نے اس مقام پر عرب البایدہ کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر ان کا ایک شجرہ بھی اس مقام پر لکھتے ہیں، جس سے تمام بیانات کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

☆☆☆☆☆☆

دوم

عرب العاربہ یعنی ٹھیٹ عرب

عرب العاربہ یقطان بن عیبر بن شالح بن ارفخشد بن شام بن نوح کی اولاد میں ہیں بعض مورخوں کا یہ قول ہے کہ عرب البایدہ اور عرب العاربہ دونوں یقطان کی اولاد ہیں اوراس لیے عربوں کو وہ بجائے تین قوموں کے صرف دو قوموں پر منقسم کرتے ہیں یعنی عرب العاربہ اور عرب المستعربہ۔

قریباً تمام مورخوں کی رائے ہے کہ کتب خمسہ موسیٰ میں جو یقطان نام آیا ہے وہی ایک نام ہے جس کو عرب قحطان کہتے ہیں اور یونانی انجیلوں میں اس کو"جوقطان" کر کے لکھا ہے اوراسی شخص کی اولاد عرب میں آباد ہوئی ہے۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر نے نہایت عجیب اور مستحکم دلیلوں سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان تینوں مذکورہ بالا ناموں سے ایک ہی شخص مراد ہے اور یہ کہ یہی شخص یقطان عرب میں آباد ہوا تھا، چناں چہ وہ اپنی کتاب جغرافیہ عرب میں ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "کتاب بطلیموس میں بی ہم یقطان کا نام اور علانیہ قوم بنی یقطان کو پاتے ہیں جو عربوں کے قحطان اور انجیل کے جوقطان کے بالکل مشابہ تھے" (صفحہ 80)

ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "اس قومی روایت کا قدیم اور عام ہونا جو عربوں کے

قحطان کو انجیل کے جو قطان سے مشابہ کرتے ہیں، ہر ایک پڑھنے والے پر روشن ہے“
(صفحہ 88)

ایک اور مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ ”یہ امر کہ قحطان ایک خاندانی نام کی صرف مختلف شکلیں ہیں خود عرب ہی ہمیشہ سے بیان کرتے آئے ہیں اور ان کی عادت سے بھی جس سے وہ حرفوں کو تبدیل کر لینے میں (یعنی معرب کر لینے میں) نہایت درجہ میلان رکھتے ہیں، یہ نتیجہ قرار واقعی نکل سکتا ہے“ (صفحہ 88)

ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے کہ ”قدیمی قوم سبا کے دار السلطنت مشہور بہ مارب میں اعراب یقطان سے جس کی مشابہت توریت کے یقطان کے ساتھ ہے یقطانی نام حویلاہ کے وقوع سے از سر نو ثابت اور مسلم ہوگئی ہے“ (صفحہ 90)

رورنڈ فارسٹر نے مسعودی کے اس قوم پر کہ بنی سعد اور بنی قحطان بہت قدیم زمانہ سے عرب کی قوموں میں مشہور چلے آتے ہیں یہ لکھا ہے کہ ”تاریخ عرب قوم عظیم قحطان کی قدامت کے باب میں آواز دے رہی ہے اور یہ ایک ایسی آواز ہے کہ ایک طرف قدیمی عام قومی روایت اس کی تائید کرتی ہے اور دوسری طرف شاید اس سے بھی زیادہ مضبوط شہادت متوسط اور جنوبی عرب کے موجودہ مقاموں اور آبادیوں کے ناموں سے اس کی حامی ہے“
(صفحہ 79)

بہر حال امر مذکورہ سے نہ تو مشہور اور معروف سیاح مسٹر برق ھردط [1] رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کا بیان ہے کہ اسی

1 اس کتاب کے پڑھنے والے الفاظ ”رضی اللہ تعالیٰ عنہ“ کو دیکھ کر جو مسٹر برق ھردط کے نام کے بعد لائے گئے ہیں بلا شک متحیر ہوں گے اور اس حیرت کے رفع کرنے کے واسطے میری دانست میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ نہایت ذی فہم و ذی علم گاڈفری

ہیگنس صاحب کی کتاب کی کسی قدر عبارت کا ترجمہ اس جگہ لکھ دیا جاوے۔'' مشہور و معروف سیاح برق ھردط جس نے دار العلوم کیمبرج میں تعلیم پائی تھی، ایک نہایت پر غور تحقیق کے بعد اور خوب سوچ کر مسلمان ہو گیا اور اپنے عیسائی دوستوں کے مجمع میں بحالت اسلام انتقال کیا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مسائل دین اسلام کی تلقین بہ مقام حلب ایک آفندی نے کی تھی اور اسی نے اس کو مسلمان کیا اور اس نے وہاں علانیہ اسلام کا اقرار کیا اور جب کہ بہ نیت حج روانہ ہوا تو مکہ کے قریب اپنے مذہب اور مسائل اسلام کی واقفیت میں اس کو سخت امتحان دینا پڑا جس کے باعث وہ ہمیشہ حاجی کے لقب کا دعویٰ کرتا رہا اس کی نو مسلمی سچی اور صاف باطن معلوم ہوتی ہے، اگر چہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کے عیسائی دوستوں سے علی العموم پوشیدہ تھی۔''

میں اس بات کے بیان کرنے سے نہایت خوش ہوں کہ میں ایک شریف آدمی سے جو بالفعل مئی 1829ء سے برٹش گورنمنٹ میں ایک معزز عہدہ پر مامور ہے، واقفیت رکھتا ہوں مگر اس کا نام ظاہر کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں ان صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مسٹر برق ھردط کے انتقال سے تھوڑے عرصہ پہلے میں وہاں موجود تھا اور مسٹر برق ھردط نے مجھے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین دلایا کہ میں

یقطان کی اولاد عرب میں آباد ہوئی تھی اور نہ سر ولیم میور انکار کرتے ہیں

درحقیقت مسلمان ہوں اور اسی حالت میں مرنے کی آرزو ہے اس کا گمنام سوانح عمری لکھنے والا اپنی کتاب میں جو بعد اس کے مشہت ہوئی اس کی موت کا حال بیان کرتا ہے مگر اس کے مذہب کے بارے میں کوئی لفظ منہ سے نکالنے سے احتیاطاً پرہیز کرتا ہے غالباً اس کو معلوم ہوگا کہ اگر حق بات زبان سے نکلی تو پادریوں کے بدنام اور رسوا کرنے کی وجہ سے میری کتابوں کے فروخت میں ہرج واقع ہوگا لیکن ایک فقرہ جو میرے بیان کی تائید کے

واسطے کافی ہے، اس کی زبان سے نکل گیا ہے وہ اسی شب کو پونے بارہ بجے بغیر افسوس اور واویلا کرنے کے مرگیا تجہیز و تکفین اس کی وصیت کے موافق بر طریق اسلام کی گئی اور اس معزز رتبہ کا جو وہ دیسی لوگوں کی آنکھوں میں رکھتا تھا کماحقہ لحاظ کیا گیا اگر وہ فی الحقیقت مسلمان تھا تو ضرور اس نے مسلمانوں کی شرع کے موافق تجہیز و تکفین ی استدعا کی ہوگی اور یقیناً اگر عیسائی اس کی وصیت پر لحاظ نہ کرتے تو حکام بہ مجبوری ان سے کراتے یہ بعید از قیاس ہے کہ وہ عیسائیوں کا مسلمانوں کو ایک ایسے نو مسلم کے شرف سے محروم رکھنا گوارا کرتے مگر یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کو بلا تکلف قنصل انگریزی کی نگرانی میں اور اس کے ہم وطنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جن کو کہ پورا پورا موقع اس کی تجدید مذہب کے واسطے اپنی لیاقتیں صرف کرنے کا ملا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کی بلاوجہ تقلید و تائید کرنے میں اس کو کوئی غرض مضنون نہ تھی بلکہ برخلاف اس کے ان عیسائیوں سے جن کی طرف سے وہ مامور تھا اور جن کی وجہ سے اس کا گذارہ ہوتا تھا اس کو مخفی رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

اگر اس کی سوانح عمری لکھنے والے کا اعتبار کیا جاوے تو وہ اعلیٰ اصول اور بہترین چال وچلن کا آدمی معلوم ہوتا ہے من جملہ اور پسندیدہ کیفیتوں کے جو اس مرتد کافر کی بابت جس طرح کہ اس کو عیسائی لوگ کہیں گے، مرقوم ہوئی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی موروثی جائیداد قیمتی دس ہزار روپے کو اپنی ماں کے نان ونفقہ کے واسطے دے کر اپنے آپ کو محض مفلس وقلانچ بنا دیا تھا۔

(ہیگنس اپالوجی صفحہ 106 مطبوعہ لنڈن 1829ء) (سید احمد)

یقطان کی اولاد کے آباد ہونے کی جگہ کی نسبت توریت میں یہ لکھا ہے کہ ''ان کی آبادی میشا سے لے کر جہاں تک کہ تو سفار تک جو مشرق میں ایک پہاڑی ہے، چلا جاوے، تو وہاں تک تھی''، مسٹر برق ھردط کے نزدیک میشا اور ''موزہ'' جو یقطانی قوم سبا کا خلیج عرب

کے دھانہ کے نزدیک ایک بندرگاہ تھا، ایک ہی مقام ہے اور سفار سے جبلی یعنی پہاڑی حصہ یمن کا جہاں کہ بہ قول بطلیموس شہر سفار اور قوم سفاریہ آباد تھی مراد ہے، لیکن رورنڈ فارسٹر اس مقام کو جس کو مسٹر برق ھر دط صاحب نے بیان کیا ہے اور جو وسعت میں قریب ڈیڑھ سو میل کے ہے، ایک نہایت کثیر قدیمی خاندان کی حدود کے ایک نہایت معتدلانہ معقول اندازہ کے واسطے محض غیر مکتفی خیال کرتے ہیں اور نہایت ضعیف دلائل سے ان کو نجد کے پہاڑوں تک پھیلا دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر اصل بات یہ ہے کہ مقدس کاتب توریت نے یقطان کی اولاد کی آبادی کی کچھ حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ وہ سمت بتلائی ہے جہاں وہ جا کر آباد ہوئی تھی۔

یقطان کے تیرہ بیٹے پیدا ہوئے۔ الموداد، شلف، حضر ماوث، یرح، ھدورام، اوزال، دقلاء، عوبال، ابیمائیل، شبا، اوفر، حویلاہ، یوبا، تمام قوم عرب العاربہ کی مع اپنی مختلف شاخوں اور شعبوں کے اشخاص مذکورہ بالا کی اولاد میں ہیں، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

الموداد

اس شخص کا خاندان یمن یا عرب المعمور میں اور اس ضلع میں جو بحرین تک چلا گیا ہے، آباد ہوا اور اس المودائی سے مطابقت رکھتا ہے، جس کو بطلیموس نے یمن کی درمیانی قوم لکھا ہے۔

شلف

یہ شخص کوہ ذامس کے مغربی حصہ میں یا اس وسیع میدان میں جو کاظم اور مدینہ کے مابین واقع ہے، آباد ہوا یہ قوم بطلیموس کی بیان ہوئی سالفی قوموں سے مابقت رکھتی ہے عربوں میں یہ قوم بنام بنی سالف مشہور رہے، جو عبرانی نام شلف کی یونانی شکل ہے۔

حضرت ماؤث

اس قوم نے اپنی سکونت کے واسطے وہ زرخیز قطعہ جو خلیج عرب کے برابر برابر پھیلا ہوا ہے اور جو اس قوم کے نام (حضرموت) سے آج تک مشہور ہے، اختیار کیا اس قوم کے لوگ یونانی اور رومیوں کے ہاں اپنی وسیع تجارت اور فن جہاز رانی اور لڑائی میں جرأت اور بہادری کے لیے مشہور تھے۔

ھدورام

یرح کا حال یہاں چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ ہم اس کو اخیر پر ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں ھدورام کی اولاد نے مشرق کی سمت اختیار کی اور اسی نواع میں آباد ہوئی قصبہ ھدرمہ اس قوم کی بہت سی یادگاروں میں سے موجود ہے ابوالفدا کا بیان ہے کہ صوبہ دار قرامطاب کی بنا اسی قوم سے ہوئی ہے۔

اوزال

یہ خاندان اوزال میں جس کو اب صنعا کہتے ہیں اور جو سرسبز اور شاداب صوبہ یمن میں واقع ہے، آباد ہوا۔ (حزقیل باب 27 ورس 19)

دقلاہ

یہ قوم بھی یمن میں آباد ہوئی اور ذوالخلاعہ جو یمن کی ایک قوم ہے اور جس کا ذکر پوکاک صاحب نے کیا ہے اسی کی اولاد میں سے ہے۔

عوبال

اس کا نشان عرب میں نہیں پایا جاتا مگر رورنڈ فارسٹر صاحب کا بیان ہے کہ یہ قوم افریقہ کو چلی گئی۔

ابیمائیل

بہت سے آثار جو مختلف اشخاص نے بیان کیے ہیں اس قوم کے بنی سالف اور حجاز کے قرب وجوار میں متوطن ہونے کے شاہد ہیں۔

شبا

اگرچہ یہ بھی جنوب کی جانب گیا اور یمن میں سکونت پذیر ہوا، مگر یہ وہ شبا نہیں ہے جس نے یمن میں خاندان شبا کی سلطنت قائم کی تھی اور شہر مارب اور شہر سبا کو بنایا تھا اکثر مورخ عرصہ دراز تک اس غلطی میں پڑے رہے کیوں کہ وہ دوسرا شبا عرف عبدالشمّس تھا کہ جس نے سلطنت خاندان شبا قائم کی تھی اور شہر ہائے مارب اور سبا کو بنایا تھا اور جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اوفر

یہ قوم صوبہ عمان میں سبا کے مشرق میں آباد ہوئی جہاں کہ شہر اوفر میں ان کے نشانات اب تک پائے جاتے ہیں (ملوک اول باب 9 ورس 28)

حویلاہ

یہ شخص مارب کے ٹھیک شمال میں بستا تھا

یو باب

یہ بھی مارب کی جانب روانہ ہوکر اسی نواح میں آباد ہوا قوم جو بارثی جس کا بطلیموس نے ذکر کیا ہے اور جس کو عرب بنی جوبار کہتے ہیں اسی کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ان قوموں کے مختلف شعبوں اور شاخوں نے جو عرب میں ایک ہی اصل سے پیدا ہوئی تھیں صرف دو وجہ سے علیحدہ علیحدہ نام حاصل کیے تھے یا تو بہ ہیئت مجموعی اپنی بڑی قوت اور تعداد کی وجہ سے یا قوم کے کسی شخص کی شہرت اور کارہائے نمایاں کے باعث سے پس ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص میں سے کسی نے کوئی کار نمایاں جس سے وہ اپنے لیے کوئی مخصوص نام اختیار کرنے کے مستحق ہوتے نہیں کیا اور اسی سبب سے شعبوں میں منقسم نہیں ہوئے مگر یرح کا حال ایسا نہیں ہے جس کا بیان ہم اب کسی قدر طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔

عرب کے جغرافیہ دان یقطان کے بے شمار لڑکوں میں سے صرف دو شخصوں کا ذکر کرتے ہیں یعنی یعرب اور جرھم کا چند مورخوں کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور یرح سے ایک ہی شخص مراد ہے اور اگرچہ یہ قاعدہ ہے کہ ''ج'' اور ''ی'' کا باہم تبادلہ ہو جاتا ہے مگر جرھم کے باب میں رائیں مختلف ہیں بعضے کچھ کہتے ہیں اور بعضے کچھ، مگر جمہور کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور جرھم دونوں یرح کے بیٹے تھے اور اسٹر یبو اور جارج سیل کی بھی یہی رائے ہے، لیکن ابوالفدا اپنی کتاب کے ایک مقام میں یعرب اور جرھم کو دو مختلف اشخاص بیان کرتا ہے اور دوسرے مقام پر جہاں کہ وہ مختلف اقوام عرب کے متفرق شعبوں کا ذکر کرتا ہے، تو جرھم کو تنہا مورث اعلیٰ تمام فرقوں کا بتلاتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یعرب اور جرھم سے ایک ہی

شخص مراد ہے اور اولادیعرب کی مختلف شاخیں اپنی جرھم میں شامل ہیں۔

مشرقی مورخوں نے اس اختلاف کو غیر منفصل چھوڑ دیا ہے مگر رورنڈ فارسٹر صاحب نے نہایت لیاقت سے ثابت کیا ہے کہ جرھم اور یعرب ایک ہی شخص تھے اور جس جگہ کہ انہوں نے اس نام کی چند قدیم و جدید مسلم شکلیں بیان کی ہیں اس جگہ بیان کیا ہے کہ ستر مترجموں نے اس نام کو جر لکھا ہے اور سینٹ جروم نے جیر اور حال کے عربوں نے جرح اور سرح اور شرح اور زہران لکھا ہے جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔ ان فرضی مختلف ناموں کی مطابقت حسب قواعد تہجی بیان کر کے صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ ''علی العموم جو شہادت کہ خود عرب بھی اپنے جرھم کو جرھہ پسر یقطان کے ساتھ مطابقت کرنے میں زمانہ دراز سے دیتے آئے ہیں اس کی تصحیح و تصدیق کتاب بطلیموس میں غیر مبدل توریتی نام کے واقع ہونے سے ہو گئی ہے اور یہ ایک ایسی مثال ہے جس کا ہم کو بارھا حوالہ دینا پڑا ہے یعنی بطلیموس کے اس جملہ کا ''انسیولا جراچیوری'' جس کا ترجمہ ہے جزیدہ بنی جرھہ جو اسی حصہ حجاز کے کنارہ کے پرے ایک جزیرہ ہے۔''

جرھہ یا جرھم کی مطابقت تسلیم کر لینے میں ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے اور عرب العاربہ کے شجرہ انساب میں ہم ان کو ایک شخص قرار دے کر یعنی یرح یا یعرب یا جرھہ یا جرھم ان کا شجرہ لکھیں گے۔

تاریخ عرب العاربہ میں اس شخص کی اولاد کا حال بہت مذکور ہے یہ اسی کی اولاد تھی جس نے مختلف فرقوں میں منقسم ہو کر بڑے بڑے کام کیے اور زبردست سلطنتوں کے بانی ہوئے مگر عرب العاربہ کی تاریخ لکھتے وقت ان کے کاموں اور ان سلطنتوں کے قائم ہونے کے زمانہ کا متعین کرنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ زبانی روایتوں میں جو زمانہ بیان ہوتا ہے وہ کبھی غلطیوں سے خالی نہیں ہوتا اور اس کو معتبر نہیں مانا جا سکتا

دوسرے اس سبب سے کہ مورخان عرب نے ان واقعات کی تاریخیں سپٹو ایجنٹ یعنی یونانی ترجمہ توریت سے اخذ کی ہیں توریت کے یونانی ترجمہ میں اور اصل عبرانی توریت میں جواب موجود ہے زمانوں کا بہت سا اختلاف ہے مگر قریباً قریباً تمام عیسائی ملکوں میں عبرانی توریت کے زمانے تسلیم کئے جاتے ہیں گو اس کے مندرجہ زمانے بھی نہایت مشتبہ اور نا قابل اعتبار ہیں تیسرے اس باعث سے کہ عرب کے مورخوں نے دو قسم کی تاریخوں کو یعنی اس کو جو زبانی روایتوں سے عرب میں چلی آتی تھی اور اس کو جسے یونانی توریت سے اخذ کیا تھا خلط ملط کر دیا ہے اور اس سبب سے بڑی ابتری ان کی تاریخ میں پڑ گئی ہے بعض واقعات کا زمانہ تو زبانی روایتوں کے بہ موجب متعین کرتے ہیں اور بعض کا یونانی توریت کے موافق پس ان مشکلات پر غالب آنا جن سے تواریخ عرب بھری پڑی ہے کوئی آسان کام نہیں۔

اس پیچیدہ اور مشکل کام کے حل کرنے کے لیے ہم نے تین ذریعے اختیار کیے ہیں:

اول

اصل عبری توریت جس کو اس زمانہ میں قریباً قریباً ہر ایک ذی علم قوم نے تسلیم کر لیا ہے اور علم تواریخ کو اسی کی مندرجہ تاریخ پر مبنی کیا ہے انہوں نے عبری توریت کو اصل اصول فرض کر کے اور اس کے مندرجہ زمانوں کو تسلیم کر کے بہت سی کتابیں تاریخ کی تصنیف کی ہیں اور ہر قسم کے مباحثوں میں خواہ مذہب سے متعلق ہو، خواہ علم تواریخ سے، خواہ علم الارض سے، خواہ علم حیوانات سے، خواہ کسی اور علم سے اسی کے مندرجہ زمانوں پر استدلال کرتے ہیں اس واسطے ہم نے بھی اپنی اس کتاب میں انہیں کی تقلید کو قرین مصلحت سمجھا ہے دوسرے یہ کہ ہم نے متعدد واقعات کو جو عرب میں واقع ہوئے ان کے ہم عصر واقعوں سے جو بنی اسرائیل پر

واقع ہوئے اور جن کا حال توریت میں مندرج ہے مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے اور اسی طرح پر ہم عرب کے واقعات کا صحیح زمانہ متعین کرنے میں کسی قدر کام یاب ہوئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ بعض تواریخی واقعات جو عرب میں واقع ہوئے وہ ایسے ہیں کہ اور ملکوں مثلاً فارس، اطالیہ اور مصر کے واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں اور یہ ایسے ملک ہیں جن کی تواریخ اوران واقعات کا زمانہ جو وہاں واقع ہوئے دنیا میں بہ خوبی مشہور ہے، علاوہ اس کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو عرب میں واقع ہوئے ہیں اور ان کے وقوع کا زمانہ قریب بہ صحت معلوم ہے اس لیے ہم نے اپنی تحقیقات میں ان دونوں تاریخوں کو بہ طور رہنما کے اختیار کیا ہے۔

عرب کے بادشاہ اوران کی حکومتیں

قحطان اول شخص تھا جو عرب میں بادشاہ ہوا اور اپنی

اول من نزل الیمن قحطان بن عایر بن شالح و قحطان المذکور اول من ملک ارض الیمن و لبس التاج (ابو الفدا)

دارالسلطنت زرخیز اور شاداب صوبہ یمن میں مقرر کی جو کہ

قحطان فالغ کا بھائی تھا اس واسطے اس کی تاریخ ولادت فالغ کی

تاریخ ولادت سے بہت بعید نہ

ہوگی اور اس لیے وہ تاریخ قریب 1757 دنیوی یا 2200 قبل حضرت مسیح کے قرار پاتی ہے زبانوں کے اختلاف کے بعد جو بابل میں مینار کی تعمیر کی وجہ سے عارض ہوگئیں، نمرود پسر کوش ملک بابل یا اشور کا بادشاہ ہوا اور حام پسر مصریم مصر کا اسی زمانہ میں قحطان بھی

یمن کا بادشاہ ہوا، یعنی 1771 دنیوی یا 2234 قبل مسیح میں

اس کے مرنے پر یعرب یا جرھم اپنے باپ کا جانشین ہوا

ثم مات قحطان و ملک بعدہ ابشہ یعرب بن قحطان (ابو الفدا)

اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کے قبضہ میں یمن اور حجاز

کے صوبے تھے جو

اس وقت میں بنی جرھم کے نام سے مشہور تھے رورنڈ فارسٹر صاحب اور اور مورخ اس باب میں متفق الرائے ہیں اور اتفاق کی صحت اکثر مقامات کے ناموں کی مطابقت سے جو ان صوبہ جات میں پائے جاتے ہیں، ہوتی ہے، جرھم کے یمن میں آباد ہونے کے باب میں مصنف موصوف نے ایک بہت معقول وجہ ثبوت پیش کی ہے یعنی یہ کہ جرھم ابو یمن کے نام سے ملقب ہوا تھا۔

جرھم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یشحب تخت پر بیٹھا اور

ثم ملک بعدہ ابنہ یشحب بن یعرب ثم ملک بعدہ ابنہ عبد شمس بن یشحب...... وسمی سبا وھو الذی بنا السد بارض مارب...... وبنی مدینۃ مارب و عرفت مدینۃ سبا...... وخلف سبا المذکور عدۃ اولاد منھم حمیر و عمرو و کھلان و اتمرو غیرھم..... ولما مات سبا ملک الیمن بعدہ ابنہ حمیر ابن سبا (ابو الفدا)

اس کے بعد اس کا بیٹا عبد الشمس ملقب بہ سبا اکبر تخت نشین ہوا۔ یہ شہزادہ یمن میں مشہور سلطنت سبا کا بانی ہوا اور اسی نے شہر سبا اور شہر مارب بنایا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔

اب چوں کہ حمیر یقطان سے چوتھی پشت میں تھا اور ترح بھی
فالغ سے چوتھی پشت میں تھا اس لیے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ
حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے بہت دور
نہیں ہو گی یعنی 1878 دنیوی یا 2126 قبل حضرت مسیح میں اس کی ولادت ہوئی ہو
گی۔

ترح کے تین بیٹے تھے ابرام، ناحور، حاران اور حمیر کے بیٹے بھی تین تھے وائل، عوف، مالک اس لیے ترح اور حمیر کی اولاد کو بھی ہم عصر خیال کرنا چاہیے یعنی کہ وہ 1948 دنیوی یا 2056 قبل حضرت مسیح کے تھے۔

وائل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا اب اول اس مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً دی گئی ہے لحاظ کر کے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط پسر حاران پر غور کر کے سکسک اور فاران کی ولادت کی تاریخ قرار دینی چاہیے جو 1778 دنیوی یا 2126 قبل حضرت مسیح میں یعنی تیس برس قبل ولادت حضرت ابراہیم کے قرار پاتی ہے۔
وائل اپنے باپ کا جانشین ہوا اور عوف کسی جگہ حجاز

ثم ملک بعده (اے بعد حمیر) ابنه وائل ابن حمیر ثم ملک بعده ابنه السکسک بن واثل ثم ملک بعده یعفر بن السکسک ثم وثب علی ملک الیمن ذوریاش وھو عامر بن ماران (فاران) (پاران) (باران) بن عوف بن حمیر (ابو الفدا)

عوف بفتح اوله و سکون ثانیه واخره فاء جبل بنجد.... و عوق بالفتح ارض فی دیار غطفان بین تجد و خیبر (مراصد الاطلاع علیٰ اسماء الا مکنة و البقاع)

اور نجد کے مابین آباد ہوا۔ یہ امر اس بات سے ثابت ہے کہ
پہاڑ جو نجد کی جانب مغرب واقع ہے آج تک جبل عوف کے نام سے
مشہور ہے فاران ابن عوف اپنے باپ کے پڑوس میں آباد ہوا یعنی
اس وادی غیر ذی زرع میں جہاں بالفعل مکہ معظّمہ موجود ہے فاران
کا اطلاق صرف اس وسیع شمالی بیابان پر نہیں ہوتا جو قادیش تک چلا
گیا ہے بلکہ ان پہاڑوں پر ہوتا ہے جو اس میں واقع ہیں اور ان
پہاڑوں ہی کے نام کی وجہ سے اس وسیع میدان کو فاران کا میدان
کہہ سکتے ہیں۔ تمام مشرقی مورخ اور نیز وہ

لوگ جو قدیم روایتوں کے معتقد ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہے اور توریت مقدس میں بھی صاف صاف مذکور ہے کہ یہی نواح بنام فاران موسوم تھا جو کہ ہم اس مضمون کو زیادہ تر تفصیل سے عرب المستعربہ کے ذکر میں بیان کریں گے اس لیے کچھ حال فاران بن عوف کا بیان کرتے ہیں۔

ابوالفدا اپنی تاریخ عرب میں بیان کرتا ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا یہ تاریخ مع اپنے لاطینی ترجمہ کے 1831ء میں از سر نو چھاپی گئی تھی اور اس کا لاطینی زبان میں یہ نام ہے (ابو الفدا ھسٹو ریا اینٹی اسلام کا اریبس) یعنی تاریخ ابوالفدا در باب عرب ایام جاہلیت اور اس کا ایڈیٹر ''ھنر یکس آرتھوبیس فلیچر'' تھا لفظ فاران اصل کتاب کے صفحہ 114 میں اس شکل سے چھپا ہے (ماراں) یعنی حرف اول پر کوئی نقطہ نہیں ہے اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ پہلا حرف کیا ہے ف ہے یا ب ہے یا پ ہے۔ اور اس موقع پر یہ تین صورتیں ہونی ممکن ہیں مگر باوجود اس نقطہ کی غلطی کے یہ متحقق ہے کہ یہ لفظ بجز فاران کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

عربی مصنفوں کا دستور ہے کہ جب کسی لفظ کا تلفظ ف سے ہوتا ہے تو اس کو ''ف''

کے حرف سے لکھتے ہیں، بعض یہودی حرف ''ف'' کا تلفظ مثل حرف ''پ'' کے کرتے ہیں مگر عربی مصنف ''پ'' کی جگہ ''ب'' کا تلفظ کرتے ہیں اور ''ب'' ہی سے اس لفظ کو لکھتے ہیں کیوں کہ ان کی الف بے میں ''پ'' کا حرف نہیں ہے اسی وجہ سے ابوالفدا نے لفظ فاران کو جس کا یہودی تلفظ پاران ''پ'' سے تھا، باران ''ب'' کے ساتھ لکھا ہے جس کا نقطہ چھپنے میں رہ گیا ہے اور اس کا ثبوت لاطینی ترجمہ سے ہوتا ہے کہ اس میں اس کا ترجمہ ''بارانی'' ''ب'' سے کیا گیا ہے۔ پس اب اس بات میں کہ میں کہ عوف کا بیٹا فاران تھا کچھ شک باقی نہیں رہا۔

جس مقام پر کہ عوف نے سکونت اختیار کی تھی وہاں کوئی ایسا ربانی کرشمہ واقع نہیں ہوا۔ جس سے اس کی شہرت کو جو اس نے عوف کے نام سے حاصل کی تھی گھٹا دیتی یا مٹی دیتی اور اس لیے وہ مقام اور وہ پہاڑ عوف ہی کے نام سے مشہور ہے مگر جس جگہ کہ فاران آباد ہوا تھا اس کا حال ایسا نہیں ہوا کیوں کہ وہاں ایک ربانی کرشمہ کے واقع ہونے کا وعدہ کیا گیا تھا اور جب وہ ربانی کرشمہ واقع ہوا جو تمام چیزوں پر جن کی عرب تعظیم اور حرمت کرتے تھے سبقت لے گیا اور ان کی شہرت کے چاند کو گہن لگا دیا فاران کی شہرت مدھم پڑ گئی اور اس کی جگہ خدائے مقدس کے نام کی شہرت قائم ہوئی فاران کا نام نسیاً منسیاً ہو گیا اور بیت اللہ الحرم کے نام سے اس مقام نے شہرت پائی جو امید ہے کہ قیامت تک اسی طرح مشہور اور معزز رہے گا۔

وائل کے بعد اس کا بیٹا سکسک اور اس کا بیٹا یعفر

ثم نهض من بني وائل النعمان بن يعفر بن السكسك بن واثل بن حمير واجتمع عليه الناس وطرف عامر بن باران عن الملك واستقل النعمان المذكور بملك اليمن ولقب نعمان المذكور بالمافر.

ثم ملک بعده ابنه اشمح بن المعافر المذکور ثم ملک بعده شداد بن عاد بن الماطاط بن سبا واجمتع له الملک و غزا البلا ان بلغ اقصی المغرب و بنی المدائن والمصانع وابقی الاثار العظیم (ابو الفدا)

جانشین ہوا اس کا چچا زاد بھائی عامر زوریاش پسر فاران پسر عوف نے جو حجاز میں آباد ہوا تھا یعفر کی سلطنت پر حملہ کیا اور فتح کرلیا لیکن نعمان بن یعفر نے اس کو نکال دیا اور وہ حجاز کی طرف چلا گیا اور نعمان نے اپنی سلطنت واپس لے لی اس کارنمایاں کی وجہ سے اس کا لقب المعافر ہوگیا اسی قاعدہ کے بہ موجب جس سے کہ ہم نے اس قدر اشخاص کی ولادت کی تاریخیں معین کی ہیں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یعفر بن سکسک اور عامر بن فاران ورحضرت ابراہیم کے تولد کی تاریخ قریب قریب ایک ہی زمانہ

میں ہے یعنی 2008 دنیوی میں یا 1996 قبل حضرت مسیح میں اب جو قدرتی قاعدہ پشتوں کے توالد وتناسل کا ہے اس کے مطابق ہم نعمان کے زمانہ پیدائش کو دریافت کرسکتے یں جس کا وقوع 1038 دنیوی میں یا 1966 قبل حضرت مسیح میں واقع ہوتا ہے۔

اس پچھلے زمانے کے پینتالیس برس بعد حضرت ابراہیم مقام ''آور'' سے جو قوم کالدی سے متعلق تھا حاران کو جو عراق عرب میں واقع ہے، بلائے گئے تھے اور یہ ایک ایسا زمانہ ہے جس کے متعلق جمیع واقعات ہم کو اس نتیجے کی رہنمائی کرتے ہیں کہ عامر اور نعمان کی جنگ اسی زمانے میں ہوئی ہوگی اس لیے یہ مستنبط ہوسکتا ہے کہ یہی وقت تھا جب کہ نعمان نے عامر کو بھگا کر اپنے آبائی تخت کو حاصل کیا تھا یعنی 2083 دنیوی یا 1921 قبل حضرت مسیح میں نعمان کے بعد اس کا بیٹا اشمح کو شکست دے کر جلا وطن کر دیا شداد نے بڑی

عظمت اور شہرت حاصل کی اور اپنی حکومت استحکام کے ساتھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا، اس نے بہت سی عالی شان عمارتیں بنائیں[1] جن کے نشان اب بھی پائے جاتے ہیں۔

شداد کا نام ایسا مشہور ہے کہ قریب قریب ہر مشرقی باشندہ اس سے واقف ہے اور اس کی عظمت و شوکت کی نسبت بہت سے عجیب و غریب قصے اور روایتیں مشہور ہیں یہ شخص ماطاط بن عبد الشمس عرف سبا اکبر کی اولاد میں تھا اس کے باپ کا نام عاد ہے مورخوں نے اس عاد کو پہلے عاد کے ساتھ غلط ملط کر دیا ہے اور اس طرح پر مختلف روایتیں جو درحقیقت پہلے عاد سے متلق تھیں اس کی طرف منسوب کی ہیں اور اس عاد کی روایتیں پہلے عاد کی طرف۔

ان دونوں عادوں کے باہم تمیز کرنے کے لیے ہم نے اس پچھلے عاد کو جس کا ابھی ذکر ہوا بنام عاد ثالث موسوم کیا ہے کیوں کہ اس نام کا یہ تیسرا شخص ہے۔

مشرقی تاریخوں میں ہم شداد اور سبا اکبر کے مابین صرف

1 مسٹر رورنڈ فارسٹر صاحب بوقت بیان کتبات قوم عاد کے جو مختلف اقطاع عرب میں ظاہر ہوئے ہیں نقب الحجر کے قدیمی آثار کا جو حضرت موت میں ہیں، ذکر کرتے ہیں حصن غراب کے آثار بھی کچھ کم مشہور نہیں ہیں۔ عدن میں بعض عمارتوں کے آثار بڑی قدامت کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو بہت شوق دلاتے ہیں اور قوم عاد سے منسوب ہیں بعض نشانات حوضوں کے جو عموماً تالاب کہلاتے ہیں عدن میں اب تک پائے جاتے ہیں اور جن کی قدامت کی وجہ سے ہر سیاح کی توجہ و اشتیاق کو کشش ہوتی ہے ان کا باقی شداد کو کہتے ہیں علاوہ ان آثار کے جن کا ذکر ہو چکا ہے بہت سے اور دریافت ہوئے ہیں جو خرد ان عمارات اور نیز ان کے بانی کی قدامت کے شاہد ہیں۔ (سید احمد)

دو نام ایک عام اور دوسرا ماطاط پاتے ہیں حالاں کہ ان کے مابین کم سے کام پانچ نام

ہونے چاہئیں مشرقی تاریخوں میں جو سلسلہ انساب میں اس طرح ناموں کی کمی پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی مورخوں نے سلسلہ انساب کو پرانے عربی شعرا کے اشعار اور تحریروں سے اخذ کیا ہے ان شاعروں کا قاعدہ تھا کہ اپنے اشعار میں انہیں لوگوں کا ذکر کیا کرتے تھے، جنہوں نے کسی بڑے بڑے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہو اور جن لوگوں نے ایسی شہرت نہیں حاصل کی ان کے نام ان اشعار میں نہیں پائے جاتے تھے اور یہی سبب ہے کہ مشرقی مورخوں نے جو سلسلہ انساب قائم کیا ہے اس میں سے وہ نام چھوٹ گئے ہیں۔

عرب العاربہ کا شجرہ انساب ہم اپنے اس مضمون کے اخیر میں شامل کریں گے اس شجرہ میں جہاں ہم کہیں ہم کو اس طرح پر ناموں کے رہ جانے کا شبہ ہوا ہے یا جہاں کہیں خود مشرقی مورخوں نے ناموں کے رہ جانے کا اقرار کیا ہے وہاں ہم نے ایک نشانی ستارہ کی بنا دی ہے جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ کس قدر نام ہماری دانست میں اس سلسلہ میں سے چھوٹ گئے ہیں۔

جس زمانے میں کہ شداد نے یمن والوں پر غلبہ حاصل کیا اور سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اس کا صحت کے ساتھ متعین کرنا کسی قدر غیر ممکن ہے بایں ہمہ کہہ سکتے ہیں کہ نعمان کی تخت نشینی سے چند سال بعد یا اس کی وفات سے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں شام کے پانچ بادشاہوں کے باہم لڑائی شروع ہوئی توریت مقدس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی کا اثر عرب میں بھی پہنچا تھا کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ ''پس در سال چہار دھم کدر لاعوم وملوکے کہ بہمر اھش بودند آمدہ رفائیاں را در عشتروث قرنیم و زوزیان را درھام وا یامیان را در شادہ قریاثایم شکست دادند و نیز حوریان را در کوہ خودشاں سیعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحرا است و برگشتہ بعین مشپاط کہ قادیش است آمدند و تمامی مرز و بوم عمالیقیاں واھم

اموریانی کہ درحصصون تامار ساکن بودنس شکست دادند'' (سفر تکوین باب 14 ورس 5,6,7)

ظاہر ہے کہ یہ حملہ آور قادیش کے شمال میں آئے ہوں گے کیوں کہ سیعیر کے پہاڑ اس جگہ سے شمال میں واقع ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قادیش کے جنوب میں دور جا کر فاران میں چلے گئے جس سے آج تک حجاز مراد لیا جاتا ہے کیوں کہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس بیان کے کہ حملہ آور پاران سے قادیش کو لوٹ گئے کچھ بھی معنی نہ ہوتے، اگر یہ کہیں کہ یہ لوگ مغرب کی جانب گئے ہوں گے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس طرف بنی عملیق رہتے تھے، جن سے کہ ان حملہ آوروں نے اپنی پہلی مہم سے قادیش کو واپس آنے کے بعد جنگ کی تھی۔

اس وقت اشمح کی حکومت اور عمل داری صوبہ یمن اور حجاز پر پھیل گئی جو کہ یہ زمانہ اس کے عہد حکومت کی ابتدا کا تھا اس لیے خیال ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا حملے کی وجہ سے اس کی طاقت میں کسی قدر ضعف آ گیا ہو جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سلطنت یمن کی اس ضعف اور شکستہ حالت کو دیکھ کر شداد نے جو ہمیشہ ایسے موقع کا منتظر رہتا تھا، اشمح پر حملہ کیا ہو اور اس کو حکومت سے بے دخل کر کے تخت چھین لیا ہو ان وجوہ کی بنا پر ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی ترغیب ہوتی ہے کہ اشمح 2091 دنیوی یا 1913 قبل حضرت مسیح میں تخت پر بیٹھا تھا اور شداد نے 2092 دنیوی یا 1912 قبل حضرت مسیح میں اس کی سلطنت کو چھین لیا تھا اور یہ زمانہ اس عام قاعدہ سے جو علم انساب میں پشتوں کے پیدا ہونے کے لیے قرار دیا گیا ہے، بالکل مطابق ہوتا ہے۔

شداد کے بعد اس کے دو بھائی لقمان اور ذوشدد یکے بعد

ثم ملک بعده اخوه لقمان بن عاد ثم ملک بعده اخوه ذو شدد بن عاد ثم ملک بعده ابنه الحرث بن ذی شدد و یقال له الحارث الرایش (ابو الفدا)

دیگرے تخت پر بیٹھے اور ذو شدد کے بعد اس کا بیٹا الحارث
بادشاہ ہوا۔ اس زمانے تک اور اس کے بہت عرصہ بعد تک وہاں دو
خود مختار سلطنتیں رہیں ایک یمن کی اور

دوسری حضر موت کی آخر کو ایک دوسرا شخص مسمی الحارث جس کا لقب رائش ہوا تخت پر بیٹھا اس نے ان دونوں سلطنتوں کو ملا کر ایک کر دیا اس لیے بعض مورخوں نے غلطی سے پہلے الحارث اور دوسرے الحارث کو ایک ہی شخص سمجھا اور اسی کی طرف دونوں سلطنتوں کو ملانا منسوب کیا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بادشاہوں کے نام جو ان دونوں الحارثوں کے مابین فرماں روا ہوئے تھے ہر ایک مورخ نے چھوڑ دیے اور ان کے نام معدوم ہو گئے اس غلطی کا ثبوت اس طرح پر ہوتا ہے کہ جو زمانہ ان بادشاہوں کا گذرا ہے اور جو تعداد بادشاہوں کی لکھی ہے وہ بہ لحاظ امتداد زمانہ کے نہایت کم ہے۔

حمزہ اصفہانی اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ الحارث

الحارث الرائش ھو الحارث بن قیس صیفی بن سبا الصغر الحمیری و کانا لرائس اول غزا منھم فاصا الغنائم وادخلھا ارض الیمن فار تاشت حمیر فی ایامه و کان ھو الذی راشھم فبذالک سمی الرایش و بین الرائش و بین حمیر خمسة عشر اباً تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء لحمزۃ اصفحانی

الرایش ذو شدد کا بیٹا اور جانشین نہ تھا بلکہ حضر موت کے
خاندان میں سے تھا افسوس کی بات ہے کہ یہ مصنف ان بادشاہوں
کی تعداد بھی نہیں بتالاتا جن کے نام معدوم ہو گئے ہیں لیکن اس کا یہ
بیان کہ حمیر اور الحارث الرایش کے مابین پندرہ پشتیں گذری تھیں ہم

کو کسی قدر ٹھیک ٹھیک وقت کے معین کرنے پر قادر کرتا ہے۔

اگر ہم بیان صدر پر اعتماد کریں

تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ الحارث ابن شدد کے اور الحارث الرایش کے مابین سات یا آٹھ اور بادشاہ ہوئے ہوں گے۔

الحارث الرایش قیس بن صیفی بن سبا الاصغر کا جو حمیر کی اولاد

ثم ملک بعده ابنه ذوالقرنین الصعب بن الرامیش ثم ملک بعده ابنه ذوالنار ابرهه بن ذی القرنین ثم ملک بعده ابنه آفریقش بن ابرهه ثم ملک بعده ذو الاذعار عمرو بن ذو المنار ثم ملک بعده شرحیل بن عمرو بن غالب بن المنتات بن زید بن یعفر بن السکسک بن واثل بن حمیر..... ثم ملک بعده ابنه الهدهاد بن شرجیل ثم ملکت بعده بنته بلقیس بنت الهدهاد و بقیت فی ملک الیمن عشرین سنة و تزوجها سلیمان بن داؤد (ابو الفدا)

وقد نقل بن سعید المغربی ابن عباس سئل عن ذی القرنین الذی ذکره الله تعالیٰ فی کتابه العزیز فقال هو من حمیر وهو الصعب المذکور فیکون ذوالقرنین المذکور فی الکتاب العزیز هو الصعب بن الرایش المذکور لا الا سکندر الرومی (ابو الفدا)

وکان اول سن ابن السدسبا الا کبر واسمه عامر و قیل عبد شمس بن یشحب بن یغرب بن قحطان ثم بناه حمیرا بن سبا بعد موت ابیه ثم اتمه بعد ذالک ذوالقرنین الحمیری وهو الصعب بن ابی مرابد و کان السد من جبل مارب الی جبل الا بلق وهما جبلان منیفان علی الجبال

الشافحة الممتد من يمين السدو شماله (العقود اللولويه فی اخبار دولة الرسولیه یمنی)

ثم ملک بعد ھا عمھا ناشر النعم بن شرجیل .... ثم ملک بعده شمر برعش بن ناشر النعم..... ثم ملک بعد شمر برعش بن ناشر النعم..... ثم ملک بعده ابنه ابو مالک بن شمر ثم ملک بعده عمران بن عامر الازدی.... ثم ملک بعده اخوه مزیقیا(ابو الفدا)

میں ہے، بیٹا تھا اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا وہ یمن اور حضرموت دونوں سلطنتوں کو ملانے میں کامیاب ہوا اور اسی سبب سے رایش یا تبع الاول کا لقب پایا۔

اس کے بعد صعب ملقب بہ ذوالقرنین اور ابرھہ ملقب بہ ذوالمنار اور افریقش، اور عمرو ملقب بہ ذوالاذعار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔

عمرو ذوالاذعار کے عہد حکومت میں شرجیل نے اس پر حملہ کیا اور بے شمار خون ریز لڑائیوں کے بعد عمرو ذوالاذعار کو شکست دی اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔ شرجیل کے بعد اس کا بیٹا الہدھاد جانشین ہوا اور اس کے بعد ملکہ بلقیس تخت پر بیٹھی، جس نے بیس برس سلطنت کر کے حضرت سلیمان بادشاہ یہود سے نکاح کر لیا۔ اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے 3000 دنیوی یا 500 قبل حضرت مسیح میں پایا جاتا ہے اس لیے نسلوں کے ہونے کے معینہ قاعدہ کے مطابق الحارث الرایش اور صعب ذوالقرنین یا۔۔۔تو

اٹھائیسویں صدی دنیا کے آخر میں یا انیسویں صدی کے شروع میں
ہوئے ہوں گے یعنی 1200 قبل حضرت مسیح گے۔ابن سعید مغربی کا
بیان ہے کہ جب حضرت ابن عباس سے اس ذوالقرنین کی نسبت
جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ
صعب حمیری تھا اس دلیل پر ابو الفدا نے بیان کیا ہے کہ اسی
ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں ہے نہ کہ سکندر اعظم کا۔

ایک مشہور و معروف کام سد کی تعمیر کا اسی ذوالقرنین کے عہد
میں اختتام کو پہنچا۔ شاھان یمن کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سد
کی بنا سبا اکبر نے شروع کی تھی اس کے بیٹے اور جانشین حمیر نے اس
کو جاری رکھا اور ذوالقرنین نے اسے اختتام کو پہنچایا وہ سد دو
پہاڑوں کے درمیان تھی ایک پہاڑ کا نام مارب اور دوسرے کا نام
ابلق تھا۔

بلقیس کے بعد اس کا چچازاد بھائی مالک ملقب بہ ناشر النعم تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا شمر برعش اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابو مالک تخت پر بیٹھا اس بادشاہ کی سلطنت میں عمران نے جو خاندان ازد سے تھا، اس پر حملہ کیا، اور شکست دے کر تخت چھین لیا اور سلطنت بنی حمیر کے خاندان سے بنی کہلان کے خاندان میں منتقل ہوگئی عمران کے بعد اس کا بھائی عمر مزیقیا تخت نشین ہوا۔

اس کے زمانے میں الاقرن بن ابو مالک نے اپنے باپ کی سلطنت کا دعویٰ کیا اور مزیقیا سے لڑ کر اس کو شکست دی،

ملک الاقرن بن ابی مالک ثم ملک بعده ذوحبشان بن

الاقرن.... ثم ملک بعده اخوه تبع بن الاقرن ثم ملک بعده ابنه کلیکرب بن تیع ثم ملک بعده ابو کرب اسعد وهو تبع اوسط و قتل ثم ملک بعده ابنه حسان بن تبع..... ثم قتله اخوه عمرو من تبع و ملک.... فسمی ذالا اعواد ثم ملک بعده عبد کلال ابن ذوی الا عواد ثم ملک بعده تبع بن حسان ابن کلیکرب و هو تبع الا صفر ثم ملک بعده ابن اخته الحارث بن عمر و تهود الحارث المذکور ثم ملک بعده مرثد ابن کلا.... ثم ملک بعده و کیعه ابن مرثد (ابو الفدا)

ثم ملک ابرهه بن الصباح ثم ملک صمبان بن محرث ثم ملک عمر بن تبع ثم مالک بعده ذوانواس و کان من لا یتهود القاه فی احد و د مضطرم ناراً فقیل له صاحب الا خدو دثم ملک بعد ذوجدن وهو اخر ملوک الحمیر (ابو الفدا)

سن کتاب ابن سعید المغربی ابن الحبشه استولوا علی الیمن بعد ذی جدن الحمیری المذکور و کان اول ملک الیمن من الحبشه ارباط ثم ملک بعده ابرهة الاشرم صاحب الفیل الذی قصد مکة ثم ملک بعده یکسوم ثم ملک بعده مسروق بن ابرهه و هوا خرمن ملک الیمن من الجشة ثم عاد ملک الیمن الی حمیر و ملکها سیف بن ذی یزن الحمیری (ابو الفدا)

اورسلطنت چھین لی اورحمیر کے خاندان میں دوبارہ سلطنت لوٹ آئی۔

اس کے بعداس کا بیٹا ذوجشان مالک تاج وتخت ہوااس کے

بعد اس کا بھائی تبع اکبر اس کے بعد اس کا بیٹا کلیکرب اور اس کے بعد
اس کا بیٹا ابوکرب اسعد طبع اوسط اس کے بعد اس کا بیٹا حسان اس کے
بعد اس کا بھائی عمر ذوالاعواد اس کے بعد اس کا بیٹا عبد کلال تخت نشین
ہوا تبع اصغر پسر حسان نے اس بادشاہ سے سلطنت چھین لی اور خود
بادشاہ ہوگیا۔اس کے بعد اس کا بھتیجا حارث بن عمر تخت پر بیٹھا تمام
مورخوں کا اتفاق ہے کہ حارث نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اس
کے بعد مرثد ابن کلال اور اس کے بعد وکیعہ ابن مرثد تخت نشین
ہوئے۔

ان بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ حارث بن عمر کے یہودی
مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے کسی قدر صحت کے ساتھ معلوم ہوسکتا
ہے جب کہ بخت نصر فلسطین کو فتح کر کے اور بیت المقدس کو مسمار کر
کے حضرت دانیال اور ان کے دوستوں کو قیدی بنا کر بابل کو لے گیا
اس وقت کچھ یہودی بچ کر یمن کو بھاگ گئے تھے اس زمانہ میں
حضرت یرمیاہ اور دانیال پیغمبر تھے اس لیے یہ بات نہایت قرین
قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان مفرور یہودیوں کی وجہ سے الحارث نے
خدائے واحد کا اقرار کیا ہوگا اور یہودی مذہب کو قبول کیا ہوگا اور یہ
امر واقعی ہے کہ الحارث اور وکیعہ اس زمانہ میں حکمران تھے یعنی
3400 دنیوی میں یا 604 قبل حضرت مسیح میں اس امر کا واقعی ہونا
زیادہ تر اس لیے قابل اعتبار ہے کہ نسلوں کے
پیدا ہونے کے قدرتی قاعدہ کے مطابق بھی یہ زمانہ ٹھیک صحیح آتا ہے کیوں کہ

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ مالک ناشر النعم 3001 دنیوی میں تخت پر بیٹھا تھا مالک اور مجموعاً چار سو برس خیال کرنا قرین عقل ہے وکیعہ کے بعد چھ اور بادشاہ خاندان حمیر میں سے تخت نشین ہوئے یعنی ابرھہ بن الصباح، صہبان بن محرث، عمر ابن تبع، ذوشناتر، ذونواس لقب بہ ذواخدود ذوجدن جو کہ ان بادشاہوں کا خاندانی سلسلہ صاف صاف تحقیق نہیں ہوا اس لیے ہم نے ان کے ناموں کو شجرہ انساب عرب العاربہ میں شامل کر دینے کی جرأت نہیں کی بلکہ ان کے ناموں کو شجرہ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے ان لوگوں کی سلطنت کا ٹھیک زمانہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے۔

ذونواس ایک متعصب یہودی تھا اور یہودی مذہب والوں کے سوا ہر مذہب کے معتقدوں اور پیروؤں کو آگ میں زندہ جلوا دیا کرتا تھا اس بات کے خیال کے واسطے ایک عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ آرٹازرکیسز اوکس نے چند یہودیوں کو جو مصر میں قید ہوئے تھے کیوں کہ ان کا مالک مصر سے ملا ہوا تھا ھرقانیہ (مازندراں) کو بھیج دیا اور چوں کہ یہ بادشاہ بھی یہودی تھا اس کی سلطنت کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور حبشیوں نے اس پر غلبہ کر لیا اور اس کو سلطنت سے خارج کر دیا۔ پس یہ زمانہ اس خاندان کا آخری زمانہ معلوم ہوتا ہے اور 3250 دنیوی یا 354 قبل حضرت مسیح کے مطابق ہوتا ہے۔

اس زمانے سے ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تک نو سو بیس برس ہوتے ہیں اس درمیان میں افریقہ کے لوگوں کی جو ارباط حبشہ کہلاتے تھے اور نیز بعض عرب المستعربہ اور ابرھوں کی حکومت رہی۔

مشرقی مورخوں نے اس بات کے غلط خیال سے کہ ارباط حبشہ اور ابرھہ دو شخص تھے بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں صرف دو ہی بادشاہ ہوئے حالاں کہ ارباط حبشہ اور ابرہہ خاندانی لقب ہیں اور ان خاندانوں کے بادشاہ اپنے اصلی نام کے ساتھ خاندانی لقب کو شامل کر لیتے

تھے۔

اس خاندان ابرھہ میں ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا جو ابرہہ اشرم صاحب الفیل کہلاتا ہے اور جس نے مکہ معظّمہ پر 4570 دنیوی یا 570 عیسوی میں چڑھائی کی تھی وہ اپنے ساتھ بہت سے ہاتھی اس نیت سے لے گیا تھا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے اس کے بعد اس کا بیٹا ابرہہ مسروق تخت نشین ہوا مگر سیف بن ذی یزن حمیری نے اس کو سلطنت سے بے دخل کر دیا جس کو کسریٰ نوشیرواں والی ایران نے بہت مدد دی تھی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا اس کے بعد سے خاندان ابرہہ کی حکومت منقطع ہوگئی۔

سیف بن ذی یزن جو حمیر کے شاہی خاندان سے تھا اپنے آپ کو سلطنت یمن کا وارث اور حق دار سمجھتا تھا اس نے روم کے بادشاہ وقت سے مدد چاہی اور شہر روم میں اسی غرض سے دس برس تک پڑا رہا مگر جب کہ اس کی امید منقطع ہوگئی تو وہاں سے کسریٰ نوشیرواں کے پاس چلا گیا اور اس سے کمک کی استدعا کی۔

اس بادشاہ نے اس کی درخواست کو منظور کیا اور بہت بڑا لشکر اس کی کمک کو دیا اور اس نے اس لشکر کی مدد سے اپنے دشمن کو شکست دی اور خاندان ابرھہ کا خاتمہ ہو گیا اور سیف بن ذی یزن از سر نو تخت پر بیٹھا۔

اس نے اپنی سکونت شاہی محل غم دان میں اختیار کی اور عیش و عشرت میں محو ہو گیا۔ اس بادشاہ کے عہد کے شعرا نے اس کی بہت تعریف و توصیف کی ہے اور جو کہ ان اشعار میں بعض تاریخی واقعات ملتے ہیں اس لیے ہم چند شعر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

لاتقصد الناس الا کابن ذی یزن
اذ خیم البحر للا عداء احوالا
وافی ھرقل وقد شالت نعمامتہ

فلم یجد عنده النصر الذی سالا

ثم انتحی نحو کسرے بعد عاشرۃ

من السنین یھبن النفس والمالا

حتیٰ اتی ببنی الاحرار یقدمھم

تخالھم فوق متن الارض اجبالا

للہ درھم من فتیہ صبر

ما ان رایت لھم فی الناس امثالا

ببض مرازبۃ غلب اساورۃ

اسد تربت فی الغیضات اشبالا

ناشرب ھنیاً علیک التاج مرتفقا

براس غمدان دار أمنک محلالا

تلک المکارم لاقعبان من لبن

شیبا بماء فعادا بعد ابدالا

سیف بن ذی یزن کو ایک اس کے درباری حبشی مصاحب

وکان سیف بن ذی یزن المذکور قداصطفے جماعۃ من الجشان و جعلھم من خاصۃ فاغتالوہ و قتلوہ فارسل کسریٰ عاملا علی الیمن واستمرت عمال کسریٰ علی الیمن الیٰ ان کان آخرھم باذان الذی کان علیٰ عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم واسلم (ابو الفدا)

نے قتل کیا۔ اس کے بعد اس صوبہ کو نوشیرواں نے اپنے

ممالک محروسہ میں شامل کرلیا اور اپنی جانب سے وہاں عامل مقرر کرتا

رہا۔ ان عاملوں میں سے اخیر عامل باذان تھا۔ اس کا زمانہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ متحد تھا چناں چہ وہ آنحضرت پر ایمان لایا اور مسلمان ہو گیا۔

عرب العاربہ میں خاندان قحطان نے بڑی طاقت اور شہرت

اول من ملک علی العرب بارض الحیرہ مالک بن فھم.... ثم ملک بعدہ اخوہ عمرو بن فھم ثم ملک بعدہ اخوہ عمرو بن فھم ثم ملک بعدہ ابن اخیہ جذیمہ بن مالک بن فھم..... وکانت لہ اخت تسمی رقاش (ابو الفدا)

لما قتل جذیمہ ملک بعدہ ابن اختہ عمرو بن عدی بن نصر بن ربیعہ....... ثم مات و ملک بعدہ ابنہ امرو القیس...... وکان یقال لامرو القعیس البدا ئے الاول ثم ملک بعد امرو القیس ابنہ عمرو بن امرو القیس.... ثم ملک بعدہ اوس بن قلام العملیقی ثم ملک اخو من العمالیق ثم رجع الملک الی بنی عمرو بن عدی بن نصر بن ربیعہ اللخمیین المذکورین و ملک منھم امرو القیس من ولد عمرو بن امرو القیس المذکور و یعبرف ھذا امروالقیس الثانی بالمحرق لانہ اول من عاقب بالنار ثم ملک بعدہ ابنہ النعمان الاعود بن امرو القیس..... ثم تذھد و خرج من الملک ...... ملک بعدہ ثم ھلک و ملک بعد ابنہ عمر بن جفنہ.... ثم ملک و ملک بعدہ ابنہ ثعلبۃ بن عمرو...... ثم ملک بعدہ ابنہ الحارث بن ثعلبہ ثم ملک و ملک بعدہ ابنہ ثعلبۃ بن عمرو..... ثم ملک بعدہ ابنہ الحارث بن ثعلبہ ثم ملک ابنہ جبلۃ بن

الحارث ثم ملك ابنه الحرث...... ثم ملك بعد ابنه المنذر الاكبر (ابو الفدا)

ثم هلك المنذر الاكبر المذكور و ملك بعد اخوه النعمان ابن الحرث ثم ملك بعده اخوه جبلة بن الحارث ثم ملك بعده اخوهم عمرو بن الحارث ثم ملك جفنته الاصغر......... ثم ملك بعده اخوه النعمان الاصغر ثم ملك نعمان بن عمرو بن المنذر...... ثم ملك بعده النعمان المذكور ابنه جبلة بن النعمان..... ثم ملك معده النعمان بن الايهم...... ثم ملك اخوه الحرث....... بين الايهم ثم ملك ابنه النعمان ابن الحرث....... ثم ملك بعده ابنه المنذر بن نعمان ثم ملك اخوه عمرو بين النعمان ثم ملك اخوهما حجر بن النعمان ثم ملك ابنه الحارث بن حجر ثم ملك ابنه جبلة بن الحرث ثم ملك ابنه الحارث ابن حبلة لم ملك ابنه النعمان بن الحرث و كنية ابو كرب و لقبه قطام ثم ملك بعده الايهم بن جبلة.... ثم ملك بعده اخوه المنذر بن جبله ثم ملك اخوهما.

سراحيل بن جبلة ثم ملك اخوهم عمرو بن جبلة ثم ملك بعده ابن اخيه جبله بن الحرث بن جبله ثم ملك بعده جبله بن الايهم بن جبله و هو اخر ملوك الغسان وهو الذى اسلم فى خلافة عمر ثم عاد الى الروم و تنصر (ابو الفدا)

فلما ملك حجر سدد امورهم وساسهم احسن سيلة وانتزع من الخميين ما كان بايدهم من ارض بكر ابن وابل... وملك بعد الحجر

المذكور ابنه عمرو بن حجر... ثم ملك بعده ابنه الحرث بن عمرو (ابو الفدا)

وملک اخوه (ای خایعرب) جرهم الحجاز ثم ملک بعد جرهم ابنه عبد باليل بن جرهم ثم ابنه جرشم بن عبد باليل ثم ابنه عبد المدان بن جرشم ثم ابنه ثعلبة بن عبد المدان ثم ابنه عبد المسيح بن ثعلبه ثما ابنه مضاض بن عبدالمسيح ثم ابنه عمرو بن مضاض ثم اخوه الحرث بن مضاض ثم ابنه عمرو بن الحارث ثم اخوه بشر بن الحارث ثم مضاض بن عمرو بن مضاض (ابو الفدا)

من ملوک العرب زهير ابن جباب بن حبل...... وكان زهبر المذكور قد اجتمع بابرهة الاشرم صاحب الفيل(ابوالفدا)

حاصل کی اور صوبہ حیرہ میں ایک زبردست سلطنت قائم کی۔

اس خاندان کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم تھا اس کے بعد اس کے بھائی عمرو کو تخت ملا۔

اس کے بعد جذیمہ بن مالک تخت پر بیٹھا۔ یہ جری مگر طامع بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بہت قوی اور مستحکم کر لیا تھا ایک طرف تو دریائے فرات اس کی سلطنت کی حد تھی اور دوسری طرف حدود شام تک پھیل گئی تھی شام تک سلطنت پھیلانے میں اس کو عملیق سے لڑنا پڑا۔ اور ایک سخت اور خونریز لڑائی کے بعد ان کو شکست دی۔

اس بادشاہ کی بہن نے جس کا نام رقاش تھا ایک شخص مسمے عدی سے جو بنی لخم میں سے تھا شادی کی تھی۔

جذیمہ کے بعد اس کا بھانجا عمرو بن عدی تخت نشین ہوا اس کے بعد اس کا بیٹا امرو القیس اور اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو بادشاہ ہوا مگر اس کو ''اوس'' بن قلام عملیقی نے تخت سے اتار دیا۔ اس کے بعد ایک یا دو اور بادشاہ اسی خاندان کے فرمانروا ہوئے جن کے نام معلوم نہیں۔ لیکن اس قدر محقق ہے کہ امرو القیس ثانی بن عمرو نے بہت جلد اپنے اور اس کے بعد زاویہ اور اس کے بعد المنذر الخامس بن نعمان ابو قابوس بادشاہ ہوا اس بادشاہ کو خالد بن ولید سردار لشکر اسلام نے شکست دے کر سلطنت کو چھین لیا۔

جس زمانہ میں یہ سب بادشاہ حکمران ہوئے اس زمانہ کا ٹھیک ٹھیک معین کرنا اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل تو بے شک ہے مگر اخیر بادشاہوں میں سے کم سے کم دو بادشاہوں کی فرماں روائی کا زمانہ ٹھیک ٹھیک بدرجہ یقین معلوم ہے اور اگر نسلوں کے ہونے کے معمولی قاعدہ پر غور کیا جاوے تو بعض اور بادشاہوں کے عہد سلطنت کے زمانہ کے محقق ہونے کے لیے کافی پتہ لگ جاوے گا۔

عمرو بن المنذر رماء السماء کی حکومت کے آٹھویں سال میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان پیدا ہوئے تھے اس واسطے یہ بادشاہ 4526 دنیوی تا 562 عیسوی میں تخت پر بیٹھا ہوگا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے پہل وحی ایاس کی حکومت کے چھٹے مہینے میں نازل ہوئی تھی اس واسطے ایاس 2410 دنیوی یا 210 عیسوی میں تخت نشین ہوا ہوگا۔ عمرو کی تخت نشینی سے

پہلے انیس بادشاہ ہو چکے تھے اور ان کی سلطنتوں کے زمانوں کے مجموعہ کا بطرز معقول پانسو پچاس برس خیال کیا جاسکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلا بادشاہ مالک بن فہم اکتالیسویں صدی دنیوی کے آغاز میں یا حضرت مسیح کے زمانہ ولادت کے قریب تخت پر بیٹھا ہوگا۔

عرب العاربہ نے ایک اور سلطنت صوبہ غسان میں قائم کی تھی اور اس سلطنت کے حاکم عرب الشام کے نام سے مشہور تھے۔ اگر صحیح طور پر غور کیا جاوے تو حاکم قیصر روم کی طرف سے بطور عمال کے تھے مگر شاہی لقب اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ عرب میں بادشاہوں کے ذیل میں بیان ہوتے ہیں۔ جو کہ بعض امور ان لوگوں سے ایسے متعلق ہیں جن سے ہم کو بعض امور کی تحقیقات اور تجسس میں آسانی ہوگی۔ اس لیے ان سلطنتوں کا ایک مختصر حال اس مقام پر لکھتے ہیں۔

اس سلطنت کی بناء چار سو برس قبل ظہور اسلام کے ہوئی اور یہ زمانہ تینتالیسویں صدی دنیوی یا تیسری صدی عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے۔

جفنہ بن عمر اس خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے لقب شاہی اختیار کیا یہ شخص ''ازد'' کی اولاد میں سے تھا جو خاندان کہلان سے علاقہ رکھتا تھا وہ عرب جو اس سے پیشتر غسان میں رہتے تھے ضجاعمہ کہلاتے تھے ان لوگوں نے عرصہ دراز تک مستعدی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا مگر آخر کار جفنہ نے ان پر فتح پائی اور ان کو مطیع کر لیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد اس کا
بیٹا ثعلبہ تخت نشین ہوا۔ ایک عرصہ تک اختیارات شاہی یکے بعد
دیگرے، الحارث، جبلہ، الحرث، المنذر الاکبر کے ہاتھوں میں
رہے۔ اس اخیر بادشاہ کا جانشین اس کا بھائی

نعمان ہوا اس کے بعد اس کا بھائی جبلہ اور اس کے بعد اس کا بھائی ایہم اور اس کے بعد اس کا بھائی عمرو تخت نشین ہوا اس کے بعد جفنۃ الاصغر بن المنذر الاکبر کی باری آئی اس کے بعد نعمان الاصغر اور اس کے بعد اس کا بھتیجا نعمان ثالث بن عمرو بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد جبلہ بن نعمان ثالث کے ہاتھ سلطنت لگی۔ یہ بادشاہ خاندان حیرہ سے بادشاہ المنذر ماء السماء کا ھمعصر تھا اور اس سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا اس کے بعد نعمان رابع بن الایہم اور اس کے بعد الحرث الثانی اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان الخامس اور اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر تخت نشین ہوا اس کے بعد عمرو برادر المنذر اور حجر برادر عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ اس کے بعد الحارث بن حجر اور جبلہ بن الحارث اور الحارث بن جبلہ باری باری سے بادشاہ ہوئے۔ پھر نعمان ابو کرب بن الحارث اور ایہم عم نعمان تخت پر بیٹھے۔ الایہم کے بعد اس کے تین بھائی المنذر، سراحیل، عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے عمرو کے بعد اس کے بھتیجے جبلہ بن الایہم بن جبلہ کو سلطنت نصیب ہوئی۔ یہ بادشاہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ تک زندہ تھا پہلے مسلمان ہو گیا اور اس کے بعد روم کو بھاگ کر عیسائی ہو گیا۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ قریب 4640 دنیوی یا 240 عیسوی میں ہو گیا۔

عرب العاربہ کی ایک اور چھوٹی اور چند روزہ سلطنت کی بنیاد ''کندہ'' کی اولاد نے جو خاندان کہلان سے تھا ڈالی تھی اس خاندان کا پہلا بادشاہ حجر بن عمرو ہوا جس نے کہ مملکت حیرہ کے ایک حصہ کو دبا کر ایک نئی سلطنت قائم کی تھی اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو اور اس کے

بعد اس کا بیٹا الحرث تخت پر بیٹھا یہ وہی شخص ہے جس نے کسریٰ قباد کا مذہب اختیار کر کے اس کی اعانت سے سلطنت حیرہ کو فتح کیا تھا مگر جب نوشیرواں نے اس سے المنذر کو سلطنت واپس دلا دی تب الحارث دیار کلب کو بھاگ گیا۔ مگر اس کے بیٹے چند روز تک چند مقالات پر حکومت کرتے رہے۔ حجر بنی اسد پر حکمران رہا۔ سراحیل بکر ابن وائل پر معدی کرب قیس عیلان پر مسلمہ تغلب اور نمر پر حاکم رہا۔

حجر کے بعد جو مارا گیا تھا اس کے بیٹے امرو القیس نے از سرنو بنی اس کو مطیع کر لیا۔ یہ امرو القیس وہی بہت بڑا مشہور شاعر عرب کا ہے۔ جب کہ منذر ماء السماء از سرنو تخت سلطنت پر بیٹھا تو امرو القیس اس کے خوف سے بھاگا اور کہیں روپوش ہو گیا ان سب بادشاہوں نے پنتالیسویں یا چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں حکومت کی تھی۔

ایک اور سلطنت حجاز میں قائم ہوئی تھی جس زمانہ میں یمن اور حیرہ کی سلطنتیں اندرونی جھگڑوں سے ضعیف ہو گئی تھیں اس زمانہ میں اولاد یعرب یا جرھم نے ایک نئی اور خود مختار سلطنت حجاز میں قائم کی تھی ابو الفدا کے نزدیک اس سلطنت کا پہلا بادشاہ جرھم تھا جس کا بھائی یعرب یمن میں حکمران تھا مگر یہ غلطی ہے اور اس وجہ سے عارض ہوئی ہے کہ ابو الفدا نے غلطی سے یعرب اور جرھم کو دو شخص خیال کیا تھا حالاں کہ یہ دونوں نام ایک شخص کے ہیں اور یہی ایک شخص یمن اور حجاز دونوں پر حاکم تھا۔ ابو الفدا نے مندرجہ ذیل نام بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ بھی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے تھے اور وہ نام یہ ہیں یالیل، جرشم بن یالیل، عبد المدان بن جرشم، ثعلبہ بن عبد المدان، عبد المسیح بن ثعلبہ، مضاض بن عبد المسیح، عمرو بن مضاض، الحرث برادر مضاض، عمرو بن الحرث، بشر بن الحرث، مضاض بن عمرو بن مضاض۔

اگر ابوالفدا کے نزدیک یہ بادشاہ حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیم سے پیش تر گذرے ہیں تو وہ بڑی غلطی پر ہے کیوں کہ عبدالمسیح کے نام سے بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ وہ عیسائی تھا اور اس لیے ممکن نہیں کہ وہ حضرت اسمٰعیل سے پیش تر گذرا ہو یا ان کا ہم عصر ہو کچھ شک نہیں کہ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی۔ جب کہ یمن اور حیرہ اور کندہ کی سلطنتیں زوال کی حالت میں تھیں اور اس لیے ہم کو یقین ہے کہ اس سلطنت کے بادشاہ پینتالیسویں اور چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں گذرے ہیں۔

یہ بھی واضح ہو کہ عمرو بن لاحی 4210 دنیوی یا تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں اسی سلطنت پر حکمران تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ اسی شخص نے بت پرستی کو عرب حجاز میں رواج دیا تھا اور کعبہ میں تین بت، ہول کعبہ کی چھت پر اور اساف اور نائلہ اور مقاموں پر رکھے تھے۔

مثل دیگر عرب العاربہ کے جو حجاز میں متوطن ہوئے اور پھر وہیں کے بادشاہ ہوئے زھیر ابن جباب نے بھی لقب شاہی اختیار کیا یہ بات اس وقت کی ہے جب کہ ابرھہ اشرم نے مکہ معظّمہ پر حملہ کیا تھا۔ کیوں کہ یہ بات مشہور ہ کہ زھیر بھی ابرھہ اشرم کے ساتھ اس مہم میں شریک تھا اس لیے بآسانی محقق ہو سکتا ہے کہ اس کا عہد حکومت چھیالیسویں صدی دنیوی یا چھٹی صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ہوگا۔ سب سے مشہور واقعہ اس کے عہد حکومت کا یہ تھا کہ اس نے بنی غطفان کے اس مقدس معبد کو جو انہوں نے کعبہ کے مقابلہ کے لیے بنایا تھا بالکل برباد کر دیا تھا۔

قبائل عرب العاربہ

اب ہم اس مقام پر عرب العاربہ کے انساب کا شجرہ لکھتے ہیں تمام قوم کا شجرہ لکھنا تو محالات سے ہے مگر یہ شجرہ انہیں لوگوں کا ہے جن کا ذکر ہم نے اس مقام پر کیا ہے۔اس شجرہ سے ان مطالب کے سمجھنے میں جو اس جگہ بیان ہوئے ہیں آسانی ہوگی۔

تمام عرب العاربہ کا جن کا ہم نے اوپر مفصل ذکر کیا ہے۔بنی جرھم کے خاندان سے علاقہ رکھتے ہیں مگر وقتاً فوقتاً بلحاظ اپنے مورثوں کے متعدد قبیلوں میں منقسم ہوتے گئے ہیں۔ ان قبیلوں میں سے جو نامی قبیلے گذرے ہیں اور جن کا ذکر اکثر کتابوں میں آتا ہے۔ان کا بیان ہم اس مقام پر کرتے ہیں ان قبیلوں کی تقسیم کرنے میں ہم ابوالفدا اور معارف ابن قتیبہ سے استفادہ کیا ہے۔

1 یعرب یا جرھم سے بنو جرھم

2 عبدالشمّس بن یشجب سے، بنوسبا

3 حمیر ابن سبا سے، بنو حمیر

4 کہلان ابن سبا سے، بنو کہلان

5 اشعر ابن سبا سے، اشعری

6 انمار ابن سبا سے، بنو انمار

7 عاملہ بن سبا ت، عاملی 8 عدی بن انمار بن سبا سے، بنو عدی

9 لخم بن عدی سے، لخمی

10 جذام ابن عدی سے، بنو جذام

11 حدس ابن لخم سے، بنو حدس

12 غنم ابن لخم سے، بنو غنم

13 بنو الدار بن ھانی بن لخم سے، داری

14 غطفان ابن حیرام ابن جذام سے بنوغطفان

قبائل ذیل بنوغطفان کی نسل میں ہیں:

15 بنونصلة
16 بنواحنف
17 بنوالضبیب
18 بنوھداله
19 بنونفاشه
20 بنوضلیع
21 بنواعایزه
22 بنوشبره
23 بنوعبداللہ
24 بنوالخضره
25 بنوسلیم
26 بنوبجاله
27 بنوغنم
28 بنوالفاله
29 سعد بن مالک بن حیرام سے، بنوسعد
30 وائل بن مالک سے بنووائل

قبائل ذیل بنوسعد کی نسل میں ہیں

31 بنوعوف
32 بنوعایزه
33 بنوفہیره
34 بنوصبحه
35 بنوالخنس
36 بنوحی
37 حشم بن جذام سے، حشمی

38حطمہ بن جذام سے، بنوحطمہ

قبائل ذیل بذوانمار کی نسل میں ہیں

39 خشعمی　　40 بجیلی

41 قسری　　42 بنواحمس

43 دھمان بن عامر بن حمیر سے، دھمانی

44 یحصب بن دھمان سے، یحصبی

45 اسلف بن سعد بن حمیر سے، سلفی

46 اسلم بن سعد سے، اسلمی

47 رعین بن حرث بن عمرو بن حمیر سے، آل ذی رعین

48 قضاعہ بن مالک بن حمیر سے، بنوقضاعہ

قبائل ذیل قضاعہ کی نسل میں ہیں

49 کلب ابن وبرہ سے، بنوکلب

50 عدی ابن جباب سے، بنوعدی

51 علیم ابن جباب سے، بنوعلیم

52 بنوالعبید

53 بنورفیدہ　　54 بنومصار

55 بنوالقین

56 بنو سلیح

57 جرم ابن ربان سے، بنو جرم

59 راسب ابن جرم سے راسبی

60 بنو بہراء

61 بنو بلی

62 بنو مہرہ

63 بنو عذرہ

64 بنو سعد

65 بنو ھذیم عبد حبشی

66 خنہ ابن سعد سے خنہ

67 سلامان ابن سعد سے، سلامانی

68 بنو جہینہ

69 بنونہو

70 التابعہ

قبائل ذیل التابعہ کی نسل میں ہیں

71 ذوقلاع

72 ذونواس

73 ذواصبح

74 ذوجدن

75 ذوقایش

76 ذویزن

77 ذوجوش

78 بنوشحول

79 وائلہ ابن حمیر سے، بنووائل

80 سکاک بن وایلہ سے، بنوسکاسک

81 عوف بن حمیر سے، بنوعوف

82 فاران ابن عوف سے، بنو فاران

83 طے بن ادد کہلانی سے، طائی

84 غوث بن ادد سے، غوثی

قبائل ذیل طائی کی نسل میں ہیں:

85 بنو بنہان 86 بنو ثعل

87 حاتمی 88 بنو السنبس

89 بنو تمیم

90 ثور بن مالک بن مرتہ کہلانی سے، ثوری

91 کندہ بن ثور سے، کندی

92 سکون بن کندہ سے، سکونی

93 اوسلہ بن ربیعہ بن خیار بن ملک کہلانی سے اوسلی

94 ھمدانی

95 سبیعی

96 وداعہ

97 مذحج بن یہابر بن مالک کہلانی سے مذحج

98 مراد بن مذحج سے، مرادی

99 سعد بن مذحج سے۔ سعدی یا سعد الشعیر ہ

100 خالد بن مذحج سے، بنو خالد

101 عنس بن مذحج سے، عنسی

102 جعفی بن سعد سے، جعفی

103 جنب بن سعد سے جنبی

104 حکم بن سعد سے، حکمی

105 عایذ اللہ بن سعد سے، عایذی

106 جمل بن سعد سے، جملی

107 مران بن جعفی سے، مرانی

108 حریم بن جعفی سے، حریمی

109 زبید بن سعد سے، زبیدی

110 جدینہ بن خارجہ بن سعد سے، جدیلی

111 ابوخولان بن عمرو بن سعد سے، خولانی

112 انعم بن مراد بن مزحج سے انعمی

113 نخع بن جسر بن اولہ بن خالد بن مرحج سے، نخعی

114 کعب بن عمرو سے، بنوالنار

115 کعب بن عمرو سے، بنوالحماس

116 بنوقنان

117 الازد بن غوث کہلانی سے، ازدی

118 مازن بن ازد سے، مازنی یا غسانی

119 دوس بن ازد سے، دوسی

120 ھنو بن ازد سے، ھنوئی

121 جفنہ بن ازد مازنی سے، جفنی

122 آل عنقا

123 آل محرق

124 جبلی

125 سلامان ابن میدعن بن ازد سے، سلامانی

126 دوس بن عدثان بن زھران الازدی سے، دوس عدثی

127 جذیمہ بن مالک بن فہم بن غنم بن دوس سے، جذیمہ

128 جھاضم بن مالک سے، جہاضمی

129 سلیمہ بن مالک سے، سلیمہ

130 ھنابہ مالک سے، بنوھنابہ

131 معین بن مالک، معینی

132 یحمد بن معین سے، بنو یحمد

قبائل ذیل ازد کی نسل میں ہیں

133 الغطریف

134 بنو یشکر

135 بنوالجدرہ

136 لہب بن عامر سے، بنولہب

137 غامد بن عامر سے، غامدی

قبائل ذیل عبداللہ بن ازد کی نسل میں ہیں:

138 قساملی
139 بنوعتیک
140 بنوبارق
141 بنوعوف
142 شہران بن عوف سے، بنوشہران
143 طاحیہ بن سود سے، بنوطاحیہ
144 بنوھداد
145 خزاعی
146 قمیری
147 بنوحلیل
148 بنوالمصطلق
149 بنوالکعب
150 بنوالملیح
151 بنوعدی
152 بنوسعد
153 اسلمی
154 جشمی
155 خزرج بن سالبتہ العنقا سے، خزرجی

قبائل ذیل خزرج کی نسل میں ہیں:

156 جشمی
157 بنوتزید
158 سلمی
159 بنوبیاضہ
160 القرافل
161 بنوالجیلی

162 القرافل | 163 بنوالنجار
164 بنوساعدہ

قبائل ذیل اوس کی نسل میں ہیں

165 اشہلی | 166 بنوظفر
167 بنوالحارثہ | 168 اھل قبا
169 انجحبی | 170 جعادرہ
171 بنوواقف | 172 سلمی
173 بنوخطمہ

سوم

عرب المستعربہ یعنی پردیسی عرب

عرب المستعربہ کے تمام قبیلے ایک ہی اصل سے نکلے ہیں ان کا نسب ترح بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عیبر بن شالح بن ارفخشد بن سام تک پہنچتا ہے۔ترح کی اولاد جو عرب میں آباد ہوئی پانچ شاخوں میں منقسم تھی اور اسی وجہ سے عرب المستعربہ بھی پانچ شاخوں میں منقسم ہیں۔

اول،اسمعیلی یا بنی اسماعیل بن ابراہیم بن ترح (سفر تکوین باب 11 ورس 28، باب 16 ورس 15)

دوم:

ابراہیمی یا بنی قطورہ یعنی ابراہیم بن ترح کی اولاد قطورہ کے سلسلہ سے (سفر تکوین باب 11 ورس 28 و باب 25 ورس 1)

سوم

ادومی یا بنی عیسو یعنی اولاد ادوم بن اسحاق بن ابراہیم بن ترح (سفر تکوین باب 11 ورس 28 و باب 21 ورس 3 و باب 25 ورس 25)

چہارم

ناحوری یا بنی ناحور یعنی اولاد ناحور برادر ابراہیم بن ترح (سفر تکوین باب 11 ورس 28 و29)

پنجم

ھارانی یا بنی ھاران یعنی اولاد مواب و عمان بن لود بن ھاران بن ترح، یہ اخیر قبیلہ کبھی تو موابی کہا جاتا ہے اور کبھی عمانی مگر ہم نے اس کو ہارانی اس واسطے لکھا ہے کہ ھاران ان دونوں کے مورث کا نام ہے اور دونوں پر حاوی ہے (سفر تکوین باب 11 ورس 28 و 29 و باب 19 ورس 30 و 28)

اب ہم اس مقام پر ہر ایک مذکورہ بالا قبیلہ کا علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے اور اسی درمیان میں یہ بھی ثابت کریں گے کہ ''فاران'' جہاں سے ربانی ہدایت کے چمکنے کی توریت مقدس میں پشین گوئی کی گئی تھی وہ جگہ حجاز اور بالخصوص مکہ کے متصل کے پہاڑ ہیں اور اس

خطبہ اسی امر کا ثابت کرنا مقصود اصلی ہے۔

اول، اسمٰعیلی یا بنی اسمٰعیل

تمام مورخ مسلمان اور غیر مسلمان سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد عرب میں آباد ہوئی اور ملک عرب کا ایک بڑا حصہ حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کی نسل سے معمور ہو گیا ان میں جو کچھ اختلاف ہے وہ ان کے مقام سکونت میں ہے اس لیے ہم ان کے مقام سکونت کو اس مقام پر تحقیقات کریں گے۔

حضرت ھاجرہ اور حضرت اسماعیل کے نکالے جانے کے قصے کی تحقیق

توریت مقدس میں حضرت ھاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے نکالے جانے کے واقعہ کو اس طرح پر بیان کیا ہے ''وسارہ پسر ھاجر مصری را کہ بجہت ابراہیم زائیدہ شدہ بود دید کہ استہزا می نماید با ابراہیم گفت کہ ایں کنیزک و پسر او را اخراج نما زیرا کہ پسر ایں کنیزک با پسر من اسحٰق وارث نخواھد شد و ایں سخن در نظر ابراہیم بسیار ناخوش آمد بہ سبب پرسش و خدا با ابراہیم گفت بجہت ایں جوان و کنیزکت در نظرت ناخوش نیاید ہر چہ کہ سارہ بتو گفتہ باشد قولش را استماع نما زیرا کہ ذریعہ تو از اسحٰق خواندہ میشود و از پسر کنیزک نیز امتے خواھم گردانید زیرا کہ از نسل تست و ابراہیم در صبحدم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ بہاجر دادہ

بدوشش گذاشت وھم پسرش را (باو دادہ) او را روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیرشبع سرگردان شدو آبے کہ درمطہرہ بود تمام شد، و پسر رادرزیر بوتہ از بوتہا گذاشت وروانہ شدہ در برابرش بہ مسافت یک تیر پرتاب نشست وگفت کہ مرگ پسر رانہ بینم ودر برابرش نشستہ آواز خودرابلند کردہ گریست۔ وخدا آواز پسر راشنید وملک خدا ھاجر راازآسمان آواز دادہ باو گفت کہ اے ھاجرترا چہ واقع شدمترس زیرا کہ خدا آواز پسر رادرجائے بودنش شنیدہ است برخیز و پسر رابردارو بدستت اوررا بگیر زیرا کہ اورا امت عظیمے خواھم کرد۔ وخدا چشمان اورراکشادہ کردو چاہ آبے دید وروانہ شدہ مطہرہ راازآب پر کردو بہ پسر نوسانید وخدا باپسر بود کہ نشو ونما نمودو در بیابان ساکن شدہ تیرانداز گردید ودر بیابان پاران ساکن شدو مادرش از برایش از دیار مصرزنے گرفت'' (سفرتکوین باب 21 ورس 9 لغایت 21)

1 اس فارسی عبارت کا اردو ترجمہ یہ ہے

''اورسارہ نے دیکھا کہ ھاجرہ مصری کا بیٹا جواس کے (خاوند) ابرھام (ابراہیم) سے ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابرھام سے کہا کہ اس لونڈی کواوراس کے بیٹے کو نکال دے۔''

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس فارسی عبارت میں لفظ مطہرہ کا انگریزی میں بوتل ترجمہ کیا گیا ہے وہ صحیح ہے قدیم عربی ترجمہ میں ''سقاء''

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

کیوں کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق (اسحٰق) کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابرھام کواس کے بیٹے کے باعث یہ بات نہایت بری معلوم ہوئی اورخدا نے ابرھام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اوراپنی لونڈی کے باعث برانہ لگے۔ جو کچھ سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس

کی بات مان کیوں کہ اضحق سے تیری نسل کا نام چلے گا اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے تب ابرھام نے صبح سویرے اٹھ کر روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ لیا اور اسے ہاجرہ کو دیا۔ بلکہ اسے اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیر شبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی اور جب مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی اور خدا نے اس کے لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ھاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا کہ اے ھاجرہ! تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیوں کہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے، اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیوں کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے ایک پانی کا چشمہ دیکھا اور جا کر مشکیزہ کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

ترجمہ کیا گیا ہے اور فارسی ترجمہ میں ''مطہرہ'' اردو میں اس کا ترجمہ ''مشکیزہ'' یا'' چھاگل'' صحیح ترجمہ ہے جو مشرقی ملکوں میں مروج ہے اور جس میں چند روز کے پینے کے لائق پانی سما سکتا ہے۔

اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی متبرک کتابوں میں بھی چند روایتیں آئی ہیں اور جو کہ صحیح بخاری مسلمانوں میں سب سے زیادہ معتبر کتاب ہے اس میں دو روایتیں اس واقعہ کی

نسبت آئی ہیں اس لیے ان دونوں کو اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے ایک میں ایک مضمون ہے اور ایک میں نہیں۔ ایک میں کچھ بیان ہوا ہے اور ایک میں کچھ اس لیے ہم دونوں روایتوں کو دو مقابل کے کالموں میں اس طرح پر لکھیں گے کہ جو اختلاف ان دونوں میں ہے وہ بمجرد دیکھنے کے معلوم ہو جاوے۔

یہ بات کہنی کہ یہ حدیثیں بخاری میں ہیں اور ضرور ہے کہ ان کو صحیح مانا جاوے صرف ایک فرضی بات ہے ورنہ جو اصول کہ حدیث کے ثبوت کے لیے قرار پائے ہیں ان کے مطابق اس روایت کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جانا ثابت نہیں ہے یہ دونوں روایتیں ابن عباس نے بیان کی ہیں اور یہ نہیں بیان کیا کہ انہوں نے کس سے سنیں اور اس لیے ہر گز ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں یہودیوں میں مشہور تھیں انہیں کو ابن عباس نے بیان کیا ہے پس وہ روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ بخاری میں اس طرح پر روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں بخاری میں اس طرح پر روایتیں مندرج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت وہ پیغمبر کی حدیث ہے بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بخاری نے جس شخص سے اس کو سنا اس نے اسی طرح بیان کیا تھا۔

پہلی روایت

1عـن ابـن عبـاس قـال لما كان بين ابراهيم و بين اهله ما كان خرح باسمعيل وام اسمعيل

2 ومعهم شنة فيها ماء.

3 فجعلت ام اسمعيل تشرب من الشنة فيدر لبنها على صبيها

4 حتى قدم مكة فوضعها تحت دوحة

5..........

6..........

7..........

8 ثم رجع ابراهيم الى اهله فاتبعته ام اسمعيل

9 حتى لما بلغوا كداء

10 نادته من وراثه يا ابراهيم الى من تتركنا

11................

12قال الى الله

13 قالت رضيت بالله

14 قال فرجعت

15 ....

16 فـجـعـلت تشرب من الشنة و يدر لبنها على صبيها حتى لما فنى الماء

17 ....

18 قالت لو ذهبت فنظرت لعلى احس احدا قال فذهبت

19 فصعدت الصفا فنظرت ونظرت هل تحس احدا

20 فلما بلفت الوادی سعت اتت المروة و فعلت ذلک اشراطاً

21 ....

22 ثم قالت لوذهبت فنطرت ما فعل تعنی الصبی فذهبت فنظرت فازا هو علی حاله کانه بشنغ للموت فلم تقرها نفسها فقالت لوذهمت فنظرت لعلی احس احد افذهبت فضحبت الصفا فنظرت و نظرت فلم تحس احدا

23 حتی اتممت سبعاً

24 ....

25 ثم قالت لوذهبت فنظرت ما فعل فازا هی بصوت

26.........

27 فقالت اغث ان کان عندک خیر

28 فاذا هو جبریل

29 قال فقال بعقبه هکذا وغمر عقبه علی الارض قال فانبثق الماء فدهشت ام اسمعیل فجعلت تحفر

30.........

31 قال فقال ابو القاسم صلی الله علیه وسلم لو ترکته کان الماء ظاهرا.

32 قال فجعلت تشرب من الماء و یدر لبنها علی صبیها الی اخو الحدیث (بخاری کتاب الانبیاء)

دوسری روایت

1 قال ابن عباس اول ما اتخذ النساء المنطق من قبل ام اسمعیل اتخذت منطقا لتعفی اثرها علی سارة ثم جاء بها ابراهیم و بابنها اسمعیل.

2 ....

3 وهی ترضعه

4 حتی و ضعهما عند البیت عند دوحة

5 فوق زمزم فی اعلی المسجد و لمیس بمکة یومئذ احد و لیس بها ماء فوضعهماهناک

6 و وضع عند هما جراباً فیه تمر

7 و سقاء فیه ماء

8 ثم قفا ابراهیم منطقا فتبعته ام اسمعیل

9 ....

10 فقالت یا ابراهیم ابن تذهب و تترکنا

11 فی هذا الوادی الذی لیس فیه انیس و لاشی فقالت له ذلک مرارا وجعل لا یلتفت الیها فقالت له الله امرک بهذا

12 قال نعم

13 قالت اذن لا يضيعنا

14 ثم رجعت

15 فا نطلق ابراهيم حتی اذا کان عند الشنیعة حیث لا یرونه استقبل بوجهه البیت ثم دعا بهولاء الدعوات ورفع یدیه فقال رب انی اسکنت من ذریتی بو اد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم حتی بلغ یشکرون.

16 وجعلت ام اسمعیل ترضع اسمعیل و تشرب من ذلک الماء حتی اذا نفدما فی السقا.

17 عطشت و عطش ابنها و جعلت تنظر الیه یتلوی او قال یتلیط فانطلقت کراهیة ان تنظر الیه

18.........

19 فوجدت الصفا اقرب جبل فی الارض یلبها فقامت علیه ثم استقبلت الواری تنظر هل تری احدا فلم تراحدا فهبطت من الصفا.

20 حتی اذا بلغت الوادی رفعت طرف درعها ثم سعت سعی الانسان المجهود حتی جاوزت الوادی ثم اتت المروة فقامت علیها.

21 فنظرت هل تری احدا فلم ترا حداً

22..........

23 فضعلت ذلک سبع مرات

24 قال ابن عباس قال النبی صلی الله علیه وسلم فذالک سعی الناس بینهما

25 فلما اشرفت على المروة سمعت صوتا

26 فقالت صه تريد نفسها ثم تسمعت ايضا فقالت قد اسمعت.

27 ان كان عندك غواث

28 فاذا هي بالملک عند موضع زمزم

29 فبث بعقبه اوقال بجناحه حتى ظهر الماء فجعلت تحوضه و تقول بيدها هكذا

30 وجعلت تغرف من الماء فی سقائها و هو يفور بعد ما تغرف

31 قال ابن عباس قال النبی صلی الله عليه وسلم يرحم الله ام اسمعيل لو تركت زمزم او قال لوم تغرف من الماء لكانت زمزم عيناً معيناً.

32 قال فشربت و ارضعت الى اخر الحديث (بخاری كتاب الانبياء)

مذکورہ بالا روایتوں سے ظاہر ہے کہ وہ مستند نہیں ہیں یعنی حضرت ابن عباس نے اس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مستند نہیں کیا پس معلوم نہیں کہ ابن عباس نے وہ روایت کس سے سنی اور کس بنیاد پر انہوں نے اس کو بیان کیا۔ بخاری کا ادب صرف اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ ابن عباس نے سعید ابن جبیر سے یہ روایت بیان کی اور سعید ابن جبیر نے اور لوگوں سے جن سے بخاری تک یہ روایت پہنچی۔ مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی۔ کہ ابن عباس نے درحقیقت اس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔

ان روایتوں میں دو فقرے (24,31) ایسے ہیں جن سے کہ بادی النظر میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابن عباس نے یہ روایتیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوں گی۔ لیکن

یہ بات نہیں ہے کیوں کہ ان دونوں فقروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں فقرے ان روایتوں کے نہیں ہیں اور کسی مقام کے ہیں کیوں کہ خود راوی نے ان دونوں فقروں کو سلسلہ بیان روایت سے علیحدہ کر کے اور بالتخصیص انہیں دونوں فقروں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے اور یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ راوی نے باقی مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں سمجھا ہے۔

ایک اور امر جو ان روایتوں کی صحت پر شبہ ڈالتا ہے یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت ابراہیم کی یہ دعا

" ربی انی لسکنت من ذریتی بو اد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم"

بیان ہوئی ہے اور راوی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت ابراہیم نے اپنی بی بی ھاجرہ اور اپنے بیٹے اسمعیل کو نکالا تھا اسی زمانہ میں وہ خود مکہ میں ان کے بسانے کو آئے تھے حالاں کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ نہ اس زمانہ میں حضرت ابراہیم ان کو یہاں بسانے کے لیے آئے اور نہ اس زمانہ میں بیت اللہ الحرام بنایا گیا تھا۔ راوی نے دو مختلف زمانوں کے واقعہ کو ملا دیا ہے ایک اس زمانہ کے واقعہ کو جب کہ حضرت ابراہیم نے حضرت ھاجرہ اور حضرت اسمعیل کو بیابان بیر شبع میں بے سہارے چھوڑ دیا تھا اور دوسرے اس زمانہ کے واقعہ کو جب کہ حضرت ھاجرہ اور حضرت اسمعیل نے زمزم کے پاس سکونت اختیار کر لی تھی اور دوبارہ حضرت ابراہیم ان کے پاس آئے تھے اور بیت اللہ الحرام بنایا تھا اور جاتے وقت یہ دعا مانگی تھی کہ

" رب انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم"

قرآن مجید میں حضرت اسمعیل کی عمر کا جب کہ ان کو حضرت ابراہیم نے نکال دیا کچھ ذکر نہیں بخاری کی ان روایتوں سے جن کا مشتبہ ہونا بخوبی ثابت ہو گیا ہے اگر حضرت اسمعیل کی عمر کا کچھ اندازہ ظاہر بھی ہوتا ہو تو بھی مذہب اسلام پر کوئی الزام عاید نہیں ہوسکتا کیوں کہ یہ روایتیں اگر مشتبہ ثابت نہ ہوتیں تو بھی بہ منزلہ وحی کے متصور نہیں ہوسکتیں۔

اصل یہ ہے کہ خود توریت مقدس میں حضرت اسمعیل کی عمر کی نسبت جب کہ وہ نکالے گئے نہایت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ورسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت بچے تھے اور بعض سے پایا جاتا ہے کہ وہ سولہ سترہ برس کے تھے اس اختلاف کی بنا پر عرب کے یہودیوں میں ان کا بچہ ہونا مشہور تھا اسی یہودی روایت کو ابن عباس نے بیان کیا ہوگا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کو منسوب نہیں کیا۔

توریت مقدس میں جو حضرت اسمعیل کی عمر کے باب میں اختلاف ہے وہ اس طرح پایا جاتا ہے سفر تکوین باب 21 ورس 14 کا فارسی ترجمہ جو ہم نے اوپر لکھا ہے وہ یہ ہے

" وابراهیم در صبح دم سحر خیزی نموده نان و مطهره آب را گرفته و به هاجره داده به دو شش گذاشت و هم پسرش را (باو داده) اور را روانه نمود پس راهی شده در بیابان بیر شبع سر گردان شد"

اس ترجمہ میں لفظ "باو دادہ" دوهلالی خطوط میں لکھا ہے جس کا یہ اشارہ ہے کہ یہ لفظ اصل عبری توریت میں نہیں ہے درحقیقت یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے صحیح ترجمہ عبری لفظوں کا یہ ہے کہ "پانی کے مشکیزے اور اس کے بیٹے کو ھاجرہ کے کندھے پر رکھ کر اس کو روانہ کر دیا" اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان کی عمر بہت چھوٹی تھی اور اسی وجہ سے لوگوں نے دودھ پیتا ہوا خیال کیا تھا حالاں کہ اسی باب کی چودھویں آیت اس کے برخلاف ہے۔

عیسائی عالموں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس چودھویں آیت سے بلا شبہ

حضرت اسمٰعیل کی اس زمانہ میں بہت چھوٹی عمر ہونا پایا جاتا ہے جو توریت کی بہت سی آیتوں کے برخلاف ہے اس لیے انہوں نے اس کی نسبت بہت کچھ بحث کی ہے۔

مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ''اگر ہم حضرت اسمٰعیل کی عمر پر غور کریں تو رنج آگین شوق اور بھی دوبالا ہوتا ہے یہ لڑکا اب کچھ بچہ نہیں تھا بلکہ کم از کم پندرھویں برس میں تھا مگر تکلیف کی وجہ سے بچہ کی طرح مضغہ سا ہورہا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں اس کی بچاری ماں جب تک کہ اس کو طاقت رہی ہوگی۔ اس کو ہاتھوں میں اٹھائے رہی ہوگی اور جب وہ تھک گئی ہوگی تو اس کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ہوگا (مگر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ تاویل کیسی لغو اور بیہودہ ہے) اس کے بعد مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک عمر حضرت اسمٰعیل کی بآسانی معلوم ہوسکتی ہے تیرہ برس کی عمر میں ان کا ختنہ ہوا تھا حضرت اسحاق اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں اور حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے کے بیابان میں بھیجے جانے سے پیشتر ان کا یعنی حضرت اسحاق کا دودھ چھوٹ چکا تھا''
(فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ 176)

توریت اور انجیل کے اکثر محققین اور علی الخصوص ''جیروم لی کلوک'' اور ''روزن ملر'' خیال کرتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی۔ اس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت ہاجرہ نے ان کو اپنے کندھے پر رکھ لیا ہو۔

جیسی بیہودہ تاویل مسٹر فارسٹر نے کی ہے اس سے زیادہ عجیب تاویل ''بشپ ھارسلی'' نے کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''عبرانی توریت کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کو اس کی ماں نے مع روٹی اور پانی کے اپنے کندھے پر رکھ لیا یہی معنے یونانی ترجمہ میں بھی سمجھے گئے ہیں اور یہ جملہ بھی کہ بچہ کو جھاڑی میں ڈال دیا جو پندرھویں آیت میں ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے حضرت اسحاقؑ کی ولادت کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر چودہ برس سے کم نہ تھی اس

واسطے ان کی ولادت کے وقت کم سے کم وہ پندرہ سال کے ہوں گے۔مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حیات انسانی گواس زمانہ میں بہت مختصر رہ گئی ہے تاہم زمانہ حال کی مدت عمر سے زیادہ دراز ہوتی ہوگی اور جو کہ طفولیت اور ہر ایک درمیانی زمانہ عمر کی حالت تمام عمر کے مجموعہ کے ساتھ جب کہ آدمی ڈیڑھ سو برس یا زیادہ عمر کے مجموعہ کے ساتھ جب کہ آدمی ڈیڑھ سو برس یا زیادہ عمر کے ہوتے تھے ہمیشہ کوئی معین مناسبت رکھتی ہوگی اس لیے قرین قیاس ہے کہ اس زمانہ میں چودہ یا سولہ برس کی عمر تک ضعیف اور ناتواں رہتے ہوں گے اور میرے نزدیک اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹوں کے زمانہ میں یہی صورت ہوگی۔ جوسفس کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کیوں کہ اس کا صریح بیان ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ اس وقت تنہا نہیں جا سکتے تھے مگر یہ دلیل کیسی بیہودہ ہے کیوں کہ تین ہی پشتوں کے بعد یہ سب باتیں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اس لیے کہ حضرت یوسفؑ حضرت ابراہیمؑ کے پوتے کے بیٹے سترہ برس کی عمر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ باپ کے مویشی چرایا کرتے تھے اور تیس برس کی عمر میں عزیز مصر کے خواب کی تعبیر بیان کی تھی اور اس کے وزیر ہو گئے تھے۔''

اس مضمون پر ایک اور مصنف یہ لکھتا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ گو بچہ کہلاتے تھے مگر سولہ سترہ برس کے ہوں گے اور اس لیے اپنی والدہ کی اعانت اور مدد کرنے کے قابل ہوں گے جس طرح کہ انہوں نے بعد کو کی۔

ایک اور مصنف کہتا ہے کہ اس جملہ کو ''کندھے پر رکھ دیا'' خطوط ھلالی کے اندر رکھ دیا جاتا جیسا کہ بشپ کڈیر اور اسٹیک ھوس اور پائل نے کیا ہے (جس سے اشارہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ توریت میں نہیں ہیں) تو یہ آیت مشتبہ نہ ہوتی۔

حضرت ھاجرہ کا اس مقام پر آباد ہونا جہاں اب شہر مکہ آباد ہے

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بی بی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بی بی ھاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیل کو جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے گھر سے نکال دیا اور وہ دونوں بیابان بیر شبع میں چلے گئے۔ چلتے چلتے اور منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں اب مکہ ہے۔ پیاس کی شدت سے حضرت اسمٰعیل کی حالت خراب ہوگئی اور مرنے کی نوبت پہنچ گئی حضرت ھاجرہ ان کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر پانی کی تلاش کو ادھر ادھر دوڑتی پھریں اور بہ مشکل پانی ملا اور جہاں پانی ملا تھا اسی جگہ انہوں نے سکونت اختیار کر لی کیوں کہ عرب میں اسی جگہ لوگ سکونت اختیار کرتے تھے جہاں پانی دستیاب ہوتا تھا۔

قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اس میں یہ آیت ہے

" ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک الحرم"

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل اس مقام کے پاس سکونت پذیر ہوئے تھے جہاں کہ بالفعل خانہ کعبہ واقع ہے اور جہاں کہ اب شہر مکہ آباد ہے عبرانی لفظ مدبر اور عربی لفظ وادی اور الفاظ

" غیر ذی زرع"

جو قرآن مجید میں آئے ہیں ایک ہی معنے رکھتے ہیں لفظ فاران اور لفظ ایل فاران جو سفر تکوین باب 21 ورس 14 اور باب 14 ورس 2 میں آیا ہے ان دونوں سے ایک ہی مقام

مراد ہے اور لفظ ایل فاران سے بالتخصیص وہ پہاڑ مراد ہیں جو کعبہ کے گرد واقع ہیں اور صفا اور مروہ اور ابو قبیس اور حرا وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں عبرانی زبان میں ''ایل'' کے معنی خدا کے ہیں فاران کے پہلے ''ایل'' کا لفظ لگانے سے انسان کا دل اس کی وجہ کی تفتیش پر متوجہ ہوتا ہے اور اس پر قرار پاتا ہے کہ اس جگہ ضرور کوئی ربانی کرشمہ ظاہر ہوا ہے یا ظاہر ہونے والا ہے خانہ کعبہ کے گرد جو پہاڑ ہیں اور جہاں کہ مسلمان حج ادا کرتے ہیں علی العموم بنام'' الال'' مشہور ہیں بعض صرف ونحو کے عالموں نے ''الال'' کو واحد لکھا ہے اور بعضوں کے نزدیک جمع کا صیغہ ہے اس لفظ کے صحیح اشتقاق کی نسبت بہت بحث ہے بعض کچھ کہتے ہیں اور بعض کچھ مگر کوئی بات اطمینان کے قابل نہیں ہے ہماری رائے میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اسی لفظ''ایل'' سے مشتق ہوا ہے ابتدا میں پہاڑ کے نام کے ساتھ اس کا استعمال تھا بمعنی کوہ خدا پھر جو کہ ایل فاران خاص حجاز میں تھا عربوں نے اس نواح کے تمام پہاڑوں کے لیے'' ایل'' کی جمع ''الال'' بنالی اور مکہ کے پہاڑوں پر اس کا اطلاق کرنے لگے۔

اگرچہ واقعات مندرجہ توریت مقدس اور قرآن مجید جن کا ہم نے اوپر بیان کیا آپس میں مطابقت رکھتے ہیں تاہم تین بڑے بڑے سوالات ہیں جو حضرت اسمعیل کی سکونت سے علاقہ رکھتے ہیں

اول یہ کہ: حضرت ابراہیم نے حضرت اسمعیل اور ان کی والدہ کو گھر سے نکال دینے کے بعد کہاں چھوڑا تھا۔

دوم یہ کہ: حضرت اسمعیل اور حضرت ھاجرہ نے بیابان میں آوارگی کے بعد کس جگہ سکونت اختیار کی۔

سوم یہ کہ: آیا وہ اسی جگہ متوطن ہوئیں جہاں کہ پہلے پہل ٹھہری تھیں یا کسی اور جگہ۔

قرآن مجید میں ان امور کی بابت کچھ تذکرہ نہیں ہے وہ حدیثیں غیر مسند ہیں اور اس

وجہ سے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا اور جو کہ مقامی روایتوں میں ان واقعات کو جو مختلف موقعوں پر واقع ہوئے تھے خلط ملط کر دیا ہے اس لیے ان پر اعتبار نہیں ہوسکتا پس ہمارے نزدیک اول سوال کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے اس سے زیادہ بحث کرنی فضول ہے۔توریت میں لکھا ہے کہ ''اس نے یعنی ابراہیم نے اس کو یعنی ھاجرہ کو روانہ کر دیا اور وہ چلی گئی اور بیان بیر شبع میں پھرتی رہی'' (سفر تکوین باب 21 ورس 14)

دو باقی ماندہ سوالوں کے باب میں توریت مقدس کی عبارت اس طرح پر ہے کہ ایک جگہ لکھا ہے ''اور وہ یعنی اسمعیل بڑا ہوا اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا اور ایک تیر انداز ہو گیا'' (سفر تکوین باب 21 ورس 21) توریت کا کوئی مفسر نہیں بیان کرتا اور نہ ملکی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت اسمعیل پہلے کسی ملک میں آباد ہوئے ہوں اور پھر کسی اور ملک میں چلے گئے ہوں اس لیے یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہے کہ حضرت اسمعیل اور ان کی والدہ جس حصہ ملک میں آباد ہوئی تھیں اسی میں آباد رہیں پس توریت میں جہاں صرف بیابان میں آباد ہونے کا ذکر ہے اس سے بیابان فاران ہی مراد ہے جس کی تصریح دوسرے ورس میں کی گئی ہے پس ان سوالوں کا حل کرنا اس بات کی تحقیق پر منحصر ہے کہ بیابان فاران جہاں کہ حضرت اسمعیل کا سکونت پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے کون سی جگہ ہے۔

فاران کی تحقیق

مشرقی جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ تین مقام بنام فاران موسوم ہیں اول وہ مقام اور اس کے گرد و نواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے کیوں کہ اس زمانہ میں وہ بیابان تھا

دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو مشرقی حصہ یا عرب الحجر میں واقع ہے سوم ایک ضلع جو سمرقند کی نواح میں واقع ہے۔

مشرقی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ فاران کی نسبت لکھا ہے اس کو ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

فاران المذکور فی التوراة فی قوله جاء الله من سینا واشرف من ساعیر واستعلن من فاران فساعیر جبال فلسطین وھوا نزاله الانجیل علی عیسیٰ و فاران مکة او جبالها علی ما تشهد به التوراة واستعلاثه منها انزاله القرآن علی رسوله محمد صلعم و فاران قریة من نواحی سغد سن اعمال سمرقند و قیل فاران والطور کورتان من کور مصر قبیله (مراسد الاطلاع علی اسماء الا مکنة والباقع، و معجم البلدان یا قوت حموی)

والطور جبل بارض مصر عند کوره تسمل علی عدة قوی قبلیها و بالقرب منها جبل فاران مراصد الاطلاع و معجم البلدان

فاران ثلثة مواضع فاران اسم جبال مکة و قیل لها اسم جبال الحجاز ولها ذکر فی التوراة یجی فی اعلام نبوة النبی صلعم قال الامیر ابو نصر ابن ما کولا ابو بکر نصر بن القاسم بن قضاعة القضاعی الفارانی الا سکندری سمعت ان ذلک نسبة الی جبال فاران وھی الحجاز و فاران قال ابو عبدالله القضاعی فی کتاب خصط مصر فاران و الطور کور تان من کور مصر القبلیة و فاران من قری سمرقند مشترک یا قوت الحموی.

الطور سبعة مواضع والطور ایضا علم الجبل بعینه عند کورة تشتمل

علی عدة قوی بارض مصر من جهته القبلية بينها و بين جبل الفاران مشترک.

وطريق آخر علی ساحل البحر القلزمی...... من مصر الی عبن شمس.... ثم الی بطن مغيره.... ثم الیٰ جون فاران..... و بالقرب من فاران موضع صعب اذا سلک والريح ايضا مغربا والديور مشرقا و يسمی جبلان من جبلان الی جبل الطور الی ايله الخ نزهة المشتاق لشريف الادريسی.

مجھے معلوم نہیں ہے کہ کسی غیر ملک اور مذہب کے مورخ نے فاران اور حجاز کو جہاں اب مکہ معظّمہ واقع ہے ایک ہی قرار دیا ہو لیکن عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے 1851ء میں بمقام لگڈ نی بٹاورم چھپوایا ہے اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے:

" او سکن فی يرية فران (الحجاز) و اخذت له امه امراة من ارض مصر " (عربی ترجمه توراة سامری)

عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز ایک ہی جگہ سے مراد ہے تسلیم نہیں کرتے اس تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کی تسلیم بھی لازم آتی ہے۔ کہ جو پیشین گوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے بلا شبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے۔

بہر حال ان مصنفوں کا فاران کی نسبت مختلف طرح کا بیان ہے۔

اول:

یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ فاران وہ وسیع قطعہ زمین ہے جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے اور فاران کے نام سے مشہور ہے اس کی حدود اربع عموماً یہ بتلاتے ہیں شمال میں کنعان، جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر، اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں مثلاً شور، بیر شبع، ایشام سین، زین، عیدام وغیرہ۔

دوم:

بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں موسوم بہ بیر شبع کھودا تھا اور فاران ایک ہی مقام ہے۔

سوم:

بعضوں کی یہ رائے ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ[1] پر واقع ہے بے شمار

1 یہ ایک ایسا نام ہے جس کا اطلاق توریت میں اس سارے صحرا پر معلوم ہوتا ہے جو کہ یہودیہ کی سرحد سے لے کر حوالی سینا تک پھیلتا ہے جو کہ ہم فاران کو حوالی سینا کے جنواب

میں قطع میں (سفر اعداد باب 10 ورس 12) اور شمالی جانب قادیش سے (سفر اعداد باب 13 ورس 26) ملحق اور اور جگہ بھی پاتے ہیں اس لیے اس بات کا فرض کر لینا کہ فاران اس تمام قطعہ کا نام تھا جو ان حدود سے محدود ہے آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ مقابل کے دو قطعوں کا ایک ہی نام قرار دیں اس لحاظ سے وہ دقت جو اس نام کی صحیح تطبیق میں عارض ہوتی تھی ظاہر ہوگئی ہے جب کہ یہ دیکھا جائے کہ سب جداگانہ مقامات جو مختلف مصنفوں نے اس کے واسطے قرار دیے ہیں اس قدرے وسیع قطع میں مجتمع ہوتے ہیں جو کہ ہمارے نزدیک اس کا مصداق ہے یہ نام وادی فاران میں بھی بخوبی موجود ہے جو سینائے اسفل کی ایک وادی ہے اور جس میں ہو کر بنی اسرائیل ھنگام کوچ یہ مجانب ممالک اعلیٰ گزرے تھے (کیتوز سائیکلو پیڈیا آف بائیبل)

ایک بیابان فلسطین کے جنوب کی جانب جہاں کہ حضرت اسمٰعیل سکونت پذیر ہوئے تھے (سفر تکوین باب 21 ورس 21) جس کے مغرب میں ہلال اور یلق شمال میں یہودیہ کے جنوبی پہاڑ اور مشرق میں قادیش کا بیابان اور اس کے پہاڑ یہ اہل پاران یا بیابان پاران ہے (سفر تکوین باب 14 ورس 6) نیز وہ ملک جس کے بعض اقطاع میں موسم برشکال میں گھاس اور سبزہ بہت ہوتا ہے جہاں کہ حضرت ابراہیم نے بود و باش اختیار کی تھی قادیش اور شور کے مابین اور جہاں کہ بنی اسرائیل کا قادیش کو جاتے وقت گذر ہوا تھا۔ (سفر اعداد باب 12 ورس 16 و باب 13 ورس 28) بیابان و فاران سے مراد ان پہاڑوں سے بھی جنوب کی طرف واقع ہیں یا بیابان قادیش یا فاران بھی میدان ملحق کی وجہ سے کہلاتا تھا جس طرح وہ بھی قادیش کے نام سے بوجہ چشمہ قادیش کے مشہور تھا (پیپلز بائیبل ڈکشنری) سید احمد

عمارتوں اور پرانی قبروں اور میناروں وغیرہ کے آثار وہاں اب بھی پائے جاتے ہیں

مسٹر روپر کا بیان ہے کہ میں نے ایک کلیسا کے نشانات جو پانچویں صدی عیسوی میں بنایا گیا ہوگا۔ دریافت کیے اوران کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں اس مقام پر عیسائی آباد تھے اور ایک بطریق بھی وہاں رہتا تھا ان بیانات کی تصدیق کرنے میں اوراس بات کے خیال میں کہ یہ شہراس شہر سے مطابقت رکھتا ہے جس کا مشرقی مورخوں نے مشرقی کنارہ مصر پر موجود ہونا بیان کیا ہے ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے۔

مگر یہ سب بیانات درست نہیں ہیں جن کی غلطی ہم ثابت کریں گے اگرچہ پہلے دو بیانات کی تائید میں کسی قسم کی شہادت موجود نہیں ہے اوراس لیے ان کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ وہ ثابت نہیں ہیں کافی تھا لیکن اس غرض سے کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہ رہے ہم ان کی تردید کرتے ہیں۔

اول بیان کی تردید کے لیے یعنی اس بیان کی تردید کے لیے جس میں فاران کو ایک وسیع بیابان قرار دیا ہے اوراس میں اور چھوٹے چھوٹے بیابان مثل شور اور سینا وغیرہ کے شامل کیے ہیں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ اس کی تردید میں توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کردیں کیوں کہ ان سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے اور گردونواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) ''وبنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند وابر در بیابان پاران ساکن شد''

1

1 یعنی بنی اسرائیل بیابان سینا سے کوچ کر کے نکلے اور وہ ابر دشت فاران میں ٹھہر گیا

(محمد اسماعیل

(سفر اعداد (گنتی) باب 10 ورس 12) اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں مقام کیا قرار واقعی ثابت ہوتا ہے

کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جداگانہ تھے۔

(ب) ''پس درسال چہاردھم کدرلاعومر وملوکے بہمر اھش بودند آمدہ رفائیاں را کہ درعشتر وث قرنیم وزوزیاں رادرھام وایمیاں رادرشاوہ قریاشایم شکست دادندونیز حوریاں را درکوہ خودشاں سیعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحراست'' (سفرتکوین (پیدائش) باب 14 ورس 5,6) (یعنی چودھویں برس کے بعد کدرلاعومر اوراس کے ساتھ کے بادشاہ آئے اور رفائم کوعستارات قرنیم میں اورزوزیون کوھام میں اورایمیم کوسوی قریتم میں اور حوریوں کوان کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے ایل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے محمد اسماعیل)

پس جب تک کہ بیابان فاران کوایک علیحدہ مقام نہ تسلیم کیا جاوے اس ورس کی عبارت مہمل ہوجاتی ہے۔

(ج) ''وخداوند موسیٰ راخطاب کردہ گفت کہ مردمانے بہ سفراست تا آں کہ زمین کنعن راکہ بنی اسرائیل میدھم تجسس نمایند ازھر سبط آبائے ایشاں یک نفرے کہ درمیاں ایشان سرور باشد بفرستید پس موسیٰ ایشاں رابہ فرمان خداوند ازبیابا پاران فرستادوآں مردمان ھمگی روسائے بنی اسرائیل بودند'' (سفر اعداد (گنتی) باب 13 ورس 1,2,3) (یعنی اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ آدمیوں کو بھیج کہ وہ ملک کنعان کا جو میں بنی اسرائیل کودیتا ہوں حال دریافت کریں۔ ان کے باپ دادا کے ہر قبیلے سے ایک آدمی بھیجنا جوان کے ہاں کا رئیس ہو،محمد اسماعیل)

(5) ''وروانہ شدہ پیش موسیٰ وھارون وتمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابان پاران بہ قادیش ورسیدندو بہ ایشان وھم بہ تمامی جماعت خبر رسائدوھم بہ ایشاں میوہ زمین رانمودند'' (سفر اعداد(گنتی) باب 13 ورس 26) (یعنی وہ چلے اورموسیٰ اورھارون اوربنی اسرائیل کی

ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اوران کواور ساری جماعت کو سب کیفیت سنائی اوراس ملک کا پھل ان کودکھایا محمد اسماعیل)

(ہ) ''کہ گفت خداوند از سینی برآمد واز سیعیر برایشاں تجلی کرد واز کوہ پاران درخشندہ شد و باہزار ہزاراں مقدساں ورود نمود واز دست راستش بایشاں شریعتے آتشیں رسید'' (سفر توریہ مثنی (استثنای) باب 33 ورس 2) (یعنی اس نے کہا خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر ظاہر ہوااور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوااور ہزاروں ہزار پاک بازوں کے ساتھ آیا۔اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشین (نورانی) شریعت تھی محمد اسماعیل)

(و) ''خداوند از تیمان وقدوس از کوہ پاران آمد سلاہ جلالش آسمان ھا مستور کرد و زمین از حمدش پر شد'' (کتاب حقوق باب 3 ورس 3) (یعنی خدا تیمان سے آیا اور قدوس کوہ فاران سے،سلاہ،اس کے جلال نے آسمانوں کوڈھانک لیااور زمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی محمد اسمعیل)

(ز) ''واز مدیان برخاستند و بہ پاران آمدند و مردمان چندے از پاران بہ ہمراہ خودشاں گرفتند و بہ مصر بہ خدمت فرعون بادشاہ مصر آمدند'' (کتاب اول ملوک (سلاطین) باب 11 ورس 18) (یعنی انہوں نے مدیان کوچھوڑ دیااور فاران میں چلے آئے اور یہاں سے کچھ آدمیوں کواپنے ہمراہ لے کرفرعون بادشاہ مصر کے پاس گئے محمد اسماعیل)

اور دوسرے بیان کی یعنی اس کی کہ قادیش اور فاران ایک ہی مقام ہے توریت مقدس کے مندرجہ ذیل ورسوں سے تکذیب ہوتی ہے

(الف) ''و نیز حوریاں رادر کوہ خودشاں سیعیر تا ایل پاراں کہ درنزدیک صحرا است و درگشتہ بہ عین مشپاط کہ قادیش است آمدند و تمامی مرز و بوم عمالیقاں وھم اموریانی کہ در حصصون تامار ساکن بودند شکست دادند'' (سفر تکوین (پیدائش) باب 14 ورس 6,7) (یعنی

اورحویوں اوران کے کوہ شعیر میں مارتے مارتے اہل فاران تک جو بیابان سے لگا ہوا ہے آئے پھر وہ لوٹ کر عین مصفات یعنی فادس پہنچے اورعمالیقیوں کے تمام ملک کواور اموریوں کو جو حصصون نمر میں رہتے ہیں شکست دی محمد اسماعیل)

یہ ظاہر ہے کہ جب تک قادیش اور فاران دوجداگانہ اورمختلف بیابان نہ قرار دیے جاویں۔ورس مذکورہ بالا کے کوئی معنی نہیں ہوسکتے۔

(ب) ''وروانہ شدہ پیش موسیٰ وھارون وتمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابان پاران بہ قادیش ورسیدندو بہ ایشان وھم''

بتمامی جماعت خبر رساندند وہم بہ ایشاں میوہ زمیں رانمودند (سفر اعداد (گنتی) باب 13 ورس26) (یعنی اوروہ چلے اورموسیٰ اورھارون اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے پاس دشت فاران کے قادس میں آئے اوران کواور ساری جماعت کوسب کیفیت سنائی اوراس ملک کا پھل ان کودکھایا محمد اسماعیل)

اس ورس میں جن لفظوں کے نیچے ہم نے لکیر کردی ہے ان کے ترجمہ میں ہم کوشبہ ہے اس لیے ہم اس کا ایک نہایت قدیم ترجمہ عربی کا جو 1671 عیسوی میں مع لیٹن ترجمہ کے چھپا ہے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وقدموا الی موسیٰ و هارون و جماعة بنی اسرائیل الی بریة فاران الی قادس (سفر العدد الا صحاح 13,26)

اصل ابری عبارت میں صرف یہ لفظ ہیں'' ال مدبر فاران قادیش'' عربی زبان میں جوقاعدہ بدل اورمتبدل منہ کا ہے وہ عبری زبان میں نہیں ہے اوراس لیے فاران اورقادیش بدل اورمبدل منہ نہیں ہوسکتے اورضرور ہے کہ بن دونوں کے درمیان کوئی لفظ مقدر مانا جاوے فارسی مترجم نے حرف ب کومقدر مانا ہے اور'' بہ قادیس'' ترجمہ کیا ہے اورعربی مترجم

نے ''الی'' مقدر مانا ہے اور ''الی قادیش'' ترجمہ کیا ہے اور لیٹن کے مترجم نے جو لفظ مقدر مانا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے ''جو کہ ہے بیچ قادیش کے'' مگر عربی قدیم ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ فاران کے ماقبل بھی ال یعنی ''الی'' کا لفظ آیا ہے اور وہی لفظ قادیش پر سے محذوف کر دیا ہے پس اس ترجمہ کے مطابق معنی یہ ہوتے ہیں کہ '' آئے بیابان فاران کی طرف قادیش کی طرف سے یعنی قادیش کے رستہ سے'' اس صورت میں صریح ظاہر ہوتا ہے کہ فاران اور قادیش دو مختلف مقاموں کے نام ہیں اور اسی کی تائید سفر تکوین کے ورسوں سے ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

اب ہم کو تیسرے فاران پر غور کرنا چاہیے جس کا کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہونا بیان ہوا ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے کہ حضرت اسمعیل صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر ٹھہرے تھے اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسمعیل فی الحقیقت متوطن ہوئے تھے اس لیے کہ اگر از روئے تجسس اور تفتیش کے یہ ثابت ہو جاوے کہ حضرت اسمعیل وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے لازم آوے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے۔

کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ حضرت اسمعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی رورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسمعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں مگر ہم اس غرض سے کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہ رہے ان دلیلوں کی غلطی بیان کرتے ہیں۔

مصنف موصوف نے سفر تکوین باب 25 ورس 18 پر جس کی یہ عبارت ہے ''وایشان

از حویلاہ تا شور کہ ھنگام رفتن تو بہ اشور در برابر مصرست ساکن بودند و مسکن او در حضور تمامی برادرانش افتاد‘‘ استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ ’’خدائے تعالیٰ کے وعدے اسی میں ایفا ہو گئے تھے جب کہ اسماعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں یعنی سرحد مصر سے لے کر دھانہائے فرات تک پھیل گئی تھی۔‘‘

اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے [1] فرات پر قرار دیا ہے دراصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب 10 ورس 29 میں مذکور ہے نواح یمن میں عرض بلد شمالی 17 درجہ 30 دقیقہ اور طول بلد شرقی 42 درجہ 36 دقیقہ پر واقع ہے اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معاینہ سے ہوسکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے وا گر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان تمام اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے جن کا نقشہ رورنڈ کارٹوٹ پی کیرے ایم اے نے مرتب کیا ہے۔

1 رورنڈ مسٹر فارسٹر صاحب حویلاہ کی سکونت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ’’ارض حویلاہ سے جو حضرت موسیٰ کے پہلے صحیفہ میں مذکور ہے وہ حصہ عرب کا مراد ہے جو دھان ہائے فرات سے ملحق ہے اور جنوب کی جانب ساحل خلیج فارس کے برابر برابر چلا گیا ہے‘‘ یہ بیان اس بنا پر ہے (اگر چہ ہمارے نزدیک قابل وقعت نہیں ہے) کہ جزائر بحرین میں سب سے مشہور جزیرے ’’اوال‘‘ کے نام میں اصلی نام حویلاہ کے آثار پائے جاتے ہیں اس دلیل کے استحکام میں صاحب موصوف یہ بیان کرتے ہیں کہ ’’آگے آنے والی مثالوں سے عربی زبان کے استعمال میں جو مختلف تصرفات اس نام میں ہوئے ہیں معلوم ہوں گے جیسے اول، اوآل، حوبل، حوبلاہ، خو، خط، خولان، چول، چولان، ان لفظوں میں سے بعضے لفظ ایک ہی جگہ یا ضلع کے مختلف نام ہیں‘‘ ایسے عظیم سوالات کا اس طرح پر حل کرنا اور ان سے نتائج کا استنباط کرنا

کامل اور ناطر قدارانہ تحقیقات کے قواعد معینہ کے مطابق نہیں ہے اور اسی لیے وہ قابل وقعت نہیں اور اسی باعث سے ہم نے کہا ہے کہ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بیان میں غلطی کی ہے علی الخصوص اس وجہ سے کہ یہی نام پورا پورا عرب کے دوسرے حصہ میں موجود ہے (سید احمد)

دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید اختیار کر کے ''شور'' کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں کہ صحرائے ایثام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے کیوں کہ صحرائے ''شور'' سے توریت مقدس میں مراد تمام اس وسیع میدان سے ہے جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے۔

اصل عبری توریت میں صرف دو نام ہیں شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسریا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسمعیل اس وسیع قطعہ میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے اگر کوئی شخص وہاں سے اسریا کی جانب عزیمت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے'' جو کہ سامنے مصر کے ہے اگر تو اسریا کی طرف روانہ ہو'' یعنی مصر کے سامنے سے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسریا تک کھینچو۔

فاران کی حدود اربعہ جو رونڈ مسٹر فارسٹر نے بہ حوالہ ڈاکٹر ولز کے قرار دی ہیں کہ اس کے مغرب میں بیابان شور ہے اور مشرق کوہ سیعیر اور شمال میں ارض کنعان اور جنوب میں بحر احمر یہ حدود بھی بالکل غلط ہیں۔

سینٹ پال حواری نے جو خط گلاٹیوں کے نام لکھا ہے اس کے چوتھے باب میں بائیسویں ورس سے چھبیسویں ورس تک یہ عبارت مندرج ہے ’’یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے ایک لونڈی سے دوسرا آزاد سے وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدے کے طور پر پیدا ہوا اس کے یہ معنی ظاہر ہیں کہ یہ عورتیں دو عہد نامے ہیں ایک تو کوہ سینی کی جو صرف غلام جنتی ہے ھاجرہ ہے کہ وہ ھاجرہ عرب کا کوہ سینی ہے اور یہاں کے یروشالم کی ہم جنس ہے اور اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے سو ہم سبھوں کی ماں ہے‘‘ اس پر رورنڈ مسٹر فارسٹر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوہ سینا اور ہاجرہ ایک ہی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول خود مصنف موصوف ہی کا قول ہے کیوں کہ جہاں تک ہم کو واقفیت ہے ہم کسی عیسائی مصنف کا قول اس کے مطابق نہیں پاتے ہیں کوئی مشرقی مورخ یا جغرافیہ دان ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے کوہ سینا اور ہاجرہ کو ایک ہی سمجھا ہو اور نہ انجیل مقدس کی کسی آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کوہ سینا اور ہاجرہ سے ایک شے مراد ہے سینٹ پال خواری کا اصلی منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کوہ سینا پر دو معاہدے کیے گئے تھے ایک حضرت اسحاق کے ساتھ اور دوسرا حضرت اسمعیل پسر ہاجرہ کے ساتھ سنٹ پال حواری نے کنایتاً فرمایا کہ ’’یہ ہاجرہ کوہ سینا ملک عرب میں ہے‘‘ یعنی یہ ہاجرہ یعنی بنی ہاجرہ وہ معاہدہ ہے جو کوہ سینا پر بھی کیا گیا تھا اور یروشلم کا ہمپایہ ہے جو بالفعل موجود ہے اور اس کی اولاد کے ساتھ غلامی میں ہے عبارت مذکور بالا کو اس طرح پر پھیرنا کہ اس کے معنی سے ہاجرہ اور سینا کا مقام واحد ہونا ثابت ہو جاوے بالکل غیر ممکن ہے۔

کتاب اول تواریخ ایام باب 5 ورس 9 اور 10 میں بعض اقوام بنی اسرائیل کے آباد ہونے کے ذکر کے ساتھ یہ عبارت مندرج ہے ’’و بہ طرف شرقی تا مدخل بیابان کہ بہ کنارہ نہر فرات باشد ساکن می شدند ازیرا کہ در زمین گلعاد گہ ہائے ایشاں زیاد می شدند و در زمان

شاول ایشاں باھگریاں دعویٰ کردند کہ آنہا بدست ایشاں آفادند و در چادرہائے ایشاں در تمامی مرز و بوے کہ بہ طرف گلعاد باشد ساکن شدند" (یعنی اور مشرق کی طرف دریائے فرات سے بیابان میں داخل ہونے کی جگہ تک بسا ہوا تھا کیوں کہ ملک خلباء میں ان کے جو پائے بہت بڑھ گئے تھے اور ساؤل کے زمانہ میں انہوں نے ھاجریوں سے لڑائی کی جوان کے ہاتھ سے قتل ہوئے اور وہ حلباء کے مشرق کے سارے علاقہ میں ان کے ڈیروں میں بس گئے۔ محمد اسماعیل)

ان ورسوں پر استدلال کر کے رورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ گلعاد کے شرقی نوح جو رود فرات اور خلیج فارس کی سمت میں ہے حضرت اسمعیل کے ابتدائی مقام سکونت سے مطابق ہوتا ہے ایک عرصہ کے بعد حضرت اسمعیل کی اولاد قریب قریب سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی اور انہیں سے بعض لوگ مقام متذکرہ بالا کو قدیمی باشندوں سے چھین کر وہاں جا بسے۔

مگر ان ورسوں سے جو مقصد رورنڈ مسٹر فارسٹر کا ہے وہ حاصل نہیں ہوتا کیوں کہ ان سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی ھاجرہ نے سواحل خلیج فارس پر شکست کھائی اور یہ شکست آٹھ سو برس بعد حضرت اسمعیل کے واقع ہوئی تھی ان ورسوں سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں خود حضرت اسمعیل متوطن ہوئے تھے۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ حضرت اسمعیل کی اولاد نے خلیج فارس کے شمالی سمت سے لے کر یمن تک تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا مختلف مقامات کے ناموں کی بنی ھاجرہ کے ناموں کے ساتھ مطابقت کرنے میں از حد کوشش کی ہے بعض مطابقتیں اسی طرح پر کی ہیں جن پر اعتبار نہیں ہو سکتا اور بعض میں اپنے معمولی قاعدہ کے مطابق صرف ایک حرف کے مطابق ہو جانے کو کافی سمجھا ہے اور بعض ناموں کے مطابق

کرنے میں ان کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔لیکن جس امر کے قائم کرنے میں رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس قدر جاں فشانی سے ناکام کوشش کی ہے دو وجہ سے قابل التفات اور لائق توجہ نہیں ہے۔

اول اس لیے کہ ہمارے نزدیک بھی حضرت اسمٰعیل کی اولاد یعنی ان کے بارہ نامور بیٹے اوران کے بیٹوں کی اولاد صرف اس تنگ قطعہ زمین میں محصور نہیں رہی جو مکہ معظّمہ کے گرداگرد ہے بلکہ امتداد زمانہ میں ان کی اولاد قریب قریب تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی مشرقی مورخ بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ عبارت مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے پس یہ امر متنازعہ فیہ نہیں ہے۔

ولما کثرولد اسمعیل علیه السلام عاقت علیهم مکة فانشروا فی البلاد فکانو لا بدخلون بلدآ الا اظهر هم الله علی اهله وهم لغوا العمالیق (معارف ابن قتیبة)

دوم اس لیے کہ اس مقام پر یہ امر بحث طلب نہیں ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد حضرت اسمٰعیل کی اولاد کہاں کہاں پھیل گئی تھی بلکہ اس بات پر بحث ہے کہ حضرت اسمٰعیل اوران کی اولاد ابتدا میں کس جگہ آباد ہوئی تھی پس جو کچھ کہ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے لکھا ہے اس سے امر بحث طلب کو کچھ علاقہ نہیں۔

اب ہم اس امر کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کتب خمسہ حضرت موسیٰ میں اس فاران کا جو مشرقی مصر میں کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے کچھ بھی ذکر نہیں ہے اور یہ امر اس وقت بخوبی واضح ہو جاتا ہے جب کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ہمراہیان بنی اسرائیل کی صحرا نوردیوں کے مقامات پر لحاظ کیا جاوے۔ سفر خروج باب 15 ورس 22 میں لکھا ہے ’’پس موسیٰ اسرائیلیاں را از دریائے احمر کوچانید و بہ بیابان شور رفتند وسہ روز در بیابان راہی شدہ

آب نیافتند'' (یعنی پھر موسیٰ بنی اسرائیل ک و بحر قلزم سے آگے لے گیا اور وہ شور کے بیابان میں آئے اور بیابان میں چلتے ہوئے تین دن تک ان کو کوئی پانی کا چشمہ نہ ملا محمد اسماعیل) اور جب کہ انہوں نے بیابان سین کو طے کیا تب عمالیق کی قوم آئی اور رقیدیم میں بنی اسرائیل سے لڑی دیکھو (سفر خروج باب 17 ورس 8)

بنی عملیق قدیم رہنے والے رقیدیم کے نہیں تھے بلکہ اس وادی کے رہنے والے تھے جس کا ذکر سفر اعداد باب 14 ورس 25 میں ہے اور اس ورس میں بھی جو لفظ '' آئے'' کا استعمال ہوا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رفیدیم کے رہنے والے نہ تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رفیدیم سینا کے جانب مغرب یعنی مشرق مصر میں واقع ہے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ نے اپنے اعجاز سے ایک چٹان میں سے پانی کا چشمہ نکالا تھا اور اس کا نام '' مساہ'' اور '' مریبا'' رکھا تھا (دیکھو سفر خروج باب 17 ورس 6,7) اور اسی جگہ حضرت موسیٰ نے ایک قربان گاہ بنائی تھی اور اس کا نام '' یہوانسی رکھا تھا (دیکھو سفر خروج باب 17 ورس 15)''

حضرت موسیٰ اب آگے کو مشرق کی طرف بڑھے اور صحرائے سینا میں پہنچ کر کوہ خدا کے پاس ڈیرے ڈالے اور اسی مقام پر ان کے خسر مسمی یثرو کاھن ان سے ملنے کو آئے (دیکھو سفر خروج باب 18 ور 5 و باب 19 ورس 2)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یثرو کاہن حضرت موسیٰ کے خسر کوہ سینا کے مشرق کی جانب سے آئے تھے کیوں کہ مدیان جہاں کہ وہ کاہن تھے اس کے مشرق کی سمت میں واقع ہے اس تمام سفر میں جو حضرت موسیٰ نے مصر سے سینا تک کیا فاران کا کچھ ذکر نہیں آیا۔

سینا سے بنی اسرائیل کا کوچ شمال مشرق کی سمت میں تھا اس سفر کے باب میں سفر اعداد باب 10 ورس 12 میں یہ لکھا ہے

”وبنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند و ابر در بیابان پاران ساکن شد“

حضرت موسیٰ نے اس سفر میں پہلی منزل اس مقام پر کی تھی جس کا نام ”تبعیراہ“ تھا (دیکھو سفر اعداد باب 11 ورس 3) پھر وہاں سے ”قبروث ھتاواہ“ کو روانہ ہوئے اور وہاں سے ”حصیروث“ کو کوچ کیا (دیکھو سفر اعداد باب 11 ورس 34 و 35) اور اس اخیر مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے (دیکھو سفر اعداد باب 12 ورس 16) جو کہ یہ پاران وہی جگہ ہے جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے اس لیے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ کا کوچ شمالی اور مشرقی سمت میں تھا یعنی قادیش کی طرف (دیکھو سفر اعداد باب 13 ورس 26) اور اس لیے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا ہے سینا کے مغرب کی جانب نہیں ہو سکتا۔

پس بآسانی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ شہر فاران جس کو روپر صاحب نے بیان کیا ہے اور جس کے آثار انہوں نے پائے ہیں اور جو مشرقی مورخوں کی نظر سے بھی چھپا ہوا نہ تھا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں موجود نہ تھا اور یہ کب خیال میں آ سکتا ہے کہ ایسے بیابان میں جس کی نسبت حضرت موسیٰ نے بیان کیا ہے کہ ”بیابان وسیع و ہولناک کہ در آں مار سوزندہ و عقرب و زمین خشک بے آب بود“ اس زمانہ میں کوئی شہر موجود ہو (دیکھو سفر توریہ مثنیٰ باب 8 ورس 15)

عیسائی مصنفوں نے بیابان فاران کا جو مقام قرار دیا ہے اس پر اعتبار کرنا حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کے بیان کی صحت پر منحصر ہے اور اس امر کی نسبت کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل صحرا نوردی کی حالت میں کن کن مقاموں پر ہو کر گذرے تھے خود عیسائی علماء اور فضلا میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس قدر اختلاف شاید ہی کسی اور امر کی

نسبت ہو ہم اس مقام پر حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی صحرانوردی کا ایک نقشہ شامل کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوگا کہ خود علماء عیسائی سے پانچ مختلف رستے صحرانوردی کے بیان کیے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی نسبت بطور یقین کے بیان کیا جا سکے کہ در حقیقت ان پانچوں میں سے صحرانوردی کا کون سا صحیح رستہ ہے۔

فاران پسر عوف کی اولاد بنی فاران کے نام سے مشہور تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں کچھ لوگ اس قبیلہ کے یمن والوں اور قرب و جوار کی قوموں کے ساتھ دائمی جھگڑوں اور قصوں کے سبب سے شمال اور مشرقی سمت کو چلے گئے ہوں گے اور کوہ سینا کی مغرب کی جانب مشرقی مصر میں قیام کیا ہوگا جہاں رفتہ رفتہ ایک گاؤں یا قصبہ اسی قوم فاران کے نام سے آباد ہو گیا ہوگا۔ جس کا ذکر اوپر صاحب اور اور مشرقی مورخوں نے کیا ہے مگر حضرت موسیٰ کے وقت میں اس کا کچھ وجود نہ تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ہم نام بیابان یا پہاڑ سے جس کا ذکر توریت میں ہے بالکل علیحدہ ہے۔

اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے وج شام سے یمن تک چلا گیا ہے جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مورخ بھی اس کے موید ہیں تب حضرت موسیٰ کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

اس تمام وسیع میدان پر جو شام کے جنوب میں واقع ہے کاتبین مقدس عموماً ارض شور کا اطلاق کرتے ہیں مگر بعض مقام میں اس کو صرف ''بیابان'' سے تعبیر کیا ہے (دیکھو سفر خروج باب 13 ورس 18) اور بعض جگہ ''بیابان عظیم'' سے (دیکھو سفر توریہ ثنیٰ باب 8 ورس 15) اور اس بیابان میں ایثام، سین، سینا، سن، قادیش، عیدام جو چھوٹے

چھوٹے بیابان ہیں اور نیز ایک حصہ فاران کا شامل ہے۔

جو کچھ کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے شور اور شام کو ایک ہی ملک قرار دیا ہے سفر تکوین باب 25 ورس 18 میں دو نام آئے ہیں ایک شور اور دوسرا اشورہ تمام عیسائی مصنف اشورہ کو ''اسریا'' سے تعبیر کرتے ہیں پس کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ شور سے شام مراد ہے اگر کوئی اس سے انکار کرے تو اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس تطبیق کا تسلیم کرنا اسلام کے مفید مطلب ہے کیوں کہ سفر توریہ مثنیٰ باب 33 ورس 2 اور کتاب حبقوق باب 3 ورس 3 میں پیشین گوئی ہے اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صادق آتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاران کی شمالی حد پر قادیش اور مغربی حد پر صحرائے ''سن'' اور خلیج عرب واقع ہے۔

جب کہ حضرت موسیٰ سینا سے روانہ ہوئے تو ابر قادیش کے نزدیک فاران میں ٹھہرا (دیکھو سفر اعداد باب 10 ورس 12) اور حضرت موسیٰ ''تبیعراہ'' ''قبروث ھتاواہ'' اور ''حصیروث'' ہو کر فاران میں آئے جو قادیش کے نواح میں ہے اس جگہ سے انہوں نے ایلچی روانہ کیے جو واپس آتے وقت اول قادیش میں پہنچے اور اس کے بعد فاران میں یہ ایک سیدھا اور صاف بیان ہے جس سے حضرت موسیٰ کے فاران میں سفر کرنے کا معما بخوبی حل ہو جاتا ہے۔

اب ہم توریت مقدس کے ان ورسوں پر غور کریں گے جو حضرت ھاجرہ اور حضرت اسمعیل کے نکال دینے کے باب میں ہیں سفر تکوین باب 21 ورس 14 و 15 میں لکھا ہے کہ'' ابراہیم در صبحدم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گزاشت و ہم پسرش را (باو دادہ) او را روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیر شبع سرگرداں شدہ و آبے در

مطہرہ بود تمام شد و پسرا را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت'' (یعنی ابراہیم نے صبح ہی صبح اٹھ کر روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ لیا اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے حوالے کر کے اسے رخصت کر دیا سو وہ چلی گئی اور بیر شبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی اور جو پانی مشکیزہ میں تھا جب وہ ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا محمد اسماعیل) جس عبارت کے نیچے ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس کے خواہ نخواہ یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیم نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا اور وہی ختم ہو گیا تھا بلکہ دو وجہ سے اس ورس کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیم نے قادیش کے نزدک کھودا تھا اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا حضرت ہاجرہ سے پوشیدہ نہ تھا دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا کیوں کہ وہاں صرف حضرت ابراہیم ہی کے بنائے ہوئے کنوئیں نہیں تھے بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کئے ہوئے بھی موجود تھے (دیکھو سفر تکوین باب 26 ورس 18 لغایت 22) ہمارے نزدیک اس عبارت کے معنی جو عیسائی مصنفوں نے قرار دیے ہیں اس سے زیادہ ترصحیح اور صاف یہ ہیں کہ مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا کیوں کہ بیر شبع کے ارد گرد ایسی قومیں رہتی تھیں جو لڑاکا اور جھگڑالو تھیں اور ذرا سا رحم بھی ان کے دل میں نہ تھا اس لیے حضرت ہاجرہ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں اور ایسا مقام بلاشبہ وہ تھا جہاں عرب العاربہ کی قومیں رہتی تھیں اور اس لیے کچھ شک نہیں رہتا کہ حضرت ہاجرہ نے اس نواح میں جانے کا قصد کیا۔

جو ایک چھاگل پانی حضرت ابراہیم نے ان کے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہو گا اور رستہ میں متعدد جگہ سے جہاں کہیں پانی دستیاب ہوا ہو گا حضرت ہاجرہ نے بھر لیا ہو گا لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہو گی کیوں کہ اس بیابان میں پانی نہایت کمیاب ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظّمہ ہے تو ان کے پاس باقی پانی نہیں رہا تھا اور حضرت اسمعیل تشنگی کے سبب سے ضعیف اور قریب مرگ ہو گئے ہوں گے اور حضرت ہاجرہ نہایت تشویش اور اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر پانی تلاش کرنے کو دوڑتی پھرتی ہوں گی یہ بیان ایسا صاف ہے جس میں کوئی امر خلاف قیاس یا خلاف فطرت انسانی نہیں ہے۔

خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو جو ان کو جنگل میں ملتا تھا جھاکڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تا کہ ان کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ ملے اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے ان میں جاری تھی اور اب تک جاری ہے۔

یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اس چشمہ کو جو اس مقام پر واقع تھا جہاں اب چاہ زمزم واقع ہے چھپا دیا ہو گا کیوں کہ لفظ ''بیر'' عبری میں چشمہ آب کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ان تمام حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ہاجرہ مظر بانہ ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے ''وخدا چشمان او را کشادہ کرد و چاہ آبے دید و روانہ شدہ مطہرہ را از آب پر کردہ و بہ پسر نوشاید'' (یعنی خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اس نے پانی کا ایک چشمہ دیکھا تو اس میں سے مشکیزہ بھرا اور لڑکے کو پلا کر روانہ ہو گیا (سفر تکوین باب 31 ورس 19) محمد اسماعیل عربی روایتوں میں اس واقعہ کو اس طرح پر تعبیر کیا ہے کہ ایک فرشتہ نے اس مقام پر

اپنے بازو یا پاؤں سے ایک گڑھا کر دیا جس میں سے پانی نکل آیا یہ بیان اسی قسم کا ہے جیسا کہ مذہبی روایتوں کو ایک عظمت دینے کے لیے ہوتا ہے مگر جو اصلی واقعہ ہے وہ اس سے صاف پایا جاتا ہے۔

بخاری کی حدیث ہم نے اوپر نقل کی ہے اور اس کو بجائے پیغمبر کی حدیث ہونے کے ایک قومی اور ملکی روایت کا درجہ دیا ہے اس سے بھی اتنی بات کہ حضرت ہاجرہ جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب ملکہ ہے تو پانی ہو چکا اور حضرت اسمعیل تشنگی سے قریب المرگ ہو گئے تو وہاں ان کو چشمہ مل گیا بخوبی ثابت ہوتی ہے پس یہ ایک ایسی روایت ہے جس کو ایام جاہلیت کے عربوں نے ہمیشہ مستند تسلیم کیا ہے اور باوجودے کہ وہ لوگ بے شمار قوموں اور فرقوں میں جو ایک دوسرے کے مخالف تھے اور ہر ایک کا مذہب اور اعتقاد بھی جداگانہ تھا منقسم ہو گئے تھے اس پر بھی مذکورہ بالا امر میں سب متفق تھے اس لیے ہم اس روایت کو جھوٹی اور موضوع نہیں خیال کرتے خصوصاً اس صورت میں کہ توریت مقدس کے متعدد مقامات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت ہاجرہ نے اس مقام پر جہاں ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا رہنا شروع کیا جب اور لوگوں کو اس چشمہ کی خبر ہوئی تو بنی جرھم کے بہت سے لوگ اس کے قرب وجوار میں آ کر آباد ہوئے۔

حضرت اسماعیل کا نکاح اور ان کی بیویاں

بخاری نے حضرت اسمعیل کے نکاح کرنے کی بابت ایک روایت لکھی ہے جس کو ہم بجنسہ ذیل میں لکھتے ہیں۔

قـال (اے ابـن عباس) قمر تاس من جرهم بيطن الوادی فاذاهم بطير کـانهـم انـکـروا ذلک و قـالوا ما يکون الطير الا علی ماء فبعثوا رسولهم فـنـظر فاذا هو بالماء فاخبرهم فاتوا اليها فقالو ايا ام اسمعيل اتاذنين لنا ان نکون معک او نسکن معک فبلخ ابنها فنکح فيهم امراة قال ثم انه بدا لا بـراهيـم فـقـال لا هله انی مطلع ترکتی قال فجاء فسلم فقال ابن اسمعيل فـقـالـت امـرتـه ذهب بصيد قال قولی له اذ جاء غير عتبة ببفک فلما جاء اخبـرتـه فقال انت ذلک فاذهبی الی اهلک قال ثم انه بد الابراهيم فقال لا هـلـه انی مطلع ترکتی فجاء فقال ابن اسمعيل فقالت امرته ذهب بصيد فـقـالـت الا تـنـزل فتـطـعم و تشرب فقال وما طعامکم و ما شرابکم قالت طـعـامـنا اللحم و شرابنا الماء قال اللهم بارک لهم فی طعامهم و شرابهم قـال فـقـال ابوالقاسم برکة يدعو ابراهيم (صلی الله عليهم وسلم) قال ثم انـه بـد الابـرا هيـم فـقال لا هله انی سطلع ترکتی فجاء فوافق اسمعيل من وراء زمزم بصلح بنلاله فقال يا اسمعيل ان ربک امرنی ان ابنی له ييتا قال اطـع ربک قال امرنی ان تعيننی عليه قال اذا فعل او کما قال فقا ما فجعل ابـراهيـم يبنی و اسمعيل ينا وله الحجارة و يقولان ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم قال حتی ارتفع البناء و ضعف الشيخ عن نقل الحجارة فقام عـلی حجر المقام فجعل بنا وله الحجارة ويقولان ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم (بخاری کتاب الانبياء)

یہ روایت بھی انہیں وجوہات سے ہم نے بخاری کی پہلی حدیث کی نسبت بیان کی ہیں ایک ملکی روایت کی مانند ہے نہ کہ پیغمبر صاحب کی فرمائی ہوئی حدیث کی مانند اس روایت

سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمعیل نے ایک عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے بعد جب حضرت ابراہیم حضرت اسمعیل سے ملنے کو آئے تو اس عورت سے نکاح کرنے کو ناپسند کیا اور طلاق دے دینے کا اشارہ کیا چناں چہ حضرت اسمعیل نے اس کو طلاق دے دی اور وہاں کے نو آباد لوگوں میں سے ایک اور عورت سے نکاح کر لیا اس کے بعد جب دوسری دفعہ حضرت ابراہیم ان سے ملنے کو آئے تو اس عورت سے نکاح کرنے کو پسند کیا۔

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمعیل کی دونوں بیبیاں بنی جرھم کی قوم سے تھیں مگر توریت مقدس سے پایا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلی دفعہ ایک مصری عورت سے نکاح کیا تھا۔

ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں جو پہلی بیوی کا بنی جرھم سے ہونا بیان کیا گیا ہے صحیح نہیں ہے غالباً پہلی بیوی ایک مصری عورت تھی اور یہی وجہ ہو گی کہ حضرت ابراہیم نے اس عورت سے نکاح کرنا ناپسند کیا ہو گا یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بنی جرھم نے ابتداء میں اپنی قوم کی بیٹی کو حضرت اسمعیل کے نکاح میں دینے سے تامل کیا ہو گا کیوں کہ وہ حضرت اسمعیل کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے مگر باہم سکونت پذیر ہونے سے وہ خیال جاتا رہا ہو گا اور اس لیے یقین ہوتا ہے کہ ان کی دوسری بیوی بنی جرھم کی قوم سے تھیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل کا خانہ کعبہ کو تعمیر کرنا

قرآن مجید میں نسبت تعمیر خانہ کعبہ کے یہ آیت موجود ہے

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمعیل ربنا تقبل منا انک

انت السمیع العلیم (سورہ البقرہ آیت 121)

(یعنی جب ابراہیم اوراس کا فرزند اسمعیل بیت اللہ کی دیواریں کھڑی کررہے تھے تو انہوں نے خدا سے دعا مانگی کہ اے ہمارے رب! تو ہماری عرض کو قبول کرلے تو یقیناً سننے والا اور جاننے والا ہے۔محمد اسماعیل پانی پتی)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے اور تمام قومی روایتوں سے یقیناً متحقق ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل نے خانہ کعبہ کو بنایا تھا

قرآن مجید کی رو سے بغیر کسی شک کے ہم مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت اسمعیل پیغمبر تھے اور خدا نے ان کو مثل حضرت ابراہیم ان کے باپ کے وحی بھیجنے اور اپنی مرضی ظاہر کرنے کے لیے مبعوث کیا تھا تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت کی طرف ہدایت کریں توریت مقدس میں جو وعدہ کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسمعیل کی نسبت کیا تھا وہ اس طرح پر مندرج ہے ''ودرحق اسمعیل تراشندیم اینک اورابرکت دادہ ام واورابارودگردانیدہ بغایت زیادہ خواھم نمودودوازدہ سرورتولید خواھد نمود اوررا امت عظمیٰ خواھم نمود'' (سفر تکوین باب 17 ورس 20) یہ وعدہ پورا ہوا اور آخیر تک پورا ہوتا چلا آیا (اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے ''اور اسمعیل کے حق میں میں نے تیری دعا کو سنا دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا محمد اسماعیل)''

عیسائی مصنف اس وعدہ کے ہونے کی نسبت تو کچھ کلام نہیں کرسکتے مگر از راہ مکابرہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ جسمانی یعنی دنیوی طرز کا وعدہ تھا نہ روحانی طرز کا اگرچہ یہ ان کا کہنا صریح غلط ہے مگر اس مقام پر ہم اس مسئلہ پر بحث نہیں کرنے کے بلکہ آئندہ مضمون میں جس میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی بشارات کا توریت اور انجیل میں

موجود ہونا بیان کریں گے اسی مضمون میں اس امر پر بھی بحث کریں گے۔

ذکر جو حضرت اسماعیل کے قربان ہونے کا مشہور ہے

ایک اور روایت عموماً لوگوں میں مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حضرت اسمعیل کی قربانی کر ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے زیادہ تر تقویت اس روایت کو ہوتی ہے جس میں حضرت اسحاق کی قربانی کرنے کے حکم ہونے کا ذکر ہے اور اس اختلاف کا جو سبب ہے وہ ہم آگے بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم نے جو اپنے بیٹے کی قربانی کرنے کا ارادہ کیا اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے

" قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذ بحک فانظر ما ذا تریٰ قال یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین فلما اسلما و تلہ للجبین و نادیناء ان یا ابراھیم قد صدقت الرویا انا کذالک نجری المحسنین ان ھذا لھو البلاء المبین و فدبناہ بذبح عظیم " (سورۃ الصفات آیت 101 لغایت 107)

یعنی ابراہیم نے کہا "اے میرے بیٹے! میں نے خواب دیکھا (جیسے) میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس سوچ کر جواب دے کہ اس معاملہ میں تیری کیا مرضی ہے؟ اس نے کہا اے میرے باپ! جو حکم آپ کو خدا سے ملا ہے اسے کر گذریے آپ مجھے انشاء اللہ صابر پائیں گے پھر جب وہ دونوں فرماں برداری پر آمادہ ہو گئے اور باپ نے اسے ماتھے کے بل (زمین پر) گرا لیا تو ہم نے اسے پکار کر کہا کہ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا ہم

اسی طرح محسنوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں یہ یقیناً (ابراہیم کی) سخت آزمائش تھی اور ہم نے اس کا فدیہ ایک بڑی قربانی کے ذریعہ سے دے دیا۔'' محمد اسماعیل

قرآن مجید میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حضرت اسحاق کی نسبت قربانی کا حکم تھا یا حضرت اسمعیل کی نسبت اور نہ کسی معتبر اور مستند حدیث سے اس کی تفصیل پائی جاتی ہے۔

بعض مسلمان مورخوں کا قول ہے کہ حضرت اسمعیل کی نسبت تھا یہ اختلاف توریت مقدس کی اس آیت کے مبہم اور غیر مصرح ہونے کی وجہ سے ہے جس میں اس مقام کا ذکر ہے جہاں مذکورہ بالا قربانی کا عمل میں آنا تجویز ہوا تھا اور وہ آیت یہ ہے'' خدا ابراہیم را امتحان نمود و باو گفت اے ابراہیم واو گفت اینک حاضرم و خداوند گفت کہ حال پسر یگانہ خود اسحاق را کہ دوست می داری بگیر و برزمین موریاہ 1

1 موریا کے معنی تلخی خدا یا حکم خدا یا خوف خدا اور نیز اور شلیم کے اس پہاڑ کا نام ہے جس پر بیت المقدس تعمیر ہوا تھا اور جس پر بالفعل حضرت عمر کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے اسی مقام کو عموماً وہ مقام خیال کرتے ہیں جہاں کہ حضرت ابراہیم کو اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسحاق کی قربانی کرنے کا حکم ہوا تھا گو کہ اس بات کے فرض کرنے میں بعض مشکلات پیش آتی ہیں توریت سامری سفر تکوین باب 22 ورس 2 میں بجائے موریا کے سرزمین مرہ لکھا ہے جیسا کہ انگریزی ترجمہ میں ہے اور مرہ کی نسبت لوگوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ وہی مرہ ہے جو'' شکم'' کے قریب تھا اور جہاں حضرت ابراہیم پہلے رہا کرتے تھے (سفر تکوین باب 12 ورس 6) اور وہ پہاڑ جس پر ان کا معبد بنا تھا'' جوزیم'' تھا اور یہ اخیر رائے کسی قدر لحاظ کے قابل ہے اگر یہ متحقق ہو جاوے کہ قوم سامری نے اس مقام کو اپنی حدود کے اندر لانے کے واسطے اس ورس میں کچھ تعریف نہیں کی ہے بیر شبع سے اس مقام کا فاصلہ ترجمہ سامری کا کسی قدر موئد ہے کیوں کہ بیر شبع سے مرہ تک پورا تین روز کا رستہ ہے مگر بیر شبع اور

بیت المقدس کے درمیان فاصلہ بہت قلیل ہے بشرطیکہ راستہ میں کوئی امر حارج نہ ہو گیا ہو مسلمان راوی ہیں کہ اس واقع کا موقع وہ ہے جہاں کہ زمانہ مابعد میں ان کا مشہور و معروف

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پرو (عربی ترجمہ میں بجائے لفظ ''موریاہ'' کے ''ارض الرویا'' لکھا ہے اور توریت سامری کے عربی ترجمہ میں ''ارض المختارہ المرشدہ'' لکھا ہے) ''و دراں جا اور را در یکے از کوہ ہائے کہ بہ قومی گویم از برائے قربانی سوختنی تقریب نما'' (سفر تکوین باب 22 ورس 1,2) بعض مسلمان مصنفوں نے اس گمنام جگہ کو بیت المقدس اور اس کے پہاڑ قرار دیے ہیں اور بعض نے مکہ معظّمہ کے قریب کے پہاڑ جو لوگ اس مقام کو مکہ معظّمہ کے پہاڑ قرار دیتے ہیں وہ اپنی رائے کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ عبری لفظ ''ھریم'' جس کے معنی خیال کے ہیں تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس لیے وہ استدلال کرتے ہیں کہ اس سے مکہ معظّمہ کے مشہور دو پہاڑوں صفا اور مروہ میں سے ایک مراد ہے۔''

توریت مقدس میں اسی باب کی چودھویں آیت میں یہ لکھا ہے'' وابراہیم اسم آں مکان را یہواہ یراہ گذاشت کہ تا امروزش چنین ہم میخانند و در کوہ خداوند نمایاں است'' مسلمان مورخوں کے نزدیک یہ مقام وہ ہے جو مکہ معظّمہ کے پاس واقع ہے اور آج تک عرفات کے نام سے مشہور ہے پس جو لوگ اس قربان گاہ کو مکہ معظّمہ میں قرار دیتے ہیں وہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

معبد بمقام مکہ بنایا گیا تھا اور اس معاملہ میں اور نیز دیگر معاملات میں وہ حضرت اسحاق کی جگہ حضرت اسمعیل کو بتلاتے ہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہودی، سامری، مسلمان سب اپنے اپنے معبدوں کے موقعوں کو حضرت ابراہیم کے ایمان کی آزمائش یا امتحان کے مقام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں (بائیبل سائکلو پیڈیا جلد 2 صفحہ 240)

(سرسید)

کہتے ہیں کہ قربانی کا حکم حضرت اسمعیل کی نسبت ہوا تھا اور جو لوگ اس قربان گاہ کو بیت المقدس میں قرار دیتے ہیں وہ حضرت اسحاق کی نسبت قربانی کا حکم ہونا کہتے ہیں جیسے کہ مسعودی نے لکھا ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

وقد تنازع الناس فی الذبح فمنهم من ذهب الی انه اسحق و منهم من رایے انه اسمعیل فان کان الامر بالذبح وقع بمنی فالذبح اسمعیل لان اسحق لم یدخل الحجازو ان کان الامر بالذبح و قع بالشام فالذبیح اسحق کان اسمعیل لم یدخل الشام بعد ان حمل منه (مروج الذهب مسعودی)

مگر ذی علم مسلمان عالموں کا صاف بیان ہے کہ حضرت اسحاق کی نسبت قربانی کا حکم ہوا تھا نہ کہ حضرت اسمعیل کی نسبت اور یہی امر مندرجہ حدیث سے بھی پایا جاتا ہے۔

عن محمد ابن المنتشر قال ان رجله نذر ان ینحر نفسه....... (فقال له مسروق) لا تنحر..... و اشتر کبشا فا ذبحه للمساکین فان اسحق خیر منک و فدی بکبش...... (رواه ابن رزین مشکواة)

اس حدیث میں مسروق کا صاف قول ہے کہ حضرت اسحاق قربان ہونے والے تھے۔

حضرت اسماعیل کے بیٹے اوران کے آباد ہونے کے مقامات

حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے تھے نبایوث، قیدار، ادبئیل، مبسام، مشماع، دوماہ، مسا، حدر، تیما، یطور، نافیش، قیدماہ۔

1 نبایوث

یہ شخص شمالی مغربی حصہ عرب میں آباد ہوا ٹھیک مقام اس قوم کے آباد ہونے کا نقشہ مرتبہ رورنڈ کاٹیری پی کیری ایم اے میں مابین 28,30 درجات عرض بلد شمالی 26,38 درجات طول بلد شرقی میں واقع ہے رورنڈ فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ قوم عرب الحجر کے وسط سے لے کر مشرق کی جانب اور وادی القریٰ کے اندر تک اور جنوب کی طرف کم از کم منتہائے خلیج عیلام اور حدود حجاز تک پھیلی ہوئی تھی اسطرابو اس سے بھی زیادہ وسیع قطعہ ان کی طرف منسوب کرتا ہے کیوں کہ وہ دو مقاموں کا ذکر کرتا ہے جو خلیج عرب پر واقع ہیں اور جن سے صریح ظاہر ہے کہ ان کی مملکت کی وسعت جنوبی اور عربی سمت میں مدینہ کی عرض بلد پر منتہی ہوتی تھی اور یہ دو مقام شہر و بندرگاہ حور یعنی بندرگاہ سفید جو ینبوع کے شمال میں ہے اور خود بندرگاہ ینبوع ہیں رورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم صرف پتھریلے بیابان عرب ہی میں نہیں بلکہ صوبجات عظیم حجاز اور نجد کے اندر تک بھی پھیلی ہوئی تھی۔

ممکن ہے کہ یہ قوم وقتاً فوقتاً اس وسیع ملک میں بھی پھیل گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ کتاب اشعیاہ نبی کے مندرجہ ذیل ورس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک نامی اور زبردست قوم تھی اور ورس یہ ہے ''تمامی گوسفنداں قیدار نزد تو گرد آمدہ تو چھائے نبایوث بکارت خواہند آمد و بر مذبحم برضا مندی بر خواہند آمد و خانہ جلال خود را جلیل خواہم کرد'' (کتاب اشعیاہ

باب20ورس7) (یعنی'' قیدار کی سب بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی نبایوث کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے وہ میرے مذبح پر مقبول ہوں گے اور میں اپنے پر شوکت گھر کو جلال بخشوں گا''

محمد اسماعیل

2 قیدار

یہ شخص بنی نبت کی جنوب کی طرف گیا اور حجاز میں آباد ہوا۔ زبور داؤد، کتاب اشعیاہ، ارمیاہ، حزقیل وغیرہ میں اس قوم کی عظمت وشوکت کی بے شمار شہادتیں ہیں اسی قوم میں سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ان کی بعثت سے خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر ظاہر ہوئی ان کی ذات پاک کے سودمند اثروں سے رفتہ رفتہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر خدا کی برکت اور خدائے واحد کی عبادت پھیل گئی اور اب تک پھیلتی جاتی ہے عربوں اور مشرقی اقوام کے ہاں بے شمار روایتیں اس قوم کے باب میں موجود ہیں مگر ہم اس مقام پر اس روایت کا بیان کرنا چاہتے ہیں جس کو رورنڈ مسٹر فارسٹر نے مستند تسلیم کیا ہے۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ'' اشعیاہ نبی کے کلام سے (جو اوپر مذکور ہے) جو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قیدار کی خیمہ گاہ اس اخیر حصہ ملک میں تلاش کرنی چاہیے۔ اس کی کما حقہ، تصدیق اسی نبی کے کلام کے ایک اور مقام سے بھی ہوتی ہے یعنی ارض قیدار کے بیان سے جس کو ہر شخص جو جغرافیہ عرب سے واقف ہوگا پہچان لے گا کہ اس قطعہ حجاز کا نہایت صحیح بیان ہے جس میں نامی شہر مکہ اور مدینہ واقع ہیں جس شخص کو زیادہ ثبوت اس مشابہت کا درکار ہو تو اس کو حجاز کا جغرافیہ جدیدہ معائنہ کرنا چاہیے جہاں کہ ینبوع کے قریب

شہر ہائے الخضیر اورنبت جواسمائے معرفہ قیداراورنبایوث کی باقاعدہ عربی شکلیں ہیں خط حد کنندہ آج تک چلا آتا ہےاورکسی قدر معنی رکھتا ہے۔''

اس کے بعد رورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ''یہاں تک تو ہم نے قیدار کے آثار جغرافیہ قدیمہ کی استعانت سے دریافت کئے ہیں اب یہ دیکھنا رہا ہے کہ یونانی اور رومی بیانات کا عربی روایتوں سے مقابلہ کرنے میں کس قدر ثبوت کی زیادتی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مؤیدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو، مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریح غیر ممکن ہے خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیداراوراس کی اولاد ابتداً حجاز میں آباد ہوئے تھے اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جومکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور خود محمد (صلعم) نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اوراعزاز کے دعوؤں کی اسی بناء پر تائید کی ہے 1۔ کہ اسمعیل کی اولاد میں قیدار کے سلسلہ سے تھے ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ کو پہنچ جاتا ہے جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدمہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کا اسی حصہ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری جانب اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیدڑی، درائی، کدرون تائی یا کدیتی کی موجودگی کی غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے'' (جغرافیہ تاریخی جلد اول صفحہ 248)

3 ادبئیل

مشرقی مورخوں نے اس شخص کی نسبت کچھ نہیں لکھا رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بیان ہے کہ کتب مقدمہ میں صرف ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور انہوں نے جو

1 قرآن مجید آنحضرتؐ کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے

(محمد اسماعیل)

جوسفس کی سند پر بیان کیا ہے کہ ادبئیل کا ابتدائی مقام سکونت اس کے بھائیوں کے قرب و جوار میں تھا اس قدر بیان کے صحیح ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا لیکن جب وہ اس کے آثار دریافت کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں اور مقاموں کے ناموں میں صرف چند حرف کی مشابہت ہونے سے اس کے آثار قرار دیتے ہیں تو اس پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔

4مبسام

حال کے جغرافیہ اور عرب کی تاریخ میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں لگتا رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بھی بیان ہے کہ اس اسمعیلی کے نام ونسل کے آثار بہ نسبت اس کے اور بھائیوں کے کم تر اور ضعیف تر ہیں پورا نام نہ قدیم جغرافیہ عرب میں پایا جاتا ہے اور نہ جدید جغرافیہ میں

5مشماع

مشرقی تاریخوں میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اگر رورنڈ مسٹر فارسٹر کی یہ بات تسلیم کی جاوے کہ سفر تکوین اور تواریخ الایام کا مشماع اور یونانی توریت کا مسما اور جوسفس نے جس کو مسماوس اور بطلیموس نے مسی مانیس اور عربوں نے بنی مسما لکھا ہے اس سے

ایک ہی شخص مشماع مراد ہے تو یہ کسی قدر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت نواح نجد میں تھا۔

6 دوماہ

اس شخص کی اولاد اول تہامہ کے جنوب میں مدینہ کے قرب و جوار میں آباد ہوئی مگر جب کہ اس کی اولاد بڑھ گئی تو نقل مکانی کرنے کے لیے مجبور ہوئی اور اس مقام پر آباد ہوئی جہاں کہ بالفعل دومۃ الجندل واقع ہے شام اور مدینہ کے درمیان اور بہت سے مقامات ہیں جن کے نام اس شخص کے نام پر ہیں رورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور مشرقی مورخوں کا بھی یہی قول ہے جس کی سند ذیل میں درج ہے۔

دومة الجندل........ و قد جاء فی حدیث الوا قدی دو ماه الجندل وعدها ابن السقفیه من اعمال المدینة سمیت بدوم ابن اسمعیل بن ابراهیم و قال الزجا جی دومان ابن اسمعیل و قیل کان لا سسمعیل ولد اسمه دما لعله مغیره منه قال ابن الکلبی دو ماه بن اسمعیل قال و لما کثر ولد اسمعیل عم بالتهامة خرج دو ماه بن اسمعیل حتی نزل موضع دومة و بنسی له حصناه فقیل دو ماه و نسب الحصن الیه..... قال ابو عبید السکونی دومة جندل حصن و قوی بین الشام والمدینه قرب جبلی طی و دومة من القریات من وادی القری. (معجم نبلدان)

7 مسا

روورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے کہنے میں کہ اس شخص کی اولاد عراق عرب (الجزیرہ) میں آباد ہوئی تھی بلاشبہ غلطی کی ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ قوم یمن میں آباد ہوئی اور اس امر کی تائید ''موسا'' کے نام سے ہوتی ہے جو اب تک یمن میں موجود ہے یہ مقام پی کیر صاحب کے نام نقشہ کے بموجب 13 درجہ 30 دقیقہ عرض بلد شمالی اور 33 درجہ 30 دقیقہ عرض بلد شرقی میں واقع ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم ابتداء نواح حجاز میں متوطن ہوئی تھی مگر اس مقام کی تنگی کے باعث بعد کو یمن میں چلی گئی جو بوجہ اپنی انتہا شادانی اور بکثرت پیداوار کے ملک حجاز پر بدرجہا فوقیت رکھتا ہے۔

8 حدد

تواریخ الایام میں اس کو ''حدد'' لکھا ہے اس شخص نے جنوبی سمت اختیار کی اور حجاز میں آ بسا اس امر کی تصدیق بے شمار بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے ہوتی ہے ایک مسلمان مورخ ''الزہیری''، ''حدد'' کو منجملہ ان بے شمار قوموں کے جن میں عرب کے باشندے منقسم تھے بالتصریح بیان کرتا ہے یمن میں شہر حدیدہ اور بنی حدد کا موجود ہونا صریح ہمارے بیان کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔

9 تیما

حضرت اسماعیل کے پہلے دو بیٹوں کے بعد باعتبار شہرت کے تیما کا درجہ ہے اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت صوبہ حجاز تھا لیکن کسی نہ کسی زمانہ میں اس کی اولاد تمام وسط نجد میں پھیل گئی اور بعض ان میں سے خلیج فارس کے ساحل کے برابر منتشر ہو گئے مگر ہم کو حضرت موسیٰ کے کلام کی تصدیق جس سے حضرت اسمعیل کے بیٹوں کی ابتدائی آبادی کی جگہ پائی جاتی ہے منظور ہے تو ہم کو اسی مقام کی تحقیق اور تدقیق پر جہاں کہ ان میں سے ہر ایک شخص نے ابتداء سکونت اختیار کی تھی زیادہ تر توجہ مبذول کرنی چاہیے اس جگہ کی نسبت جہاں کہ ان کی اولاد بعد کو جا بسی۔

10 یطور

رورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اس بات پر یقین کرنے کے واسطے کامل دلیل ہے کہ اس قوم کا ابتدائی مقام سکونت ضلع ''جدور'' تھا جبل قاسیوں کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق اور شاہ راہ حجاج کے مغرب میں

11 نافیش

مشرقی مورخ کچھ نہیں بیان کرتے کہ اس شخص نے کہاں سکونت اختیار کی تھی مگر روورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اس کی اولاد سے ایک قوم عرب کا وادی القرے میں موجود ہونا حضرت موسیٰ اور مصنف تواریخ الایام اور جوسفس کی سہ گانہ شہادت سے بلا شک واشتباہ متحقق ہے۔

12 قیدماہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ملک یمن کی نواح میں آباد ہوا کیوں کہ مسعودی کا قول ہے کہ ایک قوم موسوم بہ ''قدمان'' یمن میں تھی چناں چہ اس نے لکھا ہے۔

اصحاب الراس کانوا من ولد اسمعیل و هم قبیلتان یقال لاحد اهما قدمان ولاخری یامین و قیل دعویل و ذلک بالیمن (مروج الذهب مسعودی)

روورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں عجیب غلطی کی ہے کہ '' کاظمہ'' جو خلیج فارس پر واقع ہے اور جس کا ذکر ابوالفدا نے کیا ہے اسی قیدماہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

اولاد اسماعیل کے آثار

تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسماعیل کی اولاد کے ابتدائی مقام سکونت کے باب میں کی اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں اور اس طرح پر حضرت موسیٰ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب 25 ورس 18 میں مندرج ہے کہ وہ حویلاء سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب کہ تو اسریا کو روانہ ہوا۔

حضرت اسماعیل 4094 دنیوی مطابق 1910 قبل حضرت مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور گھر سے نکالے جانے کے وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی اگر اس مدت عمر پر بیس برس اور اضافہ کیے جاویں تو ہمارے نزدیک حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹوں کی ولادت کے واسطے کافی مدت ہوگی پس ہم اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ 4130 دنیوی یا 1874 قبل حضرت مسیح تک ان کا کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔

ان بارہ بیٹوں نے کوئی اور بڑی شہرت حاصل نہیں کی بجز اس کے کہ عرب کی بارہ مختلف قوموں کے مورث ہوئے اور اسی باعث سے یہ قومیں مختلف شعبوں اور فرقوں میں منقسم نہیں ہوئیں بلکہ یکساں حالت میں رہیں مگر ایک مدت مدید کے بعد عدنان کی اولاد جو قیدار ابن اسماعیل کی نسل میں تھا مختلف شعبوں میں متفرق ہوگئی اور کارہائے نمایاں سے شہرت حاصل کی۔

عدنان

مشرقی مورخ متفق الرائے ہیں کہ عدنان کے دو بیٹے تھے ''معد'' اور ''عک'' عک کی نسبت ان کا صرف اس قدر بیان ہے کہ وہ یمن کو چلا گیا مگر ان کتبوں سے جن کو رورنڈ مسٹر

فارسٹر نے عاد کی قوم کے کتبوں سے موسوم کیا ہے اور جو حضر موت میں بمقام ''حصن غراب دریافت ہوئے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اس ملک میں بادشاہی کی تھی یہ کتبے مذکورۃ الصدر مقام میں 1834ء میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز مسمی ''پالی نورس'' کے افسروں نے دریافت کیے تھے ان کتبوں کا پورا پورا بیان مع کتبوں کی نقل کے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل کی تیسری جلد میں ملے گا روورنڈ مسٹر فارسٹر نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ''عک'' وہاں کا فرماں روا تھا۔''

اس شاعرانہ کتبہ کی ٹھیک ٹھیک تاریخ قائم کرنے کی غرض سے رورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ ''عک'' عدنان کا بیٹا تھا اور بموجب حدیث حضرت ام سلمہ کے جو آں حضرت صلعم کی ازواج مطہرات میں سے تھیں عدنان حضرت اسماعیل سے چوتھی پشت میں تھا جس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ کتبہ مصر کے قحط سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس میں بڑی غلطی کی ہے کیوں کہ انہوں نے اس بات کے ثبوت میں کوئی کافی سند پیش نہیں کی ہے کہ آں حضرت صلعم نے عدنان کا حضرت اسمعیل کی چوتھی پشت میں ہونا کبھی بیان کیا تھا۔ انساب کی معتبر روایتوں کے بموجب عدنان آنحضرت صلعم سے بائیس پشت پہلے تھا۔ اب ایک پشت کی قدرتی میعاد پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عک انتالیسویں صدی دنیوی میں یا دوسری صدی قبل حضرت مسیح میں ہوگا۔

وائلہ ملقب بہ کلیب ابن ربیعہ بھی جو عدنان کی اولاد میں تھا بادشاہ ہوا تھا اور یمن والوں سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔

زھیر ابن جذیمہ اور نیز قیس ابن زہیر بھی باری باری سے حجاز کے بادشاہ ہوئے تھے مگر ان لوگوں کی تاریخیں معین کرنے کے واسطے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اس لیے ہم کسی قدر تیقن کے ساتھ تاریخیں قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن خیال کرتے ہیں کہ یہ وہی

زمانہ ہوگا جب کہ سلطنت یمن اور سلطنتیں حال زوال میں تھیں۔

آنحضرت صلعم عدنان کی نسل سے ہیں

عدنان کی نسل میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 4570 دنیوی یا 570ء میں پیدا ہوئے اور تمام جزیرہ نمائے عرب پر دینی اور دنیوی حکومت حاصل کی عیسائی مصنفوں نے آنحضرت صلعم کے نسب نامہ کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے اور اس کو غیر مثبت قرار دینے کے لیے سعی بے حاصل کی ہے اور یہ مناسب موقع تھا کہ ہم بھی اس بحث میں شامل ہوتے اور عیسائی مصنفوں کے ہر ایک اعتراض کی تردید کرتے لیکن جو کہ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون پر ایک جداگانہ خطبہ لکھیں گے اس لیے بالفعل اس بحث کا ملتوی کر دینا مناسب ہے۔

دوئم ابراہیمی یا بنی قطورہ

توریت مقدس میں لکھا ہے ''و دیگر ابراہیم زنے گرفت کہ اسمش قطوراہ بود و برایش زمران و یقشان و مدان و مدیان و یشباق و شرح را زائید و یقشان شبا و ودان را تولید نمود و پسران ودان اشوریم ولطّوشیم ولومیم بودند و پسران مدیان عیفاہ و عیفر و حنوک و ابیداع و الداعاہ بودند تمامی ایشان پسران قطوراہ بردند پس ابراہیم تمامی مایملک خود را بہ اسحٰق داد'' (سفر تکوین باب 25 ورس 1 لغایت 5)

یہ سب لوگ عرب کو چلے گئے اور اس قطعہ میں آباد ہوئے جو حدود حجاز سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے اور ان کے نشانات اب تک جو اس ملک میں واقع ہیں پائے جاتے ہیں۔

انہی ابراہیمیوں میں سے حضرت شعیب نبی کو خدا تعالیٰ نے اقوام عائکہ اور مدیان کو اپنی خالص عبادت کی تلقین اور ہدایت کرنے کے واسطے معبوث کیا تھا۔

مگر ہم ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی کس زمانہ میں ہوئے تھے لیکن اگر ہم پٹر و کا ھن مدیان کو جن کا ذکر سفر خروج باب 18 ورس 1,2 میں ہے اور شعیب کو ایک ہی شخص خیال کریں جیسا کہ عرصہ دراز سے لوگوں کو گمان ہے تو البتہ یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ یہ نبی اس وقت میں تھے جب کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تھے۔

سوم ادومی یا بنی عیسو

عیسو یعنی ادوم کی تین بیویاں تھیں عاداہ، اھلیبا ماہ، باسمث ، دختر حضرت اسماعیل و خواہر نبایوث، پہلی بیوی سے ''الی فز'' پیدا ہوا دوسری بیوی سے یعوش اور یعلوم اور قورح پیدا ہوئے تیسری سے رعوئیل پیدا ہوا الی فز کے بیٹے تیماں، اومر، سفو، گعتم ،قنز، عمالیق تھے رعوئیل کے بیٹے نحث ، زرح، شماۃ ،مزاہ پیدا ہوئے (سفر تکوین باب 36)

عیسو کی تمام اولاد قریباً قریباً کوہ سیعیر کے قرب و جوار میں آباد ہوئی تھی بعض نے ان میں سے اپنی سکونت عرب الحجر میں اور حجاز کی شمالی سرحد پر اختیار کی تھی مگر ان لوگوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ اسی وجہ سے بعض مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسو کی اولاد کبھی عرب میں آباد نہیں ہوئی۔

چہارم، بنی ناحور

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ '' عوص'' اور'' بوز'' (دیکھو سفر تکوین باب 22 ورس 21) پسران ناحور برادر ابراہیم شمالی عرب کی بے شمار قوموں کے مورث تھے اوراس کی سند میں کتاب ایوب باب 1 ورس 1 اور نباحاث یرمیاہ باب 4 ورس 21، در کتاب یرمیاہ باب 25 ورس 20 کا حوالہ دیتے ہیں۔

پنجم بنی ھاران

سر ولیم میور لکھتے ہیں'' یہ قوم بہ نسبت دیگر اقوام متذکرہ بالا کے سب سے زیادہ شمال کی جانب رہتی تھی ان کے نہایت جنوبی مقامات بحر لوط (ڈڈسی) کے مشرق میں واقع تھے اوران میں عمدہ سبزہ زار'' بلکا'' اور'' کرک'' کے شامل تھے۔''

ہاران کے بیٹے حضرت لوط تھے حضرت لوط کے بیٹے مواب اور بنی عمی تھے توریت مقدس میں ان کے پیدا ہونے کا نہایت ناپاک واقعہ اس پر طرح لکھا ہے'' ولوط از صوعر برآمدہ ودرکوہ ساکن شدودودختر انش بہ ہمراہش زیراکہ ازسکون درصوعر ترسیدواوودودختر انش درمغارہ ساکن شدند، ودختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ پدر ما پیر شدو کسے درزمین نیست کہ موافق عادت کل زمین بما درآید۔ بیا پدر خودراشراب بنوشانیم و با او بخوابیم واز پدر خود نسلے را زندہ نگاہ داریم پس دراں شب پدرخویشتن را شراب نوشانیدند و دختر بزرگ داخل شدہ با پدر خود خوابید واونہ بوقت خوابیدنش ونہ بوقت برخاستنش اطلاع بہم رسانید وروز دیگر واقع شدکہ دختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ اینک دی شب با پدر خود خوابیدم امشب نیز اور راشراب بنوشانیم وتو داخل شدہ با او بخوابی واز پدرخود نسلے را زندہ نگاہ داریم وآں شب نیز پدرخودراشراب نوشانیدند ودختر کوچک برخاستہ با اوخوابید کہ اونہ بوقت خوابیدنش ونہ بوقت

برخاستنش اطلاع بہم رسانید و دو دختر لوط از بدر خود شان حاملہ شدند و دختر بزرگ پسرے را زائید و اسمش را مواب نامید کہ بحال پدر موابیاں او است و دختر کوچک او نیز پسرے را زائید و اسمش را بن عمی نامید کہ تا بحال پدر بنی عموں اوست'' (سفر تکوین (پیدائش) باب 19 ورس 30 لغایت 38) یعنی'' اور لوط صغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیوں کہ اسے صغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بوڑھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے موافق ہمارے پاس آئے آؤ ہم اپنے باپ کو شراب پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں۔ تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو شراب پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی لیکن اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھو کل رات میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی آؤ آج رات بھی اسے شراب پلائیں اور تو بھی جا کر اس سے ہم آغوش ہو تا کہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں سو اس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو شراب پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی، لیکن اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام مواب رکھا وہی موابیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں اور چھوٹی سے بھی ایک بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام بن عمی رکھا وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں'' محمد اسماعیل

حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں کی نسبت جو کچھ اس مقام میں لکھا ہے عیسائی اس سب کو قبول کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنی صلبی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی مگر ایسا یقین کرنا درحقیقت تضحیک کے قابل ہے اگر ایسا ہوا ہوتا تو کیا یہ ایک مقدس شخص

کی تہذیب اور متانت کے متناقض نہیں ہے؟ اور کیا حضرت لوط جیسے پاک شخص کے خلاف شان نہیں ہے؟

مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اور قرآن مجید میں اگر چہ لوط کا قصہ ہے مگر اس میں یہ بات کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی مذکور نہیں ہے۔

توریت مقدس میں جو کچھ بیان ہے اس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ جو معنی عیسائی مصنفوں نے لیے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں آٹھویں ورس میں لوط کا قول لکھا ہے کہ ''مرا دو دختر یست کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکہ ایشاں را بہ شما بیروں آورم و با ایشاں آں چہ در نظر شما پسند است بکنید'' (یعنی ''میری دو لڑکیاں ہیں جو مرد سے واقف نہیں مرضی ہو تو میں ان کو تمہارے پاس لے آؤ اور جو تم کو بھلا معلوم ہوتی ہے کرو'' محمد اسماعیل

قرآن مجید میں اس جگہ تثنیہ کا لفظ نہیں ہے بلکہ جمع کا ہے جیسا کہ سورہ ھود میں ہے

''ھولاء بناتی ھن اطھر لکم''

اور سورہ حجر میں ہے

قال ھولاء بناتی ان کنتم فاعلین

مسلمان عالموں کا قول مختار یہ ہے کہ لفظ ''بنات'' سے حضرت لوط کی صلبی بیٹیاں مراد نہیں ہیں بلکہ قوم کی عورتیں مراد ہیں اور یہ بات حضرت لوط نے اس مراد سے کہی تھی جیسے کہ وہ ہمیشہ ان کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ تم اپنی خراب عادت فعل خلاف فطرت انسانی کو چھوڑو اور عورتوں سے نکاح کرو اور ان کے ساتھ رہو کہ وہ تمہارے لیے پاکیزہ زندگی ہے۔

توریت مقدس میں اس مقام پر لفظ بنوت آیا ہے جو بمعنی بنت کے ہیں مگر جس طرح عربی زبان میں بنت کا استعمال سوائے اصلی بیٹیوں کے اور عورتوں پر بھی ہوتا ہے اسی طرح عبری زبان میں بھی عام عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم اسمتھ کی عبرانی ڈکشنری میں لفظ''

بث‘‘اور’’بنوث‘‘ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عام عورتوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ کتب امثال سلیمان باب 31 ورس 29 میں استعمال ہوا ہے پس اس مقام میں بھی اس لفظ سے اصلی بیٹیاں مراد نہیں ہیں عورتیں مراد ہیں بلکہ غالباً لونڈیاں کیوں کہ حضرت لوط کی جو بیٹیاں تھیں جیسے کہ سفر تکوین باب 19 ورس 12 میں لکھا ہے ان کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کے شوہر موجود تھے۔

جب حضرت لوط سدوم سے فرار ہوئے تو ان کے داماد اور ان کی بیٹیاں ان کے ساتھ نہیں گئے صرف حضرت لوط کی بیوی اور وہی دو عورتیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور جن کو بیٹیاں کر کے تعبیر کیا ہے اور جو غالباً لونڈیاں تھیں ساتھ گئی تھیں رستہ میں ان کی بیوی زندہ نہیں رہی صرف دو چھوکریاں ان کے ساتھ تھیں۔

قرآن مجید میں اگرچہ اس مقاربت کا جو مغائرہ کوہ میں ان دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کے ساتھ کیا کچھ ذکر نہیں ہے لیکن جو کچھ کہ توریت مقدس میں لکھا ہے اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جاوے تو بھی ان دونوں چھوکریوں کا حضرت لوط کی اصل بیٹیاں ہونا اسی وجہ سے جو ہم نے اوپر بیان کی قابل یقین نہیں ہے اور جب کہ وہ لونڈیاں تھے تو ان کے ساتھ مقاربت گو کہ وہ دھوکے ہی سے ہو بموجب اس زمانہ کی شریعت کے ناجائز نہ تھی۔

سفر تکوین باب 19 ورس 32,34 میں لکھا ہے کہ ان دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کو باپ کہہ کر تعبیر کیا ہے اس کہنے سے بھی ان چھوکریوں کا اصلی بیٹیاں ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ باپ کا لفظ بہت زیادہ ہے اور اس کا اطلاق مالک اور بزرگ شخص پر عموماً ہوتا ہے۔

سر ولیم میور کے اس بیان کو کہ بنی عمان عرب کے کسی حصہ میں آباد نہیں ہوئے بلکہ شمال ہی میں رہے ہم تسلیم نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے نزدیک بنی عمان خلیج فارس کے برابر

برابر بستے تھے اوران کا نام اب تک اس حصہ عمان میں پایا جاتا ہے جوتمام قطعہ کے درمیان موجود ہے اگر بنی عمان عرب میں آباد نہیں ہوئے تھے جیسے کہ سرولیم میور کی رائے ہے تو ان کو اقوام عرب میں شمار کرنا مناسب نہ تھا۔

تمام عرب المستعربہ میں جو ترح کی نسل سے ہیں صرف بنی اسمعیل ہی کی کثرت ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد مختلف قوموں اور شعبوں میں منقسم ہو گئے مگران کے مقابل کی قومیں ایک سکون اور غیر مبدل حالت میں رہیں۔

جب کہ ہم ان قوموں کے شعبوں کا شمار اور حال بیان کریں گے تو یہ بات ظاہر ہو گی کہ ایک قوم کے کسی شخص کو اپنی قوم چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا اگر بالکل ناممکن نہ تھا تو حد سے زیادہ دشوار تو ضرور تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں تمدنی حالت نہایت محدود تھی اور لوگ اپنے مورثوں کے کارہائے نمایاں کی بڑی عظمت کرتے تھے اوران کو فخریہ یاد رکھتے تھے اور ہر ایک شریف قوم کا آدمی خودسرائی کا بندہ تھا اور بالتخصیص عرب کی مختلف قومیں اپنی قوم کے امتیاز موجودہ کو قائم اور برقرار رکھنے اور اپنی قوم کو اور قوموں کی ملاوٹ سے علیحدہ رکھنے میں نہایت درجہ محتاط تھیں۔

مندرجہ فہرست ان قوموں کی ہے جوسکون اور غیر مبدل حالت میں رہیں

1 بنی ناحور ابن ترح سے، بنوناحور،

2 ہاران ابن ترح سے، بنو ہاران

3 مواب ابن لوط سے ابن ہاران ابن ترح سے، بنو موآب

4 عمان ابن لوط سے بنو عمان

5 اولاد ابراہیم سوائے اولاد اسمعیل سے، بنو ابراہیم

6 اولاد ابراہیم بطن قطورہ سے، بنو قطورہ

7 عیسو عرف ادوم ابن اسحاق ابن ابراہیم سے بنو ادوم

مندرجہ ذیل قومیں اسمعیل کی اولاد میں ہیں جو بمقابل اور قوموں کے بہت جلد بڑھ گئیں اور عرب کے تمام ملک میں پھیل گئیں۔

8 اسمعیل ابن ابراہیم سے، بنو اسمعیل، مگر اسمعیل کے باہ بیٹوں کے نام سے علیحدہ علیحدہ بارہ قومیں چلیں

9 بنایوث سے، بنو بنایوث

10 قیدار سے، بنو قیدار

11 ادبئیل سے بنو ادبئیل

12 مبسام سے، بنو مبسام

13 مشماع سے، بنو مشماع

14 دوماہ سے، بنو دوماہ

15 مسا سے، بنو مسا

16 حدر سے، بنو حدر

17 تیما سے بنو تیما

18 یطور سے، بنو یطور

19 نافش سے، بنو نافش

20 قید ماہ سے، بنو قید ماہ

حضرت اسمعیل کے بارہ بیٹوں میں سے قیدار کی اولاد نے ایک عرصہ کے بعد شہرت حاصل کی اور مختلف شاخوں میں متفرع ہوگئی۔ مگر بہت صدیوں تک یہ بھی اپنی اصلی حالت پر رہی اور مدت تک ان میں ایسے لئیق اور نامی اشخاص جنہوں نے اپنی لیاقتوں اور عجیب و غریب قابلیتوں کی وجہ سے نامور ہونے کا استحقاق حاصل کیا ہو یا سلطنتوں اور قوموں کے بانی ہوئے ہوں پیدا نہیں ہوئے اور اسی وجہ سے قیدار کی اولاد کی تاریخ کے سلسلہ کو مرتب کرنے میں بہت سی صدیوں کا فصل واقع ہوجاتا ہے مگر یہ ایک ایسا امر ہے جس سے عرب کی قومی اور ملکی روایت کی جو حضرت اسمعیل کی نسبت چلی آتی ہے کما حقہ، تصدیق ہوتی ہے۔ کیوں کہ ایک جلاوطن ماں اور بیٹے کی اولاد کی کثرت اور ترقی کے واسطے جو ایسی بیکس اور مصیبت زدہ حالت میں خانہ بدر کی گئی تھی ضرور بلکہ یقیناً ایک عرصہ درکار ہوا ہوگا خصوصاً ایسی ترقی کے واسطے جس نے انجام کار ان کو دنیا کی تاریخ میں ایک نہایت نامور اور ممتاز جگہ پر پہنچایا اور ان کی اولاد نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں کئے جن کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ہم عرب کی تاریخ میں قیدار کی اولاد میں اس قوم کی ابتدا سے اس وقت تک کہ اس کو شہرت ہوئی آٹھ نام پاتے ہیں یعنی حمل، نابت، سلامان، الھمیسع، الیسع، آدد، اد، عدنان

یہ وہی عدنان ہے جس کا بیٹا عک یمن کا بادشاہ ہوا تھا اور جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں

مندرجہ ذیل قبائل عدنان کی اولاد میں ہیں

21 ایاد ابن معد ابن عدنان سے، ایادی

22 قنص ابن معد سے، قنصی

23 مضر ابن نضر ابن معد کے، بنو مضر

24 ربیع ابن نضر ابن معد کے، بنو ربیعہ

25 اسد ابن ربیع سے، بنو اسد

26 صبیعہ ابن ربیعہ سے، بنو صبیعہ

قبائل ذیل صبیعہ کی اولاد میں ہیں

27 بنو ابو الکلب 28 بنو شحنہ

29 جدیلہ ابن اسد ابن ربیعہ سے، بنو جدیلہ

30 عنزہ ابن اسد سے، بنو عنزہ

31 عمیر ابن اسد سے، بنو عمیر

32 عبدالقیس ابن اقصی ابن دومی ابن جدیلہ سے بنو عبدالقیس

33 الدیل ابن شن ابن اقصیٰ ابن عبدالقیس سے، بنو الدیل شنی

قبائل ذیل الدیل کی اولاد میں ہیں

34 بنو بحشہ

35 ضوحاں ابن وادیہ ابن نکیر ابن اقصیٰ ابن عبدالقیس وائلہ سے، بنو وائلہ

36انمار ابن عمر وابن وادیہ سے، بنوانمار

37 عجل ابن عمرو سے، بنوعجل قیسی

38 **محارب ابن عمر**و سے، بنوالمحارب

39الدیل ابن عمرو سے، بنوالدیل

قبائل ذیل الدیل کی شاخ ہیں

40بنوصوحان

41العواق ابن عمر وابن وادیہ سے، بنوالعوق یا عوقی

42اولاد بکر ابن ھیب ابن عمر وابن غنم ابن تغلب، ابن وایل ابن قاست ابن حنب اقصیٰ ابن دومی ابن جدیلہ سے، الاراقم

43 بکر ابن وایل ابن قاست سے، بنوبکر

44 ثعلب ابن وایل ابن قاست سے، بنوثعلب

قبائل ذیل ثعلب کی اولاد میں ہیں

45بنوعکب

46بنوعدی

47بنوکنانہ یا قریش ثعلب

48بنوازھیر

49بنوعتاب

50 غنم ابن حبیب ابن کعب ابن یشکر ابن وایل سے، بنو غنم

51 لجیم ابن صعب ابن علی ابن بکر سے، بنو لجیم

قبائل ذیل لجیم کی اولاد میں ہیں

52 بنو حفان

53 بنو عجل

54 اولاد مالک ابن صعب سے، بنو ازمان

55 ذھل ابن ثعلبہ ابن عقبہ ابن صعب سے، بنو ذھل

56 شیبان ابن ثعلبہ سے، بنو شیبان

قبائل ذیل شیبان کی اولاد میں ہیں

57 بنو الورثہ

58 بنو الجدر

59 بنو الشقیقہ

60 اولاد تیم اللات ابن ثعلبہ سے اللہازم

61 سدوس ابن شیبان اہل زہل سے، سدوسی

62 قمعہ عرف قیس عیلان ابن الیاس ابن مضر سے، قیس عیلانی یا بنو قیس

63 عمر ابن قیس عیلان، بنو عمرو

قبائل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں

64 بنو خارجہ

65 بنو وابش

66 بنو یشکر

67 بنو عوف

68 بنو رہم

69 بنو رباح

70 سعد ابن قیس عیلان سے، بنو سعد

71 غطفان ابن سعد سے، بنو غطفان

72 معن ابن عسر ابن سعد سے، بنو معن

73 غنی ابن عسر سے، بنو غنی

قبائل ذیل غنی کی اولاد میں ہیں

74 بنو ضبینہ

75 بنو بہثہ

76 بنو عبید

77منبہہ ابن عسر سے، بنومنبہہ

قبائل ذیل منبہہ کی اولاد میں ہیں

78بنوحسر 79بنوستان

80اشجع ابن غطفان ابن صعب سے، بنواشجع

قبائل ذیل اشجع کی شاخ ہیں

81بنودھمان

82ذیبان ابن بغیض ابن رالیس ابن غطفان سے، بنوذبیان

قبائل ذیل ذبیان کی اولاد میں ہیں

83بنوفزارہ 84بنوالعشر اء

85عبس ابن بغیض سے، بنوعبس

86سعد ابن ذبیان ابن بغیض، بنوسعد

قبائل ذیل سعد کی اولاد میں ہیں

87 بنوجحاش
88 بنوسبیع
89 بنوحشور
90 خصفہ ابن قیس عیلان سے، بنوخصفہ

قبائل ذیل خصفۃ کی شاخ میں

91 بنوجسر
92 ابو مالک بن عکرمہ ابن خصفہ سے، بنوابو مالک
93 منصورابن عکرمہ سے، بنوسلیم

قبائل ذیل منصور کی اولاد میں ہیں

94 بنوحرام
95 بنوخفاف
96 بنوسمان
97 بنورعل
98 بنوذکوان
99 بنومطرود
100 بنوبہز
101 بنوتنفذ
102 بنورفاعہ
103 بنوشرید
104 بنوقبۃ
105 سلامان ابن عکرمہ سے، سلامنی
106 ہوازن ابن منصور سے، بنوہوازن

107 مازن ابن منصور سے، بنو مازن

108 سعد ابن بکر ابن ہوازن سے، بنو سعد

109 نصر ابن معاویہ ابن بکر سے، بنو نصر

110 مرہ ابن صعصعہ ابن معاویہ سے، بنو مرہ یا بنو سلول

111 نمیر ابن عامر ابن صعصعہ سے، نمیری

112 ہلال ابن عامر سے، بنو ہلال

113 ربیعہ ابن عامر سے، بنو مجد

114 اولاد عمرو ابن عامر سے، بنو البکا

115 معاویہ ابن کلاب ابن ربیعہ سے، بنو معاویہ

116 جعفر ابن کلاب سے، بنو جعفر

117 اولاد ابن عمرو ابن کلاب سے، بنو ددان

118 اولاد عبداللہ ابن کعب ابن ربیعہ سے، بنو العجلان

119 اولاد قشیر ابن کعب سے، بنو ضمرہ

120 اولاد منبہ ابن ہوازن سے، ابو ثقیف

قبائل ذیل ابو ثقیف کی اولاد میں ہیں

121 بنو مالک　　　122 بنو احلاف

123 طانجہ ابن الیاس ابن مضر سے، بنو طانجہ، یا بنو خندف

124 تیم ابن عبد منات ابن عدا ابن طانجہ سے، بنو تیین

125 عدی ابن عبد منات سے، بنو عدی

126 ثور ابن عبد منات سے، ثوری

قبائل ذیل عبد منات کی اولاد میں ہیں

127 الرباب

128 بنو نصر

129 بنو مازن

130 بنو السیل

131 بنو عایذہ

132 بنو تیم اللات

133 بنو زبان

134 بنو عوف

135 بنو شئیم

136 بنو الزہل

137 بنو بجالہ

138 مزینہ ابن عد ابن طانجہ سے، مزنی

قبائل ذیل ظاعنہ کی شاخ ہیں

140 بنو صوفہ

141 تمیم ابن مر سے، بنو تمیم

قبائل ذیل تمیم کی اولاد میں ہیں

142 جطات

143 بنوعصیہ

144 البراجم

145 بنوکلیب

146 بنوریاح

147 بنومرہ

148 بنومقرہ

149 بنوحمان

150 بنوحنظلہ

151 بنودارم

152 بنوعدویہ

153 بنولطیہہ

154 آل صفوان

155 آل عطارد

156 بنوعوف

157 مدرکہ ابن الیاس ابن مضر سے، بنومدرکہ بنوخندف

158 حذیل ابن مدرکہ سے، بنوحذیل یا حذیلی

159 تمیم ابن سعد ابن حذیل سے، بنوتمیم

160 حریب ابن سعد سے، بنوحریب

161 مناعہ ابن سعد سے، بنومناعہ

162 خناعہ ابن سعد سے، بنوخناعہ

163 جہم ابن سعد سے، جہمی

164 غنم ابن سعد سے، غنمی

165 حرث ابن سعد سے، حرثی

166 خزیمہ ابن مدرکہ سے، بنوخزیمہ

167 الہوم ابن خذیمہ سے، بنوالہون

قبائل ذیل الھون کی اولاد میں ہیں

168 بنوالقارہ
169 عضلی
170 الدیشی
171 اسد ابن خزیمہ سے، بنو اسد
172 دودان ابن اسد سے، دودانی
173 کاہل ابن اسد سے، کاہلی
174 حملہ ابن اسد سے، حملی
175 عمرو ابن اسد سے، عمری

قبائل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں

176 بنو فقعس
177 بنوالصیدا
178 بنو نصر
179 بنوالزینہ
180 بنو عاضرہ
181 بنو نعامہ
182 کنانہ ابن خزیمہ سے، بنو کنانہ
183 مالک ابن کنانہ سے، ابو مالک

قبائل ذیل مالک کی اولاد میں ہیں

184 بنوفقین

185 بنوفراس

186 بنوبجر

187 ملکان ابن کنانہ سے، بنوملکان

188 عبدمنات ابن کنانہ سے، بنوعبدمنات

قبائل ذیل عبدمنات کی اولاد میں ہیں

189 بنومدلج

190 بنوجزیمہ

191 بنولیث

192 بنوالدیل

193 بنوضمر ہ

194 بنوغفار

195 بنوعریج

196 عمروابن کنانہ سے، عمریون

197 عامرابن کنانہ سے، عامریون

قبائل ذیل کنانہ کی شاخ ہیں

198 الاحابیش

199 نضر ابن کنانہ سے، بنوالنظر

200 مالک ابن نضر سے، بنو مالک

201 الحرث ابن مالک سے مطیبین

قبائل ذیل الحرث کی شاخ ہیں

202 بنو الخلج

203 فہر ابن مالک سے، بنوفہر یا قریش

204 محارب ابن فہر سے، بنو محارب

205 غالب ابن فہر سے، بنو غالب

206 تیم ابن غالب سے، بنوتیم یا بنوالادرم

207 لوی ابن غالب سے، بنولوی

208 عامر ابن لوی سے، بنو عامر

قبائل ذیل عامر کی اولاد میں ہیں

209 حسل

210 معیص

211 سامہ بن لوی سے، بنوسامہ

212 سعد ابن لوی سے، بنوسعد

قبائل ذیل سعد کی شاخ ہیں

213 بنانہ

214 خزیمہ ابن لوی سے، بنو خزیمہ

قبائل ذیل خزیمہ کی شاخ ہیں

215 بنو عایذہ

216 حرث ابن لوی سے، بنو الحرث

217 عوف ابن لوی سے، بنو العوف

218 کعب ابن لوی سے، بنو کعب

219 عدی ابن کعب سے، بنو عدی

220 ہصیص ابن کعب سے، بنو ہصیص

قبائل ذیل ہصیص کی اولاد میں ہیں

221 بنو سہم　　　222 بنو جمح

223 مرہ ابن کعب سے، بنو مرہ

224 تیم ابن مرہ سے، بنو مرہ

225 مخزوم ابن مرہ سے، بنومخزوم

226 کلاب ابن مرہ سے، بنوکلاب

227 زہرہ ابن کلاب سے، بنوزہرہ

228 قصی ابن کلاب سے، بنوقصی یا مجمع

قبائل ذیل کلاب کی اولاد میں ہیں

229 نوفلییوں

230 عبدالدار ابن قصی سے، داری

قبائل ذیل عبدالدار کی شاخ ہیں

231 شیبی

232 امیہ ابن عبدالشمس ابن عبدمناف ابن قصی سے، بنوامیہ

233 ہاشم ابن عبدمناف سے، بنوہاشم

234 عبدالمطلب ابن ہاشم سے، بنومطلب

235 عباس ابن عبدالمطلب سے، عباسی

236 علی ابن ابوطالب ابن عبدالمطلب سے، علوی

237 فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے، سادات بنی فاطمہ علیہا السلام

اس مطلب سے کہ اقوام مذکورہ بالا کا سلسلہ بخوبی ذہن نشین ہوجائے اور آسانی سے

سمجھ میں آجائے، اس مقام پر ایک شجرہ عرب مستعربہ کی قوموں کا شامل کیا جاتا ہے۔

عرب کی قوموں کے بیان کو ختم کرتے وقت اس بات کا بیان کرنا مناسب ہے کہ عرب میں ایک دستور تھا کہ ایک ضعیف قوم یا وہ قوم جو زوال کی حالت میں پڑ جاتی تھی اکثر اپنے آپ کو کسی زبردست قوم میں ملا دیتی تھی۔ اس اختلاط کے مقصد کو نہ سمجھنے سے غیر ملک کے مورخ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ایسا اختلاط نسب کے اختلاط سے علاقہ رکھتا ہے اور اس کے بعد وہ دونوں قومیں ایک ہی لقب یعنی زبردست قوم کے لقب نسبی سے ملقب ہو جاتی تھیں اور اسی بناء پر ان کا مقولہ ہے کہ عرب کی قومیں انقلابات اجتماع کے ہمیشہ زیر مشق رہی ہیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیوں کہ وہ دونوں قومیں اس طرح پر مخلوط نہیں ہوتی تھیں کہ ایک ہی مورث اعلیٰ کی نسل سے خیال کی جاتی ہوں بلکہ اس اختلاط کے یہ معنی تھے کہ زبردست قوم زبردست قوم کے تابع اور اس قوم کے قوانین اور رسم و رواج کی پابند ہو جاتی تھی اور ضرورت کے وقت اور ہر ایک امر میں اس قوم کی ساتھی اور مددگار ہوتی تھی دونوں قوموں کے آدمی ایک ہی نامی سردار کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے تھے اور اگر ان دونوں قوموں کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا۔ جس کے عوض تمام قوم سے تاوان لیے جانے کا دستور تھا تو وہ تاوان برابر دونوں قوموں پر عاید ہوتا تھا۔

انگریزی لفظ ''سراسین'' کی تحقیق

اس خطبہ کے ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ لفظ ''سراسین'' کی بابت جو یونانیوں نے زمانہ جاہلیت کے بعض عربوں کی نسبت استعمال کیا ہے اور جس کا اطلاق انجام کار تمام جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں پر قبل ظہور اسلام اور نیز بعد ظہور اسلام ہو گیا ہے

کچھ گفت گو کی جاوے۔ متعدد مورخوں نے اپنی ذہانت کو اس لفظ کے ماخذ کے بیان کرنے کی کوشش میں صرف کیا ہے اور ہر ایک نے ایک نیا ڈھنگ اس کے ماخذ تلاش کرنے کا اختیار کیا ہے جس نے بارہا پرانے تعصّبات کو ظاہر کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات کافی ہے کہ رورنڈ پوکاک صاحب نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے بعینہ اس کو اس مقام پر ترجمہ کر دیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ اس مضمون پر ہمارے مصنفوں نے اب تک جو کچھ چھاپا ہے اس میں کسی جگہ میں اس امر کی قابل اطمینان دلیل نہیں پاتا ہوں کہ وہ لوگ جو پہلے عرب کہلاتے تھے آخر میں ''سراسین'' کے نام سے کیوں موسوم ہوئے جن لوگوں نے کہ اس نام کو ''سرح'' سے مشتق کیا ہے ان کی رائے کی کماحقہ، تردید ہوگئی ہے اب عموماً یہ گمان ہے کہ یہ نام ''سرق'' (چوری) سے نکلا ہے جس سے ایک وحشی اور لٹیری قوم سے صریح مراد ہے۔ مگر یہ نام ان کو کہاں سے ملا ہے؟ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ نام خود انہیں کے ہاں سے نہیں شروع ہوا ہوگا۔ بلکہ کسی اور قوم کی زبان سے یہ لفظ لیا گیا ہے کیوں کہ عرب ایسے نام کو جو بموجب رسوائی اور ذلت کا ہے اپنے لیے کب گوارا کرتے۔ اب عالموں کو یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ آیا ان لوگوں کے نام کو جو عام طور پر علانیہ قزاقی اور رہزنی کے لیے مشہور ہیں لفظ ''سرق'' سے مشتق کرنا جائز ہوسکتا ہے جس کے معنی خفیہ چوری کرنے کے ہیں یا نہیں اب اگر کوئی ''سراسین'' کی تحقیق میں میری تبعیت کرنا چاہے تو اس کو اپنی آنکھیں شرق کی طرف کھولنی چاہئیں کس واسطے کہ ''سراسینس'' اور ''سراسی نائے'' کی آواز میں ''شرقی'' اور اس کی جمع ''شرقیوں'' اور ''شرقین'' کی نسبت کیا فرق ہوگا جس کے معنی اہل الشرق یعنی باشندگان شرق کے ہیں جس طرح کہ سابق میں عربوں کو علی الخصوص یہودی خیال کرتے تھے کیوں کہ اس کی سرزمین کا شرقی حصہ (حسب قول طلسیطوس) عرب میں محدود ہے اسی

طرح توریت مقدس (سفر تکوین باب 10 ورس 30 (یقطان کی اولاد کو جو عرب تھی مشرق میں بیان کرتی ہے یعنی ساحل کے اس حصہ پر جو مابین ''مبشام'' اور ''سفار'' کے جو مشرق میں ایک پہاڑ ہے واقع ہے یعنی اگر ''آرساڈیاس'' قابل اعتبار ہو

''من مكة الى تجئى مدينة الجبل الشرقى''

یعنی مکہ سے وہاں تک کہ تم اس مشرقی پہاڑ کے شہر تک آؤ یا جیسا کہ مسودہ ''کوڈیکس'' میں مرقوم ہے

''اى المدينة الشرقى''

یعنی مشرقی شہر تک (جس سے میری دانست میں مدینہ منورہ مراد ہے جو جانب شرق واقع ہے حضرت سلیمان کی عقل تمام اہل الشرق کی عقل سے بڑھ کر خیال کی گئی ہے یعنی (حسب بیان اس یہودی کے گو وہ کوئی ہو جس نے کہ صحف ملوک کا عربی میں ترجمہ کیا ہے (''سراسین'' یا عربوں کی عقل سے اس طرح یرمیاہ بنی (باب 49 ورس 28) میں اعراب بنی قیدار کو ''اہل الشرق'' کہا ہے علامہ ''ہیوگوگروشیس'' بیان کرتا ہے کہ عیسائیان سابق کی یہ رائے تھی کہ وہ علا جو حسب بیان متی حواری (باب 2) پرستش کو آئے تھے ملک عرب سے آئے تھے اور اس کا خود بھی یہی عقیدہ تھا نناسوس (فولیس میں) لکھتا ہے کہ میں نے اپنی سفارت کی جو بجانب بنی عشوفیہ، بنی حمیر، اور سراسین اور دیگر اقوام پرستش کنندہ کی تھی تعمیل کر دی اس لیے ''سراسینس'' کا اور مشرقی اقوام کے زمرہ میں شامل ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ مشرق میں آباد تھے محمد الفروز آبادی صفی الدین اور لوگوں کا بیان ہے کہ مشرق کے چند اور مقامات بھی بدیں وجہ کہ وہ مشرق کے اور حصوں میں واقع تھے بنام ''شرقہ'' و ''شرقیہ'' موسوم تھے اور ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ ایسے مقامات کے باشندے اہل الشرق کہلاتے ہیں ایسی ہی دلیل سے ان لوگوں کو بھی جو ایسے ملک میں بستے ہوں کہ بلحاظ

اور ملکوں کے ''الشرق'' یعنی پورب کہلاتا ہو اسی نام سے ملقب کیوں نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ اپنے اور ان لوگوں کے درمیان جو اپنی ہی بولی میں اپنے آپ کو مغربی یعنی باشندہ جزیرہ موری تانیا کہتے ہیں کس طرح پوری پوری تمیز کر سکتے ہیں اسی طرح سے جیسے کہ باشندہائے ملک مغرب ''المغاربہ'' کہلاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو عرب میں متوطن ہیں ''مشارقہ'' یا ''سراسینس'' کہے جاسکتے ہیں اور یہ نام ان کی عدات واوضاع کے لحاظ سے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ باعتبار ان کی جائے سکونت کے رکھا گیا ہے اسی طرح سے تم اس مشہور ومعروف حکیم بو علی سینا کی اس نامی کتاب کا نام ''سراسینگ فلاسفی'' یعنی ''الفلسفہ المشرقیہ'' کچھ اس کی جاہلیت کی وجہ سے نہیں کہتے ہو بلکہ اس کے مشرقی ہونے کے سبب سے رہی یہ بات کہ عربی حرف ش کا یونانی کی مانند تلفظ ہوا ہے اس سے کوئی دشواری نہیں ہوتی کیوں کہ وہ عبرانی حرف کا بھی اسی طرح تلفظ کرتے تھے لفظ ''سرائیس'' کا ایک اور مادہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ''شرک'' اس واسطے کہ وہ خدائے واحد کے شریک قرار دیتے تھے لیکن یہ نام جو قدیمی عربوں کی نسبت اس قدر موزوں ہے مسلمان لوگ ان کا اطلاق از راہ بے انصافی و ناحق اندیشی عیسائیوں پر کرتے ہیں اور عیسائی اس سے استغفار بھیجتے ہیں مگر یہ امر ہمارے مضمون سے علاقہ نہیں رکھتا۔

النصوص الباهره فی حریة الهاجرة علی ما یستفاد من کتب الیهود

افادها

المولوی عنایت رسول چڑیاکوٹی سلمہ اللہ تعالیٰ

ام حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام عبری زبان میں (ہاغار) اور عربی میں (ہاجر) ہے یہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

سفر ایشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے لکھا ہے کہ ''شہر بابل دار السلطنت نمرود میں جہاں تارح یعنی آذر اور ابراہیم علیہ السلام اور ان کے تمام خاندان کے لوگ رہتے تھے ایک شخص حکیم ہنرمند ذکی الطبع فطین جو اکثر علوم صنائع میں کمال رکھتا تھا رہتا تھا اس کا نام (رقیون) تھا مگر وہ بہت مفلس ومحتاج ومفلوک تھا تنگدستی وسختی سے وطن میں رہنا نا مناسب سمجھ کر مصر کی راہ لی جب وہ وہاں پہنچا اور اس کی لیاقت ودانش مندی باشندگان مصر پر ظاہر ہوگئی تو بادشاہ مصر نے اس کو براہ قدر دانی عیان سلطنت میں داخل کیا رفتہ رفتہ بالکل حاوی ہوا بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا یہ پہلا شخص ہے جس کا لقب فرعون ہوا اسی فرعون کے زمانہ بادشاہت میں بوجہ قحط سالی کے حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مع اپنے اہل بیت کے مصر میں تشریف لے گئے۔''

رقیوں میں ہاغار دونوں عبری لفظ ہیں اور اس سے استدلال ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں عبرانی یعنی بنی عبیر تھے اور کیا عجب ہے کہ اسی قبیلہ کے ہوں جس قبیلہ کے حضرت ابراہیم تھے اور ظاہراً اسی خیال سے کہ بادشاہ مصران کا ہم وطن یا ہم قبیلہ ہے اس قحط ومصیبت میں حضرت ابراہیم نے مصر میں جانے کا قصد کیا ہو جیسا کہ ہر ایک انسان کو ایسے موقع پر اس قسم کا خیال ہوسکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیم مصر میں پہنچے اور انہوں نے حضرت سارہ کا اپنی بی بی ہونا ظاہر نہ کیا بلکہ بہن ہونے کا جو رشتہ تھا وہ ظاہر کیا تو فرعون نے حضرت سارہ سے شادی کرنی چاہی اور حضرت ابراہیم کو بہت کچھ دے کر حضرت سارہ کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا۔

اس واقعہ سے بھی استدلال ہوسکتا ہے کہ فرعون بادشاہ مصر کو بسبب ہم قوم ہونے

کے زیادہ تر حضرت سارہ سے شادی کرنے کی رغبت ہوئی تھی۔

غرض کہ ھنوز شادی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف قسم کے صدمات فرعون پر واقع ہوئے اوران کے سبب سے فرعون نے حضرت سارہ کے حال کی زیادہ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم کی بیوی بھی ہیں اسی وقت فرعون نے ان کو حضرت ابراہیم کے پاس بھیج دیا اور ہاجرہ اپنی بیٹی کو بھی ان کے سپرد کر دیا۔

فرعون نے جو اپنی بیٹی ہاجر کو حضرت سارہ کے ساتھ کر دیا ظاہراس کے کئی سبب معلوم ہوتے ہیں ابراہیم اور سارہ کی نیکی اور بزرگی اوران کا اور فرعون و ہاجر کا ہم قوم ہونا اس بات کے لیے بڑی رغبت ہوئی ہوگی کہ فرعون اپنی بیٹی کو ان کی تعلیم اور تربیت اور صحبت میں سپر دکرے کیوں کہ مصری اس کی قوم وقبیلہ سے نہ تھے علاوہ اس کے اس زمانہ میں اور اس خاندان میں شادی و بیاہ میں ہم کفو ہونے کا بہت خیال تھا مصر میں رقیون فرعون مصر کے خاندان کا کوئی شخص نہ تھا اور یہ بہت بڑی ترغیب اس بات کی تھی کہ ہاجر سارہ کے سپرد کی جاوے تا کہ ان کی تربیت میں رہے اور کہیں کفو میں اس کی شادی ہو جاوے۔ رخصت کے وقت فرعون نے اپنی بیٹی ہاجر کو سمجھایا کہ تیرا رہنا ان کے ساتھ تیرے لیے میرے پاس رہنے سے بہتر ہے۔ اس سمجھانے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس خیال سے فرعون نے اپنی بیٹی ان کے سپرد کی تھی۔

بعداس کے جب حضرت ابراہیم مع ہاجر فرعون کی بیٹی کے وہاں سے چلے تو فرعون نے ان کے ساتھ پیادے مامور کی تا کہ بحفاظت پہنچ جاویں چناں چہ یہ سب لوگ بآرام تمام مع احمال واثقال ولونڈی وغلام وغیرہ کے جو بادشاہ مصر نے ان کو دیے تھے اپنے ملک میں جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی تھی بخیر وخوبی پہنچ گئے اس وقت ابراہیم ہاجر کی بدولت بہت دولت مند اور مال دار ہو گئے چناں چہ توریت میں لکھا ہے۔

ہم ان لفظوں کو اس مقام پر عربی خط کے حرفوں میں لکھتے ہیں۔

ویعل ابرام ممصر ایم هو واشتو وخل اشر لو ولوط عمو هنضبا و ابرام کابید متود بمقنه و بکسف و بزاهاب

ترجمہ عربی: " فصعدا ابرام من ممر هو و زوجته و کل ماله و لوط معه الی القبیلة وابرام عظیم جدا بالماثیة والفضة والذهب"

ترجمہ اردو: "اور کوچ کیا ابراہیم نے مصر سے اس کی بی بی نے مع اپنے گل مال کے اور لوط کے شمال کی طرف کو (کتاب پیدائش باب 13 آیت 1,2)"

غرض کہ اس مورخ کے بیان سے ظاہر ہے کہ ہاجر بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں تعلیم تہذیب کے لیے سارہ کے سپرد کی گئی تھیں اور ان کا ہم وطن ہونا بلکہ ادنیٰ تامل سے اہل خاندان سے ہونا پایا جاتا ہے۔

مفسرین توریت بھی حضرت ہاجر کو بادشاہ کی بیٹی لکھتے ہیں چنانچہ (وبی شلوموا سحاق) نے کتاب پیدائش کے سولہویں باب کی پہلی آیت کی تفسیر میں جو لکھا ہے اس کو بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

اس عبارت کو عربی خط کے حرفوں میں لکھا جاتا ہے

" بث برعه ها یشا کشرا نسیم شنعسوا اساره امر موطاب شتها بتی شفحه ببیت زه و لو کبیره ببیت احیر"

(ترجمہ عربی) هی کانت بنچ فرعون لمارا الایات التی اخرحت بساره قال ما اطبب ان تکون بنتی خادمة فی امیت ذاولا ان تکون سیدة فی بیت آخر

ترجمہ اردو: "وہ فرعون کی بیٹی تھی جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو

کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہوکر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ"

1850ء میں بمقام کلکتہ اسی بات کا مباحثہ ہوا تھا اور اکثر یہودیوں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ حضرت ہاجر لونڈی نہیں تھیں بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجر کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر ہم جو نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی و غلام دو طرح پر ہوتے تھے شرا سے اور غنیمت سے یعنی یا تو وہ لونڈی و غلام ہوتے تھے جو لڑائی میں اسیر ہوکر آتے تھے اور وہ (شیبوث حرب) کہلاتے تھے یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے یا ان کی اولاد لونڈی و غلام و ہتے تھے یلید یابث ولید البیت یعنی خانہ زاد مگر حضرت ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں پھر وہ کیوں کر لونڈی ہوسکتی تھیں ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہودی ان کو کیوں لونڈی کہتے تھے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسماعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد و عداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسماعیل بہ نسبت بنی اسرائیل کے حقیر سمجھے جاویں منسوب کرتے ہیں اور اسی خیال سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے مگر وہ استدلال سرتا پا غلط اور بالکل تحریف ہے جس کو بالتفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

حضرت سارہ ادھیڑ ہوگئی تھیں اور ان کی اولاد نہ ہوئی تھی اس لیے انہوں نے حضرت ہاجرہ کو زوجہ بنانے کی اجازت دی کہ انہیں سے کچھ اولاد پیدا ہو چناں چہ ہاجرہ سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارہ بھی حاملہ ہوگئیں اور حضرت اسحاق پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق کئی برس کے ہوگئے تھے ان کا دودھ بھی چھٹ چکا تھا اور حضرت

اسماعیل ان سے عمر میں کچھ بڑے تھے دونوں میں آپس میں کچھ تکرار ہوگئی جیسا کہ دو بچوں میں ہو جاتی ہے حضرت سارہ کو یہ بات بری معلوم ہوئی اور اس لڑائی جھگڑے میں حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے لڑکے کو نکال دو اس مقام پر جو حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہا اس سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ درحقیقت میں لونڈی تھیں بلکہ جس طرح عورتیں لڑائی غصہ میں خصوصاً جب کہ دو عورتوں بلکہ دو سوکنوں میں بچوں پر تکرار ہو جائے ایک دوسری کو تہتک اور حقارت کے کلمے کہہ اٹھتی ہیں اسی طرح حضرت سارہ نے بھی یہ لفظ امہ یعنی لونڈی کا حضرت ہاجرہ کی نسبت کہا اس سے کسی طرح سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ وہ درحقیقت لونڈی تھیں مگر یہودیوں کو اور جو لوگ یہودیوں کی پیروی کرتے ہیں ان کو ایک موقع حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہنے کا مل گیا۔

حضرت سارہ کی اس بات سے حضرت ابراہیم نہایت ناراض ہوئے مگر خدا نے ان کی تسلی کی اور کہا کہ اس لونڈی اور بچہ کی طرف سے رنج مت کر تو ان کو نکال دے میں اس لونڈی کے بچے سے ایک قوم پیدا کروں گا۔

اس مقام پر جو خدا نے لونڈی کہا وہ بعینہ نقل سارہ کے قول کی ہے یعنی سارہ نے جس کو حقارت سے لونڈی اور لونڈی کا بچہ کہا ہے اسی میں سے ایک قوم پیدا کروں گا یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی لائق آدمی کو کہے کہ یہ نالائق کیا کام کرتا ہے پس اس دوسرے شخص کا بھی اس کو نالائق کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ درحقیقت وہ شخص نالائق ہے اور جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ہاجر بیٹی رقیون بادشاہ مصر کی بلکہ ہم قوم و ہم وطن ابراہیم کی تھیں اور جو وجوہ رقبت کی اس زمانے میں تھیں ان سے بھی حضرت ہاجر بری تھیں تو ان الفاظ سے جو لڑائی و جھگڑے و غصہ میں بولے گئے ہیں اسی طرح ان کا واقعی لونڈی ہونا مراد نہیں ہوسکتا۔

علاوہ اس کے لفظ امہ مجازاً محاورہ میں زوجہ پر بھی بولا جاتا ہے یہودیوں میں دستور تھا کہ دختر کا باپ بروقت شادی کے بعوض دختر کے پسر کے باپ سے کچھ روپیہ لیتے تھے تب بیٹی دیتے تھے جیسے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بعض قوموں میں دستور ہے اور اس دستور کو بیٹی کا بیچنا کہتے تھے مگر وہ لونڈی نہ ہوتی تھی بلکہ زوجہ شرعی ہوتی تھی اور تمام حقوق وجیت کے اس کو حال ہوتے تھے ایسی زوجہ پر بھی لونڈی کا مجازاً اطلاق ہوا ہے چنانچہ توریت مقدس کی دوسری کتاب باب 12 کتاب ساتویں میں لکھا ہے کہ ''خدا نے کہا کہ اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو بیچے (امہ) ہونے کے لیے تو وہ لونڈیوں کی طرح نکل نہ جائے گی اگر وہ اپنے مالک کی نظر میں ناپسند ہو جس سے اس نے زفاف نہیں کیا تو فدیہ دے گا بوجہ ناپسند ہونے کے اجنبی قوم کے پاس بیچ نہیں سکتا اور اگر اپنے پسر کی خلوت میں دیا تو لڑکیوں کے دستور کے موافق برتاؤ ہوگا اور اگر اس کے اوپر دوسری کر لی تو حقوق زوجیت یعنی کھانا، کپڑا، خلوت کم نہ کرے گا اور اگر یہ تینوں امر اس کے ساتھ نہ کیے جاویں تو بلاتردد چھوٹ جاوے گی۔''

جو کہ ان آیتوں سے مسائل فقیہہ مستنبط ہوتے ہیں اس لیے علمائے یہود نے اس میں بہت غور کی ہے کل مباحثہ لکھنا طول ہے مگر جس قدر کہ اس مقام کے مناسب ہے مختصراً لکھا جاتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ امہ سے لونڈی مراد نہیں ہوسکتی اول تو انہی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لونڈی سے بیوی یعنی زوجہ شرعی مراد ہے دوسرے یہ کہ یہ سب آیتیں بنی اسرائیل کی شان میں ہیں جیسا کہ سیاق دلالت کرتا ہے اور بموجب توریت مقدس کے لونڈیوں کی طرح بنی اسرائیل کی بیع وشرا جائز نہیں ہے چنانچہ اس کی تفصیل توریت مقدس کی تیسری کتاب باب 25 آیت 42 اور دوسری کتاب باب 22 آیت 3 میں مندرج ہے بنی اسرائیل چوری کے جرم میں یا دشمن کی قید میں سے چھڑانے کے لیے خریدے جاسکتے تھے اور

صرف سات برس تک مالک کی بطور غلام کے خدمت کرتے تھے حضرت یوسف کے بھائی بھی چوری کے جرم میں بطور غلام رکھ لیے گئے تھے مگر وہ غلام نہ تھے۔

اور اگر فرض کریں کہ اس وقت میں جو احکام ہیں وہ غیر بنی اسرائیل کے لیے ہیں تو بھی آیت کے معنی درست نہ ہوں گے کیوں کہ غیر بنی اسرائیل لونڈی و غلام پچاسویں برس از خود آزاد ہو جاتے تھے اور آیت میں حکم ہے کہ وہ آزاد نہ ہو گی اس مقام پر تفسیر رشی کی عبارت نقل کی جاتی ہے جس سے مطلب مذکور ثابت ہوتا ہے۔

اس عبارت کی صورت عربی خط میں یہ ہے:

ام راعه بيعنی ادونيها شلا ناسئه حين بحينا و لخونساء، اشر لا يعادا ه شها يا لو ليعاداه لهخنيساه لولا شا و كسف قنيئاه هو كسف قد وشيها و كان رامز لا خ هكا ثوب شمصوه بيعود و رامزلا خ شاينا صريخه قدوشيخ احريم.

(ترجمه عربی) وان قبحة بعين بعلها: لانه لخلوتها ما هوى لذى لم يزفها، و كان له ان يزفها و يتخلى بها للتزويج و ثمن شرايها هو ثمن نكاحها وفى الاية كناية با مرا لنكاح و بانه لا يجوزمع الغير عرسها.

اردو ترجمہ: (توریت) اگر بری ہے اپنے خاوند کی نظروں میں (تفسیر) کہ اسے رغبت نہ ہوئی اس کے ساتھ خلوت کی (توریت) جس نے زفاف نہ کیا (تفسیر) کہ اس کو مناسب تھا اس سے زفاف اس کے ساتھ خلوت کرنا جورو کرنے کے لیے اور قیمت اس خرید کی قیمت ہے اس کی شادی کی اور یہاں کنایہ ہے کہ آیت میں حکم شادی کا ہے اور کنایہ ہے کہ وہ دوسرے سے شادی کرنے کی مجاز نہیں۔

اسی موقع پر اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح ایسی جورو پر جس کی بابت

بعوض شادی روپیہ دیا گیا ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا۔اسی طرح ایسی جورو پر بھی جو بطور ڈولہ کے آئی ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے۔جیسے کہ ابی غایل حضرت داؤد کی بیوی پر لونڈی تور خادمہ کا اطلاق ہوا ہے۔جس کا ذکر عنقریب آتا ہے کہ یہ امر حضرت ہاجر کے حال سے بھی نہایت مناسب تھا۔اس سے مجازاً ان کی نسبت بھی امہ یعنی لونڈی بولا گیا۔مگر جب کہ رقیت کسی طرح ثابت نہیں ہے تو اس لفظ سے حقیقی لونڈی مراد نہیں ہو سکتی۔

اگر یہ کہا جاوے کہ ان مقاموں میں بھی امہ سے جورو مراد ہے۔مگر سریہ کا کہنا بھی صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ جب بنی اسرائیل کی لڑکیاں لونڈیاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں تو سریہ کیوں کر ہو سکتی ہیں۔

اور اگر یہ شبہ کیا جاوے کہ جن مقاموں کا بیان ہوا وہاں قرینہ ہے جس سے امہ سے لونڈی مراد نہیں ہو سکتی مگر جہاں حضرت ہاجرہ کی نسبت امہ کا اطلاق ہوا ہے وہاں کیا قرینہ ہے جس سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لیے جاویں اس شبہ کے رفع کرنے کو ناظرین کو ذرا توجہ کی تکلیف دی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بلکہ اس کے بعد بھی یہ دستور تھا کہ لونڈی میراث نہیں پاتی تھی چنانچہ اسی وجہ سے لیا اور راحیل یعقوب علیہ السلام کی بیویوں نے ان سے کہا کہ ''کیا اب ہمارے لیے اپنے باپ کے گھر میں کچھ حق میراث ہے کیا ہم اجنبیہ نہیں شمار کی گئیں کیوں کہ بیچ ڈالا ہم کو اور قیمت بھی کھا گیا'' پیدائش باب 31 آیت 14,15

اور لونڈی کی اولاد جو دوسری سے ہو وہ بھی لونڈی اور غلام ہوتی تھی ان کے لیے میراث نہ تھی چنانچہ یہ حکیم موسیٰ کو بھی دیا گیا اور لونڈی کی اولاد جو مالک سے ہو وہ بیوی کی اولاد کے ساتھ میراث نہیں پاتی تھی جو کچھ ان کو باپ اپنی زندگی میں دبوے وہی ان کو ملتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے قطورہ کی اولاد کو اپنی زندگی میں کچھ دے کر الگ کر دیا

تھا جیسا کہ کتاب پیدائش باب 25 میں مندرج ہے۔ جب کہ یہ قاعدہ شرعی معلوم ہو گیا تو اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جب سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے لڑکے کو نکال تو اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میراث نہ پاوے لونڈی بچہ میرے بیٹے اسحاق کے ساتھ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سارہ کو اندیشہ یہی تھا کہ اسمعیل اسحاق کے ساتھ میراث پاویں گے۔ پس اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں یا اسمعیل لونڈی بچہ ہوتے تو میراث پانے کا خیال کیوں کر ہوتا۔ بلکہ اس وقت کی شریعت میں یہ حکم تھا۔ کہ زوجہ مطلقہ میراث نہیں پاتی تھی اور جس لڑکے کو باپ عاق یعنی ساقط المیر اث کر دیتا تھا وہ بھی میراث سے محروم ہو جاتا تھا اس لیے حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے درخواست کی تھی کہ ہاجر کو اور اس کے لڑکے کو نکال دے یعنی ایک کو طلاق دے اور ایک کو عاق کرے تا کہ دونوں مستحق میراث نہ رہیں۔ یہ قرینہ ہے کہ ان آیتوں میں امہ کا لفظ جو خلاف محل واقع ہوا ہے اس سے اس کے مجازی معنی مراد ہیں اور حقیقی مراد نہیں ہو سکتے علاوہ اس سے اور بھی قرینے تو یہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔۔۔۔

ان مقامات کے سوا کسی مقام میں حضرت ہاجر کی نسبت لونڈی کا لفظ توریت میں نہیں آیا ہے بلکہ شفحہ کا لفظ آیا ہے اور شفحہ کے معنی لونڈی کے نہیں ہیں انقلوس یہودی نے جس نے توریت کا ترجمہ کالدی زبان میں کیا شفحہ کا ترجمہ امتا جو بمعنی امۃ ہی لکھا ہے اور اس سبب سے اکثر مترجموں نے توریت کے ترجموں میں جو اور زبانوں میں کیے اس لفظ کا لونڈی ترجمہ کیا حالاں کہ لونڈی کو عبری زبان میں (امہ) کہتے ہیں جو عربی لفظ امۃ کا مرادف ہے اور شفحہ کے معنی خادمہ کے ہیں ہم تفرقہ بتانے کے لیے سموئیل باب 25 کی 41 آیت نقل کرتے ہیں اس سے امہ اور شفحہ کا فرق ظاہر ہو جاوے گا۔

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے

وتر مرهنا اماثخا لشفحه لرحوص رغلی عبدی ادونی

ترجمہ عربی: وقالت نعم انه امة له خادمة تغسل رجعل حبید سیدی

ترجمہ اردو: اور کہا ہاں اس کی لونڈی خادمہ ہے اپنے سردار کے خادموں کا پانوں دھونے کے لیے۔

یہ قول ابی غایل حضرت داؤد کی بی بی کا ہے جب کہ حضرت داؤد نے اس کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ بطور ڈولہ کے حضرت داؤد کے ہاں آئی تھیں۔

شفحہ کے اصلی معنی جیسا کہ اہل لغت لکھتے ہیں قبیلہ کی عورت کے ہیں مادہ اس لفظ کا اور (مشباحہ) کا جس کے معنی قبیلہ کے ہیں ایک ہے لیکن عرف میں اس کے معنی خادمہ کے ہیں پھر اس لفظ سے لونڈی سمجھنا یا غلطی ہے یا تعصب ہے۔

تیسرا مقام جہاں سے ان کے لونڈی ہونے پر استدلال کرتے ہیں پیدائش باب 25 پہلی آیت 6 آیت تک جس کا ترجمہ یہ ہے اور ابرایم نے پھر عورت کی جس کا نام فطورہ تھا اور اس سے زمران، یقشان، مدان، مدیان، یشباق، شودہ پیدا ہوئے اور یقشان کے شبا اور دون پیدا ہوئے دوان کی اولاد اشوریم لطّوشیم لامیم، مدیان کی اولاد عیفا عیفر حنوخ ابی دع اور الداعا یہ سب قطورہ کی اولاد ہیں: اور دیا ابراہیم نے جو کچھ ان کے تھا اسحاق کے اور سریہ کی اولاد کو ابراہیم نے اپنی حیات میں کچھ دے کر اسحاق کے پاس سے نکال دیا پورب طرف شرقی عرب میں یہاں چھٹی آیت میں واقع ہے لبنی ھپیلغشم جس سے استدلال کرتے ہیں پیلغش جسے کلدی میں پیلقتا یا پلقتا کہتے ہیں یا لحبنا بولتے ہیں اس کے معنی بے شبہ سریہ ہیں اس کی جمع موافق قاعدہ کے پیلغشیم آتی ہے ربی سلیمان ابن اسحاق نے لکھا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کے لیے کابین نامہ نہ ہوا سے پیلغشم کہتے ہیں بہر نوع

یہ امر ثابت ہے کہ پیلغش سریہ ہے استدلال یہ ہے کہ آیت میں پیلغشم بلفظ جمع ہے اور اس سے مراد قطورہ اور ہاجرہ ہیں کیوں کہ سارہ کے سوا یہی دو بیویاں ابراہیم کی ثابت ہیں اس لیے یہ سریہ ہوں گی فقط یہ شبہ پیلغشم کے لفظ سے پیدا ہوا حال یہ ہے کہ عبری میں جمع نے اور میم سے آتی ہے۔ لہٰذا جمع پیلغشیم ہونا چاہیے لیکن توریت میں اس مقام میں پیلغشم بدوں کے وارد ہے پیلغشیم نہیں ہے اس لفظ پر مفسرین نے بحث کی ہے بعض نے اس کو جمع مانا ہے اور بے کے نہ ہونے کی یہ توجیہہ کی ہے کہ ابراہیم کے ایک ہی سریہ تھی اس واسطے کو گرادیا رشی مقصور لکھا گیا کیوں کہ ایک ہی سریہ تھی ساتھ ہی اس کے اس مفسر نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ سریہ ھاجو تھیں ارو ہی قطورہ ہیں۔ یعنی ہاجرہ اور قطورہ ایک ہی کا نام ہے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی جس کا بیان آئندہ ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ اور اسی طرح اکثر مفسرین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ سریہ ابراہیم کی ایک ہی تھی لہٰذا پیلغشم سے جمع مقصود نہیں اور نہ بصورت جمع ہے تو اسی وجہ سے اونقلوس نے جو قدیم مترجم ہے اس لفظ کے ترجمہ میں لحینا ثالفظ واحد اختیار کیا ہے ایسی حالت میں اس سے استدلال کیوں کر ہوسکتا ہے کیوں کہ مدار حجت جمعیت تھی اور وہ غیر مسلم ہے باقی رہی یہ بات کہ وہ سریہ جس کے شان میں یہ آیت وارد ہے ھاجرہ ہیں۔ اس بیان سے کہ ہاجرہ ہی کا نام قطورہ ہے دعوے بلادلیل ہے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس باب میں قطورہ اور ان کی اولاد کا ذکر ہے اور انہیں کو آیت سریہ بتاتی ہے علاوہ اس کے سفرالتواریخ اول کے پہلے باب کی 32 آیت میں جہاں سب کے نسب نامے لکھے ہیں جو اہل کتاب میں معتبر ہے لکھا ہے ''اور بنی قطورہ سریہ ابراہیم فلاں اور فلاں یہ وہی اشخاص جنہیں پیدائش کے باب 25 میں قطورہ کی اولاد گنایا ہے اور فلسطین کے پورب کی طرف سکونت کی اجازت دی ہے یہاں سے قطورہ کا سریہ ہونا بخوبی ثابت ہے اور اسی مقام پر 23 آیت کے اخیر میں لکھا ہے کہ یہ سب قطورہ کی اولاد ہیں اس سے ثابت ہے کہ قطورہ ہاجرہ نہ تھیں ورنہ اسمعیل کو

بھی ان میں شمار کرتا بلکہ اس باب کی 26 آیت میں گنایا ہے ابراہیم کے بیٹے اسحاق اور اسمعیل اس وقت یہ دستور تھا یعنی اکثر یہ محاورہ تھا کہ بیان نسب میں سریہ کی اولاد کو ما کی طرف نسبت کرتے تھے اور بیوی کی اولاد کو باپ کی طرف اسی لیے نسب نامہ اسمعیل کو ابراہیم کی طرف منسوب کیا اور فطورہ کی اولاد کی نسبت ابراہیم کی طرف نہیں بلکہ قطورہ کی طرف کی علاوہ اس کے ہاجر کی اولاد پاران میں بسی اور قطورہ کی اولاد فلسطین کے پورب جیسا توریت میں بیان ہوا ہے باوجود ان سب تباین اور تغایر کے دونوں کو ایک کہنا بناوٹ ہے علاوہ اس کے ابراہیم ہاجر کو طلاق دی تھی اور آئمہ کو زن مطلقہ سے نکاح جائز نہیں چناں چہ موسیٰ کی شریعت میں یہ حکم منصوص ہے تو اگر یہی شریعت ابراہیم کے وقت میں بھی تھی جیسا کہ یہود دعویٰ کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ قطورہ ہاجر ایک ہیں بالکل خلاف ہے اور اگر ابراہیم کے وقت میں یہ شریعت نہ بھی رہی تو خلاف دستور انبیاء کے ہیں کسی نبی کا سوائے پیغمبر آخر الزمان کے زن مطلقہ سے نکاح کرنا ثابت نہیں۔''

اب ہم رجوع کرتے ہیں پیلغشم کے لفظ اور اس آیت کے معنی کی طرف اگر تسلیم کیا جاوے کہ یہ لفظ جمع ہے جیسا اب جو نسخے موجودہ مطبوعہ لندن وامسٹردام وغیرہ دیکھے گئے ان میں پیلغشیم یے اور میم کے ساتھ لکھا ہوا خلاف بیان مفسرین کے پایا جاتا ہے تو بھی مدعا مستدل کا ثابت نہ ہوگا کیوں کہ جائز ہے کہ یہ جمع پیلغشی اسم منسوب کی ہو جیسا اسم منسوب کی جمع اس وزن پر متعارف ہے پیلغشی کے معنی سریہ زا ہیں جسے اس ملک میں پرستار زادہ کہتے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ ابراہیم نے سریہ زا لڑکوں کو کچھ دے کر وہاں سے رخصت کر دیا اور ان کو فلسطین کے پورب میں بسنے کی اجازت دی لیکن ان میں اسمعیل نہ تھے بلکہ اسی باب کی نویں آیت میں لکھا ہے کہ دفن کیا ابراہیم کو اسماعیل اور اسحاق اور ان کے لڑکوں نے توریت اور اس کی تفسیر دیکھنے والوں پر بخوبی واضح ہو جاوے گا کہ ہاجر کا لونڈی ہونا

کتب مقدمہ سے ثابت نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

(2)::اقوام عرب کی رسوم وعادات اسلام سے قبل

افحکم الجاھلیه یبغون ومن احسن من الله حکما لقوم یوقلون

عادات وخصائل اور رسول اور توہمات

ایام جاہلیت کے عرب بلکہ بالعموم سب عرب بغیر کسی استثنا کے(کیوں کہ زمانہ حال کے بدو عرب بھی اپنے مورثوں سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں) ایک نہایت سادہ مزاج قوم تھی ان کی معاشرت کا سادہ اور بے تکلف طریقہ قوانین قدرت کے قریب قریب تھا یا اس سے بالکل مطابقت رکھتا تھا وجود انسانی کا سلسلہ ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کی حالت سے رفتہ رفتہ ترقی حاصل کرتا گیا اور آخر کار گلہ بانی کے رتبہ پر پہنچ گیا جو بمقابلہ اس کی پہلی حالت کے نہایت عمدہ اور افضل تھا۔اس حالت کے تبدیل ہونے سے انسانوں کو آپس میں امن اور صلح سے رہنے اور اپنی معدوم اور سادہ احتیاجوں کے رفع کرنے کو بہت سا سرمایہ مل گیا بھیڑوں کی اون سے ایک قسم کا موٹا ٹاٹ بنانا سیکھ لیا جس کو بذریعہ میخوں کے زمین پر خیمہ کی طرح کھڑا کر کے اس کے اندر رہا کرتے تھے اور جب ان کو اپنے گلہ کو کسی دوسرے عمدہ چراگاہ پر لے جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اپنے ڈیروں کو اس جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ

لے جا کھڑا کرتے تھے اور وہیں رہنے لگتے تھے ان کی پوشاک صرف ایک لمبی بن سی ہوئی چادر ہوتی تھی جس کو بطور تہمت کے اپنے کمر سے لپیٹ لیتے تھے ان کا کھانا نیم برشت گوشت اور اونٹ کا دودھ اور کھجوریں ہوتا تھا ان کی تمام ملکیت اور جائداد مویشی گھوڑے اور وہ عرب کا بیش بہا جانور یعنی اونٹ اور لونڈی اور غلام ہوتی تھی اور تمام ملکیت میں لونڈی اور غلام سب سے گراں بہا خیال کیے جاتے تھے۔

بدو عرب کی معاشرت، جس کو خانہ بدوش اقوام عرب کا نمونہ خیال کرنا چاہیے، ایک چرواہے کے طریقہ معاشرت سے کچھ زیادہ نہ تھی خیمہ میں رہا کرتا تھا، پانی اور چراگاہ کی جستجو میں پھرا کرتا تھا مگر بعض جو زیادہ تمدن پسند تھے باہم مجتمع ہو کر اپنے خیموں کی باقاعدہ ترتیب اور انتظام سے دیہات بنا لیتے تھے اور اگر ان کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی تھی تو قصبے اور شہر پیدا ہو جاتے تھے اور وہاں کے باشندے کسی قدر مہذب زندگانی کے فوائد سے جلع متمتع ہوتے تھے ان کا وقت کاشت کاری میں کھجوروں اور درختوں کے بونے میں جن کے پھلوں سے اوقات بسری ہو اور مختلف انواع کی دستکاری اور ہر قسم کی تجارت اور سوداگری میں صرف ہوتا تھا وہ ان اشیاء کی سوداگری کیا کرتے تھے گرم مصالح، بلسان، مر، لوبان، دار چینی، سنا، لیڈنن، سونا، جواہرات، موتی، ہاتھی دانت، آبنوس اور لونڈی اور غلام۔

بہت پرانے زمانہ سے یہ لوگ مصر اور شام اور قرب و جوار کے ملکوں سے بذریعہ کارواں کے تجارت کرتے تھے توریت سے بھی پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے وقت میں بھی یہی پیشہ رکھتے تھے مگر ان دونوں قوموں یعنی خانہ بدوش اور تجارت پیشہ کا قومی چال چلن ایک ہی سا تھا کھانے پینے میں کم خرچ اور کفایت شعار ہونا اور اس پر راضی اور قانع رہنا ایک عمدہ اور بیش بہا وصف خیال کیا جاتا ہے باہلی ایک نامی شاعر اپنے بھائی کے ایک مرثیہ میں جس میں اس نے اس کی موت کا حال لکھا تھا اس طرح

پر اپنے بھائی کی تعریف کرتا ہے۔

تکفیہ فلذۃ لحم ان الم بہا

من الشواء و یکفی شربہ الغمر

معتدل نیند کی بھی بہت تعریف کی جاتی تھی ہذلی ایک نامی شاعر اس عادت کی یوں تعریف کرتا ہے:

قلیل غرار النوم اکبر ہمہ

دم الثار او یلقی کمیا مسفعا

علی الصباح اٹھنا بھی ایک عمدہ صفت شمار ہوتی تھی اور اس آدمی کی قوت اور مستعدی پر دلالت سمجھی جاتی تھی امراء القیس خود اپنی تعریف اس طرح پر کرتا ہے:

وقد اغتدی والطیر فی دکنا تھا

نہایت فیاضی سے مہمان نوازی ان کا قومی خاصہ تھا اور اس کو جملہ حسنات اور اوصاف میں اعلیٰ اور افضل سمجھتے تھے مسافروں اور مہمانوں کی خاطر داری بے انتہا فیاضی سے کرنا اور مہربانی اور اخلاق اور تعظیم کے ساتھ پیش آنا ایک پاک فرض خیال کیا جاتا تھا اور اگر کوئی اس کو ترک کر دیتا تھا یا غفلت کرتا تو تمام لوگ اس کو دل سے برا جانتے تھے اور اس کی حقارت کرتے تھے ہذلی شاعر خود اپنے پر اس شعر میں بددعا کرتا ہے اگر وہ مہمان نوازی کے طریقہ میں کچھ قصور کرے

لا در دری ان اطعمت نازلکم

فشر الحتی و عندی البر مکنرز

ہمسایہ کے حال پر مہربانی اور اس کی خبر گیری کرنا اور اس کے مکان اور خاندان اور

مال کی نگرانی اور حفاظت کرنا نیک آدمیوں کے اوصاف میں سے تھا اور اگر کوئی اس باب میں ذرا بھی بے پروائی یا سستی کرتا تھا تو اس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور اس کا کوئی معیوب لقب رکھ دیتے تھے بکری شاعر علقمہ کی اس طرح پر ہجو کرتا ہے:

تبیتون فی المشتا ملاء بطونکم

وجا راتکم غرثی یبتن خماسا

اور ایک اور شاعر زبیدی اس صفت میں ایک شخص کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

وجارھم احمی اذا ضیم غیرہم

قیدیوں کو چھوڑانا اور محتاجوں اور بیکسوں کی مدد کرنا تمام نیکیوں میں افضل اور جمیع اوصاف میں سب سے زیادہ قابل ستائش خیال کیا جاتا تھا ایک شاعر اپنی تعریف اس طرح پر کرتا ہے۔

وفلکنا غل امرء القیس منہ

بعد ما طال حبسہ والعناء

ایک اور شاعر طرفہ اس صفت کا بیان اس طرح پر کرتا ہے:

ولکن متی یستر قد القوم ارفد

ہذلی شاعر ایک صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

واحمی المصاب اذا مادعی

ایک شریف عرب کو اپنی عزت کا لحاظ اور اپنے وعدہ کا خیال ایسا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا جیسے کہ مذکورہ بالا اور اوصاف ضروری سمجھے جاتے تھے عمرو ایک مشہور شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

ونوجد نحن امنعہم ذمارا

واوفاہم اذا عقد و ایمینا

صاف اور ستھری پوشاک اور خوشبودار چیزیں پسندیدہ اشیاء میں سمجھی جاتی تھیں عدوانی کی بیٹی اپنے شوہر کی تعریف میں اس طرح پر کہتی ہے:

حدیث الشباب طیب الثوب والعطر

بالوں کو مشک سے معطر کرنا اور خوشبودار چمڑے کی جوتیاں پہننی امارت کی نشانیاں تھیں ایک شاعر اپنی ممدوحہ کی اس طرح پر مدح کرتا ہے:

اذا التاجر الداری جاء بفارة

من السک اراحت فی مفارقۃ تجری

پرہیز گاری بھی اوصاف حسنہ میں شمار کی جاتی تھی حاتم طائی اس طرح پر لکھتا ہے:

واغفر عوراء الکریم ادخار

واعرض عن شتم اللیئیم تکرما

فصاحت و بلاغت لطافت وظرافت بھی فضیلت کے دائرہ کی تکمیل کے لیے ضروری تھیں عمرو شاعر اپنے بیٹے غرار کی تعریف میں کہتا ہے:

وان غرارا ان یکن غیر واضح

فانی احب الجون ذا المنطق الدم

نابغہ شاعر کند زبان ہونے سے اس طرح خدا سے پناہ مانگتا ہے:

اعذنی رب من حصر وعی

گھوڑے کی سواری کی اگر بچپن ہی سے مشق کی جاتی تھی تو نہایت تعریف اور توصیف ہوتی تھی اور اگر کوئی بڑا ہو کر گھوڑے کی سواری سیکھتا تھا تو ہجو اور طعنہ کا نشانہ بنتا تھا ایک شاعر نے ایک قوم کی ہجو اس طرح پر کی ہے:

لم یرکبوا الا بعد ما کبروا

فبھم ثقال علی اکتا فھم میل

بھیڑیہ کا شکار کرنا بہادر ہونے کا عمدہ ترین ثبوت تھا

شامخ شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

وما قد دفعت الذئب عنہ

ریگستان کے طول و عرض کا اندازہ اس کی ریت کی ایک مٹھی بھر کر سونگھنے سے دریافت کرتے تھے امراء القیس شاعر اس طرح پر بیان کرتا ہے

اذا لناقۃ العوذ الدنیا فی غرغرا

زمانہ جاہلیت کے عرب میں شعر و شاعری نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی تھی۔

جہاں یہ خوبیاں ان میں تھیں اس کے ساتھ نہایت بد اخلاقی اور فحش عرب جاہلیت میں پھیلا ہوا تھا۔ قصائد کے شروع میں جو نشیب کے اشعار ہوتے تھے ان میں دولت مند اور امیروں کی لڑکیوں اور عورتوں اور بہنوں کا نام لے لے کر بیان کرتے تھے اور ہر طرح کے عیبوں کو علانیہ ان کی طرف منسوب کرتے تھے ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے اختیار میں ایک جن رہتا ہے اس جس قدر بڑا شاعر ہوتا ہے اسی قدر زبردست جن اس کے زیر حکم رہتا ہے حسن نامی شاعر اپنی تعلیٰ میں اس طرح کہتا ہے:

وما نفرت جنبی و ما فل مبردی

بدکاری اور زناکاری سے نادم نہیں ہوتے تھے اور ہر طرح کی غیر مہذب نظم میں از راہ بے شرمی اس کو مشتہر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

سب لوگ شراب اور نہایت قوی منشی کے پینے سے بدرجہ غایت انس رکھتے تھے اور مدہوشی کی حالت میں تمام لوگوں سے نہایت خراب اور معیوب باتیں سرزد ہوتی تھیں۔

قمار بازی سب لوگوں کا بلا استثناء ایک ہر دل عزیز کھیل تھا اور اگر کوئی خاص مقام قمار بازی کا مشہور تھا تو لوگ دور دراز مسافت سے وہاں جوا کھیلنے کو جایا کرتے تھے سود خواری بھی عام طور سے نہایت درجہ مروج تھی۔

لونڈیوں کو جو قینات کہلاتی تھیں گانا بجانا اور ناچنا سکھایا جاتا تھا اور وہ حرام کاری کرنے کی مجاز تھیں اور اس حرام کاری کی آمدنی ان کے آقا اپنے تصرف میں لاتے تھے۔

رہزنی اور غارت گری اور قتل روزمرہ کی باتیں تھیں انسانوں کا خون بلا خوف اور بغیر تاسف کے ہر روز ہوا کرتا تھا لڑائی میں جو عورتیں قید ہوتی تھیں ان کو فتح مند لونڈیاں بنا لیتے تھے حارث شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

ثم ملنا علیٰ تمیم فاحیرمنا

وفینا بنات سرا مناء

ٹوٹکوں میں اور شگون لینے میں ان کو نہایت مضبوط اعتقاد تھا جب کوئی مصیبت یا تباہی ان پر نازل ہوتی تھی تو پتھر کی چھوٹی کنکریوں پر کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے اور ان کو پھینکتے تھے اور ایسا کرنے سے اس مصیبت کے دور ہونے کی توقع رکھتے تھے جانوروں کے اڑنے اور بولنے سے بھی نیک اور بد شگون لیا کرتے تھے مثلاً اگر کوئی جانور کسی شخص کی بائیں طرف سے دائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اس کو نیک شگون سمجھتے تھے اور ''سانح'' کہتے تھے لیکن اگر دائیں جانب سے بائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اس کو بد شگونی سمجھتے تھے اور ''جارح'' کہتے تھے اس قسم کی تفاؤل کا عام نام ''طیرہ'' تھا۔

لبید ابن ربیعۃ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے اس موقع پر جب کہ اس کا بھائی بجلی کے صدمہ سے مارا گیا یہ شعر کہا تھا:

لعمرک ما تدری الضوارب بالحصی

ولا اجرات الطیر ما اللہ صانع

جاہلیت کے عرب کسی کام کے ہو جانے پر بھیڑ کی قربانی کرنے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تھا تو بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دیتے تھے اور اس ہرن کو عتیرہ کہتے تھے مگر بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دینا ایک معیوب کام خیال کیا جاتا تھا کعب شاعر اپنے خاندان کی تعریف میں کہتا ہے:

وما عترا الظبا بجی کعب

اگر کوئی کسی کو مار ڈالتا تھا تو خون کے عوض خون ہی معزز بدلا گنا جاتا تھا جو لوگ خون کے بدلے ریت لیتے تھے ان کو ان کے ہم جنس اور ہم وطن حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے عمرو ابن معدی کرب کی بہن اپنے بھائی کے خون کا کسی شرط پر تصفیہ کرنے سے منع کرتے ہے

ولا تاخذوا منہم اقالا وابکرا

ان کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی آدمی کے خون کا عوض خون نہ لیا جاوے تو ایک چھوٹا پردرا کیڑا مقتول کے سر میں سے نکل کر آسمان میں چیختا پھرتا ہے اس عجیب کیڑے کو "ہامہ" اور "صدیٰ" کہتے تھے لبید شاعر ایک نوحہ میں اس طرح کہتا ہے:

فلیس الناس بعدک فی نفیر

وماہم غیرا صداء و ہام

ہر شخص کے مرنے کے بعد یہ دستور تھا کہ اس کے اونٹ کو اس کی قبر سے باندھ دیتے تھے یہاں تک کہ بھوک اور پیاس کے مارے وہ مر جاتا تھا اور اس اونٹ کو "بلیہ" کہتے تھے لبید شاعر اپنے ممدوح کی سخاوت کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

تاوی الاطتاب کل ذریۃ

مثل البلیۃ قالص اهد امها

جب کوئی مرجاتا تھا تو برس روز تک اس کا سوگ رکھتے تھے اور اس کو رویا کرتے تھے لبید شاعر اپنے وارثوں کو یوں وصیت کرتا ہے:

الی الحول ثم اسم السلام علیکما

ومن یبک حولا کاملاً فقد اعتذر

لڑائی میں عورتیں مردوں کے ہمراہ ہوتی تھیں اور ہر طرح ان کی مدد کرتی تھیں جب کہ ان کے شوہر لڑائی میں مصروف ہوتے تھے تو وہ پکار پکار کر کہتی تھیں ’’آگے بڑھو آگے بڑھو اے ہمارے جری اور بہادر خاوندا اگر تم کوتاہی کرو گے اور ہم کو دشمن سے نہ بچاؤ گے تو ہم تمہاری بیویاں نہ ہوں گی۔‘‘

قحط اور گرانی کے زمانہ میں اپنے اونٹوں کو مجروح کر کے ان کا خون پیا کرتے تھے خشک سالی میں مینہ برسنے کا ٹوٹکا اس طرح پر کرتے تھے کہ پہاڑوں میں ایک گائے کو لے جاتے تھے اور اس کی دم میں سوکھی ہوئی گھاس اور کانٹے اور جھاڑیاں باندھ کر اس میں آگ لگا دیتے تھے اور گائے کو پہاڑوں میں چھوڑ دیتے تھے۔

گھوڑ دوڑ اور اس پر بازی لگانا جس کو وہ ’’رہان‘‘ کہتے تھے ان میں مروج تھی دو قوموں اور فریقوں کے باہم جنگ وجدل ایک تھوڑی سی غلط فہمی کی وجہ سے قائم ہو جاتی تھی بعض اوقات یہ لڑائیاں ایک مدت مدید تک جاری رہتی تھیں جیسے کہ عیص اور ذبیان کے باہم پورے سو برس تک لڑائی جاری رہی۔

باوجودے کہ کوئی شخص اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتا تھا تو بھی اس کی ملکیت کا استحقاق اس کو باقی رہتا تھا اور اس استحقاق کو فروخت کر دینے کا بھی مجاز تھا اور مشتری ان غلاموں پر اپنی ملکیت قائم کرتا تھا اور اس طرح سے یہ بد بخت ہمیشہ کی آزادی سے بالکل محروم تھے۔

عورتیں کسی جانور کا دودھ نہیں دوہتی تھیں اور اگر کسی خاندان کی عورتوں کو دودھ دوہتے دیکھ پاتے تھے تو اس خاندان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور وہ خاندان لوگوں کی آنکھوں میں دفعتاً حقیر ہو جاتا تھا۔

مجرم کو فوج داری کی سزا میں جلتی ہوئی ریت پر بٹھا دیتے تھے مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے تھے اور اس کو بہت لذیذ غذا سمجھتے تھے جو اونٹنی یا بھیڑ یا بکری دس دفعہ بچہ جن لیتی تھی اس کو چھوڑ دیتے تھے اور وہ چھوٹی پھرا کرتی تھی اور جب وہ مر جاتی تھی تو اس کا گوشت مرد کھاتے تھے اور عورتوں کو اس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی اگر اونٹنی یا بھیڑ یا بکری پانچویں دفعہ مادہ بچہ جنتی تھیں تو اس کے کان کاٹ کر اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اس کو ''بحیرہ'' کہتے تھے اور اس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا منع تھا۔

کسی کام کے ہو جانے پر اونٹوں کو بطور سانڈ کے چھوڑ دینے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تھا تو اونٹ کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیتے تھے اور وہ جہاں چاہتا تھا پھرا کرتا تھا۔

اگر کوئی اونٹنی دس بچے دے چکتی تھی اور بکری سات بچے تو عورتوں کو اس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور صرف مرد ہی اس کا گوشت کھا سکتے تھے۔

اگر کسی بکری کے مادہ بچہ ہوتا تھا تو مالک اس کو اپنے لیے رہنے دیتا تھا اور اگر نر پیدا ہوتا تھا تو بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا اور اگر دو بچے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتے تھے تو مالک دونوں کو اپنے لیے رکھتا تھا اور وہ ''وصیلہ'' کہلاتی تھی۔

جو اونٹ کہ دس بچوں کا باپ ہو چکتا تھا وہ چھوڑ دیا جاتا تھا اور جہاں وہ چاہتا تھا پھرا کرتا تھا اور بنام ''حامی'' موسوم ہوتا تھا۔

قسم لینے کا نہایت سنجیدہ قاعدہ یہ تھا کہ آگ جلا کر اس میں نمک اور گندھک پیش کر

ڈالتے تھے یہ آگ ''ھولہ'' کہلاتی تھی اور اس کا جلانے والا ''مہول'' کہلاتا تھا عوص شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

اذا استقبلتہ الشّمس صد بوجھہ

کما صد عن نار المھول حالف

قسم کے مستحکم کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ تھا کہ میزاب خانہ کعبہ کے نیچے چابک کمان اور جوتی رکھ دیتے تھے اور اس طرح کرنے سے قسم پختہ ہو جاتی تھی۔

اقرار اور وعدہ کے مستحکم کرنے کو اپنے بزرگوں کی اور بتوں کی قسم کھایا کرتے تھے۔

بالغ مرد اپنے والدین کی وراثت پانے کے مستحق ہوتے تھے نابالغ لڑکے اور عورتیں حصہ نہیں پاتے تھے۔

قرضہ پر سود لیتے تھے ایک قاعدہ یہ تھا کہ اگر قرضہ وقت معینہ پر ادا نہ ہوتا تھا تو اس کی تعداد کو دوچند کر دیتے تھے اور میعاد ادا کو بڑھا دیتے تھے۔

عرب جاہلیت انتقام لینا واجب سمجھتے تھے لیکن مختلف قوموں میں باہم حقوق کی برابری کو نہیں مانتے تھے۔

اگر کسی شخص کے قاتل کا سراغ نہ لگتا تھا تو جس قوم کے شخص پر قتل کا شبہ ہوتا تھا پچاس معزز شخص فرداً فرداً اپنی بے گناہی کی قسم کھاتے تھے۔

ہر شخص گو وہ اجنبی ہی ہو دوسرے شخص کے گھر میں درانہ چلے آنے کا مجاز تھا اور اندر آنے سے پہلے اندر آنے کی اجازت طلب نہیں کرتے تھے۔

کسی رشتہ دار کے گھر کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

دس دس آدمی بشراکت ایک جانور کو خریدتے تھے اور ہر ایک شخص کے حصہ کو متعین کرنے کے واسطے دس پانسے (جس میں ایک سادہ ہوتا تھا اور باقی نو پر حصوں کے اندازہ کا

نشان بنا ہوتا تھا) پھینکے جاتے تھے اور جو پانسا جس کے نام پڑتا تھا وہی اس کا حصہ ہوتا تھا۔

خانہ کعبہ میں سات تیر رکھے ہوئے تھے اور ہر تیر پر ایک علامت بنی ہوئی تھی بعضوں پر کام کرنے کے حکم دینے کی اور بعضوں پر اس کام کرنے سے منع کرنے کی علامت تھی ہر شخص پیش تر اس سے کہ کوئی کام شروع کرے ان تیروں سے استخارہ کرتا تھا اور اسی کے بموجب کام کرتا تھا ان تیروں کو ''ازلام'' کہتے تھے۔

عرب کے مشہور جنوں کے نام

تمام عرب جاہلیت کا شیوہ بت پرستی تھا اور جن بتوں کی وہ پرستش کیا کرتے تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔

1 ہبل: ایک بہت بڑا بت تھا جو خانہ کعبہ کے اوپر رکھا ہوا تھا

2 ود: قبیلہ بنی کلب کا یہ بت تھا اور وہ قبیلہ اس کی پرستش کرتا تھا

3 سواع: قبیلہ بنی مذحج کا یہ بت تھا اور وہ اس کی پرستش کرتے تھے

4 یغوث: قبیلہ بنی مراد کا یہ بت تھا اور وہ اس کی عبادت کرتے تھے

5 یعوق: بنی ہمدان کے قبیلہ کا یہ بت تھا اور وہ اس کو معبود سمجھتے تھے اور عبادت کرتے تھے

6 نسر: یمن کے قبیلے بنی حمیر کا یہ بت تھا اور یمن کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔

7 عزیٰ: قبیلہ بنی غطفان کا یہ بت تھا اور اس کی پرستش وہ قبیلہ کیا کرتا تھا

8 لات 9 منات: یہ بات کسی خاص قبیلہ سے علاقہ نہیں رکھتے تھے بلکہ عرب کی تمام قومیں ان کی پرستش کیا کرتی تھیں۔

10 دوار: یہ بت نوجوان عورتوں کی پرستش کرنے کا تھا وہ چند دفعہ اس کے گرد طواف کرتی تھیں اور پھر اسی کو پوجتی تھیں۔

11 اساف: جو کوہ صفا پر تھا اور

12 نائلہ: جو کوہ مروہ پر تھا ان دونوں بتوں پر ہر قسم کی قربانی ہوتی تھی اور سفر کو جانے اور سفر سے واپس آنے کے وقت ان کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

13 عبعب: ایک بڑا پتھر تھا جس پر اونٹوں کی قربانی کرتے تھے اور ذبیحہ کے خون کا اس پر بہنا نہایت ناموری کی بات خیال کی جاتی تھی۔

کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم کی مورت بنی ہوئی تھی اور ان کے ہاتھ میں وہی استخارہ کے تیر تھے جو ''آزلام'' کہلاتے تھے اور ایک بھیڑ کا بچہ ان کے قریب کھڑا تھا اور حضرت ابراہیم کی بھی مورت خانہ کعبہ میں رکھی ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی تصویریں خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھنچی ہوئی تھیں۔

حضرت مریم کی بھی ایک مورت تھی اس طرح پر کہ حضرت عیسیٰ ان کی گود میں ہیں یا ان کی تصویر اس طرح خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھنچی ہوئی تھی۔

عرب کی دیسی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ود'' اور ''یعوث'' اور ''یعوق'' اور ''نسر'' مشہور لوگوں کے جو ایام جاہلیت میں گذرے ہیں نام ہیں ان کی تصویریں پتھروں پر منقش کر کے بطور یادگار کے خانہ کعبہ کے اندر رکھ دی تھیں ایک مدت مدید کے بعد ان کو رتبہ معبودیت دے کر پرستش کرنے لگے اس میں کچھ شک نہیں کہ عرب کے نیم وحشی باشندے

ان سورتوں پر خدا ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ان لوگوں کو جن کی یہ مورتیں تھیں معبود سمجھتے تھے بلکہ ان کو مقدس سمجھنے کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں ۔

بتوں کے متعلق عربوں کا اعتقاد

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا عرب جاہلیت ان مورتوں کو ان شخصوں اور ان کی ارواحوں کی یادگار سمجھتے تھے اور ان کی تعظیم اور تکریم اس سبب سے نہیں کرتے تھے کہ ان مورتوں میں کوئی شان الوہیت موجود ہے بلکہ محض اس وجہ سے ان کی عزت اور تعظیم کرتے تھے کہ وہ ان مشہور اور نامور اشخاص کی یادگار ہے جس میں بموجب ان کے اعتقاد کی جماہ صفات الوہیت یا کسی قسم کی شان الوہیت موجود ہے ان کے نزدیک ان مورتوں کی پرستش سے ان لوگوں کی ارواحیں خوش ہوتی تھیں جن کی وہ یادگاریں تھیں ۔

ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ خدا تعالیٰ کی جملہ قدرتیں بیماروں کو شفا بخشنا، بیٹا بیٹی عطا کرنا قحط و وبا اور دیگر آفات ارضی و سماوی کا دور کرنا ان کے مشہور و معروف لوگوں کے اختیار میں بھی تھا جن کی طرف انہوں نے صفات الوہیت منسوب کی تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ اگر مورتوں کی تعظیم اور پرستش کی جاوے گی تو ان کی دعائیں اور منتیں قبول ہوں گی ۔

ان کا یہ بھی مستحکم عقیدہ تھا کہ یہ اشخاص خدا تعالیٰ کے محبوب تھے اور اپنی مورتوں کی پرستش سے خوش ہو کر پرستش کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے قرب حاصل کرانے کا ذریعہ ہوں

گے اور ان کو تمام روحانی خوشی عطا کریں گے اور ان کی مغفرت کی شفاعت کریں گے۔

بتوں کی پرستش کا قاعدہ

ان کا قاعدہ بتوں کی پرستش کا یہ تھا کہ بتوں کو سجدہ کرتے تھے ان کے گرد طواف کرتے تھے اور نہایت ادب اور تعظیم سے بوسہ دیتے تھے اونٹوں کی قربانی ان پر کرتے تھے مویشیوں کا پہلا بچہ بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا اپنے کھیتوں کی سالانہ پیداوار اور مویشی کے انتفاع میں سے ایک معین حصہ خدا کے واسطے اور دوسرا حصہ بتوں کے واسطے اٹھا رکھتے تھے اور اگر بتوں کا حصہ کسی طرح ضائع ہو جاتا تو خدا کے حصہ میں سے اس کو پورا کر دیتے اور اگر خدا کا کسی طرح ضائع ہوتا تو بتوں کے حصہ میں سے اس کو پورا نہیں کرتے تھے۔

حجر اسود اور خانہ کعبہ کی تعظیم تاریخ عرب کے ابتدائی زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے اس کی بناء کو خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی طرف منسوب کرتے ہیں مگر برخلاف ان مقدس چیزوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ خانہ کعبہ کو کسی شخص کی یادگار نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ تمام عمارت ہی یہ لقب بیت اللہ ممیّز اور ممتاز تھی اور اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کے واسطے مخصوص تھی درحقیقت اس کو ایسا سمجھتے تھے جیسے کہ یہودی بیت المقدس کو اور عیسائی گرجا کو اور مسلمان مسجد کو خدا کی عبادت کرنے کے لیے اس زمانہ میں سمجھتے ہیں قرآن مجید میں خانہ کعبہ کو متعدد جگہ مسجد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

حجر اسود اور خانہ کعبہ

حجر اسود کو بھی مثل ایک بت کے یا کسی مشہور و معروف شخص کی یادگار کے نہیں سمجھتے تھے عام خیال یہ تھا کہ یہ ایک بہشت کا پتھر ہے مگر تحقیق نہیں ہے کہ شروع زمانہ سے یہ خیال تھا یا بعد کو پیدا ہوا۔ جو بات کہ محقق ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بناء ہونے سے پہلے یہ حجر اسود ایک میدان میں اکیلا پڑا ہوا تھا کوئی عرب کی روایت ایسی نہیں ملی جس سے یہ بات تحقیق ہو کہ یہ پتھر اس میدان میں کیوں پڑا ہوا تھا اور جس زمانہ میں کہ وہ وہاں پڑا ہوا تھا اس کے ساتھ کیا رسمیں متعلق تھیں مگر یہودیوں کی تاریخ سے ہم کسی قدر صحت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ اگر حجر اسود کے ساتھ کچھ رسمیں ادا ہوتی ہوں گی تو وہ انہیں کے مشابہ ہوں گی جن کا برتاؤ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اس قسم کے پتھروں کے ساتھ کیا کرتے تھے دیکھو کتاب پیدائش باب 12 ورس 7,8 و باب 13 ورس 18 و باب 26 ورس 25 و باب 28 ورس 18 و کتاب خروج باب 20 ورس 25

خانہ کعبہ کی تعمیر اور حجر اسود کے خانہ کعبہ کے ایک کونہ میں نصب ہونے کے بعد بھی کسی رسم کا اس کے ساتھ بالتحقیق ہونا پایا نہیں جاتا جو رسم کے اب تسلیم کی جاتی ہے اور جو حجر اسود کے ساتھ مخصوص خیال ہوتی ہے وہ بوسہ دینا ہے مگر یہ رسم بھی کچھ اس کے واسطے مخصوص نہ تھی خانہ کعبہ کے اور حصے بھی اسی طرح چومے جاتے تھے۔ خانہ کعبہ کا حال یہ تھا کہ سب

لوگ اس کے اندر بیٹھا کرتے تھے اور خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے گرد طواف بھی کرتے تھے لیکن عجب ترین رسم یہ تھی کہ یہ عبادت و پرستش مطلق برہنگی کی حالت میں ہوتی تھی عرب جاہلیت اس بات کو برا سمجھتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی عبادت کپڑے پہن کر کریں جو ہر قسم کے گناہوں سے ملعوث ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ کے دو ہمسر

خانہ کعبہ کی ہمسری کے واسطے دو مبعد اور یکے بعد دیگرے بتائے گئے تھے ایک تو قبیلہ غطفان نے اور دوسرا یمن میں، قبائل خثام اور بجیلہ نے باشتراک بنایا تھا۔ ان دونوں معبدوں میں بت رکھے ہوئے تھے جن کو ان قبیلوں کے لوگ بطور معبود کے پوجتے تھے ان نقلی کعبوں میں سے اول کو تو زہیر بادشاہ حجاز نے چھٹی صدی عیسوی میں بالکل غارت کر دیا تھا اور دوسرے کو جریر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یعنی ان کے پیدا ہونے کے بعد منہدم کر دیا تھا۔

حج زمانہ جاہلیت میں

حج کی رسم کو عرب کے باشندے زمانہ دراز سے مانتے چلے آتے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے زمانہ تک اس کا پتہ چلتا ہے۔

وقت ادائے حج کے احرام باندھنے کی رسم بھی ان میں شائع تھی اور اگر کوئی شخص احرام باندھے ہوئے اپنے گھر میں آنا چاہتا تھا تو دروازہ کی راہ سے نہیں آتا تھا بلکہ

پچھواڑے کی دیوار پھلانگ کر اندر آتا تھا۔

صفا اور مروہ کے پہاڑوں کے درمیان دوڑنے کی رسم بھی زمانہ جاہلیت سے عرب میں رائج تھی جیسے کہ اب بھی مروج ہے۔

جو لوگ حج کرنے کو آتے تھے اس مقدس میدان میں جمع ہوتے تھے جو عرفات کے نام سے مشہور ہے لیکن قوم قریش جملہ اقوام عرب میں ذی اختیار تھی اس لیے قریش مع اپنے دوستوں کے مقام مزدلفہ پر جو گرد و نواح کی زمین کی نسبت زیادہ بلند اور مرتفع ہے ٹھہرتے تھے اور باقی گرو، عرفات میں مقیم ہوتے تھے جہاں کہ حج کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

حج کی رسم ختم ہونے کے بعد یہ مجمع ایک مقام کو جو منا کہلاتا ہے چلا جاتا تھا اور وہاں اپنے بزرگوں کے نام اور بہادرانہ کاموں کا فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور ان بہادری کے حالات کو اشعار میں پڑھنے سے اور بھی جلاء دیتے تھے۔

سال کے چار مہینے متبرک سمجھے جاتے تھے اور حج کی رسم جیسا کہ بالفعل دستور ہے انہیں مہینوں میں سے ایک مہینی یعنی ذالحجہ میں ادا کی جاتی تھی مگر ان مہینوں کی حرمت بعض اوقات مبدل اور ملتوی ہو جاتی تھی کس واسطے کہ اگر کوئی لڑائی ان مہینوں میں سے کسی میں واقع ہوتی تھی تو لوگ ان کی قدرتی ترتیب کو بدل دینے سے گناہ سے بری الذمہ ہو جاتے تھے یعنی موجودہ مہینے کو غیر حرام فرض کر لیتے تھے اور ماہ آئندہ کو حرام کا مہینا سمجھ لیتے تھے۔

عرب جاہلیت ایک میعاد معین تک لڑائی کے موقوف رکھنے کا عہد کر لیتے تھے اور اس رسم کو حج کا ہم پایہ سمجھتے تھے۔

صابی فرقہ

باشندگان عرب کی ایک تعداد کثیر بت پرست تھی مگر وہاں ایک فرقہ موسوم بہ ’’صابئ‘‘ بھی تھا جو ثوابت اور سیاروں کی پرستش کرتا تھا انھوں نے بے شمار ھیاکل یعنی ستاروں کی پرستش کے معبد تمام ملک میں تعمیر کیے تھے اور ان کو ان مقدس ستاروں کی پرستش کے واسطے مخصوص کیا تھا اس وجہ سے عرب کے لوگ علی العموم یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ اجرام فلکی انسان کی قسمت پر فرداً فرداً اور نیز بہ ہیئت مجموعی نیک یا بد اثر رکھتے ہیں اور باقی مخلوقات پر بھی موثر ہیں اور بالخصوص ان کا یہ اعتقاد تھا کہ مینہ کا برسنا یا امساک باراں کا ہونا انہیں اجرام فلکی کی نیک یا بد تاثیر پر بالکل منحصر ہے اس کے علاوہ اور مذاہب بھی عرب میں شائع تھے لیکن ہم اس جگہ ان کی بحث نہیں کرنے کے کیوں کہ یہ مضمون ہمارے اس مقالہ سے جو اس کے بعد آوے گا علاقہ رکھتا ہے۔

عورتوں کی حالت جاہلیت میں

عورتیں حقیقت میں نہایت خراب اور ذلیل حالت میں تھیں مردوں کو بالکل اختیار تھا کہ جتنی چاہیں اتنی عورتیں کریں اگر چہ اس بات کے تعین کرنے کے لیے کوئی قانون منضبط نہ تھا کہ مرد کو کون سی قرابت مند عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے اور کون سی سے ناجائز مگر با ایں ہمہ یہ رسم شائع تھی کہ اس عورت سے جو قریب تر رشتہ رکھتی ہو ازدواج نہیں رکھتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایسی عورت کی اولاد عموماً ضعیف اور کمزور ہوتی ہے۔

ازدواج وطلاق کی رسوم عہد جاہلیت میں

ازدواج کی رسم ادا کرتے تھے اور مہر بھی باندھتے تھے طلاق بھی دیتے تھے ہر شخص اپنی زوجہ کو جس طرح ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر اپنی زوجیت میں لے سکتا تھا اسی طرح ہزار بار طلاق دینے کے بعد بھی پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا کیوں کہ تعداد طلاق کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔

طلاق کے بعد ایک میعاد مقرر تھی جس کے اندر عورت کو کسی اور مرد کے ساتھ ازدواج کرنے کی ممانعت تھی اور اس میعاد کے اندر اگر فریقین میں آشتی ہو جاتی تو پھر اپنی زوجیت میں لے لیتے تھے مرد اس رسم سے بہت ظالمانہ اور وحشیانہ طور سے مستفید ہوتے تھے اور اپنی جوروں کو کسی بہانہ سے طلاق دے دیتے تھے بیچاری عورت میعاد معینہ تک منتظر رہتی تھی اور اس میعاد میں کسی دوسرے سے ازدواج نہ کر سکتی تھی لیکن جب میعاد قریب الانقضا ہوتی تھی تو اس کا شوہر پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا اور تھوڑے عرصہ بعد پھر اس کو طلاق دے دیتا تھا اور میعاد معینہ کے اختتام کے قریب پھر اپنے ازدواج میں لے لیتا تھا اور اسی طرح بار بار کیا کرتا تھا عربوں میں ایک یہ بے رحم رسم رائج تھی کہ ہر شخص اس بات کو ایک قسم کی ذلت خیال کرتا تھا کہ وہ عورت جو ایک مرتبہ اس کی زوجہ تھی دوسرے شخص کے ازدواج میں آوے۔

ایک اور قسم کی طلاق بھی زمانہ جاہلیت کے عربوں میں جاری تھی جو ''ظہار'' کہلاتی تھی اور وہ اس طرح پر ہوتی تھی کہ مرد اپنی زوجہ کے ایک عضو کے چھونے سے باز رہتا تھا یہ کہہ کر کہ مجھ کو اپنی زوجہ جسم کے فلاں عضو کا چھونا ایسا حرام ہے جیسا کہ اپنی ماں یا کسی اور قریب رشتہ والی عورت کے جس کے ساتھ ازدواج ناجائز ہے عضو کا چھونا اس کہنے سے طلاق ہو جاتی تھی۔

بدترین رسمیں

عرب جاہلیت کی رسموں میں سب سے زیادہ خراب رسم اور سب سے زیادہ بے رحم لڑکیوں کا مار ڈالنا یا ان کو زندہ دفن کردینا تھا۔

تبنیت کی رسم بھی ان میں شائع تھی اور پسر متبنیٰ اپنے والدین کی جائداد کا حق دار اور وارث خیال کیا جاتا تھا۔

لڑکے اپنی سوتیلی ماؤں کے ساتھ ازدواج کرنے کے مجاز تھے مگر باپ اپنے بیٹے یا متبنیٰ کی زوجہ کے ساتھ شادی کرنے کا مجاز نہ تھا اور اس کے خلاف عمل کرنا نہایت معیوب اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد اس کا سوتیلا بیٹا اگر وہ نہ ہوتو کوئی قریب کا رشتہ دار بیوہ کے سر پر ایک چادر ڈال دیا کرتا تھا اور وہ شخص جو اس طرح چادر ڈالتا تھا اس سے شادی کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

ماتم کی مدت

عورتیں متوفی شوہروں کا ماتم ایک سال کامل تک کیا کرتی تھیں اور میعاد معینہ کے بعد بیوہ اونٹ کی چند خشک مینگنیں یا تو کسی کتے پر یا کندھے پر سے خود اپنی ہی پیٹھ پر پھینک دیتی تھی جس سے یہ مراد تھی کہ اب بیوہ کو اپنے متوفی شوہر کا کچھ بھی خیال نہیں رہا۔

عورتوں میں پردہ نہ تھا

عورتوں میں اپنے گھر سے نکلنے اور عام مجمع میں بدون پردہ اور حجاب کے آنے کا دستور تھا اور اپنے جسم کے کسی حصہ کو کھلا رکھنے اور عوام الناس کو دکھلانے میں کوئی بے حیائی اور بے شرمی کی بات خیال نہیں کرتی تھیں۔

عورتوں کے مصنوعی بال

عورتیں مصنوعی بال سر پر لگایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کو نیل سے گودا کرتی تھیں

میت کی رسوم

خاندان کے تمام اشخاص قسم ذکور تمام قسم کی عورتوں کو چھونے سے جب کہ وہ اپنے معمولی ایام میں ہوں پرہیز کرتے تھے اور ان عورتوں کو باقی اشخاص خاندان کے ساتھ ملنے جلنے کی ممانعت تھی۔

مردوں کے متعلق عادات اور رسوم

مردوں کو قبر میں دفن کرنے کا اعراب جاہلیت میں رواج تھا اور جس کسی جنازہ کو دفن

کرنے کے لیے لے جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو اور آدمی مردہ کی تعظیم اور اس پر افسوس ظاہر کرنے کے لیے سروقد اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کا خون بجز انسان کی سانس کے اور کچھ نہیں ہے اور روح محض ایک ہوا انسان کے جسم کے اندر ہے مگر بعض لوگ جو کہ بہ نسبت ان کے زیادہ تعلیم یافتہ تھے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ روح ایک نہایت چھوٹا سا جانور ہے جو انسان کے پیدا ہونے کے وقت اس کے جسم میں گھس جاتا ہے اور ہمیشہ اپنے آپ کو بڑھاتا رہتا ہے انسان کے مرنے کے بعد وہ جانور جسم کو چھوڑ کر قبر کے گرد چیختا پھرتا ہے یہاں تک کہ ایک الو کے برابر ہو جاتا ہے۔

عرب کی ارواح خبیثہ

زمانہ جاہلیت کے عرب دیوؤں اور خبیث ارواحوں کو مانتے تھے تمام خیالی اور وہمی اور فرضی صورتیں جو بیابانوں یا پرانی مسمار اور منہدم عمارتوں میں ان کو نظر آتیں اور جن کی کہ تنہا آدمی کے خیال میں اکثر صورت بن جاتی ہے ان سب کو مختلف قسم کی خبیث ارواحیں تصور کرتے تھے۔

بعض لوگ ان مغالطات فطری کو مختلف بروج کی تاثیر کی طرف منسوب کرتے تھے اور ان کی رائے اوروں کی رائے کے مقابلہ میں افضل تر معلوم ہوتی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے عرب نیک اور بد جنات میں عقیدہ رکھتے تھے ان کی مختلف صورتیں اور شکلیں مقرر تھیں اور مختلف نام رکھے تھے ان کے نزدیک بعض جنات نصف جسم انسان کا سا اور نصف جسم روحانی رکھتے تھے زمانہ جاہلیت کے عرب اور قوتوں اور وجودوں میں بھی

اعتقاد رکھتے تھے جو انسان کی نظر سے غائب تھے مگر آئندہ کی خبروں کو بآواز بلند ظاہر کر دیتے تھے اور خود ہمیشہ پوشیدہ رہتے تھے وہ فرشتوں کی اور اورارواحوں کو بھی جو دکھائی نہیں دیتیں مانتے تھے اور مختلف شکلیں ان کی طرف منسوب کرتے تھے۔

عرب کے زمانہ جاہلیت کی رسم ورواج کو اس مقام پر ہم نے نہایت سرسری طور پر بیان کیا ہے مگر ہم کو امید ہے کہ ان ہم وحشی لیکن عالی دماغ اور آزاد منش باشندگان عرب کے خانگی اور سوشیل عام حالات معلوم ہونے سے ایک منصف مزاج شخص، اگر ایسا شخص دنیا میں پایا جاتا ہے اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اسلام کے قبل عربوں کا کیا حال تھا اور بعد اسلام کے ان کا کیا حال ہو گیا اور بالعموم ان کے اخلاق کس طرح پر تبدیل ہو گئے ان کی اگلی اور پچھلے حالت کے مقابلہ کرنے میں ہمارا یہ سرسری بیان منصف مزاج شخص کو کافی مدد دے گا اور ایسے نتائج مستنبط کرنے کے قابل کرے گا جن کی جانب اس کی انصاف پسندی اس کو ہدایت کرے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆

(3)::اہل عرب اور ان کے مذاہب اسلام سے قبل

ومن یتمع غیر الا سلام دیناً فلن یقبل منه وهو فی الاخرة من الخاسرین

اس مضمون میں ہم اس امر کی تحقیقات بھی کریں گے کہ ان ادیان میں سے جو زمانہ جاہلیت میں مروج تھے اسلام کون سے دین سے مشابہ تر ہے اور آیا اس مشابہت اور مماثلت کی وجہ سے اسلام ایک دین حق ثابت ہوتا ہے یا ایک عیارانہ بنایا ہوا قصہ۔

مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے

توریت مقدس میں جو بیان انسان کے پیدا ہونے کا اور اس کے بعد بابل میں زبانوں کے مختلف ہو جانے اور روئے زمین پر پراگندہ ہونے کا ذکر ہے اسی کو ہم اپنی اس بحث کا جو اس خطبہ میں ہے ابتدائی مقام فرض کرتے ہیں اور اسی بناء پر یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ عبادت اور پرستش کی سادگی اور یک رنگی خود بخود اس وقت تک جاری رہی ہوگی جب کہ انسان تعداد میں کم اور ایک محدود مقام میں تھے مگر جب کہ وہ زیادہ وسیع ملکوں میں پھیل گئے جن کی آب وہوا اور ملک کی بناوٹ مختلف تھی تو اس وقت ان کے دلوں کو نئے اور عجیب

خیالات نے قریباً ہر ایک بات کی نسبت گھیر لیا خصوصاً اس وجود کی ماہیت کی نسبت جس کی عظمت کے جلوے نیک یا بد خوف و ہراس سے ان کو تسلیم کرنے پڑے۔

وہ لوگ ان قدرتی ظہور کے طبعی اسباب سے جن کے دیکھنے سے ایک تربیت یافتہ آدمی کے دل میں بھی خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے جیسے کہ بھونچالوں کا آنا، زمین کا دھنس جانا اور پھٹ جانا، دریاؤں کا جوش، سمندروں کا تلاطم، پہاڑوں کے عجائبات، درختوں کی کرامات، بادلوں کی گڑگڑاہٹ، بجلی کی کڑک اور چمک اور اس کے گرنے سے بربادی اور خوف ناک طوفانوں کی تباہی کے اسباب سے محض ناواقف تھے اس لیے انھوں نے ان سب کاموں کو کسی ایسے وجود کے کام تصور کیے ہوں گے جس کو وہ اپنے آپ سے بدرجہا اعلیٰ اور زبردست اور بوجہ غیر ظاہر ہوئے اس وجود کے اور بھی زیادہ خوف ناک تصور کرتے ہوں گے یہی اسباب ہیں جن کے سبب ابتداء میں انسان کے دل میں عبادت کرنے اور قربانیاں چڑھانے اور پوجا کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر ان دیوتاؤں کو ان تین طریقوں سے خوش کرنے یا ان کا غصہ مٹانے میں بوجہ ملک کی خاصیت اور ملک کی آب و ہوا کے اور اس کے باشندوں کے عام مزاج اور چال چلن کے ہر ایک ملک کے باشندوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہم کو امید ہے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے اس کتاب کے پڑھنے والے سمجھ جائیں گے کہ عرب میں عموماً مذہبوں کی ابتدا کس طرح پر شروع ہوئی۔

باعتبار مذہب عرب کی تقسیم

عرب میں جو قومیں قبل اسلام کے موجود تھیں ان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں باعتبار مذہب کے چار مختلف فرقوں میں منقسم تھیں 1 بت پرست 2 خدا پرست، 3 لا مذہب اور 4 معتقدین مذہب الہامی

1 بت پرستی

انسان کی جبلت میں جو ہر ایک چیز کے سمجھنے کی طاقت ہے اور جس کو ہم عقل یا سمجھ سے تعبیر کر سکتے ہیں اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اپنے وجود کی نہایت ابتدائی منزل میں اولاً بتوں کی پرستش کا اپنے ذہن میں خیال پیدا کرے اسی سبب سے اولاً اس کے ذہن میں بتوں کی پرستش کا خیال پیدا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ قائم و مستحکم ہو گیا۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ ” آدمی از روئے خلقت اور جبلت کے مذہب کو ماننے والا پیدا ہوا ہے“ اگر وہ معبود حقیقی سے ناواقف ہو گا تو مجازی معبود اپنے لیے بنا لے گا وہ خطروں اور مشکلوں سے گھرا ہوا ہے وہ قدرت کی عظیم الشان طاقتوں کو ہر طرف اپنے اپنے کام میں مشغول دیکھتا ہے جن کے سبب سے اس کو خوف و رجا پیدا ہوتی ہے اور باوصف اس کے سبب سے اس کو خوف و رجا پیدا ہوتی ہے اور باوصف اس کے سبب سے اس کو خوف و رجا پیدا ہوتی ہے اور باوصف اس کے ان کے کام اس کے حیز ادراک اور قبضہ قدرت سے باہر ہیں اس واسطے اس کے دل میں اپنے سے کسی زیادہ طاقتور شے سے ایک تعلق پیدا کرنے کا

جس پر وہ تکیہ اور بھروسا کر سکے خیال پیدا ہوتا ہے قدرت کے ان کاموں کو ذہن نشین کرنے اوران کے سمجھ میں آنے کے لیے اب اس کے واسطے صرف ایک طریقہ ہے طبعی اسباب کا تصور تو بہت تھوڑے عرصہ سے پیدا ہوا ہے ابتدائی انسان صرف ایک قسم کی علت کا گمان کر سکتا ہے یعنی مثل اپنے ایک باارادہ طبیعت کا اس لیے وہ تمام چیزوں کو جنہیں متحرک اور عمل کنندہ پاتا ہے ذی روح اور ذی فہم وجود ٹھہرا لیتا ہے اوران کی طرف مثل انسانوں کے خیالات اور طبائع منسوب کرتا ہے اور اس سے زیادہ کیا قرین قیاس ہوسکتا ہے کہ بذریعہ نذروں اور التجاؤں کے ان کے مہربان کرنے یا ان کی بدمزاجی یا غصہ کے دور کرنے کے واسطے کوشش کرے۔

جب کہ انسان ھنوز وحشیانہ حالت میں تھا اس نے قدرت کی بڑی بڑی اشیاء کو اپنی فرحت یا مصیبت کے اسباب کی نظر سے دیکھا اور اسی واسطے ان کو یہ نسبت اپنے زیادہ طاقت ور سمجھا اور اس نیت سے کہ اپنی دعائیں اور التجائیں ان سے ایک ظاہری شکل میں کرے اس کو اپنی خیالی چیزوں کے مجسم کرنے کے واسطے جواب اس کے معبود ہو گئے نقاشی یا مصوری گو کیسی ہی ناقص ہو عمل میں لانی پڑی بت پرستی کی ایک اور بنا کسی قوم کے کسی شخص کی خدمات کی جو اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے مشہور و معروف ہوا ممنونیت کی خواہش تھی یعنی ایسے کارہائے نمایاں جو شاعروں کے وحشیانہ گیتوں اور نظموں میں مشہور ہوئے اور مرنے کے بعد اس شخص کو معبور ہونے کا رتبہ کا صلہ دلایا یہی امر عرب پر بھی صادق آتا ہے آفتاب، ماہتاب، سیارے اور بروج ملائک اور ارواح جو بقول ان کے انسانوں کی زندگانی کے واقعات پر حاوی اور قادر تھے ان سب کو رتبہ الوہیت دے رکھا تھا اور ان کی پرستش کرتے تھے اسی طرح ان آدمیوں کی بھی پرستش کرتے تھے جنہوں نے اپنے شکرگزار ملک کی خدمتیں بجالا کر نام حاصل کیا تھا۔

اس طریقہ پرستش کے اختیار کرنے میں انسانوں کا منشاء محض معلل بہ دنیا تھا ان بتوں یا ان اشیاء اور اشخاص کی پرستش کا باعث جن کے وہ قائم مقام ہیں یہ اعتقاد تھا کہ اپنے پرستش کنندہ کو ہر قسم کی دنیوی خوشی اور آسائش عطا کرنا اور ان مصیبتوں اور خرابیوں کو جو اس پر نازل ہونے والی ہوں رد کر دینا ان کے اختیار میں ہے اور ان کی پرستش کو ترک کر دینے کی سزا ان کے اعتقاد میں افلاد، بیماری، لاولدی اور عبرت انگیز موتی ہوئی تھی۔

جب کہ زمانہ بڑھتا گیا، جب کہ تہذیب اور شائستگی کو ترقی ہوتی گئی، جب کہ باہمی راہ و رسم کے ذریعے زیادہ شائع اور پرامن ہوتے گئے، جب کہ آدمیوں کو ایک دوسرے سے ملاقی ہونے کا زیادہ اتفاق ہوتا گیا یہاں تک کہ اپنے خیالات اور اپنی رایوں اور اپنے عقائد کا تبادلہ کرنے کے قابل ہوئے ان کے دماغ عالی ہوتے گئے اور ان کی خوشیاں زیادہ شائستہ اور پاک ہوتی گئیں۔

یہی غیر محسوس خیالات کی ترقی عرب میں بھی ہوئی اور اس ملک کے باشندوں نے اپنے معبودوں کو ہر جسمانی آسائش اور روحانی خوشی کے عطا کرنے کا اس شخص کی نسبت جس سے وہ راضی ہوں اختیار کلی دے دیا۔

قدیمی باشندگان عرب کی نسبت یعنی قوم عاد، ثمود، حدیس، جرھم الاولیٰ اور عملق اول وغیرہ کی اس قدر محقق ہے کہ یہ لوگ بت پرست تھے مگر ہمارے پاس کوئی ایسی مقامی روایت عرب کی نہیں ہے جو ہم کو ان کی پرستش اصنام کے طریقوں کی تعین اور جو قدرتیں کہ وہ اپنے معبودوں کی طرف منسوب کرتے تھے ان کی تصریح اور جن اغراض اور ارادوں سے کہ وہ مورتوں کو پوجتے تھے ان کے بیان کرنے میں مطمئن کرے قریب قریب تمام حال جو ہم کو عرب کے بتوں کی نسبت معلوم ہوتا ہے صرف یقطان اور اسماعیل کی اولاد کے بتوں کی نسبت معلوم ہے جو عرب العاربہ اور عرب المستعربہ کے نام سے مشہور ہے ان کے بت دو

قسم کے تھے ایک قسم تو وہ تھی جو ملائک اور ارواح اور غیر محسوس طاقتوں سے جن پر کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے اور جن کو مونث خیال کرتے تھے نسبت رکھتے تھے اور دوسری قسم کے وہ تھے جو نامی اشخاص کی طرف جنہوں نے اپنے عمدہ کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی منسوب تھے۔

وہ قدرتی سادگی اور بے تکلفی جو ابتدائی درجہ تمدن میں آدمیوں کی نشانیاں ہیں ان کی پرستش کے طریقوں میں قابل تمیز نہیں رہی تھیں۔ علاوہ اس کے انہوں نے بہت سے خیالات غیر ملکوں کے اور نیز اپنے ہی وطن اصلی کے الہامی مذہبوں سے اخذ کر لیے تھے اور ان سب کو اپنے توہمات سے خلط ملط کر کے اپنے معبودوں کو دنیا اور عقبٰی دونوں کے اختیارات دے دیے تھے لیکن اتنا فرق تھا کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیوی اختیارات بالکل ان کے معبودوں ے ہاتھ میں ہیں اور عقبٰی کے اختیارات کی نسبت ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کے بت یعنی وہ جن کی پرستش کے لیے وہ بت بنائے گئے ہیں ان کے گناہوں کی معافی کی خدا تعالٰی سے شفاعت کریں گے ان کی طرز معاشرت اور ان کی خانگی سوشیل اور مذہبی اطوار اور رسوم بھی اسی طرح سے گرد و نواح کے ملکوں سے جن کے باشندے الہامی مذہب رکھتے تھے اثر حاصل کیا تھا۔ غرضکہ قبل ظہور اسلام کے ملک عرب میں بت پرستی کی یہ کیفیت تھی۔

2 لامذہبی

زمانہ جاہلیت میں ملک عرب میں ایک فرقہ تھا جو کسی چیز کو نہیں مانتا تھا نہ تو بت پرستی کو اور نہ کسی الہامی مذہب کو ان کو خدا کے وجود سے انکار تھا اور حشر کے بھی منکر تھے اور جو کہ وہ گناہ کے وجود کے قائل نہ تھے اسی لیے عقبٰی میں روح کی جزا یا سزا کے قائل نہ تھے وہ اپنے

آپ کو جملہ قیود قانونی خواہ رسمی سے مبرا تصور کرتے تھے اور اپنی ہی آزاد مرضی کے موافق کار بند ہوئے تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کا وجود اس دنیا میں ایک درخت یا جانور کی مانند ہے وہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی پر پہنچ کر تنزل پکڑتا ہے اور مر جاتا ہے جس طرح کہ کوئی ادنیٰ جانور مر جاتا ہے اور جانوروں ہی کی مانند بالکل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

3 خدا پرستی

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی خدا پرست عرب تھے اور وہ دو قسم کے تھے سا یک تو ایک غیر معلوم اور پوشیدہ قدرت کو جس کو وہ اپنے وجود کا خالق قرار دیتے تھے مانتے تھے لیکن باقی امور میں ان کا عقیدہ لا مذہبوں کے عقیدہ کی مانند تھا دوسری قسم کے فرقہ کے لوگ خدا کو برحق مانتے تھے اور قیامت اور نجات اور حشر اور بقائے روح اور اس کی جزا اور سزا کے جو حسب اعمال انسانوں کو ملے گی قائل تھے مگر انبیاء اور وحی پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔

اس اخیر فرقہ کا عقیدہ تھا کہ غیر فانی روح کی جزا اور سزا دوسرے جہان میں محض آدمیوں کے نیک اور بد اعمال پر جو اس دنیا میں کیے ہوں منحصر ہے۔ اس لیے ضرور ہوا کہ وہ ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ان کو دائمی خوشی حاصل ہو اور ان کو ابدی تکلیف اور خرابی سے محفوظ رکھے۔ لیکن خود ان کے پاس کوئی ایسا اصول جس پر وہ کار بند ہوں موجود نہ تھا اس لیے انہوں نے ان قواعد کی طرف توجہ کی جن کو ان کے گرد و نواح کی قومیں مانتی تھیں اور اپنی سمجھ کے موافق ہر قوم سے کچھ کچھ باتیں اخذ کر کے اختیار کیں۔ یہی اسباب تھے جن کے سبب سے عرب کے کچھ لوگ بت پرست ہو گئے اور بعض نے کسی مذہب معینہ کی پابندی نہیں کی بلکہ اپنی ہی عقل اور سمجھ کے بموجب کار بند ہوئے۔

4 الہامی مذہب

اسلام سے پہلے چار الہامی مذہب عرب میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے 1 مذہب صابئی 2 مذہب ابراہیمی اور دیگر انبیاء عرب کا 3 مذہب یہود 4 مذہب عیسوی

5 مذہب صابئی

اس مذہب کو عرب میں قوم سامری نے رواج دیا تھا جو اپنے آپ کو قدیم مذہب کے پیرو سمجھتے تھے وہ حضرت شیث اور حضرت اخنوخ یعنی ادریس کو اپنے نبی کہتے تھے اور اپنے مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتے تھے ان کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جس کو وہ صحیفہ شیث کہتے تھے ہماری رائے میں کوئی یہودی یا عیسائی یا مسلمان صائبیوں کے اس عقیدہ پر جو وہ حضرت ادریس کے ساتھ رکھتے تھے کسی قسم کا اعتراض نہیں کرسکتا ہے توریت میں حضرت ادریس کو ایک مقدس اور باخدا شخص لکھا ہے اور وہ آیت یہ ہے

" واخنوخ باخدا سلوک نموده بعد ازاں نا پدید شد چه خدا اور را گرفته بود"

(کتاب پیدائش باب 5 ورس 24) وہ شخص جس کو مسلمان ادریس یا الیاس کہتے ہیں اور توریت کا اخنوخ ایک شخص ہیں صائبیوں کے ہاں سات وقت کی نمازیں تھیں اور وہ ان کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس طرح کہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں مردہ کی بھی وہ نماز پڑھا کرتے تھے مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک قمری مہینہ کا روزہ رکھا کرتے تھے مگر جو برائی کہ

آہستہ آہستہ ان کے مذہب میں پھیل گئی تھی وہ یہ تھی کہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے انہوں نے سات ھیاکل یعنی معبہ سبع سیاروں کے لیے بنائے تھے اور جس ستارہ کا جو معبد تھا اسی معبد میں اس ستارہ کی پرستش کرتے تھے حران کے معبد میں سب لوگ بہ نیت حج جمع ہوا کرتے تھے خانہ کعبہ کی بھی بڑی تعظیم کرتے تھے ان کا سب سے بڑا مذہبی تیوہار اس روز ہوا کرتا تھا جب کہ آفتاب برج حمل میں جو موسم بہار کا اول برج ہے داخل ہوتا تھا اور چھوٹے چھوٹے تیوہار اس وقت ہوتے تھے جب کہ پانچ سیارے یعنی زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطاد ربعض برجوں میں یکے بعد دیگرے داخل ہوا کرتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان سیاروں کا سعد اور نحس اثر انسان کی قسمتوں پر اور دنیا کے اور امور پر ہوتا ہے وہ یقین کرتے تھے کہ بارش یا مینہ کی کشش انہیں ستاروں کی تاثیر پر منحصر ہے یہ خیال اور اسی قسم کے اور خیالات اور عقائد صائبیوں کے سوا عرب کے اور لوگوں میں بھی رائج ہو گئے تھے ان میں اعتکاف کرنے کا بھی رواج تھا اور غاروں یا پہاڑوں میں چند روز مراقبہ اور سکوت میں بسر کرتے تھے۔

2 ابراہیمی یا دیگر انبیاء عرب کا مذہب

اسلام سے پہلے پانچ انبیاء عرب میں مبعوث ہوئے تھے 1 ہود، 2 صالح، 3 ابراہیم، 4 اسماعیل، 5 شعیب یہ سب نبی حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کو احکام عشرہ کے عطا ہونے سے بیش تر گذرے ہیں۔

اصل اصول ان جمیع انبیاء کے مذاہب کا خدائے واحد کی عبادت تھا اور دیگر احکام و مسائل جن کو انبیاء مذکور نے بتایا تھا باستشناء احکام و مسائل حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے سب فراموش ہو گئے تھے اور کوئی مقامی روایت ایسی موجود نہیں ہے جو ہم کو اس

بات سے واقف کرے کہ وہ احکام کیا تھے اور کتنے تھے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے مذہب کے احکام و مسائل کے لیے بھی اسی طرح کوئی ایسی کافی سند نہیں ہے جس سے کہ ہم ان کو تفصیل وار بیان کر سکیں اور ایسے بہت کم مسائل ہیں جنہوں نے باستعانت روایت مذہبی اور روایت مقامی کے ایسا تاریخی رتبہ حاصل کیا ہو کہ ہم اس کے حوالہ دینے کے لائق ہوں۔

حضرت ابراہیم کے تقویٰ اور پرہیز گاری کا سب سے پہلا کام بت پرستی کا ترک کرنا، اپنے باپ کے بتوں کا توڑنا اور خدائے برحق پر یقین کر کے صدق دل سے اس کی پرستش کرنا تھا۔

ختنہ ار داڑھی کا رکھنا رسوم مذہبی ہیں جن کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ رسمیں حضرت ابراہیم نے مروج اور معین کی تھیں خدائے پاک کی پرستش کے واسطے قربان گاہوں کے بنانے کی رسم بھی حضرت ابراہیم نے جاری کی تھی اور منجملہ بے شمار قربان گاہوں کے جو حضرت ابراہیم نے بنائیں ایک قربان گاہ اس مقام پر بھی بنائی تھی جہاں کہ حجر اسود قبل اس کے کہ دیوار کعبہ میں اور پتھروں کے ساتھ نصب ہو کھڑا ہوا تھا۔

خدا تعالیٰ کے نام پر قربانی کرنا بھی حضرت ابراہیم نے مقرر کیا تھا اور یہ رسم آج تک ان کی اولاد میں اور ان کی اولاد کے پیروؤں میں بجنسہ مروج ہے۔

خدائے تعالیٰ کی عبادت کے واسطے خانہ کعبہ کی تعمیر کی نسبت عرب کی تمام مقامی روایتیں اور تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بنایا تھا۔

سینٹ پال حواری نے جو گلیشیا والوں کے نام خط لکھا ہے ہماری رائے میں اس سے

بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کو جو ''بیت المقدس کا ہم پایہ ہے'' حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بنایا تھا۔

خانہ کعبہ میں اول خدا کی عبادت اس کے اندر اور باہر کیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے اور طواف کے وقت ساری جماعت پکار پکار کر خدا کا نام لیتی تھی اور خدا نہ کعبہ کو بوسہ دیتی جاتی تھی۔

اس مقام پر خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا فرق ہے خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے اور اس کو اور حجر اسود کو بوسہ دینے اور قربان گاہوں کے بنانے اور ان کی تعظیم کرنے اور حضرت یعقوب کے پتھر کھڑا کرنے اور اس پر تیل ڈالنے اور نماز میں بیت المقدس یا کعبہ کی طرف سجدہ کرنے غرض کہ اشیائے مجسم کی تعظیم اور حرمت کرنے میں اور بت پرستوں کی ان رسوم میں جو کہ وہ اپنے بتوں کی نسبت عمل میں لاتے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کو ہر شخص حقارت اور غصہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور اب بھی دیکھتا ہے۔

بلاشبہ ان دونوں کاموں میں بڑا فرق ہے مگر جو امر کہ لوگوں کو ان دونوں کاموں میں صاف صاف تمیز کرنے سے روکتا ہے وہ لفظ ''بت پرستی'' ہے جس سے یہ مراد سمجھی جاتی ہے کہ آدمی کسی مجسم اور مصنوعی شے کی تعظیم اور پرستش کرنے میں گنہگار ہوتے ہیں۔

مگر یہ غلطی ہے بت پرستوں کے مشرک اور گنہگار ہونے کی صرف یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ مجسم اور مصنوعی اشیاء کی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چند روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاءک ان سب قدرتوں کا مالک سمجھتے ہیں جو درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے علاقہ رکھتے ہیں اور ان اشیاء وغیرہ کی اس طرح بندگی بجالاتے ہیں جو صرف خدا تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے ان کے بت ان وجودوں کے جو غیر خدا ہیں قائم مقام اور یادگار ہوتے ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ کے اس اعتقاد کی وجہ سے وہ

مشرک اور گنہگار رہو جاتے ہیں خواہ وہ ان روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کے ناموں پر کوئی مورت یا بت قائم کر کے پوجتے ہوں خواہ صرف اپنے دل ہی میں یہ اعتقاد رکھ کر ان کی پرستش کرتے ہوں اور ظاہر میں ان کا کوئی بت نہ بناتے ہوں ان کو بت پرست اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اکثر ان روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کی جن کو وہ صفات الٰہی کا مخزن اور معدن سمجھتے تھے اپنے خیال کے موافق بت اور مورتیں بنا کر ان کے توسل سے ان کو پوجتے تھے اگر وہ ان ظاہری وسائل پرستش کو اختیار نہ کرتے لیکن باطن میں یہی اعتقاد رکھتے تب بھی ان کو بت پرست کہنا ناموزوں نہ ہوتا۔

حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی قربان گاہیں جن میں کہ حجر اسود بھی شامل ہے اور حضرت یعقوب کا کھڑا کیا ہوا پتھر اور خانہ کعبہ اور بیت المقدس یہ سب چیزیں کسی مشہور و معروف اشخاص کی یادگار کے طور پر نہیں بنائی گئی تھیں اور نہ وہ کسی فرشتہ یا عظیم الشان قدرتی شے کے نام پر قائم کی گئی تھیں بلکہ بالتخصیص قادر مطلق کے نام پر جو تمام چیزوں کا خالق ہے اور اسی کی پرستش کی غرض سے بنائی گئی تھیں جملہ رسوم اور تکلفات جو ان مقام پر برتے جاتے تھے صرف خدا تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے مختلف طریقے تھے اور خدا تعالیٰ کی بندگی کو کسی طور پر بجا لائی جاوے جس کو خدا تعالیٰ نے منظور اور مقبول کر لیا ہو ہرگز گناہ یا شرک یا بت پرستی نہیں ہوسکتی۔

تمام آدمیوں کا میدان عرفات میں جمع ہونا جہاں کہ نہ حضرت ابراہیم کا حجر اسود ہے نہ حضرت یعقوب کا سنگ قربان گاہ اور نہ حضرت اسماعیل کا معبد بلکہ محض ایک وسیع میدان ہے ان لوگوں کا ایک ساتھ شامل ہو کر خدا کا نام لے کر پکارنا اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنا خاص خدا کی عبادت ہے جس کا نام مسلمانوں نے حج رکھا ہے اور حضرت ابراہیم اور حضرت

اسماعیل اس طرح پر عبادت کرنے کے بانی ہوئے تھے پس کون شبہ کر سکتا ہے کہ حج اس واجب الوجود لاشریک لہ کی خاص الخاص عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ رفتہ رفتہ ملک عرب میں بت پرستی کا عام رواج ہو گیا تھا مگر با ایں ہمہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے اشخاص ایسے بھی تھے جو ان مذاہب الہامی میں سے کسی نہ کسی مذہب کے متبع تھے اور خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے انہیں لوگوں میں سے متعدد نے مجدد مذہب ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی ہونے کا مجمع عام میں وعظ کہا اور لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے پر ترغیب دی وہ لوگ جنہوں نے اپنی نسبت مجدد ہونے کی شہرت دی تھی ان کے نام یہ ہیں حنظلہ بن صفوان، خالد ابن سنان، اسد ابو کرب، قیس ابن صیداہ وغیرہ اور بعضوں نے عبدالمطلب کو بھی ایک مجدد مذہب قرار دیا ہے۔

لیکن یہ کیسا ہی حیرت انگیز امر کیوں نہ معلوم ہو کہ اس شخص کی اولاد جس نے اپنے باپ کے بتوں کو توڑا اور ان کی پرستش سے منہ موڑا اور خدائے برحق کی پرستش کے لیے متوجہ ہوا اور کہا

" انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین"

رفتہ رفتہ بت پرستی کی حالت میں ڈوب جائے مگر اس سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرت آمیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسی کی اولاد میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے پھر اپنے مورثوں کے بتوں کو بلکہ تمام عرب کے بتوں کو غارت کر دیا اور جس نے خدائے اعظم اور علام الغیوب کی عبادت کو جو تمام چیزوں کا مبداء اور مرجع ہے رواج دیا اور اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچا دیا اور جس نے کہا کہ جہالت اور کفر کی اس گہری تاریکی کو جس میں کہ اس کے ہم وطن مبتلا تھے دین حق کے پاک اور شفاف نور سے منور کر دیا۔

7 یہودی مذہب

یہودی مذہب کو شام کے یہودیوں نے عرب کے ملک میں شائع کیا تھا جو اس ملک میں جا کر آباد ہوئے تھے بعض مصنف ناواجب جرأت کر کے یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک قوم بنی اسرائیل کی اپنے جتھے سے علیحدہ ہو کر عرب میں جا بسی تھی اور وہاں اکثر قوموں کو اپنا مذہب تلقین کیا مگر یہ رائے صحت سے بالکل معرا ہے اصل یہ ہے کہ یہودی مذہب عرب ان یہودیوں کے ساتھ آیا تھا جو پینتیسویں صدی دنیوی میں یا پانچویں صدی قبل حضرت مسیح کے بخت نصر کے ظلم سے جو ان کے ملک اور قوم کی تخریب کے درپے ہوا تھا بھاگ گئے تھے اور شمالی عرب میں بمقام خیبر آباد ہوئے تھے تھوڑے عرصہ بعد جب کہ ان کی مضطرب حالت نے کسی قدر سکون اور قرار پکڑا انہوں نے اپنے مذہب کو پھیلانا شروع کیا اور قبیلہ کنانہ اور حارث ابن کعب اور کندہ کے بعض لوگوں کو اپنے مذہب میں لائے جب کہ 3250 دنیوی میں یا 354 قبل مسیح کے یمن کے بادشاہ ذونواس حمیری نے مذہب یہود اختیار کیا تب اس نے اور لوگوں کو بھی بالجبر اس مذہب میں داخل کر کے اس کو بہت ترقی دی اس زمانے میں یہودیوں کو عرب میں بڑا اقتدار حاصل تھا اور اکثر شہر اور قلعے ان کے قبضے میں تھے۔

اس بات کے یقین کرنے کا قوی قرینہ یہ ہے کہ یہودی بت پرستی کو غصہ اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے مگر عرب کی کوئی مقامی روایت اس مضمون کی نہیں پائی جاتی کہ خانہ کعبہ کی نسبت ان یہودیوں کی رائے سے برخلاف تھی مگر یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک تصویر یا موت حضرت ابراہیم کی جن کے پاس ایک مینڈھا قربانی کے واسطے موجود کھڑا تھا یہودیوں کے ذریعے سے خانہ کعبہ میں اس بیان کے مطابق جو توریت میں ہے کھینچی گئی ہوگی یا رکھی گئی ہوگی کیوں کہ یہودی اس قسم کی تصویروں یا مورتوں کے بنانے اور رکھنے کو گناہ نہیں

سمجھتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہودیوں کے ذریعے سے ملک عرب میں خدا تعالیٰ کی معرفت کا علم جیسا کہ قبائل عرب میں بالعموم پیش تر تھا اس سے بھی دو چند ہو گیا وہ عرب جنہوں نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور وہ لوگ بھی جو ان سے راہ و رسم رکھتے تھے اس سے فائدہ مند ہوئے تھے کیوں کہ یہودیوں کے پاس ایک عمدہ قانون شریعت اور سوشیل اور پولٹیکل کا موجود تھا اور اس زمانہ کے عرب اس قسم کی چیز سے بالکل بے بہرہ تھے اس سے ایک معقول طور پر استنباط ہوتا ہے کہ بہت سے خانگی اور سوشیل آئین اور رسوم کو جو اس قانون میں مذکور ہیں عربوں نے اختیار کر لیا ہوگا خصوصاً یمن کے رہنے والوں نے جہاں کہ ان کے بادشاہ ذونواس نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور اس نے یہودی مذہب کی ترویج میں کوشش کی ہوگی۔

ہم کو اس مقام پر مذہب یہود کے مسائل اور عقائد اور ان کی رسموں اور طریقوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ یہ سب باتیں توریت میں موجود ہیں اور ہر شخص ان سے کسی نہ کسی قدر واقف ہے اور وہ امور جن کا بیان کرنا ہم کو بالتخصیص مدنظر ہے اس مقام پر بیان ہوں گے جہاں کہ ہم مذہب یہود اور اسلام کے تعلق باہمی پر بحث کریں گے۔

8 عیسوی مذہب

یہ بات محقق ہے کہ عیسوی مذہب نے تیسری صدی عیسوی میں ملک عرب میں دخل پایا تھا جب کہ ان خرابیوں اور بدعتوں کی وجہ سے جو آہستہ آہستہ مشرقی کلیسا میں شائع ہو گئی

تھیں قدیم عیسائیوں کی تباہی ہوئی تھی اور وہ لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے تاکہ اور کسی جگہ جا کر پناہ لیں اکثر مشرقی اور نیز یورپین مورخ جنہوں نے اس مضمون کو مشرقی مصنفوں سے اخذ کیا ہے اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ وہ زمانہ ذونواس کی سلطنت کا زمانہ تھا مگر ہم اس کی رائے سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارے حساب کے موافق جس کا بیان ہم نے خطبہ اول میں کیا ہے ذونواس کا زمانہ قریباً چھ سو برس پیشتر اس واقعہ کے گذر چکا تھا اور اسی وجہ سے ہم ان مصنفوں کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کرتے جن کا بیان ہے کہ ذوانوس نے عیسائیوں کی تخریب کی تھی۔

اول مقام جہاں کہ یہ بھاگے ہوئے عیسائی آباد ہوئے تھے نجران تھا اور اس سے پایا جاتا ہے کہ وہاں کے متعدد بہ لوگوں نے عیسوی مذہب قبول کر لیا تھا یہ عیسائی فرقہ جیکو بائٹ یعنی یعقوبی فرقہ تھا اور اس لقب سے مشرقی فرقہ ''مانو فیز بٹیز'' کا موسوم کیا جاتا تھا اگرچہ صحیح طور پر یہ لقب شام اور عراق اور بابل کے فرقہ ''مانو فیز بٹیز'' پر اطلاق ہوسکتا ہے یکو بایٹ کا لقب ایک شام کے راہب کے سبب سے جس کا نام جیکو بس براڈیش تھا اس فرقہ کا پڑ گیا تھا اور جس نے کہ یونان کے بادشاہ جسٹی نین کے عہد میں اپنے ملک سے نکلے ہوئے ''مانو فیز پٹیز'' کا ایک علیحدہ فرقہ قائم کر لیا تھا ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ صرف ایک صفت رکھتے ہیں یعنی ایک انسانی صفت نے ان میں تقدیس کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

عیسائی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسوی مذہب نے اہل عرب میں بہت ترقی حاصل کی تھی مگر ہم اس باب میں ان سے اتفاق نہیں کرتے کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ باستثنائے صوبہ نجران کے جس کے اکثر باشندوں نے عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ قبائل حمیر، غسان، ربیعہ، تغلب، بحرو، تونخ، طے، قودیہ اور حیرہ میں معدود اشخاص نے ان کی تقلید کی تھی اور کوئی جماعت کثیر یا قوم کی قوم عیسوی مذہب میں نہیں آئی تھی جس طرح کہ یہودی

مذہب میں آ گئی تھیں اغلب ہے کہ ان متفرق اعراب متنصرہ کی وساطت سے حضرت مریم کی تصویر خواہ مورت حضرت عیسیٰ کو گود میں لیے ہوئے خانہ کعبہ کی اندرونی دیواروں پر کھینچی گئی ہو یا اس کے اندر رکھی گئی ہو۔

خانہ کعبہ میں متعدد قوموں کے معبودوں کی یا بزرگوں کی تصویریں یا مورتیں رکھی ہوئی تھیں اور جس فرقہ سے وہ تصویر یا موت علاقہ رکھتی تھی وہی فرقہ اس کی پرستش کرتا تھا جب کہ عرب کے لوگوں نے یہودی اور عیسائی مذہب اختیار کر لیا تو اسی مذہب کے لوگوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت مریم کی تصویر یا مورت خانہ کعبہ میں رکھی یا کھینچی ہو گی کیوں کہ جس طرح عرب کے اور فرقوں کو اپنے معبودوں یا بزرگوں کی مورتیں رکھنے یا کھینچنے کا کعبہ میں حق تھا اسی طرح ان عربوں کو بھی حق تھا جو یہودی اور عیسائی ہو گئے تھے اور کسی کو اس کی ممانعت کا حق نہ تھا۔

اسلام سے پیش تر ملک عرب کی یہ مذہبی حالت تھی اور ایسے مختلف مذہب جو زمانہ واحد میں وہاں مروج ہو گئے تھے اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا ہو گا کہ ان مذہبوں کے احکام اور مسائل اور رسوم باہم خلط ملط اور اہل عرب میں بالعموم مروج ہو گئے ہوں گے کیوں کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ان نیم وحشی اور جاہل لوگوں کو اس قدر شعور ہو کہ اتنے مذاہب مختلفہ کے باہمی تفرق کو جانچ سکتے ہوں اور ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر کے دقیق تفاوت کی تمیز کرتے ہوں۔

اسلام کی مناسبت دیگر الہامی مذہب سے

ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتاً

اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعتاً جزیرہ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھرپور کر دیا اس لیے اگر یہ کہنا جائز ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ دین سلام عرب کے حق میں رحمت ایزدی سے کچھ زیادہ تھا اسلام از روئے اصول کے بت پرستی کے بالکل متناقض تھا۔ کیوں کہ وہ حقائق قدرتی اور ابدی کی تعلیم و تلقین کر کے انسان کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانا چاہتا تھا۔ اور بت پرستی انسان کو جہالت کی حالت میں رکھ کر از روئے تمدن اور اخلاق کے دونوں طرح سے غلام بنانا چاہتی تھی اسلام لامذہبی سے بھی کچھ موافقت نہ رکھتا تھا کیوں کہ اس کا ابتدائی اور خاص اصول یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی وحدانیت پر اس کے وجود پر بے چون و چرا اعتقاد رکھنا چاہیے جس کے وجود سے لامذہبوں کا انکار تھا مذہب اسلام میں اور عرب کے خدا پرستوں کے مذہب کے دونوں فرقوں میں سے دوسرے فرقہ سے کوئی سخت مخالفت نہ تھی کیوں کہ اگر اس فرقہ کے عقائد میں وحی کے عقیدہ کو اضافہ کیا جاوے تو مذہب اسلام کے اصلی اصول کے بہت قریب قریب ہو جاتا ہے مذہب صائی کے عقائد الہامی سے اسلام بالکل مماثل تھا لیکن اس مذہب میں اجرام فلکی کی پرستش کو رد کرتا تھا اور سیاروں کے نام پر مورتیں بناتے اور معابد قائم کرنے کو بھی جو ایک قسم کی بت پرستی ہے اور جس میں قوم اور صائی بوجہ امتداد زمانہ کے آہستہ آہستہ آ پڑی تھی ناروا ٹھہراتا تھا۔

ابراہیمی مذہب اور عرب کے اور نبیوں کے مذہب اور یہودی مذہب کے اصول اور احکام اور عقائد اسلام کے اصول اور احکام اور عقائد کے کچھ بھی متناقض نہ تھے بلکہ درحقیقت اسلام کے اصول اور احکام ابراہیمی مذہب اور دیگر انبیائے عرب کے مذہب اور یہود کے مذہب کے اصول اور احکام کو مکمل کرتے تھے اسلام میں اور یہودی مذہب میں صرف یہ فرق تھا کہ اسلام حضرت یحیٰی کو تسلیم کرتا تھا مگر یہودیوں اور عیسائیوں کی بعض غلط تفاسیر کو جو وہ

توریت اور انجیل کی آیتوں کی کرتے تھے نہیں مانتا تھا اصول اسلام ان عمدہ اصول سے جن کی درحقیقت حضرت عیسیٰ نے تلقین کی تھی مطابقت نامہ رکھتا تھا لیکن زمانہ اسلام میں جو عیسائی تھے ان کے اصول اور عقائد اور مسائل اور رسوم مذہبی اور ان کے برتاؤ سے بالکل مخالف تھا اور بجز چند متفرق اور متعدد مسائل اخلاق کے کسی اور چیز میں ان دونوں مذہبوں میں نہ تھی۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کیا ہے ہم جواب دیتے ہیں کہ مذہب اسلام صائی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ابراہیمی مذہب اور عرب کے دیگر الہامی مذہبوں کے اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ترتیب اور یہودی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی قرار واقعی تکمیل اور اللہ جل شانہ، کی وحدانیت کی ایسے اعلیٰ درجہ پر توضیح جو کسی اور مذہب میں اس تکمیل سے نہیں تھی اور جس کو ہم وحدت فی الذات اور وحدت فی الصفات اور وحدت فی العباد سے تعبیر کرتے ہیں اور اخلاق کے ان اصولوں کی جن کی حضرت عیسیٰ نے دراصل تلقین کی تھی تکمیل ہے اور ان تمام مذاہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور اجتماع کا نام اسلام ہے ہم اپنے اس جواب کو بعض مثالوں کے حوالہ سے مشرح کرتے ہیں۔

مذہب اسلام میں دوسرے معبود کی پرستش کا امتناع اور بت پرستی کا استیصال یہودیوں کے مذہب کے اصول کے بالکل مماثل ہے۔ توریت میں لکھا ہے کہ ”درحضور من ترا خدایان غیر نہ باشند“ (سفر خروج باب 20 ورس 3) بہر چہ شمارا مامور داشتم رعایت نماید واسم خدایان غیر را ذکر نہ نمودہ از دھانت شنیدہ ندشود (سفر خروج باب 23 ورس 13) ” بجہت خود صورت تراشیدہ و ہیچ شکل از چیز ہائیکہ در آسمان ست در بالا و یا در زمین ست در پائین و یا دو آب ھلہ“ کہ در زیر زمین است مساز آنہا را سجدہ لہ نمودہ ایشاں را عبادت منا

زیرا کہ من خداوند خدائے تو ام (سفر خروج باب 20 ورس 4,5) بہ تنہا توجہ منہائید و خدایان ریختہ شدہ از برائے خود مسازید خداوند خدائے شما منم (سفر لویان باب 19 ورس 4) از بائے خودتاں بتاں واصنام تراشیدہ شدہ مسازید ونصب شدھا از برائے خودتاں بر پائے منہمائید و درزمین خودتاں تصویر ہائے سنگے جہت سجدہ نمودنش مگذارید، زیرا کہ خداوند خدائے شمامم (سفر لویان باب 26 ورس 1) ''خدایان ایشاں راسجدہ نہ نمودہ بآنہا عبادت مکن وموافق اعمال ایشاں عمل منہا بلکہ ایشاں رابالکل منہدم ساختہ وبت ہائے ایشاں بالتمام بشکن'' (سفر خروج باب 23 ورس 24)

سب سے بہتر اور اعلیٰ احکام یہودی مذہب میں ہیں جو ذیل میں لکھتے جاتے ہیں اسلام میں یہی حکام بجنسہ موجود ہیں ''پدر و مادر خود رااحترام نما، قتل مکن، زنا منہا، دزدی مکن، بر ہمسایہ ات شہادت دروغ مدہ، بخانہ ہمسایہ ات طمع مورز'' (سفر خروج باب 20 ورس 12,17)

اوقات نماز جو اسلام میں مقرر ہیں اور جن کی تعداد[1] سات یا پانچ یا تین ہیں مذہب صائی اور مذہب یہود کی اوقات نماز سے بہت مشابہ ہیں۔

اسلام میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ صائی مذہب اور یہود کے مذہب کے طریقہ سے نہایت مماثل ہے نماز ل دل کی صفائی کے لیے تھی اور یہی اصل منشاء نماز کے قرر کرنے کا تھا

1 یعنی فجر، ضحیٰ، یعنی چاشت، ظہر، عصر، مغرب، عشا، تہجد، دوسری اور ساتویں نماز مسلمانوں میں فرض نہیں اور باقی پانچ نمازیں فرض ہیں دوسری اور تیسری کو اور چوتھی اور پانچویں کو ایک وقت میں پڑھ لینے کا اختیار ہے اس صورت میں پانچ نماویں اور تین وقت رہ گئے (سید احمد)

اور جسم اور پوشاک وغیرہ کی صفائی جس کے واسطے شرع اسلام میں حکم ہے صائبیوں اور یہودیوں کی اس قسم کی رسومات سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں توریت میں خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا کہ نزد قوم رواند شدہ ایشاں راامروز وفردا تقدیس نمائے تا کہ جامہ ہائے خود راشست وشونمایند (سفر خروج باب 19 ورس 10) ''پس موسیٰ ہارون و پسرانش را نزدیک آوردہ ایشاں رابہ آب شست وشوداد'' (سفر لویان باب 8 ورس 6)

مذہبی امور میں صرف ایک یہی بات اسلام میں نئی ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی یعنی نماز کے بلانے کے لیے یہودیوں کے قرنائے بجانے اور عیسائیوں کے گھنٹے بجانے کے بدلے اذان مقرر کی گئی ہے اس نرالے پن کی نسبت ایک عیسائی مصنف اس طرح پر لکھتا ہے کہ ''مختلف اوقات نماز کی اطلاع موذن مسجدوں کی میناروں یا مانوں پر کھڑے ہوکر اذان دینے سے کرتے ہیں ان کا لحن جو ایک بہت سادہ مگر سنجیدہ لہجہ میں بلند ہوتا ہے شہروں کی دوپہر کی ودند پکار میں مسجد کی بلندی سے دلچسپ اور خوش آواز معلوم ہوتا ہے لیکن سنسان رات میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ اکثر فرنگیوں کی زبان سے بھی پیغمبر صاحب کی تعریف نکل گئی ہے کہ یہودیوں کے معبد کی قرنائے اور کلیسائے نصاریٰ کے گھنٹوں کی آواز کے مقابلہ میں انسانی آواز کو پسند کیا۔''

تمام قربانیاں جو مذہب اسلام میں جائز ہیں مذہب یہود کی قربانیوں کے مشابہ ہیں گویا یہ قربانیاں شارع اسلام نے مذہب یہود کی بے شمار قربانیوں سے منتخب کرلی ہیں اور جو تاکیدی حکم مذہب یہود میں ان قربانیوں کے کرنے کی نسبت تھا اس کو نہایت خفیف بلکہ اختیاری کردیا ہے۔

مذہب اسلام میں جو روزے مقرر ہیں وہ مذہب یہود اور مذہب صائی کے روزوں سے مشابہ ہیں بلکہ صائی مذہب کے روزوں سے بہ نسبت یہودی مذہب کے روزوں کے

زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

ہفتہ کے ایک معینہ دن میں نماز اور دیگر رسوم مذہبی کے مقررہ وقت پر لوگوں کو کار ہائے دنیوی سے منع کرنا یہودیوں کی اسی قسم کی رسم سے مطابقت رکھتا ہے لیکن حضرت ابراہیم کے زمانہ سے اہل عرب جمعہ کو متبرک دن سمجھتے آئے ہیں۔

ختنہ بھی وہی ہے جس کا یہود اور پیروان حضرت ابراہیم کے ہاں دستور تھا نکاح اور طلاق کا بھی قریب قریب ویسا ہی قاعدہ ہے جیسا کہ اور مذہب الہامی میں تھا توریت میں لکھا ہے کہ ''اگر کسے زنے را گرفتہ بہ نکاح خود درآورد وواقع شود کہ بہ سبب چیز کینے کہ درو یافت شد درنظرش التفات نہ باید آنگاہ طلاق نامہ نوشتہ بدستش بدھد وا اورا از خانہ اش رخصت دھد'' (سفر توریہ مثنی باب 24 ورس 1)

بعض عورتوں سے نکاح کرنے کے جواز یا عدم جواز میں جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ اکثر باتوں میں یہودیوں کے مذہب کے احکام سے مشابہ ہیں۔

جب مرد اور عورت کو مسجد میں جانے یا قرآن مجید کے چھونے کا امتناع نہیں دستوروں سے مشابہت رکھتا ہے جو مذہب یہود میں جاری ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ مذہب اسلام میں بہ نسبت مذہب یہود کے یہ امتناع کم سختی سے ہے۔

سوئر کے گوشت کے کھانے کی ممانعت مذہب اسلام میں ویسی ہی ہے جیسی کہ بنی اسرائیل کے مذہب میں تھی توریت میں لکھا ہے ''وخوک باوجودیکہ ذی سم چاک وتمام شگاف است اما نوش خوار نمی کند آں برائے شما ناپاک است''

(سفر لویاں باب 11 ورس 7)

جانوروں کے حلال یا حرام ہونے اور مرے ہوئے جانور کا گوشت نہ کھانے کی نسبت جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ موسوی شریعت کے نہایت ہی مشابہ ہیں بلکہ

علمائے اسلام نے وہ تمام مسائل موسوی شریعت سے مستنبط کیے ہیں۔

شراب خواری اور دیگر مسکرات کا امتناع بھی موسوی شریعت کے مشابہ ہے توریت میں ہے کہ ''ہنگام درآمدن شما بہ خیمہ شراب و مسکرات رانخورید'' (سفر لویان باب 10 ورس 9) مگر مذہب اسلام نے اس خرابی کی جو شراب سے ہوتی ہے پوری بندش کر دی ہے یعنی شراب کو بالکل حرام کر دیا ہے اور کسی وقت پینے کی اجازت نہیں ہے۔

مذہب اسلام میں مختلف جرائم اور تقصیرات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہیں وہ بھی ان سزاؤں سے جو موسوی شریعت میں ہیں نہایت درجہ مشابہت رکھتی ہیں زنا کی سزا سو کوڑے مارنا مذہب اسلام میں ہے یہ سزا یہودیوں کے قانون سے مختلف ہے لیکن جو علمائے اسلام یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں بھی زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے تو یہ سزا یہودیوں کے مذہب سے بالکل مماثلت رکھتی ہے۔

مسلمان فقہائے نے ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے اگر درحقیقت مذہب اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہو وہ بھی موسوی شریعت سے بالکل مماثل ہے توریت میں لکھا ہے ''وہر کسے کہ اسم خداوندرا کفر بگوید البتہ باید کشتہ شود تمامی جماعت باید اورا بے تامل سنگسار نمایند خواہ غریب خواہ متوطن چونکہ اسم خداوند را کفر گفتہ است کشتہ شود'' (سفر لویاں باب 24 ورس 16)

بعض عیسائی مورخوں نے کہا ہے کہ اسلام میں ملائک کا تصور اور اعتقاد یہودیوں کی کتاب تالمد سے اور جنات اور شیاطین کا اعتقاد یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمد دونوں سے اور مرنے کے بعد جسم اور روح کی حالت کا بیان یہودیوں سے اور بہشت اور دوزخ کی کیفیت یہودیوں اور عیسائیوں سے اور قیامت اور روز حشر کے حالات کا یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمد سے اخذ کیا ہے مگر ہمارے رائے یہ ہے کہ اول تو وہ حالات جس طرح پر کہ

لوگ خیال کرتے ہیں اس طرح پر مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے دوسرے یہ کہ ان امور میں سے جس قدر کہ مذہب اسلام سے علاقہ نہیں رکھتے ہیں وہ ان ذریعوں سے اخذ نہیں کئے گئے کیوں کہ بجز اتحاد نام کے اور جو کچھ کہ اسلام میں بیان کیا گیا ہے وہ کتب مذکورہ بالا کے بیان سے بالکل اختلاف رکھتا ہے۔

اس خطبہ میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم ان امور پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں اور ان امور میں سے جو امور کہ متعلق اسلام ہیں اور جو امور کہ متعلق اسلام نہیں ہیں ان میں تمیز کریں اور امور متعلقہ اسلام کی کامل تشریح کریں اس لیے ہم اس مضمون کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ اگر بالفرض امور مذکورہ بالا مذہب اسلام سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے کہ بالعموم مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر کا اعتقاد ہے تو وہ امور بھی مذہب اسلام میں اسی قسم کے تصور کیے جاویں گے جیسے کہ مذہب اسلام کے اور احکام یہودی مذہب سے مشابہ ہیں۔

اسلام نے عیسائی مذہب سے بجز مندرجہ ذیل عقیدوں کے اور کوئی عقیدہ اخذ نہیں کیا ہے ایک یہ کہ ''اللہ کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے پیار کر'' (انجیل متی باب 22 ورس 37) دوسرا یہ کہ ''اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے کریں تم بھی ان سے ویسا ہی کرو'' (انجیل لوک باب 6 ورس 31)

صداقت اسلام کی دلیل

اس مقام پر اگر کسی محقق اور صداقت کے متلاشی مزاج آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر یہی حال ہے تو اسلام اصول اور عقائد متفرقہ اور منتشر و مذاہب سابق کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے جو ادھر ادھر سے جمع کر لیے ہیں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں

ہے جو اسلام کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہو لیکن ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گئی کہ یہ مشابہت اور مماثلت اصول اور عقائد مذہب اسلام کی دیگر مذہب الہامی کے اصول وعقائد سے مذہب اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہے غیر منتہی اور کامل ذات ہو ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے لحاظ سے خارج کر دینا محال ہے اسی طرح سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لیے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں۔

محسن عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلعم

مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا جنہوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنہوں نے اپنے باایمان متبعین کے لیے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

☆☆☆☆☆☆☆

اختتام ـــــــــــــــــــــــــ حصہ اول

اردو کا کلاسیکی ادب

مقالات سرسید

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیرت طیبہ
کے متعلق بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات

جلد یازدہم حصہ دوئم

مرتبہ

مولانا محمد اسماعیل، پانی پتی

(4) اسلام دنیا کے لیے رحمت ہے اور تمام انبیاء کے مذاہب کی پشت و پناہ

الیوم اکملت لکم دینکم واتمت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

مذہب اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور موسوی اور عیسوی مذہب کو اس سے نہایت فائدے پہنچے ہیں۔

یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیوں کہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمانی مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اس کا ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفدار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لیے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے ہمارا یہ مضمون چار حصوں پر منقسم ہے۔

مضمون کا پہلا حصہ

پہلے حصہ میں ان فائدوں کا بیان ہے جو مذہب اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں۔

گو ہم کیسے ہی سچے دل اور نیک نیت سے ناطرفدارانہ اس مضمون کو لکھیں گے مگر ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جو بات مذہب اسلام کے متعلق ہوتی ہے اس کو عیسائی مصنف ہمیشہ بد ظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نیکی کو چھوڑ بدی پر حمل کرتے ہیں اس لیے ہم کو توقع نہیں ہوتی کہ جو خاص ہماری رائے اس باب میں ہو وہ اسی بدگمانی اور بدظنی کی نگاہ سے نہ دیکھی جاوے اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر ہم انہیں راؤں کا بیان کریں جن کو خود بعض عیسائی مصنفوں نے انسان کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت لکھی ہیں۔

سر ولیم میور جو ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے اپنی کتاب لائف آف احمد مپن جس کے لیے ہم مسلمانوں کو ان کا شکر کرنا چاہیے ارقام فرماتے ہیں کہ ''ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے (یعنی مذہب اسلام نے، ہمیشہ کے واسطے اکثر توھمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک جزیرہ نما پر چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ایک خاص اور ہر ایک جگہ احاطہ کی ہوئی قدرت کا مسئلہ حضرت محمد کے معتقدوں کے دلوں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا ہے جیسے کہ خاص محمدؐ کے دل میں تھا مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنے ہیں یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا

چاہیے بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چناں چہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت برتنی چاہیے نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے، مذہب اسلام اس بات پر فخر کرسکتا ہے کہ اس میں پرہیز گاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔''

سر ولیم کی اس تحریر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ اس سچے مسئلہ وحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پر تاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج تھے اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور سخت گناہ ہے۔

برادرانہ دینی محبت کا برتاؤ آپس میں مسلمانوں کے ایک خدا کے ماننے والے ہونے کی وجہ سے بتایا جو ایک قدرتی رشتہ دینی بھائی ہونے کا ہے مگر انسانی محبت کا برتاؤ تمام انسانوں سے بلکہ ہر ایک سے جو جگر تو رکھتا ہو برتنے کو فرمایا۔

غلاموں کی نسبت اگر صحیح تسلیم کیا جاوے تو اسلام نے غلامی کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہے اسیران جنگ کے سوا کوئی غلام نہیں ہوسکتا تھا وہ بھی زمانہ جاہلیت کی رسم کے موافق مگر قرآن نے

"اما منا بعدوا اما فداء"

کہہ کر اس کو بھی نابود کر دیا جو لوگ اسیران جنگ کو احساناً چھوڑ دیتے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ پاتے ہیں اور جو کچھ لے کر چھوڑتے ہیں وہ ان سے کم تر گنے جاتے ہیں اس حکم کے

پہلے سے جو لوگ غلام رکھتے تھے ان کی پرورش کا اسی طرح ان کو حکم دیا جس طرح کہ وہ آپ اپنی جان کی پرورش کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کی نسبت سر ولیم میور نے مذکورہ بالا فقرہ میں اشارہ کیا ہے مگر اتنی بات اور زیادہ کرنی چاہیے تھی کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے اور ناشائستہ کلمات کے منہ سے نکالنے کی ممانعت سے والدین کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے ایک مناسب اندازہ سے خیرات دینے کی رغبت دلانے سے لوگوں کو ان کی حاجت میں قرض حسنہ دینے سے وعدہ کی وفا کرنے کی تاکید سے جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی برتنے کے حکم سے انسانوں کے اخلاق اور ان کی حسن معاشرت میں بہت کچھ ترقی دی ہے۔

مشہور اور نہایت لائق اور قابل مورخ گبن اپنی کتاب میں جہاں یہ بحث کرتا ہے کہ حضرت محمدؐ اپنے ملک کی نسبت کیسے تھے اس طرح پر لکھتا ہے کہ "حضرت محمدؐ کی سیرت میں سب سے اخیر جو بات غور کرنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ان کا عظم وشان لوگوں کی بھلائی اور بہبودی کے حق میں مفید ہو یا مضر جو لوگ کہ آنحضرت کے سخت دشمن ہیں وہ بھی اور نہایت متعصب عیسائی اور یہودی بھی باوجود پیغمبر برحق نہ ماننے کے اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرت نے دعویٰ رسالت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لیے اختیار کیا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اس سے اچھا ہے (گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذہبوں سے مذہب اسلام چھا ہے) آنخضرت یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب سماویہ قدیمہ کی سچائی اور پاکیزگی اور ان کے بانیوں یعنی اگلے پیغمبروں اور معجزوں اور ایمان داری کو مذہب اسلام کی بنیاد خیال کرتے تھے۔ عرب کے بت خدا کے تخت کے روبرو توڑ دیے گئے اور انسان کے خون کے کفارہ کو

نماز روزہ خیرات سے بدل دیا جو ایک پسندیدہ اور سیدھے سادھے طریقہ کی عبادت ہے (یعنی جو انسان کی قربانی بتوں پر ہوتی تھی اس کو معدوم کیا اور بعوض اس کے نماز و روزہ و خیرات کو بطور کفارہ قرار دیا) ان کے عقبیٰ کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں شاید وہ اپنے ملک کا اخلاقی اور ملکی انتظام درستی سے نہ کر سکتے ہوں مگر آنحضرت نے مسلمانوں میں نیکی اور محبت کی ایک روح ڈال دی آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم ہونے کو روک دیا قومیں جو کہ مخالف تھیں اعتقاد میں فرماں برداری میں متفق ہو گئیں خانگی جھگڑوں میں جو بہادری بیہودہ طور سے صرف ہوتی تھی نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے مقابلہ پر مائل ہو گئی۔''

مسٹر گبن کی یہ رائے بھی کسی قدر حاشیہ لکھنے کے لائق ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ مسٹر گبن ایک نہایت غیر متعصب مورخ ہے اور مسلمانوں کی تاریخ بھی اس نے نہایت سچائی اور دیانت داری سے لکھی ہے مگر بعض مذہبی مسائل جو اس کو تحقیق نہیں ہوئے یا غلط طور سے اس تک پہنچے یا جہاں اصلی مسئلہ اور علما کی رائے اور اجتہاد میں اس نے تمیز نہیں کی ان مقاموں میں اس نے نسبت آنحضرت صلعم کے یا مذہب اسلام کے رائے قائم کی ہے اور ہم کو اس نامی مورخ کے نہایت بے تعصب ہونے کی وجہ سے یقین ہے کہ اگر صحیح مسئلہ اس تک پہنچتا تو کبھی وہ رائے قائم نہ کرتا جو اس نے کی۔

انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان ناممکن ہے ان دیکھی، ان چھوئی، ان چکھی، ان سمجھی، چیز کیوں کر سمجھ میں آ سکتی ہے؟ جس چیز کے لیے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہوں وہ کیوں کر بیان ہو سکتی ہے؟ کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیوں کر بتلائی جا سکتی ہے؟ یہ تمام امور محالات سے ہیں پس وحی یا الہام ان کو

کیوں کر بیان کرسکتا ہے؟ سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے کہ

”لاعین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر“

پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور سزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی موذی چیز ہے اور کچھ نہیں بتا سکتا سو وہ بھی دنیا ہی کی محبوب اور موذی چیزوں پر قیاس ہوسکتا ہے نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب و موذی چیز پر اس لیے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب و موذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا بیان کیا ہے موسیٰ یہی فرمایا کیے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ پیدا ہوگا وبا نہ ہوگی گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا وبا پھیلے گی انہوں نے اپنی تمام زندگی میں عقبی کا نام ہی نہیں لیا کیوں کہ اس زمانہ کے لوگ بجز اس کے اور کسی چیز پر سزا و جزا کا قیاس کر ہی نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت صلعم نے سزا و جزا کا ان دنیاوی تمثیلوں میں بیان کیا جس پر اس ملک کے لوگ سزا و جزا کے محبوب و موذی ہونے کا قیاس کر سکتے تھے نہ یہ کہ اس سے وہی حقیقت مراد تھی جو ان لفظوں کے لغوی معنی تھے اگر آنحضرت صلعم یورپ کے کسی ٹھنڈے ملک میں پیدا ہوتے تو ضرور بجائے ٹھنڈی نہروں کے گرم پانی کی نہریں اور بجائے موتی کے محلوں کے آتش خانہ والے محل بیان فرماتے اور نہ اس سے حقیقت مراد ہوتی نہ اس سے بلکہ صرف ایک تمثیل قیاس کرنے کو تھی وہ بھی صحیح قیاس کرنے کو نہیں بلکہ قیاس مع الفارق کرنے کو جس قدر علمائے ربانی گذرے ہیں وہ سب اسی بات کے قائل ہیں قل آعوذیے ملانے بلکہ کٹ ملا ہمیشہ ان کے برخلاف رہے مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے مخالف یا موافق ہونے سے تبدیل نہیں ہوتی۔

اخلاقی اور ملکی انتظام کی نسبت بھی جو کچھ مسٹر گبن صاحب نے لکھا حاشیہ چڑھانے کے قابل ہے اخلاق کا لفظ جو انہوں نے استعمال کیا وہ اسپریچوئل اور سوشیل یعنی روحانی اور

تمدنی دونوں برتاؤں کو شامل ہے۔ روحانی برتاؤ کی نیکی تمدنی برتاؤ کی خوبی کو لازم ہے الا تمدنی برتاؤ کو روحانی نیکی یا بدی سے تعلق ہونا کچھ ضرور نہیں ہے آنحضرت صلعم کا کام صرف اسپر چوئل ور چو یعنی روحانی نیکی کا بتانا تھا اور جہاں تک اس کو تمدن سے تعلق تھا بطور لزوم کے تھا نہ بطور مقصود بالذات کے کیوں کہ وہ از خود انسان کی حالت ترقی کے ساتھ ترقی پائی جاتی ہے پس یہ بات کہ آنحضرت صلعم نے روحانی اخلاق کو کافی ترقی دی خود مسٹر گبن نے تسلیم کی ہے باقی رہی تمدنی حالت یہ ان کے اصلی کام کی جس پر وہ کھڑے ہوئے جزو نہ تھی گو اس میں بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔

ملکی انتظام محض ایک دنیاوی کام تھا جہاں تک جان و مال کے امن سے متعلق تھا اور اس زمانہ کی حالت کے مطابق بطور ایک دنیاوی کام کے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچا تھا اور آئندہ کے لیے وہ یہ انتظام فرما کر کہ

" انتم اعلم بامور دنیاکم"

ان لوگوں کے ہاتھوں چھوڑا تھا جو آئندہ زمانہ میں ہوں یہ ایک نہایت غلطی ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی امور اور انتظام ملکی بھی ایک جزو پیغمبری کا تھا۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمیٰ ''اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن'' میں یہ رائے لکھی ہے کہ ''اس بات کا خیال کرنا جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے اس کی اشاعت صرف بزور شمشیر ہوئی تھی کیوں کہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں وہ سب بلا تامل اس بات کو تسلیم کریں گے کہ حضرت محمد کا دین (جس کے ذریعہ سے انسانوں کے خون یعنی قربانی کے بدلے نماز اور خیرات جاری ہوئی اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی اور حسن معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی اور جس کا اسی وجہ سے بہت بڑا اثر شائستگی پر ہوا ہوگا)

مشرقی دنیا کے لیے ایک حقیقی برکت تھا اور اس وجہ سے خاص کر اس کو ان خون ریز تدبیروں کی حاجت نہ پڑی ہوگی جن کا استعمال بلا استثنا اور بلا امتیاز کے حضرت موسیٰ نے بت پرستی کے نیست و نابود کرنے کو کیا تھا پس ایسے اعلیٰ وسیلہ کی نسبت جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغو اور بیہودہ بات ہے۔ جب ان معاملات پر خواہ اس مذہب کے بانی کے لحاظ سے خواہ اس مذہب کے عجیب و غریب عروج اور ترقی کے لحاظ سے نظر کی جاوے تو بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں ہے کہ اس پر نہایت دل سے توجہ کی جاوے اس امر میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں نے مذہب اسلام اور مذہب عیسائی کی خوبیوں کو بمقابلہ ایک سروے کے تحقیق کیا ہے اور ان پر غور کی ہے ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جو اس تحقیقات میں اکثر اوقات تردد کرتے ہوں اور صرف اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ مذہب اسلام کے احکام بہت ہی عمدہ اور مفید مقاصد کو لیے ہوئے ہیں بلکہ اس بات کا اعتقاد کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں کہ آخر کار مذہب اسلام سے انسان کو فائدہ کثیر پیدا ہو گا۔''

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہر ایک طرح کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن شخصوں نے فلسفہ اور علوم وفنون کو سب سے پہلے زندہ کیا جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور ایک سلسلہ کے بیان کئے گئے ہیں بلا شبہ وہ ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مور تھے جو خلفائے عباسیہ اور بنی امیہ کے عہد میں وہاں رہتے تھے علم جو ابتداء ایشیا سے یورپ میں آیا تھا اس کا وہاں دوبارہ رواج مذہب اسلام کی دانش مندی سے ہوا بات مشہور و معروف ہے کہ اہل عرب میں چھ سو برس کے قریب سے علم وفنون جاری تھے اور یورپ میں جہالت اور وحشیانہ پن پھیلا ہوا تھا علم ادب قریباً نیست و نابود ہوگیا تھا۔

علاوہ اس کے یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعات، ہیئت، فلسفہ، ریاضی، جو دوسری صدی میں یورپ میں جاری تھے ابتداء عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان یورپ کے فلسفہ کے موجد خیال کیئے جاتے ہیں۔''

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہے، کیوں کہ اگر ان جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے جس کو فریقین جہاد کہتے تھے، قطع نظر کی جاوے تو بالتخصیص مسلمانوں کے سبب سے فیوڈل انتظام کی سختیاں اور اسیروں کی خود مختاری یورپ سے موقوف ہوگئی۔ جس کے باقی ماندہ اثروں پر ہمارے ملک یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی عالی شان عمارت کی بنیاد قائم ہوئی اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانی چاہیے کہ حضرت محمدؐ کے پیروؤں کے (جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں)'' اس لحاظ سے بھی ممنون ہیں کہ مغربی تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں انہی کی کوششوں سے فنون اور علم ریاضی، طب وغیرہ کے بعض نہایت بڑے بڑے شعبوں کی اشاعت ہوئیں۔

چیمبر انسائیکلوپیڈیا میں ایک آرٹیکل لکھنے والے مذہب اسلام کی نسبت یہ رائے لکھی ہے کہ ''مذہب اسلام کا وہ حصہ بھی جس میں بہت کم تغیر و تبدل ہوئی ہے اور جس سے اس کے بانی کی طبیعت نہایت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے اس سے ہماری مراد قرآن کے علم اخلاقی سے ہم ناانصافی، کذب، غرور، انتقام، غیبت، استہزا، طمع، اصراف، عیاشی، بے اعتباری، بدگمانی، نہایت قابل ملامت خیال کی گئی ہیں۔ نیک نیتی، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، بردباری، کفایت شعاری، سچائی، راست بازی، ادب، صلح، سچی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا، سچی

ایمان داری کا رکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے۔''

اس مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہم اس بات پر غور نہیں کر سکتے ہیں کہ اسلام نے تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا کیا لیکن اگر نہایت ٹھیک ٹھیک کہا جاوے تو یورپ میں علوم وفنون کی ترقی میں اسی کا حصہ تھا مسلمان علی العموم نویں صدی سے تیرھویں صدی تک وحشی یورپ کے لیے روشن ضمیر معلم کہے جاسکتے ہیں خاندان عباسیہ کے خلفاء کے نہایت عمدہ زمانہ سے یونانی خیالات اور یونانی تہذیب کا از سرنو سرسبز ہونا شمار کیا جا سکتا ہے قدیم علم ادب ہمیشہ کے واسطے بغیر کسی علاج کے مفقود ہو جاتا اگر مسلمانوں کے مدرسوں میں اس کا پناہ نہ ملتی۔ عربی فلسفہ، قدرتی چیزوں کی تواریخ، جغرافیہ، علم تاریخ، صرف ونحو، علم کلام اور فن شاعری کی (جس کی تعلیم پرانے استاد دیتے تھے) بہت سی کتابیں پیدا ہوگئیں جن میں سے اکثر اس وقت تک جاری رہیں گی اور تعلیم بھی دی جاوے گی جب تک نسلیں تعلیم ہونے کے واسطے پیدا ہوتی رہیں گی۔''

ایک جواب مضمون لکھنے والے نے جس نے یہ مضمون اختیار کیا تھا کہ ''اسلام ایک ملکی انتظام ہے جو مشرق و مغرب میں جاری ہے'' اسلام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''اسلام نے بچہ کشی کا انسداد کر دیا جو اس زمانہ میں قرب و جوار کے ملکوں میں جاری تھی گو عیسائی مذہب نے بھی اس کو روکا تھا مگر اسلام کے برابر اس کو کامیابی نہیں ہوئی اسلام نے غلام کو موقوف کر دیا۔ جو اس ملک کی پرانی جاہلیت کی رسم تھی اسلام نے ملکی حقوق کو برابر کر دیا اور صرف انہی لوگوں کے حق میں انصاف نہیں کیا جو اس مذہب کے معتقد تھے بلکہ ان شخصوں کے ساتھ بھی برابر انصاف کیا جن کو اس کے ہتھیاروں نے فتح کیا تھا اسلام نے اس محصول کو جو سلطنت کو دیا جاتا تھا گھٹا کر صرف دسواں حصہ کر دیا۔ اسلام نے تجارت کو تمام محصولات اور مزاحمتوں سے آزاد کر دیا اسلام نے مذہب کے معتقدوں کو اس بات سے کہ اپنے مذہبی سرگروہ کو یا

مذہبی کام کو جبراً روپیہ دیں اور تمام لوگوں کو اس بات سے کہ غالب مذہب کو ہر ایک قسم کا مذہبی چندہ دیں بالکل بری کر دیا اسلام نے فرقہ فتح مند کے تمام حقوق مفتوحہ لوگوں میں سے ان شخصوں کو دے دیے جو اس مذہب کے پابند تھے ان کو ہر ایک قسم کی پناہ دی اسلام نے مال کی حفاظت کی سود لینے کو اور خون کا بدلہ بغیر حکم عدالت کے لینے کو موقوف کیا صفائی اور پرہیزگاری کی حفاظت کی اور ان باتوں کی صرف ہدایت ہی نہیں کی بلکہ ان کو پیدا کیا اور قائم کر دیا حرام کاری کو موقوف کر دیا۔ غریبوں کو خیرات دینے اور ہر ایک شخص کی تعظیم کرنے کی ہدایت کی۔"

وہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ "جو نتیجے اسلام سے پیدا ہوئے وہ اس قدر وسیع اور دقیق اور مستحکم ہیں کہ ان کی تکمیل کر لینا تو درکنار ہم یقین نہیں کر سکتے کہ وہ انسان کے خیال میں بھی آ سکیں۔ اسی سبب سے بعوض اس کے کہ اس کی نسبت اس طرح پر دلیلیں کی جاویں جس طرح کہ سولن کے قانون یا نپولین کی فتوحات کے نتیجوں کے اندازہ کرنے میں کی جاتی ہیں یا تو ان کی نسبت یہ کہا جاوے کہ اتفاقیہ ہو گئے ہیں یا بجبوری ربانی مرضی کی طرف منسوب کیا جاوے۔ بااین ہمہ یہ نظم ایک شخص واحد نے کیا تھا۔ جس نے اپنے ملک کے تمام باشندوں میں اپنی روح پھونک دی اور تمام قوم کے دل پر نہایت تعظیم و تکریم کا خیال جو کسی انسان کے واسطے کبھی ظاہر نہیں کیا گیا نقش کر دیا۔ جو سلسلہ قوانین طرح موافق تھا جیسا کہ ادنیٰ ترین لوگوں سے اور اس سلسلہ نے ایک قوم سے دوسری قوم میں گذر کر ہر ایک قوم کو جس نے اس کو قبول کیا ان قوموں اور سلطنتوں سے فائق کر دیا جن سے ان کا میل ہوا۔"

طامس کارلائل نے جو اس زمانہ کی دنیا میں نہایت نامور عالم ہیں اپنی کتاب میں جس کا نام "لیکچرز آن ہیروز" ہے اس مضمون کی نسبت جس پر ہم بحث کر رہے ہیں یہ رائے لکھی ہے کہ "اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب کا ملک

پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کچھ خیال بھی نہ تھا۔ اس قوم میں ایک الوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا اب دیکھو کہ جس چے سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوگئی اور چھوٹی چیز نہایت ہی بڑی چیز بن گئی اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہوگئی۔ عرب کی بہادری اور عظمت کی تجلی اور عقل کی روشنی زمانہائے دراز تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چمکتی رہی۔ اعتقاد ایک بڑی چیز اور جان ڈالنے والا ہے جس وقت کوئی قوم کسی بات پر اعتقاد لاتی ہے تو اس کے خیالات بار آور اور روح کو عظمت دینے والے اور رفیع الشان ہو جاتے ہیں یہی عرب اور یہی حضرت محمدؐ اور یہی ایک صدی کا زمانہ گویا ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ظلمت میں کسمپرسی ایک ریگستان تھا مگر دیکھو کہ یہ ریگستان زور شور سے اڑ جانے والی باروت نے نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں سے دہلی سے غرناطہ تک روشن کر دیا" یہ رائیں ہیں عیسائی مصنفوں کی جو انہوں نے اسلام کی نسبت لکھی ہیں اب ہم اپنے خطبہ کے اس حصہ کو انہی رایوں پر ختم کرتے ہیں اور دوسرے حصہ پر متوجہ ہوتے ہیں۔

مضمون کا دوسرا حصہ

دوسرے حصہ میں عیسائی مصنفوں کی اس رائے کی کہ اسلام انسان کی حالت معاشرت کے حق میں مضر ثابت ہوا ہے تردید کی جاتی ہے۔

آنریبل سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمد میں فرماتے ہیں کہ "اگر چھوٹی چھوٹی

باتوں سے قطع نظر کی جاوے تو بھی مذہب اسلام سے تین بڑی بڑی خرابیاں ہوئی ہیں: 1 اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ جوروؤں کا ہونا اور اطلاق دے دینا اور غلام بنالینا مستحکم کیا گیا ہے اور رائج ہورہا ہے اور یہ باتیں علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں۔ عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہیں اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کردیتی ہیں 2 دوم یہ کہ مذہبی آزادی یعنی یہ بات کہ لوگ جونسا مذہب چاہیں اختیار کریں او راس کے لوازم مذہبی آزادی سے ادا کریں۔ بالکل روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کردی گئی ہے تحمل کا تو نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا 3 سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اوراس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے" پس اب ہم اپنے اس خطبہ میں ان تینوں خرابیوں میں سے جن کا ذکر سرولیم نے کیا ہے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے۔

اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ جورواں کرنی اسلام لانے والوں پر لازمی قرار دی گئی ہیں یا کچھ زیادہ ثواب کی بات ٹھہرائی ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے عموماً ایک سے زیادہ جورواں کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی صرف ان لوگوں کو اجازت دی ہے جن کو وجوہات طبعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو لیکن اگر یہ عذر نہ ہو تو ایک سے زیادہ جورواں کرنی ان نیکیوں اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے جن کی ہدایت اسلام نے فرمائی ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ جو مخالفت عیسائی مصنفوں اور مسلمانوں کے طور وطریق، دستورات وخیالات میں ہے وہ اس امر کا مانع قوی ہے کہ اس معاملہ میں سنجیدگی اور نیک نیتی اور صفائی قلب سے غور کی جاوے۔ مثلاً کثرت ازدواج کے لفظ سے بھی عیسائی مصنفوں کے دل میں ایسے مکروہ خیالات گذرتے ہیں کہ وہ اس امر میں ہر ایک بات کی نسبت پہلے ہی سے مصمم ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس میں عیب نکالیں اور اس امر پر لحاظ نہیں کرتے کہ ملک کی

آب وہوا اور مرد وعورت کی تعداد اور مختلف طبعی وجوہات اور معاشرت کے لحاظ سے وہ کس حالت میں اور کس حد تک جائز ہو سکتی ہے۔

ہم اس معاملہ کی نسبت تین امر یعنی 1 قانون قدرت اور 2 باہمی معاشرت اور 3 مذہب کے لحاظ سے بحث کریں گے۔

1 پہلے امر پر غور کرنے کے لیے ہم اس بات کا دریافت کرنا (بشرطیکہ ممکن ہو) ضرور سمجھتے ہیں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا یعنی اس نے انسان کثیر الازواج ذی روح بنایا ہے یا نہیں۔ خالق کائنات کا ارادہ جو کچھ کہ ہو صاف صاف بلا کسی حجت و تکرار کے قدرت کے تمام کاموں سے ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ یہ امر صریح ناممکن ہے کہ اس کی مرضی ان چیزوں کے برخلاف ہو جس اس کی مرضی سے پیدا ہوئی ہیں۔

پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک نر و ایک مادہ پیدا ہوتا ہے برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مادائیں ہونی مقصود ہیں ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جان دار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں وہ اکثر بلکہ قریباً کل کے اسی قسم کے ہیں پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے مگر جو کہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا و نادر و عجیب قوت کے جس کو عقل یا نطق بمعنی مدرک کلیات و جزئیات کہتے ہیں اور اس کے خالق نے اس میں ودیعت کی ہے اور تمام مخلوقات سے اشرف ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے جو اس کے گرد و پیش رہتے ہیں،

قدرت نے اس کو عطا کیے ہیں، ان کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی وقوانین حفظان صحت اور ملک کی تاثیرات آب وہوا کے کام میں لاوے ورنہ اس میں اور دیگر حیوانات میں جو اس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکری یا مرغی سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا ہے۔ پس جیسے کہ کثرت ازواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی قطعی التزام ایک سے زیادہ نہ ہونے کا خلاف فطرت ہے۔

دوسرے امر کی نسبت یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ انسان اپنی سرشت سے مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں یوں بیان کیا ہے کہ جب کہ خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا انسان کے حق میں اچھا نہیں ہے، تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے تفکرات وترددات، لطف وفرحت رنج وراحت میں شریک ہو اپنی مجانست سے اس کی خوشی کو بڑھاوے اور اپنی محبت اور الفت کی بھری ہوئی ہمدردی سے اس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے یہ ہے کہ انسان کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکیم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کر آباد کرو'' مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرضوں کے ادا کرنے میں قاصر ہو، تو اس دانش مند حکیم، خالق زن ومرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی حد خاص تک، ایک ہی وقت میں جوروواں رکھنے کی اجازت ہو، خواہ یہ ہو کہ پہلی زوجہ کے طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ چناں چہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو حاصل ہے سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے اس

علاج کو کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول جج (یعنی قاضی) کی اجازت حاصل کرنی چاہیے اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی جس کی ضرورت ہم نے صاف صاف لفظوں میں ثابت کی ہے، تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں نہایت نقصان پہنچتا۔ کیوں کہ ایسی سخت قطعی قید سے نہایت قبیح اور بدترین برائیوں اور گناہوں کی طرف انسان کو مائل ہونا پڑتا۔ اگرچہ اس نقصان کا تعلیم و تربیت کی ترقی سے کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لیے سم قاتل ہیں۔

مسٹر ہنگز نے جو اپنی رائے نسبت تعدد ازواج لکھی ہے اور جان ڈیون پورٹ نے جو مانٹسکیو کی رائے اس باب میں نقل کی ہے اس کا اس مقام پر بیان کرنا بے موقع نہیں ہے اگرچہ یہ بات افسوس کی ہے کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازواج پر صرف ایک نظر سے نگاہ کی ہے، یعنی امورات طبعی کے لحاظ سے، مگر مذہب اسلام میں یہ خاص اجازت حالات خاص میں صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا، اس غرض سے دی گئی ہے کہ تزویج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے مانٹسکیو کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ''گرم ملک میں عورتیں آٹھ نو یا دس برس کی عمر میں نکاح کے لائق ہو جاتی ہیں پس ان ملکوں میں بچپن اور نکاح کے لائق جوانی گویا ساتھ ہی ساتھ ہوتی ہے۔ بیس برس کی عمر میں وہ بڑھیا ہو جاتی ہیں پس اس لیے یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ان ملکوں میں جب کہ کوئی قانون مانع نہ ہو انسان جورو کو طلاق دے کر دوسری جورو کر لے اور تعدد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جاوے۔''

مسٹر ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''علم قوائے انسانی اور علم طبعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسے دریافت کیے ہیں، جو کثرت ازدواج کے واسطے بہ طور ایک عذر کے متصور ہو سکتے ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتے ہیں مگر بنی اسماعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں، متعلق ہو سکتے ہیں علاوہ اس کے وہ بیان کرتے ہیں کہ سر ڈبلیو اوسلی صاحب کے مشرقی مجموعہ صفحہ 108 میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر اور بتدریج عالم ضعیفی میں پہنچتے ہیں مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقت ور رہتا۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانی مذہب اسلام کے لیے اس بات کی کہ انہوں نے متعدد جوروؤں کی اجازت دی، ایک وجہ بڑی تھی اور یہ کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کی آئین پر چھوڑ دیا، کیوں کہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہو گی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہو گی۔''

اب ہم اس مقام پر ان بدعادتوں اور خراب اخلاق کا جو آنحضرت صلعم سے پہلے ایام جاہلیت میں عموماً جاری تھے، اس ناطرف دارانہ بحث میں ذکر نہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں ملک ایران اپنے اخلاق کی خرابی میں سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہاں قوانین طلاق بالائے طاق رکھ دیے گے تھے اور رشتہ داری کا گو وہ کیسی ہی قریب ہو یا بعید مطلق پاس ولحاظ نہیں تھا۔ بیٹے کو اس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن غرض کہ اس معاملہ میں فی الواقع ایک جانور کے گلہ سے مشابہت رکھتے تھے جو کسی قسم کے قانون کے پابند نہیں ہوتے ایران کے گوشہ شمال و مغرب میں یہودی بہ کثرت آباد تھے ان کے ہاں

کثرت ازدواج کی رسم بلا قید اور حد کے بے روک ٹوک کے جاری تھی اور زمانہ جاہلیت کے عرب کے حالات کو بہ نظر غور دیکھنے سے جہاں یہودیوں اور ایرانیوں کے دستورات خلط ملط ہو گئے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں یہ دونوں رسمیں یکساں جاری تھیں۔ تعداد ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی لوگ جس عورت کو چاہتے تھے پسند کرتے تھے اپنے پسند میں کسی قسم کے قانون کے پابند نہ تھے تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز ورتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں عورتوں کی نسبت بدنیتی کے وحشیانہ خیالات اور ان کے ساتھ وحشیانہ حرکات کا تفاخر صرف بے عیب ہی نہیں گنا جاتا تھا بلکہ شیخی اور عالی ہمتی اور بڑی بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانہ کے عیسائی مذہب پر (اگر وہ مذہب عیسوی کہا جا سکے) جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کے معتقدوں کو ایک ایسے طریقہ کا پیرو پاتے ہیں جو اوپر کے دستوروں کے بالکل برخلاف ہے، یعنی ایک بھی جورو کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت و تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد عورت دونوں کے لیے وہی نیکی گنی جاتی تھی ایسے زمانے میں جس میں عقل کی اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور رسم ورواج اور اخلاق اور طرز معاشرت اس درجہ خراب ہو گیا تھا، بانی اسلام نے نہایت خوبی اور دانش مندی سے ایک ایسا عمدہ قانون بنایا جو بہ لحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن ومرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لیے اس کے تلخیوں کو دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔

3 تیسرے جب کہ ہم اس معاملہ پر بہ لحاظ مذہب کے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ دیکھا چاہتے ہیں کہ دو اور الہامی مذہبوں نے یعنی یہودی مذہب نے اور خصوصاً عیسائی مذہب نے جس کے پیرو مذہب اسلام کے مسئلہ پر نہایت طعن کرتے ہیں، اس باب

میں کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہم دکھاویں گے کہ مذہب اسلام نے یہ کیا اور پھر اہل انصاف سے پوچھیں گے کہ مذہب عیسوی نے تعداد ازواج کو روکا ہے یا مذہب اسلام نے۔

مذہب یہود تو ایک مخزن ہے جس میں بہ کثرت ازدواج اور بلا تعین حد موجود ہے عیسائی مذہب نے بھی تعداد ازدواج کی کہیں ممانعت نہیں کی چناں چہ ہم اپنے اس قول کی تائید میں چند مشہور و معروف عیسائی عالموں کی رائیں نقل کرتے ہیں جن سے تعداد ازدواج کی تائید ہوتی ہے مسٹر ہگنز بیان کرتے ہیں کہ ''حضرت محمد نے اس نہایت قدیم موسوی مذہب کے مقنن کی پیروی کر کے اپنی قوم کو جو اسماعیل کی اولاد ہے (جو مسلمانوں کے باپ کا بیٹا تھا) متعدد بیویوں کی اجازت ہے اس واسطے عیسائی ہمیشہ اس پر عیب نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیروؤں کی کمینہ خواہش کو پورا کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے حضرت سلیمان کی نظیر اور حضرت داؤد کی نظیر پر (جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لیے بنایا تھا) یہ امر چنداں اعتراض کے لائق نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں کے گروہ میں سے کسی نہ کسی نے ان کے احکام کے قلم بند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا، کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی ہے۔''

مسٹر ڈیون پورٹ اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔'' نہایت مشہور و معروف عالم جان ملٹن تعدد ازدواج کا ایک مشہور حامی ہے جس نے اس امر کی تائید میں

بئیبل میں بہت سی آیتیں نقل کرنے کے بعد یہ تحریر کیا ہے کہ: ''علاوہ اس کے خدا

نے ایک تمثیلی صورت (حزقیل) میں مسماۃ ان اھولا و اھولیا سے اپنا نکاح کرنا ظاہر کیا ہے۔ اور یہ ایک ایسا بیان ہے کہ اس کو خداوند تعالیٰ بالتخصیص اس طوالت کے ساتھ ایک تمثیل میں بھی ہرگز نہ اختیار کرتا اور نہ درحقیقت ایسی بات کا مرتکب ہوتا کہ اگر وہ رسم جس کی دلالت اس سے ہوتی ہے فی نفسہ معیوب یا مذموم ہوتی۔ پس جس رسم کا امتناع انجیل میں بھی کسی کو نہیں ہے وہ کیوں معیوب یا مذموم خیال کی جاسکتی ہے کیوں کہ انجیل میں ان ملکی آئین میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں کیا گیا ہے جو انجیل سے بیشتر جاری تھے"۔

جان ملٹ یہ بھی کہتے ہیں کہ "میں عبرانیوں کے خط کے باب ۱۳ ورس ۴ سے اس طرز سے جواز تعدد ازواج پر استدلال کرتا ہوں کہ تعدد ازواج کی رسم یا تو نکاح جائز ہے یا فجور ہے یا زنا ہے۔ پس اس مقدس رسول نے کوئی چوتھی صورت تسلیم نہیں کی۔ پس میں یقین کرتا ہوں کہ ان بہت سے بزرگوں کی تعظیم وتوقیر کے لحاظ سے جو کثیر الازواج تھے ہر پاک شخص اس کو فجور یا زنا خیال کرنے سے باز رہے گا۔ کیوں کہ خدا حرام کاروں اور زانیوں کو سزا دے گا حالاں کہ ان بزرگوں پر خدا کی خاص نظر تھی جیسا کہ خود اس نے فرمایا ہے پس اگر متعدد نکاحوں کا کرنا ٹھیک ٹھیک نکاح ہو تو ہی جائز ہے اسی حواری کا قول ہے کہ "سب میں نکاح کرنا بھلا ہے اور بستر ناپاک نہیں"۔

یہ حال تو تعدد ازواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا۔ اب ہم کہتے ہیں کہ مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کو پسند کیا ہے۔ تعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کا جوڑا پیدا کیا ضرور ایسا ہوگا کہ جو قانون کے قدرتی تو برخلاف نہ ہو اور حسن معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے۔ اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی

ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو' اور ٹھیٹ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ:

فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدة

یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے۔ اگر ان لفظوں پر کافی غور نہ کی جاوے اور صرف اوپرے معنی لیے جاویں' جیسے کہ اکثر علماء اور فقہا نے لیے ہیں تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو بے اعتدالی سے باز رکھنے کی غرض سے (جو ہمیشہ بدتر اور بعض دفعہ خطرناک ہوتی ہے) اور اس بات کا یقین ہونے کی ایک نظر سے کہ جس شخص نے ایک سے زیادہ جوروئیں کیں وہ ایک واقعی ضرورت کے سبب سے مجبور تھا' بہت سخت قیدیں اور شرطیں لگائی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سب کو برابر حقوق دینے اور سب کے ساتھ برابر محبت رکھنی تاکہ عدل کے معنی متحقق ہوں۔ پس جو لوگ سچے دین دار اور درحقیقت مذہب کے تابع ہیں وہ از خود بجز ضرورت مجوزہ کے ایک سے زیادہ جورواں کرنے سے باز رہتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اجازت سے بغیر اس کی شرائط کو پورا کریے جن کا پورا کرنا نہایت مشکل ہے فائدہ اٹھانا اپنے مذہبی فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا نہیں ہے۔

لیکن اگر ان مختصر لفظوں پر معتمق نظر غور کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ شارع نے ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت کو نہایت محدود اور خاص حالت میں مخصوص کر دیا ہے کیوں کہ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو خوف ہے ہ عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی ہونی چاہیے۔ لفظ خوف عدم ایک ایسا لفظ ہے کہ جب تک محل عدل ساقط نہ ہو خوف عدم زائل نہیں ہو سکتا۔ گو اس وقت ہم کیسا ہی سچا ارادہ کر لیں کہ ہم دونوں جوروؤں میں عدل کریں گے (جو

درحقیقت بہ حالت قیام محل عدل ناممکن ہے) تب بھی خوف عدم عدل اگر محل عدل قائم ہے زائل نہیں ہوتا۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کی بخوبی تفصیل ہے جہاں خدا نے ان لوگوں کی نسبت جن کے پاس متعدد جوروان تھیں صاف صاف فرمادیا ہے کہ:

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقہ وان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفورا رحیما وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعة وکان اللہ واسعا حکیما. (سورہ نساء)

> ''تم ہرگز متعدد جوروؤں میں عدل نہ کرسکوگے تم عدل کرنے کی کتنی ہی حرص کرو۔ پس مت جھک پڑو اندھا دھندی سے جھک پڑنا تا کہ چھوڑ دو ان کو ادھر میں لٹکتی ہوئی کہ نہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہے کہ دوسرا شوہر کرسکے نہ سہاگن ہے کہ خصم کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کرے۔ پھر اگر تم صلح کرلو اور پرہیز گاری کرو تو بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر تم دونوں جدا ہو جاوء تو اللہ تعالیٰ کو اپنی وسعت رزق سے بے پرواہ کرے گا اور اللہ بری وسعت والا حکیم ہے''۔

اس آیت سے صاف ثابت ہوگیا کہ عدل غیر ممکن ہے اور اس لیے خوف عدم عدل بھی ساقط نہیں ہوسکتا جب تک کہ محل عدل باقی ہے اور اس آیت میں طلاق کو مسقط محل عدل بتایا ہے۔ اگرچہ اور بھی چند امور مثلاً امراض یا نقصان خلقت مسقط محل عدم ہوسکتے ہیں۔ پس اجازت تعدد ازواج کی عدم وجود محل عدل میں منحصر ہوگی اور عدم وجود محل عدل مستلزم عدم حسن معاشرت ہے۔ پس کس دانائی اور احتیاط اور خوبی اور بے انتہا عمدگی سے شارع نے قانون

قدرت اور حسن معاشرت دونوں کو قائم رکھ کر اس باب میں حکم دیا ہے اور ہر غیر متعصب شخص کا دل قبول کرے گا کہ بے شک یہ حکم اسی شخص کا ہے جس نے مرد وزن کا جوڑا پیدا کیا ہے۔

ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو، جن کی زندگی کا عین منشاء ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے، ایک حیلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کے بے جا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہو گی۔

ان تمام باتوں کے سمجھنے کے بعد ہمارے اس مضمون کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ یہ جو تعدد ازواج اس زمانہ میں رائج ہے جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو اور تین تین اور چار چار جوروائیں کرنے لگے اور ایک بازار کی عورت کو داؤں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا، جہاں مقدس مولوی ہوئے اللہ میاں کے سانڈ بنے اس مریدن کو لے ڈالا وہاں وعظ کہنے گئے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا، قرآن پڑھاتے پڑتے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے۔ اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا، اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے۔ پس ایسے شخصوں کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔

اب طلاق کی نسبت ہم کو گفتگو کرنی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس طرح ہم نے تعدد ازواج کی نسبت تین طرح پر یعنی قانون قدرت، حسن معاشرت اور مذہب کی رو سے بحث کی ہے، اس طرح پر بحث نہیں ہو سکتی اور اس لیے ہم ا مسئلہ پر صرف بہ لحاظ حسن معاشرت اور مذہب کے بحث کریں گے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تمام قدیم و جدید قوموں و مذہبوں میں نکاح کا عام رواج ہے۔ او وہ علی العموم انسان کی ذاتی وتمدنی بہبودی کی بنیادہ جو چیز اس کو معدوم کرنے والی ہے یعنی طلاق وہ نہایت ہی بد چیز فوائد ذاتی وتمدنی کو برباد کرنے والی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ روم کے گرجانے بنظر اس کی حفاظت کے نکاح کو اپنے ساتھ پاک رسموں میں قرار دے کر اس کو تبرک ٹھیرایا ہے اور انگلستان کے کے طلاق کا حکم صرف ایک حالت میں جائز رکھا ہے جب کہ ہاؤس آف لارڈز سے زر کثیر صرف کرنے کے بعد حاصل ہوا۔ یہ انتظام ۱۸۵۶ء تک قائم تھا۔ یعنی اس وقت تک جب کہ طلاق کے تمام مقدمات کے سننے اور جیوری کی رائے سے اس کی نسبت تجویز ہونے کے لیے ایک نئی عدالت قائم کی گئی۔

عموماً یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ سب سے بڑا دشمن، حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے۔ اس کے سبب سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب و حالت سے ایسی خرابیاں مرد و عورت میں پیدا ہو جاویں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے۔ پس کچھ شک نہیں ہے کہ ایسی حالت میں طلاق سے فائدہ ہے اس کے باعث مرد و عورت کو آزادی ہو جات ہے جن سے مزاج کی مخالفت یا سختی یا بے استقلالی سے دونوں کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ باایں ہمہ اگر چہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بہ لحاظ ان بد اخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پہ وقوع میں آتی ہیں اور نیز اس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جب کہ طلاق کے ساتھی ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں۔ تو اس کو بطور ایک علاج سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہو

سکتا ہے۔ جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ نا قابل برداشت ہوں اور ایسے ترددات اور تفکرات میں ڈالنے والی ہون جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والی ہوں اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والی اور باہمی حسن و معاشرت کے بدلے دن رات کے لعن طعن جوتی پیزار رکھنے والی ہوں دور ہوسکتی ہیں اور اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جاوے (جیسے کہ اسلام نے صرف اسی حالت میں اس کو بے گناہ ٹھیرایا ہے) تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں ہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہیں۔

جب کہ ہم بہ لحاظ مذہب کے طلاق کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ پات ہیں کہ مذہب اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ حسن معاشرت کی حفاظت اور اصلاح پر نظر رکھی ہے۔ یہودی مذہب میں طلاق دینا بغیر کسی قید و شرط و حالت کے مرد کے اختیار میں تھا کہ جب وہ چاہے طلاق نامہ لکھ کر جورو کے حوالہ کردے گا اور ایسا کرنے سے کسی حالت میں وہ کسی گناہ یا گنہگار متصور نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ حال کے زمانہ میں عیسائی سمجھتے ہیں (اگر وہ صحیح ہو) تو بجز ایک خاص وجہ سے اور کسی حالت میں طلاق کا دینا جائز نہیں رکھا اور فرمایا کہ ''میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب طلاق دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس کی چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے'' اگر اس فقرہ سے عدم جواز طلاق سمجھا جاوے جیسا کہ حال کے زمانہ میں عیسائی سمجھتے ہیں (اور شاید وہ سمجھ صحیح نہیں ہے) تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسانوں سے قریب ناممکن کے تھی چنانچہ حضرت مسیح کے معتقدوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ ''اگر جورو سے مراد بہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں'' پس اگر یہ حکم اسی طرح مانا جاوے جس طرح کہ اس زمانہ

کے عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لیے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن و شوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام حسن معاشرت اور اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لیے اور بہت سی خرابیاں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ باایں ہمہ بعض عیسائی مذہب کی رو سے بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ جان ملٹن نے اپنی کتاب مسائل مذہب عیسوی میں یہ بحث لکھی ہے کہ ''نکاح کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے نکاح نہایت مرتبہ کا ایک اتحاد ہے مگر ناقابل انفکاک یا ناقابل تفریق نہیں ہے'' بعض لوگ اس کے ناقابل تفریق ہونے کی نسبت متی کی انجیل باب ۱۹ ورس ۵ سے استدلال کرتے ہیں۔ اگر ان الفاظ پر مناسب طور سے غور کیا جاوے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نکاح خفیف خفیف باتوں پر نکاح کو منقطع کرنا نہیں چاہیے کیوں کہ جو کچھ نکاح ناقابل انفکاک ہونے کی نسبت کہا گیا ہے وہ خاص عقد نکاح اور اس کے تمام مقاصد و لوازمات کی پوری پوری تعمیل ہونے پر منحصر ہے خواہ وہ الفاظ بطور ایک حکم بطور ایک قدرتی نتیجہ کے خیال کے کیے جاویں۔ اور اسی وجہ سے متی کی انجیل میں ان لفظوں کے ساتھ یہ لفظ بیان کیے گئے ہیں کہ ''مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا...... اور وہ دونوں ایک تن ہوں گے'' یعنی بہ شرطیکہ نکاحکی اصلی نوعیت کے مطابق (جن کا بیان کتاب پیدائش ۲ ورس ۱۸ الغایت ۲۰ میں ہے) عورت خاوند کے واسطے ایک مددگار ہو یا یہ کہ جانبین کے باہم خیر خواہی اور محبت اور آرام و وفاداری میں کچھ فرق نہ آوے کیوں کہ عرف عام کے بموجب یہی اصی وضع نکاح ہے لیکن اگر اصل منشاء نکاح کا منقطع ہو جاوے تو اس سے لازم آتا ہے کہ نکاح بھی دراصل منقطع ہو گیا۔

دوسری آیت میں جو بیان ہوا ہے اور جس پر بڑا زور دیا گیا ہے یعنی جو کچھ خدا نے ملایا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے لحاظ سے قابل ہے۔ مگر نکاح ہی کے عقد سے یہ بات ظاہر

ہوتی ہے کہ خدا ان کس چیز کو ملایا ہے خدا نے صرف اس چیز کو ملایا ہے جو ملاپ کے قابل ہے اور جو مناسب ہے بہتر ہے اور محترم ہے۔ انسان کی قدرتی طبیعت کے خلاف اور نا مناسب حالت کے ملاپ کا حکم نہیں دیا جس میں صرف بے عزتی اور تکلیف اور عداوت و مصیبت بھری ہوئی ہو۔ خدا تعالیٰ کچھ اس قسم کے ملاپ نہیں کرتا ہے جو درحقیقت ملاپ نہیں ہوں۔ بلکہ جبر یا ناعاقبت اندیشی کو غلطی یا بدسلیگتی کے اثر سے ہوئے ہوں۔ پس ایسی ناگوار خانہ داری کی رائی سے اپنے تئیں نجات دینا کس وجہ سے ناجائز ہے علاوہ اس کے ہمارا مسئلہ ان شخصوں کو جدا نہیں کرتا جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے مقدس آئین کے بموجب ملایا ہے بلکہ صرف ان شخصوں کو علیحدہ کرتا ہے۔ جن کو خود خدا نے اپنے ایسے ہی مقدا آئین کی رو سے جدا کر دیا ہے اور یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا اثر ہم پر ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ سابق میں اس کی امت پر ہوتا تھا۔ مذہب عیسوی کے کمال کو جس کی ترقی بعض لوگ نکاح کے ناقابل انفکاک ہونے کی ایک دلیل بیان کرتے ہیں اس کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ اس ترقی کو جبر اور قوانین تعزیری کے ذریعہ سے ہم میں زبردستی اس کا رواج نہیں دینا چاہیے بلکہ اگر ہو تو اس کو ترغیب اور عیسائی پند و نصائح کے ذریعہ سے جاری کرنا چاہیے۔ کسی شخص کی نسبت صرف اس حالت میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نکاح کو قطع کیا جو شرعاً منعقد ہوا تھا جب کہ وہ احکام الٰہی میں اس بات کو زیادہ کر کے جو خاص اس حکم میں شامل نہ ہو مذہب کے حیلہ سے اس شخص سے جدا ہو جاوے جو اس کی منشاء کے موافق ہو کیوں کہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے منصفانہ اور پاک اور مقدس قانون میں صرف مختلف وجہوں پر طلاق کی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض صورتوں میں اس کی ہدایت کی ہے اور بحالت خلاف ورزی سخت سزائیں قرار دی ہیں۔ دیکھو کتاب خروج باب ۲۱ ورس ۴ و ۱۰ و ۱۱ اور کتاب استثنا باب ۱۱ ورس ۱۴ و باب ۲۴ ورس ۱ و کتاب عزرا باب ۱۰ ورس ۳

نحمیا باب ۲۳ ورس ۲۰۔

توریت کتاب استثنا باب ۲۴ ورس ۱ میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ایک بیوی کر لے اور اس سے نکاح ہو جاوے اور ایسا اتفاق ہو کہ وہ اس کو پسند نہ ہو کیونکہ اس میں کچھ ناپاکی ہے تو اس کو چاہیے کہ ایک طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دے اور اس کو اپنے گھر سے نکال دے''۔ پس اگر فرض کیا جاوے کہ جو سبب طلاق بتایا گیا ہے وہ سچا ہے اور مصنوعی نہیں تو اس مقام میں خداوند تعالیٰ نے ایک بیوی ابتدا ہی میں اس غرض سے دی کہ وہ اس کی مدد اور تسلی وخوشی کا باعث ہو جیسا کہ خدا آئین نکاح سے ظاہر ہوتا ہے تو اگر بعد کو جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے وہ بیوی رنج ورسوائی اور تباہی اور اذیت اور مصیبت کی باعث ہو تو ہم کو کیوں کر یہ خیال کرنا چاہیے کہ خدا ہم سے ایسی عورت کے طلاق دینے لیس ناخوش ہوگا۔ میں دل کی سختی کو اس شکص سے منسوب کرتا ہوں جو اس عورت کو اپنے پاس رہنے دے نہ کہ اس شخص سے جو ایسی صورتوں میں گھر سے نکال دے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ خود حضرت سلیمان یا شاید خود خدا کی روح نے حضرت سلیمان کے منہ سے یہی بات کہی ہے۔ چنانچہ توریت کتاب امثال سلیمان باب ۳۰ ورس ۲۱ و ۲۳ میں لکھا ہے کہ ''تین چیزوں سے دنیا کو بے چینی حاصل ہوتی ہے بلکہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتی ہے...... اور ایک مکروہ عورت سے جب کہ اس کا نکاح ہو جاوے'' اس کے برخلاف کتاب واعظ باب ۹ ورس ۹ میں بیان ہوا ہے کہ ''تو اس عورت کے ساتھ ہنسی خوشی سے بسر کر جس کو اس نے (خدا) نے تجھے دیا ہے اور جس کو تو اپنی فانی زندگی کے تمام زمانے میں پیار کرتا ہے''۔ پس جو عورت اس نے تجھ کر دی ہے وہ عوت ہے جس کو تو پیار کرتا ہے نہ کہ وہ جس سے تو نفرت کرت ہے اور کتاب ملاخی باب ۲ ورس ۱۶ میں بیان ہوا ہے کہ ''جو شخص نفرت کرتا ہے (یا اس وجہ سے کہ وہ نفرت کرتی ہے) اس کو چاہیے کہ اس کو چھوڑ دے'' چنانچہ یوفیوس سے پہلے سب نے اس

فقرہ کا ایسا ہی ترجمہ کیا ہے ا۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس حکم کو موسیٰ کی معرفت اس غرض سے صادر نہیں فرمایا۔ اور نہ اس نبی کی معرفت اس پر اس کو اسی غرض سے دوھرایا ہے۔ کہ شوہر کو اپنی سنگ دلی کے برتاؤ کا موقع ملے۔ بلکہ اس غرض سے صادر کیا ہے کہ جہاں ضرورت ہو اس بدنصیب عورت کو اس کے اثر سے بچاوے۔ کیوں کہ اس میں کوئی سنگ دلی نہیں ہے کہ اس عورت کو عزت سے اور بلا تکلیف رخصت کر دے جس کا خود ہی یہ قصور ہے۔ کہ وہ محبوب نہیں ہوئی۔ اس لیے ایسی عورت کو جو نہ صرف یہی ہے ک محبوب نہیں ہوئی بلکہ وہ معلق چھوڑ دی گئی ہو اور اس سے نفرت اور عداوت کی جاتی ہو۔ غرض کہ جس عورت کا یہ حال ہو اس کو ایک نہایت تکلیف دہ قانون کا اتباع کر کے اس کے شوہر کے نہایت بھاری غلامی کے جوے میں رکھنا (کیوں کہ نکاح بے محبت ایسا ہوتا ہے) جس کو نہ تو اس کے ساتھ الفت ہو اور نہ دوستی ہو یہی درحقیقت ایسی سختی ہے جس میں ہر ایک قسم کی طلاق سے زیادہ بے رحمی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دے دی ہے

ا۔ صحیفہ ملاخی باب ۲ کی آیتوں کے ترجمے اس طرح پر ہوئے ہیں۔

۲۔ ترجمہ عربی ۱۸۱۱ء میں ہے:

وامراة شبابک لاتترک لکن ان ایغضتها سرحها

اور ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۷۱ء

وزوجة غلامتک لا تنزولها اذا بغضت فاطلق

اور ایسا ہی رومن کیتھولک بئیبل میں ہے اور انگریزی ترجمہ پروٹسٹنٹ کے حاشیہ پر بھی یہی عبارت ہے جس سے ملٹن نے استلال کیا ہے۔ (سید احمد)۔

جس کا اگر مناسب طور سے عمل درآمد کیا جاوے تو وہ نہایت منصفانہ اور رحیمانہ ہے بلکہ اس نے اس کے فائدوں کو ان شخصوں تک بھی وسعت دی ہے جن کی نسبت وہ یہ جانتا ہے ک یہ اپنی سنگ دلی کی وجہ سے اس کا بے جا عمل درآمد کریں گے اور اس نے بدکار آدمیوں کی سنگ دلی گوارا کرنا اس سے بہتر تصور کیا ہے کہ نیک آدمیوں کی تکلیف رفع کرنے سے باز رہے یا جس رسم کا ایک ربانی برکت سے ایک بدتری مصائب ہو جانے کا اندیشہ تھا خود اسی کو درھم برھم کر دے۔

خود حضرت عیسی نے نویں آیت میں زنا کی وجہ لیس طلاق کی اجازت دی ہے اور یہ بات نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور ہوتی کہ جن شخصوں کو خدا نے ایک مرتہب نکاح میں باندھ دیا ہے وہ ہرگز آئندہ جدا نہ ہوں۔ مگر مشرقی زبانوں کے محاورہ کے بموجب اس لفظ سے جس کا ترجمہ زنا کیا گیا ہے صرف زنا ہی مراد نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے یا تو وہ چیز مراد ہے جس کو ناپاک چیز کہا گیا ہے۔ یا کسی ایسے امر کا نقصان مراد ہے جو جس امر کا ایک بیوی کی ذات میں ہونا واجبا ضروری ہے جو کتاب استثنا کے ۲۴ باب کی پہلی آیت میں مذکور ہے جیسا کہ سیلڈن نے سب سے پہلے اپنی کتاب اکزورھبریا میں ایسے محاورہ کو بہت سی زبانیں یہود کی شہادت سے ثابت کیا ہے اور یا اس سے وہ شے مراد ہے جو محبت' وفاداری' باہمی اعانت یا معاشرت یعنی اصلی آئین نکاح کے مقصد کے خلاف ہو کہ ہرگز اس سے موافقت نہ ہوسکے جیسا کہ سیلڈن نے ثابت کیا ہے کیوں کہ جس وقت فربسیوں نے یہ سوال کیا تھا کہ ایک بیوی کو ہر ایک وجہ طلاق دینا جاءز ہے یا نہیں تو یہ جواب دینا لغو ہوتا کہ سوائے زنا کے اور کسی حالت میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو بخوشی مشہور ومعروف تھی کہ زنا کی حالت میں وہ جائز ہی نہیں تھی۔ بلکہ ایک زانیہ کو نکال دینا ضروری تھیا۔ اور وہ بھی طلاق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ قتل کر دینے سے۔ پس اس مقام پر اس لفظ سے یہ نسبت محض زنا کے

زیادہ تر وسیع معنی سمجھنے چاہئیں جیسا کہ کتاب اقدس کے اکثر مقامات سے خصوصاً قاضیوں کی کتاب باب ۱۹ آیت ۲ سے ظاہر ہے جہاں لکھا ہے کہ ''اس کی بیوی زنا کر کے چلی گئی '' یہاں زنا کے عرفی معنی نہیں ہو سکتے کیوں کہ ایسی حالت میں اس کو جرات نہ ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی جاوے بلکہ یہ مراد ہکہ وہ اپنے شوہر سے تمردانہ (نشوز) برتاؤ کر کے چلی گئی اونہ ایسی صورت میں (یعنی جب کہ بجز زنا کے طلاق جائز نہ تھی) پولوس مقدس کسی کافر مرد یا عورت کے جدا ہو جانے کے سبب سے طلاق کی اجازت دیتے ا اگر یہ بھی ایک قسم کا زنا نہ ہوتا۔ اس بحث سے یہ امر کچھ متعلق نہیں ہے کہ یہ مسئلہ کافر مرد یا عورت کے متعلقہے کیوں کہ جو شخص خاندان کو ترک کر دے وہ کافر سے بدتر ہے (پولوس کا پہلا خط تموتی کے نام باب ۵ آیت ۸) اور نہ نکاح کے اصلی منشاء کے حق میں کوئی بات اس سے زیادہ ضروری اور پسندیدہ ہو سکتی ہے کہ جو عقد محبت اور تمام عمر کی باہمی اعانت کی توقع اور نیک ارادوں سے کیا گیا ہو وہ کینہ اور سنگین عداوت اور طرفین کی جانب سے ناپسندیدہ برتاؤ کے سبب سے قطر کر دیا جاوے۔ پس خدا تعالیٰ نے انسان

ا۔ اس مقام پر پولوس کے خط موسومہ قرنیناں کے ساتویں باب کی ۱۵ آیت پر اشارہ ہے۔ (سید احمد)۔

کے لیے جب کہ وہ بہشت میں معصومیت کی حالت میں تھا۔ دنیا میں گناہ کے آنے سے پہلے یہ حکم دیا کہ نکاح ناقابل انفکاک ہونا چاہیے نہ گناہ کے بعد حالات کے تغیر کے موافق اور نیز اس نظر سے کہ معصوم آدمی بدکار آمیوں کے ہاتھ س ہمیشہ کے ضرر سے محفوظ رہے اس نے نکاح کے انفکاک کی اجازت دی اور یہ اجازت قانون قدرت اور موسوی

شریعت کا ایک جزو ہے اور حضرت مسیح نے بھی اس کی ممانعت نہیں کی۔ پس ہر ایک معاہدہ سے جبکہ ابتداعمل میں آوے اس کا دوامی اور ناقابل انفکاک ہونا مقصود ہوتا ہے گو وہ کسی فریق کی بدعہدی کے سبب سے کیسی ہی جلد کیوں نہ ٹوٹ جاوے اور نہ اب تک کوئی معقول وجہ اس بات کی بیان کی گئی ہے کہ نکاح کی نوعیت اس باب میں اور تمام معاہدوں سے مختلف ہوتی ہے خصوصاً اس حالت میں جب کہ پولوس مقدس نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی بھائی یا بہنا ایسی باتوں میں مفید نہیں ہے۔ یہ نہ صرف چھوڑ دینے کی نسبت بلکہ ایسی صورتوں میں جو ایک نالائق قید پیدا کرنے میں ہوتی ہے جیسا کہ قرنتیوں نے پہلے خط میں لکھا ہے: (باب ۷ آیت ۱۵) کہ ''کوئی بھائی یا بہن ایسی باتوں میں مفید نہیں ہے کہ خدا نے ملاپ کے لیے بلایا ہے'' پس خدا تعالیٰ نے ہم کو اس غرض سے نہیں بلایا کہ ہم دائمی نزاع اور ترددات کے باعث سے پریشان خاطر رہیں کیوں کہ ہمارے بلانے کا مقصد امن اور آزادی ہے نہ کہ نکاح چہ جا کہ دائمی نزاع اور ایک ناخوش ازدواج کی غلامانہ قید جس کو رسول نے تمام چیزوں سے زیادہ ایک آزاد آدمی اور عیسائی کے ناقابل بتلایا ہے۔ یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ حضرت مسیح نے موسوی شریعت سے کوئی ایسا حکم خارج کر دیا جس سے مظلوم اور مصیبت زدہ لوگوں پر رحم کرنے کا موقع ملتا تھا اور نہ اس موقع پر حضرت مسیح کو یہ منظور تھا۔ کہ ان کا یہ قول حکم عدالت کے سبب سمجھا جاوے یا اس معاملہ کی نسبت کوئی نیا اور سخت حکم دیا جاوے بلکہ قانون کے بے جا عمل درآمدوں کے بیان کرنے کے بعد انہون نے اپنے حسب معمول ایک زیادہ تر کامل دستور معاشرت کا بتلایا اور اس موقع پر مثل اور تمام موقعوں کے منصب قضا کا دعویٰ نہیں کیا اور امر حق کو محض نصیحت کے طور پر بیان فرمایا نہ کہ جبریہ احکام سے۔ پس انجیل کی نصیحتوں کو ملکی آئین قرار دینا اور احکام تعزیری کے ذریعہ سے اس کو نافذ کرنا ایک سخت غلطی ہے''۔

یہ تمام تقریر جان ملٹن کی تھی جو انہوں نے ایک محققانہ اور عالمانہ طور پر بائیبل کے

احکام سے استنباط کی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مطلب نہایت مختصر تقریر سے ختم ہوتا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا کہ جورو کو ہر ایک طرح پر طلاق دینی درست ہے یا نہیں ان کا جواب یہ ہے کہ بجز افعالی فمیمہ کے اور کسی صورت میں جائز نہیں۔ جس لفظ کا ترجمہ حرام کاری یا زنا کیا گیا ہے وہ عام لفظ ہے اور سب قسم کی برائیاں اس میں داخل ہیں اور اس کا ٹھیک ترجمہ افعال ذمیمہ ہوسکتا ہے پس جو کچھ کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا اس سے امتناع طلاق نہیں نکلتا بلکہ بلا قصور صرف اپنی نفسانی بدخواہشوں کے لیے طلاق دینا جائز نہیں بتایا گیا ہے۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ مذہب اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس کو بطور علاج ایک مرض کے جائز اور مباح بتایا۔ مگر زن وشوہر کا معاملہ ایک ایسا نازل اور ایک عجیب قسم کے ارتباط واختلاط کا معاملہ ہے کہ اس میں جو بیماری پیدا ہو سوائے ان ہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کرسکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لیے بانی اسلام نے اس کی تشخیص نہ کسی (جج) کی یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتویٰ پر بلکہ صرف اس کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لیے ابتدا میں عورت بطور انیس دل نواز اور مونس غم گسار کے پیدا ہوئی تھی۔

آپ اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جاوے صرف مرد کے حسن اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔

بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا:

ما خلق الله شيئا على وجه الارض ابغض اليه من الطلاق (رواه الدار قطغی).

''بجز طلاق کے اور کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر
پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب ہو''۔
پھر ایک دفعہ یوں فرمایا:

ابغض الحلال الی اللہ الطلاق (رواہ ابو دائود)

''مباح چیزوں میں سے سب سے زیادہ خدا کو غضب میں
لانے والی چیز طلاق ہے''۔
یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینی چاہتی ہیں یہ فرمایا کہ:

ابما امراۃ سالت زوجھا طلاقا عفی غیر ما باس فحرام علیھا رایحۃ النۃ (رواہ احمد والترمذی و ابو دائود وابن ماجہ الدارمی)

''جو عورت اپنے خاوند سے بغیر ضرورت شدید اور بغیر حالت
سختی میں طلاق چاہے اس پر خوش بو جنت کی حرام ہے یعنی جنت میں
نہ جاوے گی''۔

ہمارے پیغمبر خدا صلعم طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعتاً طلاق دے دے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ:

اخبر رسول اللہ صلعم عن رجل طلق امراۃ ثلث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال ابلعب بکتاب اللہ عزوجل وانا بین اظھر کم حتی قام رجل فقال یا رسول اللہ الا اقتلہ . (رواہ النسائی)

''ایک دفعہ رسول خدا صلعم کو اطلاع ہوئی کہ ایک شخص نے
اپنی جورو کو دفعتاً تین طلاقیں دے دی ہیں۔ یہ سن کر آں حضرت صلعم

غصہ کے مارے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ کیا خدائے بزرگ کے حکم
کو کھیل بنایا ہے ایسی حالت میں بھی کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر
ایک شخص کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کے اے رسول اللہ خدا کے کیا
میں اس کو قتل کر ڈالوں یعنی وہ شخص آں حضرت کے غصے ہونے سے
یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے''۔

بانی اسلام نے انہی ہدایتوں اور تہدیدوں ہی پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی نہایت عمدہ تدبیر رکھی ہے یعنی پوری تفریق واقع ہونے کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے اور پھر اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ دفعتاً تین طلاقیں نہ دی جاویں بلکہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلہ سے طلاق دی جاوے کہ ہر ایک میں قریباً پچیس روز کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور پھر بھی اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جاوے اور رنجش مٹ جاوے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جاوے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں۔ دوسری طلاق کے بعد بھی اسی طرح وہ پھر آپس میں مل سکتے ہیں اور بہ دستور جورو خصم رہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دی جاوے تو ثابت ہو گیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں پھر بہتر ہے کہ پوری تفریق ہو جاوے۔

ان ہدایتوں کے سوا ایک اور نہایت عمدہ ہدایت یہ فرمائی کہ ایسی حالت میں جب کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑا ہے طلاق نہ دی جاوے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت والفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا ان دونوں کے دل سے جاتا رہے۔

علاوہ ان ہدایتوں کے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطر داری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کیساتھ برداشت کرنے کی نہایت

تاکید سے ہدایت فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔

ان سب احکام سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بانی اسلام نے صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دی ہے جب کہ وہ ایک نہایت بیش بہا نعمت ثابت ہونے میں ذرا بھی خطا نہ کرے اور جب کہ اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کے تردداات اور تکلیفیں اور تلخیاں یا توبالکل رفع ہو جاویں۔ یا بہرکیف کچھ کم ہو جاویں۔ اور اگر طلاق کو کام میں نہ لایا جاوے تو حالت معاشرت روز بہ روز زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاوے۔ ایسی صورت میں طلاق حسن معاشرت کے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی بلکہ برخلاف اس کے وہ دونوں کے حق میں ایک برکت اور حالت معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہے۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس اس کے افعال کی نفرین انہی پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر۔ ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب ٹھیٹ اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے۔ کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل انصاف معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بنایا ہوا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لیے اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔ اور غور کیا جاوے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی اس بحث میں جو کچھ روشنی بئیبل کے ورسوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیوں کہ اسلام نے بارہ سو برس پیش تر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بہ طور معجون مفرح استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرضلا علاج کا علاج ہے۔

اب ہم غلامی کے الزام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایک سب سے بڑا الزام اس کے جائز رکھنے کا مذہب اسلام کی نسبت لگایا گیا ہے اور بیان ہوا ہے کہ قوانین حسن

معاشرت اوراخلاق کے بالکل برخلاف ہے۔قوانین حسن معاشرت کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے۔ کہ اگراس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جاوے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرات ہوسکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اسکی نسبت کچھ اعتراض کریں کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا اس زمانے کے رسم ورواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو۔قبل اس کے کہ ہم اس معاملہ میں اپنی رائے پر بناء مذہب اسلام ظاہر کردیں گاڈفری ہگنز صاحب نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔

گادفری ھگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''انسان کے حق میں یہ ایک بدقسمتی کی بات معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو حضرت عیسیٰ نے اور نہ حضرت محمدؐ نے غلامی کا موقوف کرنا مناسب خیال کیا ۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ دونوں نے اپنے معتقدوں کو یہ ہدایت کی تو ان کو اوروں کے ساتھ وہ کرنا چاہیے کہ جیسا کہ اوروں سے اپنے ساتھ کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے درحقیقت غلامی موقوف کردی۔ یہ بات ظاہر میں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ عمل میں ایسا نہیں ہے مسلمانوں کی خانگی غلامی بلاشبہ ناقابل حمایت ہے لیکن افریقہ کی بردہ فروشی اور ویسٹ انڈیز کے کارخانہ باغات میں غلاموں پر کی سختیوں اور بے رحمیوں کا مقابلہ میں (جو عیسائی ملکوں میں مروج تھیں) کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتیں۔ ہم نہایت اعتقاد سے روم کے پوپ اور کنٹربری کے آرچ بشپ اور کونسلوں اور مجلسوں اور پوپ کے احکام اور عقاید مذہبی قوانین اور معاہدوں کا ذکر سنتے ہیں۔مگر ہم نے یہ بات سنی ہے کہ ان لوگوں نے کوئی عا تدبیر اس خوفناک تجارت کے انسداد کے لیے کی (واضح ہو کہ اس زمانے میں تمام انگلستان میں غلامی کی تجارت رائج تھی) ورنہ اس کی نسبت ہم کو پوپ کا

کوئی حکم دکھاؤ یا کسی مجلس کا کوئی قانون بتاؤ۔ روم اور کنٹربری کے بشپ خود اس خطاب کے مستحق ہیں۔ کہ وہ اپنے معتقدوں کی خواہش کے پورا کرنے کا کام دیتے تھے۔ جو خطاب کہ انہوں نے حضرت محمدؐ کو اس وجہ سے دیا ہے۔ جب کہ روم کے پوپوں کو اس تجارت کا فساد عظیم صاف صاف ثابت ہو گیا تھا تو انہوں نے ان شخصوں کو قوم سے خارج نہیں کیا جو اس تجارت میں مصروف تھے جیسا کہ کیوکارس یعنی پیروان جارج فاکس نے کیا تھا۔

میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہ یہ ظاہری عذر کریں گے کہ وہ کسی شخص کو اس وجہ سے غلاموں کا مالک ہے قوم سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے مثلاً جہاں کہیں لفظ ''سروس'' یا ''دولوس'' پایا جاتا ہے۔ اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے وہاں اس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیے۔ لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور ''فریدئین'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے نیم منعی ہیں لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جاوے تو اس سے کسی طرح پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے۔ جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔

اگر چہ پیغمبر صاحب نے اس مکروہ دستور کو موقوف نہیں کیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے تھا۔ تاہم انہوں نے بالکل بغیر ذکر کیے ہوئے نہیں چھوڑا۔ بلکہ اس بات کے فرمانے سے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور کسی شخص کو اپنے زمانے کے بھائی کو غلام نہیں رکھنا چاہیے۔ انہوں نے انسانوں کے ایک گروہ کثیر کو آزاد کر دیا۔ جس وقت کوئی یہ کہہ دے کہ میں ایمان لے آیا ہوں تو وہ فوراً آزاد ہے۔ اگر حضرت محمدؐ نے اس باب میں جیسا کہ چاہیے تھا ویسا نہیں کیا۔ تو انہوں نے کچھ تو جو بالکل نہ ہونے لیں (جیسے کہ انجیل میں کچھ نہیں ہے)

بہتر ہے اور اس سبب سے غالبًا کچھ لوگ بلا تصدیق قلبی بھی مسلمان ہو گئے ہوں گے گو کہ اس امر کو کوئی پکا دین دار عیسائی جس کا گرم ایمان مذبح کے دھکتے ہوئے انگارے سے زیادہ تر گرما گرم ہے عجب لگاوے اور اس کو بدنیتی پر حمل کرے۔ لیکن تاہم اس تدبیر نے لاکھوں آدمیوں کو مصیبت سے بچایا ہے۔ ایک اور تدبیر غلامی کی ترمیم یا اس کی قباحتوں کی تخفیف کرنے کی پیغمبر صاحب کے اس حکم سے ملتی ہے جہاں یہ فرمایا ہے کہ غلاموں کو فروخت کرنے میں ماں سے بچے جدا نہ کیے جاویں۔ ہمارے ویسٹ انڈیز والے ہر روز یہی جرم کرتے ہیں۔ مجھ کو کوئی ایسا حکم انجیل میں نہیں ملا اس لیے حضرت محمدؐ نے اس کو انجیل میں سے نہیں لیا۔

گاڈفری ھگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہم عیسائی اکثر اوقات بے چارے حبشیوں کو عیسائی بنانے کی خواہش کرتے ہیں مگر میں انہی مشیرنی سوسائٹیوں کو یہ صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنی دولت کثیر کو اس باب میں صرف کریں کہ جس وقت حبشیوں کا مذہب تبدیل ہو جاوے تو ان کو فوراً آزاد کر دیں اور ان کو اپنا بھائی قرار دیں جیسا کہ مسلمان کیا کرتے ہیں اور میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے تمام وعظوں سے اس قدر لوگ ان کے معتقد نہ ہوں گے جیسے کہ اس بات سے ہوں گے''۔

گاڈفری ھگنز صاحب نے ویسٹ منسٹر ریویو کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ ان کا مسئلہ قانون کی غلامی کے باب میں یہ ہے کہ ''اگر غلام تمہارے پاس آویں تو تم ان کو قید اور اس کے بعد ان کو سر بازار مت فروخت کرو گو کوئی دعوے داران کا موجود نہ ہو (جیسا کہ انیسویں صدی میں عیسائی انگلستان کا قانون اس کے صوبوں میں جاری ہے) بلکہ ان کو آزاد کر دو اور تم کو مناسب نہیں کہ ان کو نکال دو۔ مگر حضرت محمدؐ (جنہوں نے غلامی کے مٹانے کی نسبت نہایت عمدہ تدبیریں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے

تھے۔

حضرت محمدؐ تو فرماتے ہیں کہ ''ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کے ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کردیں تو وہ اپنے تیئں آزاد ہیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کولکھ کردو۔ اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانوتو تم خدا کی دولت مُں سے جواس نے تم کودی ہےان کودو'' گاڈفری ھگنز کہتے ہیں کہ مجھ کوانجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا گاڈفری ھگنز کا استدلال تھا مگر یہ استدلال کی قدر حاشیہ لکھنے کامحتاج ہےان کے یہ بیان کہ ''حضرت محمدؐ نے غلامی کوموقوف کرنا مناسب خیال نہ کیا'' صحیح نہیں ہے جولوگ تقلیسد کی تاریکی مُں اندھے ہورہے ہین وہ بھی اس بات کوتسلیم کرتے ہیں کہ آں حضرت صلعم کی مرضی اورخوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہرحکم مین غلاموں کی آزادی پررغبت دلاتے تھےاور جولوگ خاص آں حضرت صلعم کواپنا ہادی وپیشوا جانتے ہیں اورزیدوعمروکی رائے اوراجتہادکی کچھ پروانہیں کرتے تو وہ صاف صاف قرآن مجید میں پاتے ہیں کہ بانی اسلام نے آئندہ غلامی کو بالکل قطعاً موقوف کردیا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔ پس یہ فخر صرف مذہب اسلام کوہی ہے کہ اس نے غلامی کومعدوم کیا ہےاور ہرانسان کوآزادقراردیاہے۔

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا واذكروا نعمت الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمة اخوانا (سوره آل عمران)

اسلام لانے سے غلامی ساقط ہوجانے پر جواستدلال گاڈفری ھگنز نے کیا ہے ہم کو دل سےاس پراتفاق ہے۔ خداتعالیٰ نے سورہ حجرات میں صاف فرمایاہے کہ:

انما المومنون اخوة

یعنی سب ایمان والے آپس میں بھائی ہیں اور سورہ آل عمران میں فرمایا ہے کہ:

''سب لوگ اکٹھے ہو کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اور جدی جدی راہوں میں مت بھٹکو اور تم کو جو نعمت خدا نے دی ہے (یعنی اسلام) اس کا شکر کرو۔ ایک وقت تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر تمہارے دلوں میں خدا نے محبت ڈال دی پھر تم ہو گئے اللہ کی نعمت (یعنی اسلام) کے سبب آپس میں بھائی''۔

پس کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور اس لیے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہی ''اخوت'' اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لیے چلا جاتا ہے مگر جب ہمارے پیغمبر نے علانیہ صاف صاف لفظوں میں آئندہ کی غلامی کو عام طور پر معدوم کر دیا ہے تو ہم کو اس قسم کی خاص خاص باتوں پر استدلال کی حاجت نہیں ہے۔

کتابت کا جو ذکر گاڈفری ھگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو بلکہ اس کا ذکر کرنا واجب تھا اور انکار کرنا قابل سزا کے تھا چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے (اگر وہ صحیح ہو) معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انس سے کتابت کی درخواست کی تو انہوں نے انکار کیا۔ ابن سیرین وہ مقدمہ حضرت عمر کے سامنے پیش کیا اور حضرت عمر نے حضرت انس کو اس انکار کرنے پر دروں سے پٹوایا اور کتابت یعنی خط آزادی بہ معاوضہ روپیہ کے بہ جبر حضرت انس سے لکھوا کر دیا۔ گو یہ حدیث قابل شبہ ہو مگر خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کہ کتابت کی درخواست کرنے پر خط آزادی بہ معاوضہ روپیہ کے لکھ کر دینا لازم ہے۔

بہرحال جوحمایت اس عالم اوراضل مصنف ن نہایت قابلیت اور بڑی سرگرمی سے مذہب اسلام کی کی ہے اس کا واجب شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مصنف نے غلامی کی ترمیم یا اس کی خرابیوں کی تخفیف میں جو بچوں کو ماں سے جدا نہ کرنے کا ذکر ہے اس کے ساتھ چند اور قسم کے احکام زیادہ کرنے چاہئیں جو غلامی کی ترمیم اور اس کی خرابیوں کی تخفیف کے حق میں ویسی ہی مفید ہیں چنانچہ آں حضرت صلعم نے غلاموں ا کے حق میں فرمایا ہے کہ:

قال (ای النبی صلعم فی حق العبید) ان اخوانکم خولکم جعلهم الله تحت ایدکم فمن کان اخوه تحت یده فلیطعمه ممایا کل ویلبسه‘ مما یلبس ولا تکلفوهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فان کلفتموهم ما یغلبهم فاعینوهم (بخاری باب قول النبی صلعم العبید اخوانکم صفحه ۳۴۶)

”وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے تابع کر دیا ہے پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں سے اس کو کھلاوے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں سے اس کو پہناوے اور ان سے ایسی تکلیف کے کام جو ان کو تھکا دیں نہ لے اور اگر ایسی تکلیف کا کام ان کو دیا جاوے جو ان کو تھکا دے گا تو خود ان کی مدد کرے“۔

اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانے میں اپنے غلاموں

۱۔ اس حدیث میں بوجہ اسلام کے بھائی ہونے کا ذکر نہیں ہے اور آیت قرآن مجید میں جو اوپر مذکور ہوئی بوجہ اسلام بھائی ہونے کا ذکر ہے۔ اس لیے اسلام سے غلامی ساقط ہونے پر گاڈفری ھگنز صاحب نے استدلال کیا ہے۔ (سید احمد)

کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے اور ایک خوان میں اپنے ساتھ کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے اور جب سفر میں جاتے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سوار ہوتے تھے اور باری باری سے نکیل پکڑ کر پیادہ پا چلتے تھے۔

خلیفہ عمر عین اپنی خلافت کے عروج کے زمانے میں (خواہ ان کے عالی مرتبہ کو پیغمبر کا جانشین ہونے کی وجہ سے خیال کرو خواہ ایک ایسی سلطنت کا بادشاہ تصور کرنے سے جو دنیا میں سب سے زیادہ وسیع اور باعظمت تھی) اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام باری میں سوار ہوتا تھا عرب کے جلتے ہوئے ریگستان اور جھلستی ہوئی گرم ہوا میں نہایت خوشی اور فخر آمیز خیالات اور نیکی سے بھرے ہوئے دل سے پیادہ پا اونٹ کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے۔ فاطمہ پیغمبر کی بیٹی اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی ان کا دست مبارک ہتھے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لانڈی کا تا کہ دونوں کو برابر محنت پڑے۔ پس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر کرنے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے۔ ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زاید از حد ترقی متصور ہے پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی قیاس کرنا

محض غلطی ہے آں حضرت صلعم نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا بلکہ ان کی نسبت لونڈی و غلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے ان کی رقیت اور حقارت نکلتی تھی منع فرمایا اور نہایت شائستہ و مہذب و شفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی۔ یعنی یہ فرمایا کہ ''ان کو لڑکا'' اور ''لڑکی'' کہہ کر پکارا کرو جس کو بگاڑ کر ہندوستان کے ناخدا ترسوں نے ''چھوکرا'' اور ''چھوکری'' بہ معنی لونڈی و غلام کہنا شروع کیا ہے۔ مسلم کی اس حدیث کے لفظوں کو دیکھو اور سمجھو کہ تمہارے پیشوا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا ہے کہ اس فرمانے کے بعد بھی ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یقولن احد کم عبدی و امتی کلکم عبید اللہ و کل نساء کما اماء اللہ و لکن لیقل غلامی و جاریتی و فتائی دفتاتی (مسلم کتاب الالفاظ من الادب)

''کوئی تم میں سے میرا غلام اور میری لونڈی ہر گز نہ کہے۔ تم
سب خدا کے غلام ہو اور سب تمہاری عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں مگر
یوں کہو کہ میرا بچہ اور میری بچی اور میرا لڑکا اور میری لڑکی''

علاوہ اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔

اب ہم ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے غلامی کی نسبت کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام نے آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ بموجب قدیم رسم جاہلیت کے غلام ہو چکے تھے ان کی آزادی کا احساناً بلا لینے زر معاوضہ کے حکم نہیں دیا۔ وہ بدستور ان لوگوں کے ملک رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے۔ اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام

مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعتاً آزاد کیوں نہ کر دیا تو اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کی اس قدر تو ضرور تسلی ہو گی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے۔ اور ایسا بے رحم و شفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے محل و بے نظیر ہے اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر ترغیبیں دلائیں ہاں بلاشبہ جو سمجھ دار اور دانش ور لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے ان کی آزادی کا دفعتاً حکم دے دینا محالات علمی سے تھا اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جاوے پس یہی کام اسلام نے کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے۔ بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔

بہ قول مسٹر ھگنز کے گو حضرت مسیح نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے محمد رحمۃ اللعالمین نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا۔ تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا اور جو قدیم زمانے کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ایک ملکی رسم کے جاری تھی۔ اور جن رسموں کو اس بڑے مقدس مقنن موسیٰ نے بھی بہ طور ملکی قانون کے اپنی کتاب میں داخل کیا تھا اور جن کو حضرت مسیح نے بھی نہیں توڑا تھا اور جن کو حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا دفعتاً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسوم اور مطول قانونوں کو ایک دوسرے لفظ کے فرمانے سے کہ

اما منا بعد و اما فداء

مٹا دیا۔

یتیمے	کہ	ناکردہ	قرآں درست
کتب	خانہ	چند	ملت بشست

صلی اللہ علیہ وسلم . بابی انت و امی یا رسول اللہ.

اس رسول مقبول ھادم الرقیۃ ناصر الانسان رحمۃ للعالمین نے اپنے مبارک ہونٹوں سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کا یہ حکم دیتا ہے کہ:

فاذالقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشد الوثاق فاما بعد و اما فداء. (سورہ محمد آیت ۴)

> ''خدا تعالیٰ کا یہ حکم دیتا ہے کہ جب تم مقابل ہو کافروں کے تو گردنیں کاٹو جب کہ تم اس پر گھمسان کر چکو تو ان کو قید کر لو۔ پھر قید کرنے کے بعد یا تو ان پر احسان رکھ کر یا ان سے فدیہ لے کر یعنی چھڑائی لے کر چھوڑ دو''۔

اس آیت میں پایا جاتا ہے کہ کافروں کے مغلوب ہو جانے پر جوان کے قید کرنے کا حکم ہے اس سے مقصد ان کی جان بچانا ہے اور قید رکرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے چھڑائی لے کر چھوڑنے میں جب دو حکم دیے جاتے ہیں۔ تو ان لوگوں کو جن کی نسبت یہ حکم ہیں اس قدر تو اختیار رہتا ہے۔ کہ ان دونوں میں سے جون سے حکم کی چاہیں تعمیل کریں۔ مگر دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں۔ بلکہ کوئی اور امر اختیار کریں پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عمل درآمد کرنا واجب ہے۔ ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیے رقیت یعنی قیدیوں کا

لونڈی و غلام بنانا بالکل نیست و نابود ہو گیا ہ۔ ہاں یہ بات ہوسکتی ہے کہ ہے کہ اگر کوئی شخص قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو اس وقت تک اس کو قید رکھے۔ مگر وہ قیدی بدستور ایک قیدی ہوگا اور رقیت و مملوکیت کسی حالت میں اس پر طاری نہ ہوگی اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی اور اسی لیے پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔

ہمارے ہاں کے عالموں کی رائے میں اس امر کی نسبت اختلاف ہے کہ کن صورتوں میں قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑنا چاہیے بعض کی یہ رائے ہے کہ ان کو صرف اس حالت میں چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں اور بعضوں کی یہ رائے ہے جو بہ ظاہر معقول بھی معلوم ہوتی ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جاوے اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار رہے کہ چاہیں مسلمانوں کے ملک میں رعیت ہو کر رہیں اور چاہیں اپنے خاص ملک کو چلے جاویں۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں احسان رکھ کر چھوڑ دینے کی حالت میں کوئی قید و شرط نہیں لگائی ہے اور اسی لیے ہمارے نزدیک پچھلی رائے ان کی پہلی رائے سے زیادہ مستند و معتبر و صحیح ہے۔

دیکھو کتابت یعنی بہ معاوضہ روپیہ کے خط آزادی لکھ دینے اور فدیہ لے کر چھوڑنے میں چنداں فرق نہیں ہے اگلے غلاموں کی نسبت جو کتابت کا حکم ہے وہ اگلے غلاموں کی آزادی کی نہایت معتبر دستاویز ہے۔

جس نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ہم کو کچھ کم رنج نہیں ہوتا۔ مگر ہم اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو

کرنے دیتا ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم کے مطابق اوراس کے عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے اور وہ ضرور ایک دن اسس حقیق شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا۔ خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینہ میں۔

سر ولیم میور اسلام میں ایک یہ نقص بتلاتے ہیں کہ اسلام میں مذہب کے معاملہ میں آزادی رائے روک دی گئی ہے بلکہ بالکل معدوم کر دی گئی ہے۔

مگر سر ولم میور کی اس رائے کا جس میں وہ مذہب اسلام میں مذہبی رائے کی آزادی نہ ہونے کا نقص نکالتے ہیں ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے۔ کیوں کہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام ایسی کون سی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی کو روکتی اور معدوم کرتی ہے اور مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی جن کی کتب مقدسہ گویا مذہب اسلام کے اور مذہب عیسائی دونوں کی بنیاد ہیں یہ پکا عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ اس کے تاریخی مضمون کے باوجودیکہ ان کے مصنف سے بھی معلوم نہیں ہیں وحی آسمانی ہیں اور اس لیے سہو و خطا و غلطی سے بالکل مبرا ہیں اور ہر ایک انسان کو بغیر ذرا سے بھی تامل کے اور بغیر کسی حجت کے اور بغیر استعمال کرنے اپنے قوائے عقلیہ کے ان کے حق ہونے کا اعتقاد کرنا چاہیے۔

عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ بلحاظ اعتقاد نسبت کتب مقدسہ کے وہ دو فرقے ہو گئے ہیں ایک وہ جو یقین کرتے ہیں کہ کتاب مقدس تمام و کمال وحی من السماء ہے۔ دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو وحی سمجھتا ہے جو مسائل و احکام سے متعلق ہے اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا۔

مگر قطع نظر اس اختلاف سے جو عیسائیوں کو کتب مقدسہ کے اعتقاد اور ان کے وحی ہونے کی نسبت ہے۔ ان کو دو بڑے بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے جن کے سبب

سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور سے بالکلیہ نیست و نابود ہو جاتی ہے اور اس لیے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سبھی زیادہ خراب حالت میں ہیں اور وہ دو مسئلے یہ ہیں۔

ا۔ ایک مسئلہ

توحید فی الثلیث اور تثلیث فی التوحید

کا ہے۔ یہ ایک نہایت عجیب طور کا مسئلہ ہے۔ جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے۔ لفظ تثلیث کا خدا کے تین مقدس جسموں کے ظاہر کرنے کو حضرت عیسیٰ کی دوسری صدی تک یعنی اس وقت تک جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل یا نائسیا میں بھی جو ۳۲۵ برس بعد حضرت عیسیٰ کے ہوئی تھی اور جسم میں اپریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا طے نہیں ہوا تھا اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے۔ کیوں کہ پارسن اور اور مشہور و معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس پر خاص اس مسئلہ کا استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے۔ پس اگر اعتقاد کی خوبی نہیات عجیب و مشکل گو خلاف عقل مسائل پر اعتقاد لانے میں ہو تو بلا شبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد معلوم ہوگا۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص عیسائی کہلاوے اور اس کو عیسائیوں کے حقوق خدا کی بارگاہ میں حاصل ہوں اس کو اس مسئلہ عجیب و غریب پر پکا اعتقاد لانا چاہیے۔ تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے برخلاف ہے۔ تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بے کار و معطل چھوڑ کر نہایت اصرار و تعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے۔ دلیل و عقل کو اس میں دخل دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

۲۔ دوسرا مسئلہ فدیہ کا یعنی حضرت عیسیٰ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے

اور آئندہ کے گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی ایسا مسئلہ ہے جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ فدیہ کا یک ایسا مسئلہ ہے جس کے سبب سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا اور بدی اور بداخلاقی کے دروازہ کو کھول دیتا ہے کیوں کہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجاب دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا بقول شخصے

گناہ من از نامدے در شمار
ترا نام کے بودے آموزگار

پس جو کوئی زیادہ گناہ کرنے گا وہی شخص زیادہ رحمت کا مستحق ہوگا جو حق ایک بڑے ولی کو ہونا چاہیے۔ اس لیے سب سے بڑا گنہگار سب سے بڑا ولی ہوگا۔ مگر ہم ایسی رائے کو پسند نہیں کرتے اور سچے ایمان داروں کو جو وہ کسی معبود حق یا باطل پر یقین رکھتے ہوں۔ ان کا نیکوکار ہونا لازم سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ فدیہ کے بعد بھی دوزخ بالکل خالی نہ ہوگی کیوں کہ عیسائی مذہب کے موافق بھی تمام کافر جو بے شمار گروہ ہیں اور جن کے بے شمار نام ہیں سب دوزخ میں جاویں گے اور اس کے تنگ و تاریک مکانوں میں قید رہیں گے۔

ایک مسئلہ مذہب عیسوی کا جو سرنوشت کے نام سے مشہور ہے حسن معاشرت کے حق میں ویسا ہی ہے مضرت بخش ہے اگر اس مسئلہ کا معتقد نیک طبیعت اور صاف دل ہو تو بآسانی اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ازل سے اس کا نام کتاب حیات میں لکھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ خیال کرتا ہے کہ اگر اس کی برائیاں اور اس کے گناہ سمندر کے کناروں کی ریت کے برابر بھی ہو جاویں تب بھی اس کا نام صفحہ کتاب حیات سے نہ مٹا سکیں گے اوا گر وہ کم بخت تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا نام صفحہ کتاب حیات میں مندرج نہیں ہے اور اسلیے وہ اپنے

قدرتی مزاج کے خراب میلان کو روکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کو اسے کوئی ترغیب نہیں رہتی۔

مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسہ سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں ہے۔

ہم اس مقام پر ایک مشہور و معروف فرانسیسی عالم یعنی ایم ڈی سینٹ ھلیئر کی رائے نقل کرتے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنی تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب اور خصوصاً عیسائی مذہب کے فیاض اور دانش مند بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ ''اسلام میں کوئی بات مشتبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے۔ مذہب اسلام خود اس بات کے مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جاوے اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔

اب مذہب اسلام کی آزادی رائے کا حال مذہبی معاملات کی نسبت غور کرو۔ دین محمدی صلعم کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں کی نسبت ہر ایک شخص آزادانہ رائے دے سکتا ہے راویوں کی نسبت، روایت کے مضمون کی نسبت، نہایت آزادانہ تحقیقات و تفتیش کرنے کا اور ان تمام روایتوں کا اور حدیثوں کو جو اس کی آزادانہ تحقیقات اور بے تعصب رائے میں تحقیق کے بعد نامعتبر ٹھیریں نامقبول کرنے کا ہر ایک شخص کا کلیۃ اختیار حاصل ہے۔ جو روایتیں اور حدیثیں کہ غور و فکر اور تحمل سے تحقیقات کرنے کے بعد عقل اور قدرت

کے برخلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پاویں یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں ان سب کو رد کر دنے کا کلیۃ مجاز ہے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ: ''حدیث بے سند گوز شتر است'' یہ قول ایک ایسے بڑے شخص کا ہے جس کو لوگوں نے نبی سے کچھ ہی کم مان رکھا ہے۔

قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ ہم انے قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کے سچ سے مانا ہے۔ ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں ہے۔ مذہب اسلام میں ایسی قوت کسی کو نہیں ہے کہ دوسرے کو خواہ مخواہ برخلاف اس کی سمجھ کے اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے۔ ہر شخص آپ اپنے لیے مجتہد ہے۔ صحابہ جن کو ہم بعد پیغمبر کے بزرگ سمجھتے ہیں ان کی نسبت بھی اکابر مذہب اسلام کا یہ قول ہے کہ

نحن رجال وھم رجال

پس اس سے زیادہ اور کیا مذہبی معاملات میں آزادی رائے ہو سکتی ہے۔

مگر ہم یہودی اور عیسائی مذہب میں اس قسم کی آزادی رائے معاملات مذہبی نہیں دیکھتے مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کو ماننا اور وہ بھی اندھا دھوندی کے اعتقاد اور بے مداخلت عقل اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جاوے۔ کیوں کہ خود قرآن مجید ہی اس بڑے مسئلہ کو جبر و سختی و ناسمجھی سے تسلیم کرنے کو نہیں کہتا بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں

کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد اس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ اس پاک کتاب میں لکھا ہے کہ:

ومن آیاته ان خلقکم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون.

ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنو الیها وجعل بینکم مودة ورحمة ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون.

ومن آیاته خلق السموات والارض و اختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذالک لایات للعلمین.

ومن آیاته منامکم بالیل والنهار وابتغائوکم من فضله ان فی ذالک لایات لقوم یسمعون.

ومن آیاته یریکم البرق خوفاً وطمعا و ینزل منالسماء ماء فجی به الالرض بعد موتها ان فی ذالک لایات لقوم یعقلون.

ومن آیاته ان تقوم السماء والارض بامره.

ومن آیاته ان یرسل الریاح مبشرات ولیذیقکم من رحمیه ولتجری الفلک بامره .

الله الذی یرسل الریاح فتثیر سحابا قیبسط فی السماء کیف یشاء و یجعله کسفا فتری الودق یخرج من خلاله.

الله الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوة ثم جعل من بعد قوة ضعفا و شیبة (سوره روم .

الم تر ان الله انزل من السماء ماء فاخرجنا به الثمرات مختلفا الوانها ومن الجبال جدد ببض و حمر مختلف الوانها و غرابیب سود ومن

الناس والدواب والانعام مختلف الوانه كذالک (سوره فاطر).

ان فی السموات والارض لایا ت للمومنین و فی خلقکم وما یبث من دابة آیات لقوم یوقنون.

واختلاف الیل و النهار وما انزل الله من السماء من رزق فاحیا به الارض بعد موتها و تصریف الریاح آیات لقوم یعقلون تلک آیات الله نتلوها علیک بالحق فبای حدیث بعد الله و آیاته یومنون (سوره جاثیه).

هو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا به خضرا نخرج منه حبا متراکبا ومن النخل من طلعها قموان دانیة و جناب من اعناب والزیتون والرمان متشابها وغیر متشابه انظروا الی ثمره اذا اثمرو ینعه ان فی ذالک لایات لقوم یوقنون (سوره انعام)

هو الذی مد الارض و جعل فیها رواسی وانهارا ومن کل الثمرات فیها جعل زوجین اثنین یغشی الیل النهار ان فی ذالک لایات لقوم یتفکرون (سوره رعد)

وفی الارض قطع متجاورات و جنات من اعناب وزرع و نخیل صنوان وغیر صنوان بسقی بما واحد و نفضل بعضها علی بعض فی الاکل ان فی ذالک لایات لقوم یعقلون (سوره رعد)

الذی جعل لکم الارض مهدو سلک لکم فیها سبلا و انزل من السماء ماء فاخرجنا به ازواجا من نبات شتیٰ کلو وادعو انعامکم ان فی ذالک لایات لاولی النهی (سوه طه).

والانعام خلقها لکم فیها دفع و منافع و منها تاکلون ولکم فیها

جمال حسین تریحون و حین تسرحون و تنحمل اثقالکم الی بلدلم تکونو بالغیه الابشق الانفس (سورہ نحل)

وان لکم بی الانعام لعبرۃ نسقیکم مما فی بطونہا من بین فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربین (سورہ نحل)

ومن آیۃ الجوار فی البحر کالا علام ان یشاء یسکن الریح فیظلن رواکد علی ظہرہ ان فی ذالک لایات لکل صبا شکور (سورہ شوریٰ)

واللہ اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئاً و جعل لکم السمع والابصار والافئدہ لعلکم تشکرون. الم یرو الی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکہن الا اللہ ان فی ذالک لایات لقوم یومنون (سورہ نحل)

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی نشانی ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا کہ پھر تم چلتے پھرتے آدمی ہوئے۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم کو پیدا کیا اور تم ہی سے تمہارے لیے جوڑا بنایا کہ اس سے تم کو چین ہو اور آپس میں تمہاری محبت و شفقت پیدا کی اسی میں ان لوگوں کے یے جو غور کرتے ہیں۔ خدا کے ہونے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہی آسمانوں اور زمین کا پیدا ہونا اور تمہاری نرالی نرالی بولیوں کا او رتمہارے بھانت بھانت کے رنگوں کا ہونا ان چیزوں میں تمام دنیا کے لوگوں کے لیے خدا کے ہونے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہی تمہارا رات میں اور دن میں سور ہنا اور

اسکی مہربانی سے رزق تلاش کرنا اس میں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنتے یعنی سمجھتے ہیں خدا کے ہونے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے بجلی کی چمک اور کڑک کا تم کو دکھلانا جس سے تم ڈر جاتے ہو اور مینہ برسنے کے لالچ کرتے ہو اور برساتا ہے آسمان سے مینہ پھر مری ہوئی یعنی خشک زمین کو زندہ یعنی ہرا کر دیتا ہے اسی میں ان لوگوں کے لیے جو سمجھدار ہیں خدا کے ہونے کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ اسی کے حکم سے آسمان وزمین کھڑے ہیں۔ خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ مینہ کی خوش خبری لانے والی ہوا کو چلاتا ہے تا کہ اس کی رحمت کا تم مزہ چکھو اور اس کے حکم سے پانی سے کشتیاں چلیں۔ خدا وہ ہے کہ ہوا چلاتا ہے پھر وہ بادلوں کو ہانک کر لاتی ہے۔ پھر جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور پھر بادلوں کا دل کر دیتا ہے پھر ان میں سے بوندیں ٹپکاتا ہے۔ خدا وہ ہے جس نے تم کو پہلے سے نہایت ہیچ وناتواں پیدا کیا پھر تم کو ناتوانی سے قوی کیا پھر قوی سے ضعیف کر دیا اور بڑھاپے سے تمہارے بال بھی سفید کر دیے کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے رنگ برنگ کے پھل پیدا کیے اور پہاڑوں میں سفید وسرخ اور سیاہ بجھنگ تہیں نکالیں اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپایوں میں طرح بہ طرح کے رنگ بنائے آسمانوں میں اور زمینوں میں خدا کے ہونے پر یقین والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور

تمہارے پیدا کرنے میں اور جانوروں کو بہتات سے پھیلانے میں یقین والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور رات کے جانے اور دن کے آنے اور ان کو بڑا ہونے اور چھوٹا ہونے اور آسمان سے مینہ برسانے پھر مردہ زمین کے زندہ کرنے اور ہوا کے ادل بدل کرنے میں سمجھ دار لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ٹھیک تجھ کو بتلاتی ہیں۔ پھر کون سی بات ہے جس پر اللہ کی اور اس کی نشانیوں کے بعد ایمان لاویں گے۔ خدا وہ ہے جو برساتا ہے آسمان سے پانی پھر پانی کے سبب ہم نے تمام اگنے والی چیزیں پائیں۔ پھر ہم نے اس سے سبز پودے نکالے جس میں سے دانوں کے گچھے نکلتے ہیں اور کھجور کے درختوں میں ان کی پھننگ میں سے پھل کے بوجھ سے زمین کو جھکے ہوئے گابھے نکلتے ہیں اور انگور اور زیتون اور انار کے باغ ایک سے اور ایک طرح کے اگتے ہیں دیکھو اس کے پھل کو جب کہ وہ پھلے اور پکے اس میں بھی بلاشبہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں خدا کے ہونے کی نشانیاں ہیں۔ اللہ ہے جس نے زمین کو ایسا بڑا بنایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور اس میں تمام پھلوں کو دو دو بنایا۔ رات سے دن کو چھپا دیتا ہے۔ اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں خدا کے ہونے کی پر نشانیاں ہیں اور زمین کے مختلف ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ ہیں، کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں۔ کسی کی بہت گھنی شاخیں ہیں اور کسی کی چھدری جو ایک سے پانی سیراب ہوتے ہیں اور کھانے میں ایک

دوسرے سے مزے دار ہیں اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں وہ خدا ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو پنگوڑھا بنایا اور تمھارے لیے اس میں رستے جاری کیے اور آسمان سے مینہ برسایا پھر ہم نے پانی کے سبب مختلف اگنے والی چیزوں کے جوڑے نکالے' کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ اس میں بھی عقل والوں کے لیے خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں او رتمھارے لیے مویشی کو پیدا کیا ان میں گرم ہونے کا سامان اور بہت سے منافع ہیں اور ان ہی میں سے تم کھاتے ہو اور تم کو ان سے زیبائش ہے جب کہ شام کو چرا کر لاتے ہو اور چرانے کو لے جاتے ہو تمھارا بوجھ کسی شہر کو اٹھا کر لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر ادھ موئے ہوئے نہ پہنچ سکتے تھے اور تمھارے لیے مویشی میں ایک بڑی نصیحت ہے ہم تم کو وہ چیز پلاتے ہیں جو ان کے پیٹ میں گوبر و لہو کے سبب بنتی ہے۔ یعنی اچھا خاصا دودھ جو پینے والوں کے حلق میں آسانی سے اتر جاتا ہے اور خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہیں پہاڑوں کی مانند جہاز سمندر میں چلنے والے اگر خدا چاہے ہوا بند کر دے وہ سمندر کی پیٹھ پر ٹھہر جاویں اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لیے جو صابر و شاکر ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں اور اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا تم کچھ نہیں جانتے تھے بنایا تمھارے لیے سننا تاکہ تم شکر کرو کیا تم پرندوں کو نہیں دیکھتے۔ جو ادھر آسمان کی وسعت میں ہیں کون ان کو تھامے ہوئے ہے بجز خدا کے اس میں بھی

بے شک ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں

ہیں''۔

اگر چند آیتوں کے مضامین کو مختصراً ایک جگہ جمع کر دیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ کس خوبی اور فصاحت و بلاغت سے خدا کے ہونے پر قدرتی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ دنیا کو دیکھو کہ وہ کیسی عجیب چیز ہے۔ تاروں بھرا آسمان' اندھیرے کو اجالا کرنے والا سورج' گھٹنے بڑھنے والا۔ اندھیری رات میں چاندنی کے سے پترے بچھا دینے والا چاند۔ دریا کی موجوں میں اور بے نشان رستوں میں رستہ بنانے والے ستارے خدا کی طرح بہ طرح کی صنعتیں کھی ہوئی آنکھوں والوں خدا کے ہونے کی بڑا نشانیاں ہیں۔ یہ زمین خدا نے تمہارے لیے بنائی اس میں ہر طرف کو جانے آنے کے رستے رکھے تم ان پر رہتے ہو اور ادھر ادھر پھرتے ہو۔ بادلوں کے بے انتہا دل اس نیلے گھیرے کے سینے میں پیدا ہوتے ہیں کھڑے رہتے ہیں ڈولتے پھرتے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ پہاڑوں کی صورت کے اجگر بادل روئی کیپھوئے کی طرح ہوا کے جھونکے سے اڑنے والے کے دل کے دل موسلا دھار مینہ برساتے ہیں پژمردہ زمین کو سرسبز کرتے ہیں۔ گھاس اگتی ہے اونچے اونچے کھجور کے درخت پتوں کی خوش نما چھتریوں سمیٹ اگتے ہیں جن کے گرد کھجوروں کے گچھے لٹکتے ہیں کیا یہ اس پیدا کرنے والے کے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں۔ تمہارے مویشی بھی کیا عجیب نہیں ہیں تمہارے لیے گھاس کو دودھ بنا دیتی ہے۔ ان کے اون سے تم اپنی پوشاکیں بناتے ہو۔ دن بھر جنبل میں چرتی ہیں شام کو صف باندھ کر تمہارے گھر آتی ہیں۔ پھر ان بڑے بڑے پہاڑوں یعنی جہازوں کو دیکھو جو اپنے کپڑے کے پر پھیلائے سمندر جست کرتے ہوئے جاتے ہیں ہوا ان کو لیے پھرتی ہے۔ مگر جب خدا نے ہوا بند کر لی تو ہو مردہ کی طرح پڑے ہیں پھر ہل تک نہیں سکتے

کیا یہ ایک کرشمہ نہیں ہے۔تم کیا کرشمہ چاہتے ہوتم خود کیا کچھ کرشمہ نہیں ہو۔ چند برس پہلے تمہارا وجود نہ تھا۔تم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ چھوٹے سے بڑا کیا' خوب صورت بنایا' طاقت تم کو دی۔خیالات کی قوت تم میں رکھی ۔تم کو ایک دوسرے پر رحم آتا ہے۔اگر تم کو ایسا نہ بناتا تو تمہارا کیا حال ہوتا۔ پھر تمہارے بال سفید ہوتے ہیں۔تمہاری طاقت گھٹ جاتی ہے۔ ناتواں ہو جاتے ہو۔ پھر تمہارا وجود نہیں رہتا۔ یہ سب چیزیں اس کے بنانے والے ہونے کی نشانیاں ہیں۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

تم قرآن اسی قسم کے قدرتی مضامین سے بھرا ہوا ہے جن سے اس علۃ العمل یعنی خدا کے ہونے پر استدلال کیا ہے۔ پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقہ پر بیان کی ہیں اور یوں فرمایا ہے کہ:

امن خلق السموات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنابه حدایق ذات بھجة ما کان لکم ان تنبیتو ا شجر ھاء اله مع الله بل ھم قوم یعدلون. آمن جعل الارض قرارا وجعل خلالھا انھارا وجعل لھارواسی وجعل بین البحرین حاجز اله مع الله بل اکثرھم لا یعلمون . (سورہ نمل)

”کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے تمہارے لیے آسمان سے مینہ برسایا۔ پھر ہم نے اس سے فرحت بخش باغ اگائے تم ان کے درخت نہیں اگا سکتے تھے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے مگر کافر وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ سے پھر جاتے ہیں۔کس نے زمین کو ٹھیرنے کی جگہ بنایا اور کس نے اس میں دریا بنائے اور کس

نے زمین کے پہاڑ بنائے اور کس نے دو سمندروں میں ایک جزیرہ
بنایا۔ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے مگر بہت کافروں میں سے نہیں
جانتے اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو
جاتے''۔

ہر گیا ہے از زمین روید
وحدہ لا شریک لہ گوید

پس امور مذہبی میں جیسی آزدی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔

یہ کہنا کہ اسلام کے نہ قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے مذہب اسلام پر من جملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کیے ہیں یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ دانستہ حق پوشی کی نظر سے باندھے ہیں۔ اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ پس کیوں کہ یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس چیز سے وہ بات ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس کی ضرورت اسلام کے لیے ہے اس کے کرنے کو خود اسلام ہی ہدایت کرے۔ جو لوگ مذہب اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں اور خدا کے کلام کو ایک ادنیٰ توجہ سے ہی دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خیال کہ اسلام زبردستی وتلوار کے زور سے قبلوایا جاتا ہے قرآن مجید کے صاف اور روشن حکم کے بالکل خلاف ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے:

لا اکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا واللہ سمیع العلیم . (سورہ بقر آیت ۲۵۷).

ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس

حتیٰ یکونوا مومنین وما کان لنفس ان تومن الا باذن الله ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون (سورۃ یونس آیت ۹۹و۱۰۰)

''دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیوں کہ سیدھی راہ یعنی اسلام گمراہی یعنی کفر سے علانیہ کھل گئی ہے پر جو کوئی بتوں کا منکر ہوا اور اللہ پر ایمان لائے تو بے شک اس نے نہایت مضبوط کنگورہ پکڑ لیا ہے جو ٹوٹنے اور قابل نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ''۔

ایک اور جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ:

''اگر چاہتا اللہ تیرا پروردگار تو سب جب زمین میں ہیں اکٹھے ایمان لے آتے پھر کیا تو دباؤ ڈال سکتا ہے لوگوں پر تاکہ مسلمان ہو جاویں (یعنی دباؤ سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا) کسی شخص کو یہ بات ممکن نہیں ہے کہ بغیر حکم اللہ کے ایمان لاوے اور اللہ ان لوگوں پر ناپاکی ڈالتا ہے جو نہیں سمجھتے''۔

جس اصول پر کہ حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثنا کے قتل وغارت ونیست ونابود کردیں۔ اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست ونابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کرکے کا یا کسی اور کو تلوار کی دھار سے مجبور کرکے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا۔ ہاں بلاشبہ اسلام نے بھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کے امن اور اسس کی جان و مال کی حفاظت اور ان کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو اور یہ ایک ایسا منصفانہ

اصول ہے جس پر کوئی شخص کسی قسم کا الزام نہیں لگا سکتا۔

اسلام میں سب سے بڑا مقصد جیسا کہ اس لازوال ہستی پر خود یقین لانا ہے ویسا ہی اس کے وجود اور اس کی وحدانیت کا علی العموم مشتہر کرنا ہے شروع اسلام کے زمانے کے مسلمانوں پر بڑا فرض تھا۔ اور حال کے مسلمانوں پر بھی بہ قدر اس حاجت اور ضرورت کے جواب میں باقی ہے فرج ہے کہ کافروں اور کافروں کے ملک جاویں اور ایسے خدائے واحد کے وجود کا یقین جو دکھائی نہیں دیتا' اپنے وعظ ونصیحت سے لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیں۔ جن ملکوں میں اس مقصد کے ادا کرنے میں کوئی مانع ومزاحم نہیں ہے اس ملک پر اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت نہیں دی۔ مگر جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے اس وقت بلا شبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرضسے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے مگر اسی وقت جہاں ت کہ یہ مقصد حاصل ہو جاوے تا کہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اویہ ذریعہ وعظ وتلقین و پند و نصائح کے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھاویں تا کہ اسی واحد حقیقی کی پرستش دنیا میں جاری ہو۔ مسلمان کافروں میں بہ امن وامان رہیں اور اپنے چال چلن اور عادت وعبادت اور اخلاق محمدی سے خود اپنے تئیں مجسم اسلام بناویں تا کہ کافر نور اسلام کو اس مجسم اسلام میں دیکھیں اور اسلام پر دل سے یقین لاویں۔

ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہو۔ تک نکالی جاتی ہے نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ بجرد حاصل ہونے اس مقصد کے تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے۔ گو کہ ایک بھی کافر مسلمان نہ ہوا ہو۔

یہ مقصد یعنی یہ کہ مسلمان امن سے رہیں اور خدائے واحد کی پرستش کیا کریں اور خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں اور اپنے چال چلن اور عادت وعبادت واخلاق ومحبت و ہمدردی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلاویں تین طرح سے حاصل ہوتا ہے یا یہ کہ ایک مذہب ہو جاوے اور وہاں کے لوگ مسلمان ہو جاویں جیسا کہ مدینہ میں ہوا۔

یا یہ کہ صلح رہے یعنی یہ کہ کفار ادائے فرض مذہبی سے معترض نہ ہوں جیسے کہ ابتدا مکہ میں تھا یا جن مسلمانوں نے حبشہ میں ہجرت کی تھی ان کا حال تھا یا کافر لڑائی کی حالت میں مسلمانوں کو ملک میں رہنے اور آمد ورفت کرنے اور ان کی جان و مال کی حفاظت اور ادائے فرائض مذہبی سے معترض نہ ہونے پر صلح کرلیں۔

یا یہ کہ ملک فتح اور کفار مغلوب ہو جاویں تاکہ ان کو طاقت تعرض کی مسلمانوں سے ادائے فرائض مذہبی اور اعلائے کلمۃ الہ کی نہ رہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے گو کہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو آزادی رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچانے اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔

اس بیان سے ان مصنفوں کی بھی سخت غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ ''اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنا دینا مطلق نہیں ہے'' ہاں ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا۔ مگر مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے بلکہ ہم کو یہ بات تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق

عمل کیا یا نہیں اور وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو جاوے گی۔ کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل خلاف تھے۔ مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان فتح مند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بہ لحاظ قوم و مذہب کے ہر رح کا امن اور آزادی بخشتے تھے تواریخ سے ہم کو بے شمار مثالیں مسلمانوں فتح مندوں کی دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنے کی ملتی ہیں اور ہم اس مقام پر چند راویون کو نقل کرتے ہیں جو اس باب میں عیسائی مصنفوں نے لکھی ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنا اسلام کی خاصیت میں سے ہے۔

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرف دار ہوا سپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے اور اس نے اس معاملہ میں یہ لکھا ہے کہ ''اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہو و معروف بات بیان کے قابل ہے کیوں کہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلے میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانے تک ان بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی دینا''۔

گاڈفری ھگنز صاحب نے اس معاملہ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''کوئی بات ایسی عام نہیں ہے۔ جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اس میں تعصب زیادہ ہے اور اس میں دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب زعم اور محض ریا کاری ہے۔ وہ کون تھا۔ (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان سپین کو اسپین سے بایں وجہ جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے اور وہ کون تھا

(عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کر دیا تھا اور ان سب کو بطور غلام دے دیا تھا۔ اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے۔ مسلمانوں نے بہ مقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا۔ کئی صدیوں سے عیسائی امن وامان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب' ان کے پادریوں ان کے بشپ' ان کے بزرگوں' ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جولڑائی بالفعل (یعنی بہ زمانہ تحریر کتاب) یونانیوں اور ترکوں' میں ہورہی ہے۔ وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال دیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ یونانی اور حبشی اپنے فتح مندوں کی اطاعت سے آزاد ہوا چاہتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے۔ جب کبھی خلیفہ فتح یاب ہوتے تھے اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے۔ تو فوراً ان کا رتبہ بالکل مختلف اور فتح مندوں کے برابر ہو جاتا تھا۔ ایک نہایت دانش مند مگر غیر معتقد عالم نے سراسین یعنی مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی ان میں خوش وخرم تھے''۔

''لیکن اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کیے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب اور ہی تھا۔ یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیون پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی مانگ یعنی دین دار سمجھے جاتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے دینا اور تلوار سے ہوسکتا ہے۔ اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا۔ جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی' ایرانی' اسپین خواہ ہندو قتل نہیں کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے بلکہ فتح ہوتے ہی وہ سب بہ امن وامان اپنی ملکیت اور اپنے مذہب پر قابض

چھوڑ دیے جاتے تھے اور اس پچھلے حق کی بابت ایک محصول ادا دیتے تھے۔ جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا۔ خلفاء کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو۔ جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دیتا تھا اور نہ ایک مثال بھی اس بات کی پائی جاتی ہے۔ کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب چلا گیا ہو نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمان امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ پچھلے مسلمان فتح مندوں نے اپنی فتوحات میں بڑی بری بے رحمیاں کی ہیں جن کا الزام عیسائی مصنفوں نے بھی جد وجہد سے مذہب اسلام پر لگایا ہے مگر یہ واجب نہیں ہے کہ در حقیقت مذہبی تعصب کے باعث لغائی کی خرابیاں زیادہ ہوگئیں۔ مگر اس باب میں مسلمان فتح مند کچھ عیسائیوں سے زیادہ بدتر نہ تھے''۔

اس کے بعد مسٹر گاڈفری ھگنز صاحب نہایت شائستہ ملکوں

ا۔ مسٹر ھگنز صاحب نے یہاں غلطی کی ہے۔ کافروں سے جو مفتوح ہو جاتے ہیں اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے جزیہ نہیں لیا جاتا۔ بلکہ اس وجہ سے مثل مسلمانوں کے بلا مڑ دیا قتیل مڑ دپر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کیے جاتے اور گورنمنٹ کی یہ غرض قائم رکھنے حکومت اسلامی اور بحال رہنے امن و امان کے کوئی خدمت بجا نہیں لاتے ۔ بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ و امن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے معاوضہ میں ا سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے۔ بلکہ خلیفہ کو بہ نظر مصلحت ملکی بالکل اختیار ہے چاہے لے چاہے نہ لے پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے نہ مذہب سے۔ مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ محصول ہے یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔ (سید احمد)

میں بھی دوسرے مذہب کی آزادی کے باب میں شبہ کرتے ہیں اور ایک دل چسپ تقریر لکھتے ہیں کہ ''عیسائی پادریوں کی کوشش کو اگر چہ بہ حسب ظاہر بہت بڑی وسعت دی گئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی'' وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھ کو اس امر کی نسبت کسی قدر شبہ ہے کہ اس شائستہ زمانہ میں بھی جیسا کہ مشہور ہے اس وقت کیا ہوا گر سلطان روم (جس طرح کہ ہمارے پادریوں نے مسٹر ڈریمنڈ نامی کو اپنے خاص مذہب کی تلقین کے لیے جنیوا بھیجا تھا) اپنے ایک نہایت عالم مفتی کو لندن میں ایک مسجد بنوانے اور قرآن کا وعظ کرنے کو بھیجے۔ مجھ کو اندیشہ ہے اور میرا یہ اندیشہ معقول وجہ پر مبنی ہے کہ اس کے سبب سے جو لوگ آگ ۸۰ میں یا حال میں بہ مقام برمنگھم مشتعل ہوئی تھی وہ پھر پادریوں کی بدولت بھڑک اٹھے اور ہمارے وزیر اس کا جواب ایک ایڈمرل یعنی امیر البحر کے منہ سے دیں۔ جس کی یہ رائے ہوگی کہ قسطنطنیہ پر گولہ اندازی کرنا ممکن ہوگا''۔

مگر مجھ کو مسٹر ھگنز کی رائے کے ساتھ ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لندن کی شائستگی مسٹر ھگنز کے زمانہ سے اب ترقی پر ہے۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص مسمی ڈاکٹر پرفلٹ نے عین لندن میں ایک مکان لیا تھا اور ہر اتوار کو اس مکان میں برخلاف مذہب عیساء پر لکچر دیا کرتا تھا اور جو لوگ چاہتے تھے وہاں جا کر اس کا لیکچر سنتے تھے میں بھی کئی دفعہ اس کا لیکچر سننے گیا تھا اور ایک دفعہ اس نے قرآن اور اسلام پر بھی لیکچر دیا تھا۔ اچھا لیکچر تھا مگر جو عام غلطیاں قرآن اور اسلام کے بارے میں انگریزوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس کے لیکچر میں بھی تھیں۔ میں نے سنا کہ پادریوں نے اس کا لیکچر بند کرنے کی بڑی کوشش کی مگر پارلیمنٹ سے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمیٰ اپالوجی میں لکھا ہے کہ ''نائیسا کی کونسل میں ایک امر واقع ہوا تھا کانسٹنٹائن نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس سے

نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہوئے تھے جن کا خلاصہ ان چند سطروں میں موجودہ خون ریزی اور بربادی ان احمقانہ نوجہادوں کی جو عیسائیوں نے قریب دو سو برس کے عرصہ تک ترکوں پر کیے تھے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے۔ لوتھر کے پیرووٗں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل کرنا۔ وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری نے دیا۔ فرانس میں سنٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا۔ چالیس برس تک اور بہت سی خون ریزیوں کا ہونا۔ فرانس کے اول کے عہد کے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک۔ عدالت مذہب کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل نفرین ہے کیوں کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔ علاوہ اس کے اور بے انتہا بدعتوں کا اور اس بیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے۔ زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا اور تیرہ چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعوٰی جو ہر قسم ے گناہ اور عیب اور بدکاری میں جو ایک نیرو یا ایک کیلیگیو لا سے نہایت فوق لے گئے تھے۔ آخر کار اس خوف ناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لیے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لے کر قتل ہونا۔ یقیناً یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ ایک ایسا مکروہ اور قریبا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ سو بردس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا تھا ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہب دلائل کی بنا پر نہیں بہایا''۔

مشہور و معروف مورخ مسٹر گین جو زمانہ حال کے مورخوں میں سب سے بڑا مورخ ہے او جس کی سند نہایت معتبر گنی جاتی ہے اس امر کی نسبت اپنی کتاب میں یہ لکھتا ہے کہ

''مسلمانوں کی لڑائیوں کو ان کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آں حضرت نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں ان سے خلیفاؤں نے دوسرے مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی جس سے اسلام کے غیر معتقدوں کی مخالف رفع ہو جاوے۔ ملک عرب حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا مگر وہ دنیا کی قوموں کو محبت سے اور بہت کم رشک سے دیکھتا تھا۔ بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والے اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے۔ شرعاً نیست و نابود کیے جا سکتے تھے مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتح مندوں نے بعض کام دوسرے مذہب کی آزادی کے برخلاف کرنے کے بعد اس امر تاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے معتقدوں سے بہ متانت یہ استدعا کی گئی ہے: کہ وہ حضرت محمدؐ کے الہام کو جو زیادہ تر کامل ہے قبول کریں لیکن اگر انہوں نے نہ مانا اور ایک معتدل خراج یعنی جزیہ دینا قبول کر لیا تو وہ اپنے عقیدہ میں اور مذہبی پرستش میں آزادی کے مستحق تھے''۔

ایک مصنف نے اپنے ایک آرٹیکل میں جو ایسٹ اور ویسٹ اخبار میں چھپا تھا اور جس کا عنوان یہ تھا کہ ''اسلام بطور ایک ملکی نظام کے ہے'' اسلام میں آزادی مذہب کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''صرف حضرت محمدؐ ہی ایسے بانی مذہب کے تھے جو ایک دنیوی بادشاہ بھی تھے اور سپاہی بھی تھے اور یہ دونوں قوتیں خاص کر اس لیے تھیں کہ تشدد اور الوالعزمی کو روکا جاوے اور الوالعزمی کی جانب وہ مائل تھے اور تلوار ان کے اختیار میں تھی اس لیے خیال ہوتا تھا کہ جب انہوں نے مذہب کو دنیوی حکومت کا وسیلہ قرار دیا اور اپنے معتقدوں کی طبیعتوں پر وہ غلطہ حاصل کیا جس کے سبب سے وہ لوگ شرح اور حق اسی بات کو سمجھتے تھے جو آپ جاری کرنا چاہتے تھے تو چاہیے کہ ان کا مجموعہ احکام شرعی اور تمام مجموعوں سے مختلف ہو بلکہ یہ

خیال ہوتا ہے کہ ان احکام انصاف سے بھی مختلف ہو جو ہر ایک انسان کی طبیعت میں پڑے ہوئے ہیں اب اگر ہم یہ بات دیکھیں کہ آں حضرت کے احکام کا مجموعہ ایسا نہیں ہے کہ آں حضرت کے احکام کا مجموعہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ دیکھیں کہ حضرت محمدؐ نے قومی معاملات میں حق رسانی اور فتح کرنے میں رحم اور حکمرانی کرنے میں اعتدال اور سب سے مقدم دوسرے مذہب کی عدم مزاحمت کے احکام قرار دیے ہیں تو ہم کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ آں حضرت اپنے ہم جنسوں میں ایسی ہی تعظیم کا استحقاق رکھتے ہیں''۔

پھر اسی مصنف نے اسی آرٹیکل میں دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو یہ جبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبرا جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتح مندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتح مند نے ابتدائے دنیا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں''۔

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ''اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتیہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل خلاف ہے'' اسلام کی تاریخ کے ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اس کو وسعت ہوئی دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شاعر لامارٹین نے ان واقعات کا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں بارہ سو برس بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ ''صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں'' اور ایک انگریز سیاح سیلڈن نے مسلمانوں پر طعنہ کیا ہے کہ ''وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں'' اب دیکھو

کہ یہ رائیں بہت سی بے طرف دار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے بس بے سند دعوے کے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے کیسی برخلاف ہیں۔

مضمون کا تیسرا حصہ

تیسرے حصے میں ہم ان فائدوں کا بیان کرتے ہیں جو یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔

مذہب یہود اور عیسائی مذہب کے شامل کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ نے شریعت موسوی کے کسی حکم یا مسئلہ کو تغیر و تبدل نہیں کیا بلکہ حضرت موسیٰ کی شریعت کو بدستور جاری رکھا خود حضرت عیسیٰ کے اس قول سے جو متی کی انجیل باب ۵ ورس ۱۷ میں مندرج ہے کہ ''یہ مت خیال کرو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پوری کرنے آیا ہوں'' ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے پس اس وجہ سے ضرور بالضرور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جو فائدے یہودی مذہب نے مذہب اسلام سے اٹھائے ہیں مذہب عیسوی سے بھی لزوماً وہ فائدے حاصل کیے ہیں۔

مذہب یہود بلا شبہ زبانی مخرج سے پیدا ہوا تھا اس نے اس لازوال مسئلہ یعنی وحدانیت خدا کی تلقین اس حد تک کی جس قدر کہ نجات ابدی کے حاصل کرنے کو ضروری اور اس زمانے کے لوگوں کی سمجھ کے لائق تھی۔ مگر اس وحدانیت کو کاملیت سے اسلام نے شائع کیا جس سے مذہب یہود کا مسئلہ بھی کامل ہو گیا۔

تین چیزوں میں وحدت کے یقین کرنے سے خدا کی وحدانیت پر کامل طور سے

یقین ہوسکتا ہے۔

ا۔ وحدت فی الذات۔

۲۔ وحدت فی الصفات۔

۳۔ وحدت فی العبادت۔

ا۔ وحدت فی الذات کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شخص یا کوئی شے شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہ لاشریک لہ ہے اور نہ کوئی شے اس کے مشابہ ہے نہ آگ نہ پانی نہ ہوا۔

۲۔ وحدت فی الصفات کے یہ معنی ہیں کہ جو صفتیں خدا کی ہیں وہ دوسرے میں نہیں اور نہ دوسرے میں ہوسکتی ہیں۔ اور نہ دوسرے سے متعلق ہوسکتی ہیں۔

۳۔ وحدت فی العبادت کے یہ معنی ہیں کہ نہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا نہ کسی دوسرے کو عبادت کے لائق سمجھنا اور نہ وہ افعال جو خاص خدا کی عبادت کے لیے مخصوص ہوں کسی دوسرے کے لیے بجالانا جیسے سجدہ کرنا، روزہ رکھنا، نماز پڑھنا وغیرہ۔

ان تینوں وحدتوں میں سے پہلی دو وحدتوں کو اور تیسری وحدت کو اوسط طور پر (جو نہ ناقص تھا کیوں کہ نجات کے لیے کافی تھا اور نہ کامل طور پر تھا کیوں کہ وحدت کا پورا کمال اس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ کے لائق نہ تھا) یہودی مذہب نے بیان کیا اور تیسری وحدت کے اخیر حصوں کو جن سے درحقیقت اس وحدت کا کمال ہے مطلق ذکر نہیں کیا۔ اسلام نے پہلی دو وحدتوں کو بھی ''لی کمثلہ شئی'' فرما کر کامل کیا۔ پس نہ آگ جو موسیٰ نے دیکھی خدا کے اور نہ وہ آواز انی انا اللہ کی جو موسیٰ نے سنی خدا تھا اور نہ وہ نیک اور برگزیدہ شخص جس کو یہودی نے صلیب پر چڑھایا خدا ہوسکتا تھا۔ اسلام نے تیسری وحدت کو ایسے کمال پر پہنچایا جس کے سبب ایمان والوں کے دلوں کو ایسے کمال پر پہنچایا جس کے سبب ایمان والوں کے دلوں میں

بجز خدا کے اور کچھ نہیں رہا۔ جس کی تصدیق:

ایاک نعبد و ایاک نستعین

سے ہوتی ہے۔ اسلام میں بھی یہی کمال ہے کہ اسی کمالیت کی وجہ سے خدا نے فرمایا:

الیوم اکملت لکم دینکم واتمت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا

موسیٰ کی پانچویں کتابوں میں نہ قیامت کا ذکر ہے نہ مرنے کے بعد روح کی حالت کا کچھ بیان ہے۔ نیکی کی جزا' دشمن پر فتح پانا' عمر کا بڑھا ہونا' مفلسی سے نجات پانا' بیان ہوا ہے اور گناہ کی سزا' مرنا' قحط پڑنا' وبا کا ہونا' مفلسی کا ہونا اور اسی قسم کی اور مصیبتوں کا آنا۔ موسیٰ کے بعد اور نبیوں اور پیغمبروں اور نبیوں نے ان کا کچھ کچھ ذکر کیا مگر جس تفصیل اور کاملیت سے اسلام کو بتایا جس کے لیے خدا نے گویا عمداً یہ کام رکھ کر چھوڑا تھا کسی نے نہیں کیا تھا۔ مگر جو کہ روحانی حالتوں کو یعنی گنہگاروں کی ارواحوں کی تکلیفوں کا اور نیک آدمیوں کی ارواحوں کی راحت اور خوشی کا بیان کرنا اور تصویر کھینچ دینا بجز اس کے اور کسی طرح ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کو ایسی چیزوں اور حالتوں کے پیرایہ میں تشبیہاً بیان کیا جاوے۔ جن کو انسان اپنی اس زندگی میں اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا حال بہشت و دوزخ کے نام اور خوشی و ایذا و تکلیف اٹھانے کے مختلف طریقوں اور سامانوں سے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں نے نہایت بد اخلاقی کے افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے اگر چہ ہماری دانست میں ان تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی ان تمام تحریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کا ان افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے ہیں۔

اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے ان پر لگائے تھے ان کو فتح مندی سے رفع کیا اور تمام پیغمبروں اور نبیوں اور بہت سے مقدس بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصے پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دکلانے سیکہ انبیاء و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں توریت بڑی غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور انہوں نے دریافت کیا کہ یہ غلطیاں کچھ تو اس سبب سے پڑی ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت کی عبارت اور الفاظ کی غلط طور پر تعبیر کی اور کچھ اس سبب سے وہ غلطیاں ہوئیں کہ خود توریت کے قدیمی نسخوں میں جو کوڈیس کہلاتے تھے اور قلمی تھے متعدد وجوہ سے غلطیاں تھیں اور پھر جن لوگوں نے مقابلہ کر کے ان کو صحیح کیا ان کی تصحیح بھی غلطیوں سے خالی نہ تھی اور سب سے بڑا سبب ان غلطیوں کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو انسانوں نے لکھے تھے اور جن میں بلا شک بہت سی غلطیاں ہیں ان کو بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے مقدس تحریر سمجھا تھا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی ابراہیم اور حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں بیویوں اور بیٹوں اور ہارون اور داؤد و سلیمان کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی کہ ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے تمام دنیا کی نظروں میں ویسے ہی حقیر ہوتے جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا ان کے گناہوں کی سزا کے لیے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے۔

مضمون کا چوتھا حصہ

چوتھے حصے میں ہم ان فائدوں کو بیان کرتے ہیں جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں۔

دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب اسلام مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں جس قدر کہ عیسائی مذہب کو پہنچائے ہیں۔ مذہب عیسائی کی بنیاد اس نیک اور حلیم شخص سے ہے (یعنی حضرت یحییٰ پیغمبر سے) جو خدا کا راستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اس عجیب شخص پر ہے جس کو انہوں نے اتنا بزرگ و مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادے اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدمی سے عیسائی مذہب کا طرف دار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا لحاظ کیا کہ ''جان دی باپٹسٹ'' یعنی حضرت یحییٰ بلا شبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ و روح اللہ تھے پس کون سا مذہب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کے حق میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو اس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا۔ جو جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی ہیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال نعمت کا باعث ہے کہ اسی نے خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اس خالص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت عیسیٰ نے کی تھی۔ اسلام ہمیشہ اس زمانے

کے عیسائیوں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرتا تھا اور اب بھی کرتا رہتا ہے اسلام نے عیسائیوں سے اسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً

بہت سے عیسائیوں کی اسلام کی روشنی سے آنکھیں کھل گئیں اور اس کی ذلیل حالت سے خبردار ہوئے جس میں وہ مبتلا تھے اور انہوں نے پھر اسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے ان کو حاصل تھا۔ یعنی انہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدہ کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لاشریک لہ اور عیسیٰ کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چناں چہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب ''یونیٹیرین'' یعنی موحدین عیسائی سے معزز ہے

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لیے دنیا میں سے اٹھا لیا جاوے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جاوے گی کہ ''اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال ویٹیکن یعنی پوپ کے محل میں آجاویں تو غالباً وہ اس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسی پراسرار سومات کے ساتھ اس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔ اکسفور یا جنیوا میں جا کر ان کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جا کر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے ان کی تحریرات اور ان کے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے۔ اس میں غور کرنا پڑے گا۔

جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے ہیں اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں

میں ایک بزرگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا بااختیار نائب سمجھتے تھے اور اس کو معصوم جانتے تھے جیسے اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ ان کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ کرتا ہے پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت پوپ بہ لحاظ ان اختیارات کے جو اس کو حاسل تھے اور جن اختیاروں کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا تھا اور جو برائیاں اس سے پیدا ہوتی تھیں ان کو بتلایا اور ان کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لیے سچ کی جستجو کریں۔ چنانچہ خدا نے قرآن مجید میں فرمایا:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ (آل عمران آیت ۵۷)

”اے کتاب والو یعنی عیسائیو آؤ ایک بات کم ہم میں اور تم میں یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کو نہ پوجیں اور نہ ہم کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک کریں‘ (یعنی پوپوں اور بڑے بڑے پادریوں کو) پروردگار خدا کے سوا“۔

اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ:

اتخذوا احبارھم و رھبانھم ارباباً من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الھا واحدا لا الا ھو سبحانہ عما یشرکون. (سورة

توبہ آیت ۳۱)

''عیسائیوں نے اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنا لیا خدا کے سوا اور مسیح ابن مریم کو بھی اوران کوسوائے اس کے اور کچھ حکم نہیں دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کی عبادت کریں کہ صرف وہی خدا ہے اور نہ اور کوئی ۔ خدا پاک ہے اس چیز سے کہ شریک کرتے ہیں''۔

ا۔ جارج سیل نے قرآن کے ترجمہ (جلد ا صفحہ ۲۳) میں لکھا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بت پرستی اور دیگر الزاموں کے سوا حضرت محمدؐ نے یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے قیسوں اور رھبانوں کی حد سے زیادہ اطاعت کرتے ہیں جنھوں نے اس بات کا قرار دینا کہ کون سی چیز حلال ہے اور کون سی حرام اور خدا کے احکام کی تعمیل کوملتوی کر دینا اپنے اختیار میں لیا ہے۔(سید احمد)

روی عن عدی بن حاتم رضی الله عنه قال اتبت رسول الله صلعم وفی عنقی صلیب من ذهب فقال لی یا عدی اطرح هذا الوثن من عنقک فطرحته فلما انتهیت الیه وهو یقراء اتخذوا احبارهم و رهبانهم ارباباً من دون الله حتی فرغ منها قال فقلت له انا لسنا نعبد هم قال الیس یحرمون ما احل الله فتحرموته ویحلون ما حرم الله فتستحلونه قال فقلت بلی فتلک عبادتهم (معالم التنزیل)

''جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم اس وقت عیسائی

تھے آں حضرت صلعم کے پاس آئے اور ان کے گلے میں سونے کی
صلیب پڑی ہوئی تھی آں حضرت نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو
اپنے گلے سے نکال پھینک چناں چہ انہوں نے نکال ڈالی جب وہ
پاس آئے تو حضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے کہ عیسائیوں نے
اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنالیا ہے خدا کے سوا جب
آں حضرت پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو ان کی پرستش نہیں
کرتے آپ نے فرمایا کہ کیا یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اس
چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر اس کو حرام سمجھتے ہو عدی نے کہا ہاں یہ تو
ہے آں حضرت نے فرمایا کہ بس یہ یہی ان کا پوجنا ہے"۔

ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کیے اور اس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑے بہت غور سے اس کو دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدر کے دل پر اس کا کچھ اثر ہوا جب کہ ان دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جس میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرا خدا یا جھوٹا خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلے نے ان کے دل پر اثر کیا اور جیسے کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام مذہب مبتلا تھے' نکل آئے اور صاف صاف اس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے۔

جس کی بدولت ہم لاکھوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام مذہب عیسائی کو یہ نعمت نہ بخشتا' تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم مورت

صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

جو کہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لیے اس کے مخالف علانیہ اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا تاہم اس نے اپنی کوششوں

ا۔ جینی یوارڈ نے یورپ کی طرف سے جرمنی کے رفارمروں کے اور خصوصاً لوتھر مقدس کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے کہ مذہب اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چناں چہ دونوں کو جو میل بت پرستی کے برخلاف ہے اس پر غور کرو۔ مارٹینس الفانس اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۸)

کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا۔ جو عموماً مذہب پروٹسٹنٹ یا فاریمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلاموں کی بدترین غلامی سے (جو ایک مرشدانہ غلامی تھی) آزاد کردیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

والڈس کہتا ہے کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رمق بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ نے بھی انہی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔ انہوں نے (یعنی حضرت محمدؐ نے) روزوں کا وقت تبدیل کر دیا تھا اور یہ لوگ (یعنی پیروان لوتھر) تمام روزوں سے نفرت کرتے ہیں (ایک شخص نے اس کی تائید میں کہا تھا کہ قرآن میں بھی روزوں کی چنداں تاکید نہیں ہے بلکہ بہ عوض روزہ کے غریبوں کو کھانا کھلا دینا لکھا ہے۔ اس کی پیروی سے لوتھر نے روزوں سے نفرت کی تھی۔ بس لوتھر کا مذہب اور ااسلام کا مسئلہ درحقیقت ایک ہی تھا) انہوں نے اتوار کی جگہ جمعہ کو سبت قرار دیا اور یہ کسی تہوار کو نہیں مانتے (اسی شخص نے اس کی تائید میں کہا کہ اسلام میں درحقیقت سبت کا کوئی دن نہیں ٹھہرایا گیا وہ جمعہ کو بھی سب کام کرتے ہیں پس اس کی پیروی لوتھر نے کی تھی) انہوں نے ولیوں کی پرستش کو رد کیا۔ اور لوتھر کے فرقہ کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلعم کسی کو اصطباغ نہیں دیتے تھے اور کالون بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتا تھا ان دونوں نے طلاق کو جائز رکھا ہے وعلی ہذا القیاس (انتخاب از کوراٹرلی ریویو نمبر ۲۵۴) (سید احمد)

تلقین کیا تھا لوگوں میں پھیلاتے اور آخر نبی آخر الزمان پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا۔ پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے''۔

☆☆☆

(۵) مسلمانوں کی دینی اور مذہبی کتابیں

یعنی کتاب احادیث۔ کتاب سیر۔ کتاب تفاسیر اور کتاب فقہ

’’حسبنا کتاب اللہ‘‘

جس زمانہ سے کہ خدائے مجید کی توحید کے سب سے برے مجدد نے لا الہ الا اللہ کا وعظ فرمایا اس زمانہ سے تمام مسلمان خدائے پاک بیچون و بےنمون پر دلی مضبوطی اور غیر متزلزل اعتقاد اور ایمان رکھنے میں ہمیشہ اور ہر جگہ ممتاز اور سرفراز رہے ہیں اور دینی امور کی طرف سے بھی بہت بڑی توجہ کی ہے مگر جب تک کہ خلفائے بنی عباس کی خلافت کو جو بنی امیہ کے بعد ہوئی تھی۔ پوری مضبوطی نہ ہولی اس وقت تک مسلمانوں میں دنیاوی علوم وفنون کا رواج جیسا کہ چاہیے ویسا نہ ہوا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان میں خلفائے عباسیہ کی سرپرستی سے مسلمانوں میں ہر قسم کے علم وفنون کا چرچا ہوا۔ ان کے سینہ میں علم کی محبت بھی قرآن مجید کی ترویج کے شوق کی ہم سری کرنے لگی۔ عرب لوگوں کے چال چلن میں بلاشبہ

ایک عجیب وغریب وصف ہے کہ ہر قسم کے علم کی دولت کو بھا اسی آسانی سے لوٹ لیا۔ جس طرح کہ انہوں نے مشرق میں بے مثل فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان کے قلم کی فتوحات بھی ان کی تلوار کی فتوحات کی مانند معروف ومشہور لیکن ان سے بھی زیادہ دیرپا ہوئیں۔ پرانی دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی موجودہ شائستگی اور روشن دماغی میں مسلمانوں کا مرہون منت ہے۔ کیوں کہ یورپ کی مغربی حدود کے مرکز سے علم کی وہ شعائیں نمودار ہوئیں جنھوں نے خدا تعالیٰ کی کروڑ ہا مخلوق کے دلوں کو منور کیا دیا۔

ایک غیر متعصب عیسائی کا قول ہے کہ ''اگر زیادہ تصریح سے بیان نہ کیا جاوے تو بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان نویں صدی سے تیرھویں صدی تک جاہل یورپ کے روشن دماغ معلم بنے رہے۔ عربی علم حکمت، علم طب، تاریخ طبعی، جغرافیہ، تواریخ عام، صرف ونحو، بلاغت اور دل آویز فن شاعری میں بہ کثرت تصنیفیں عمل میں آئی ہیں اور اکثر ان میں سے تا قیام سلسلہ بنی آدم جاری رہیں گی اور اپنے مفید مطالب سے ان کو فیض بخشیں گی''۔

مگر حال کے زمانے کے نکتہ چینوں کو اگلے زمانے کے علمائے دین کی تصانیف کے عیب و ہنر جانچنے کے وقت ان تصانیف کے اصلی حالات پر خیال نہیں رہتا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان مصنفوں نے وہ تصنیفیں اس زمانے میں کی تھیں جب کہ ''علم تحقیق'' کے مسلم قواعد کا عرب مُں وجود بھی نہ تھا۔ اسی وجہ سے جس طرح کہ ان مصنفوں کے خیالات کی بلند پروازی اور ان کے استعارات کی وسعت کی کچھ روک ٹوک نہ تھی اسی طرح قواعد ترتیب اور خوش اسلوبی سے اتفاقیہ انحراف کی بھی کوئی چیز ان کی مانع اور مزاہم نہ تھی۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی مصنف کے عیب و ہنر کی نسبت کوئی رائے قائم نہیں ہو سکتی اور نہ کسی شخص کو اس کے منشا کا ٹھیک علم ہو سکتا ہے بجز ان کے جن کو مصنف کے زمانے کے قواعد انشا پردازی اور خیالات کے ڈھنگ سے یا ان امور سے جو کسی نہ کسی طرح اس مضمون

سے جس سے وہ کتاب تصنیف ہوئی ہے علاقہ رکھتے ہیں پوری واقفیت اور کامل مہارت حاصل ہو۔ اسی عدم مہارت اور عدم واقفیت کا سبب ہے کہ غیر ملک کے محققین نے جب ہمارے مذہب کی خوبیوں پر کوئی رائے قائم کرنے کا حوصلہ کیا ہے تو اس میں فاش فاش غلطیاں کی ہیں۔

اس کے علاوہ اور بھی امور ایسے ہیں جو کسی مصنف کی صحیح صحیح لیاقت کا اندازہ کرتے وقت دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی مصنف کی دو تصنیفوں میں سے ایک تو بڑا اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اور دوسری محض بے حقیقت ہوتی ہے اور اس کا سبب دونوں تصنیفوں کے موضوع کا مختلف ہونا ہوتا ہے۔ محمد اسماعیل بخاری مسلمانوں میں بہت بڑا عالم اور مقدس مصنف ہے۔ ایک کتاب اس کی صحیح بخاری ہے جو بہ لحاظ اس حیثیت سے جس حیثیت سے کہ وہ تصنیف ہوئی ہے نہایت معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے گو کہ دوسری حیثیت سے وہ ویسی نہ ہو۔ دوسری کتاب اس کی تاریخ بخاری ہے جو کچھ بھی قدر کے لائق نہیں ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان دونوں کتابوں کی تصنیف کا موضوع مختلف ہے۔ اسی طرح نام کی مشابہت بھی دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب اسی شخص کی ہے جو ایک مشہور مصنف ہے حالانکہ وہ اس کی تصنیف نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہم نام دوسرے شخص کی تصنیف ہوتی ہے۔ کبھی اس طرح پر دھوکا پڑ جاتا ہے۔ کہ ایک کتاب میں اس کے مصنف نے کسی مشہور شخص کی روایتیں کثرت سے نقل کیں لوگوں نے سمجھا کہ وہی مشہور شخص اس کا مصنف ہے اور اس خیال سے اس کتاب کو اس مشہور شخص کی طرف منسوب کیا اور مستند قرار دے گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی ایسی قدر ہو گئی جس کی وہ ہرگز مستحق نہ تھی جیسے کہ تفسیر ابن عباس کا حال ہے۔

یہ باتیں تو صرف تمہید کی تھیں جن کو ہم لکھ چکے اب ہم اس طرح متوجہ ہوتے ہیں کہ

کتب مذہبی تصنیف کے فن کا نرالا ڈھنگ جو مسلمانوں نے اختیار کیا تھا سب لوگوں کے ذہن نشین ہو جاوے اور اس مقصد کے لیے مصنفین نے جو مختلف طریقے دینیات کے متعدد شعبوں مثل حدیث، سیر، تفسیر، فقہ کی کتابوں کی تصنفی میں اختیار کیے ہیں ان کو بیان کریں۔ اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ ہمارے مذہب کے آئندہ نکتہ چینوں کی ہدایت کے لیے ایک سیدھا راستہ بن جاوے کیوں کہ اکثر لوگوں نے جو ہماری دینیات کی کتابوں کے حالات سے ناواقف تھے ہماری کتب دینیات کو دیکھ کر نہایت ناسزا اور درشت کلمات کہے تھے۔ اور ان کے بعد جو لوگ گزرے ہیں انھوں نے بھی بارہا اندھوں کی طرح ان کی تقلید کی ہے۔

اول۔ کتب حدیث

جناب پیغمبر خدا اور صحابہ کرام اور نیز تابعین کے زمانہ میں حدیثوں کے قلم بند نہ ہونے کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ اس زمانے میں لوگوں کو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر ٹھیک اور اصلی وجہ بیان کی جاوے تو یہ تھی کہ حدیثوں کے لکھنے اور جمع کرنے کے اکثر صحابہ کرام شدید مخالف تھے اور ہمارے نزدیک انہیں صحابہ کرام کی رائے صحیح اور بہت درست تھی۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے میں فن تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا اس وقت میں ایسی باتون کے لیے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا۔ ان اسباب کے ثبوت سے نبوت کے دو برس تک اور ہجرت سے دو سو برس قریب تک حدیثوں کا قلم بند ہونا عمل میں نہیں آیا تھا۔ جب حدیثوں کا لکھنا شروع ہوا تو اس وقت یہ مشکل پیش آئی کہ مختلف سببوں سے احادیث موضوعہ جو صحیح حدیثوں میں مخلوط ہوگئی تھیں۔ اس قدر زمانہ کے بعد صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے تمیز کرنا ایک امر اہم معلوم ہوا۔ مگر باایں ہمہ بہت سے

شخصوں نے جن کی استعداد اور علم کے اعلیٰ درجے میں کسی کو کلام نہ تھا صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے علیحدہ کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھایا اور اپنے کام میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی۔

ان علماء نے جو محدثین کہلاتے ہیں۔ حدیثوں کے اعتبار کا اندازہ کرنے کو چند قواعد قرار دیے جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اول: حدیث کے ہر ایک راوی کو جملہ راویوں کے نام جن کے ذریعے سے اس کو حدیث پہنچی ہو سلسلہ وار پیغمبر خدا تک یا جہاں تک وہ جانتا ہو بتلا دینا قرار دیا۔

دوم: یہ امر ضروری قرار دیا کہ خود راوی اور نیز وہ سب لوگ جن کے ذریعے سے سلسلہ وار وہ حدیث اس تک پہنچی ہو راست گو اور معتبر ہوں۔ اگر اس سلسلہ راویوں میں سے ایک راوی بھی ایسا نہ خیال کیا جاتا تو وہ حدیث معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ سلسلہ حدیث سے خارج کر دی جاتی تھی۔

سوم: حدیثوں کے لکھنے کے وقت اس بات کو لازمی کیا تھا کہ جملہ راویوں کے نام جن تک اس حدیث کا سلسلہ پہنچتا ہے حدیث کے ساتھ لکھ دیے جاویں تاکہ اگر ان راویوں کے عام چال چلن کی بابت اور لوگوں کو کسی قسم کی آگاہی ہو تو اس سے مطلع کر دیں اور یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ وہ راوی کس درجہ تک اعتبار کے لائق ہیں۔

چہارم: مذکورہ بالا قواعد کے سوا بعض محدثین نے اپنی تصنیفات میں حدیثوں کے درجہ اعتبار کے قلم بند کرنے کی رسم اختیار کی تھی۔

جملہ حدیثیں مختلف اوقات میں ان اصولوں پر لکھی گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ کتب احادیث کی اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ اگر سب کی سب ایک جگہ جمع کی جاویں تو ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے کو اونٹوں کی ضرورت ہو۔ ان بے شمار کتب احادیث میں

سے کتب مندرجہ ذیل یہ مقابلہ اوروں کے زیادہ مستند ہیں۔

(۱) صحیح بخاری۔(۲) صحیح مسلم (۳) ترمذی (۴) ابوداؤد۔(۵) نسائی۔(۶) ابن ماجہ۔(۷) موطا امام مالک۔

ا۔ محمد اسماعیل بخاری ۱۹۴ ہجری مطابق ۸۱۰ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ ھجری مطابق ۸۷۰ عیسوی میں انتقال فرمایا۔

مسلم ۲۰۴ ہجری مطابق ۸۱۹ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ ہجری مطابق ۸۷۵ عیسوی میں انتقال فرمایا۔

ابوعیسیٰ محمد ترمذی ۲۰۹ ہجری مطابق ۸۲۴ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ ہجری مطابق ۸۹۲ عیسوی میں انتقال فرمایا۔

ابوداؤد ۲۰۲ ہجری مطابق ۸۱۷ عیسوی میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ ہجری مطابق ۸۸۸ عیسوی میں انتقال فرمایا۔

ابوعبدالرحمان احمد نسائی ۳۰۳ ہجری مطابق ۹۱۵ ھ میں انتقال فرمایا۔

ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ نے ۳۹۳ ھ مطابق ۵۰۶ ء میں انتقال فرمایا۔

امام مالک ۹۵ ہجری مطابق ۷۱۳ ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ ہجری مطابق ۷۹۵ عیسوی میں انتقال فرمایا۔(سید احمد)۔

ابوعبدالرحمان نے احمد نسائی سے پوچھا کہ تیری کتاب کی سب حدیثیں صحیح ہیں۔تو اسنے انکار کیا صراط المستقیم میں لکھا ہے کہ ''از وے پرسید نہ کہ کتاب سنن تو ہمہ صحیح ماست گفت لا''۔

ان کتب احادیث کی اور کتابوں پر ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ ان مین وہی حدیثیں منقول ہیں جو حتی الامکان صرف معتبر اشخاص سے مروی ہوئی ہیں اور کتب احادیث میں یہ قید نہیں ہے مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح کتب مذکورہ بالا میں بعض مشتبہ یا موضوع حدیثوں کے ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے اسی طرح اور کتب حدیث میں بعض احادیث صحیح کا ہونا بھی ممکن ہے۔

مگر پہلی قسم کی کتابوں کے استثناء کی نسبت یہ درجہ اشتباہ کا ایسا ضعیف ہے کہ علماء کو ان پر اعتقاد کامل رکھنے سے (بہ شرط یہ کہ وہ اعتقاد صرف مذہبی بنا پر نہ ہو) تاوقتیکہ ان کی تکذیب میں کوئی صریح دلیل نہ پیش ہو باز نہیں رکھتا مگر دوسی قسم کی کتابوں کی نسبت یہ اعتقاد نہیں ہے۔ جو حدیثیں کہ ان میں منقول ہیں وہ جبھی قابل اعتبار خیال کی جاتی ہیں کہ ان کی صحت کے لیے کوئی شہادت موجود ہو یا ان کے نامعتبر ہونے کے لیے کوئی دلیل نہ ہو۔

جس زمانے میں یہ کتب حدیث زبانی روایتوں سے لکھی گئی تھیں راویوں نے اس بات کا التزام نہیں کیا کہ (اور یقیناً ویسا کرنا بھی ناممکن تھا) کہ وہی الفاظ بجنسہ جو پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلے تھے بیان کریں بلکہ اپنے الفاظ میں پیغمبر خدا کا مدعا ادا کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کوشش کسی حدیث کے مخصوص الفاظ کے معنی معین کرنے سے بعض احکام یا واقعات کے قائم کرنے میں کی جاوے اس میں بڑی احتیاط چاہیے کیوں کہ ہم کو اطمینان کامل نہیں ہے کہ درحقیقت جناب پیغمبر خدا نے انہیں الفاظ کو استعمال کیا تھا۔

بہت سی حدیثیں ایک ہی باب میں ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ پس ان میں سے ایک کو صحیح مان لینا اور باقیوں کو غلط بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کے حل کرنے کو عالموں نے چند قواعد وضع کیے ہیں اور ان کا نام اصول علم حدیث رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ا

ن میں سے کسی خاص حالت میں اس مدعا کے انجام دینے کے لیے وضع کیے گئے ہیں قاصر ہوں۔

تمام بے ہودہ قسم کی حدیثیں مشتبہ خیال کی گئی ہیں اور ایسی حدیثیں جو مطالب قرآن مجید سے متناقض ہیں غلط قرار دینے کے لائق ہیں۔ جس طرح کہ حضرت عائشہ نے حدیث ''سماع موتے'' کی نسبت کیا تھا۔ کیوں کہ وہ حدیث قرآن مجید کے اس بیان کے بالکل مخالف تھی:

وما انت یمسمع من فی القبور

حضرت عائشہ کے اس قول سے ہر ایک مسلمان واقف ہے۔

ایسے لوگ جو بہ کثرت حدیثیں بیان کرتے تھے صرف ان کے کثیر الروایت ہونے کی وجہ سے ان کی روایتوں کی صحت میں کلام ہوتا تھا۔ اور کسی شخص کی روایت کی ہوئی کوئی حدیث غلط ثابت ہو جاتی تھی۔ تو اس کی اور تمام روایتوں کے مشتبہ ہونے کے لیے کافی ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے راویوں کے باب میں بہت سی کتابیں اسماء رجال کی مرتب ہوئیں تاکہ معتبر اور غیر معتبر راویوں کا حال معلوم ہو جاوے۔ مجد الدین فیروز آبادی نے جو ایک مشہور محدث اور بہت بڑا عالم ہے اپنی کتاب مسمی بہ ''سفر السعادت'' میں ترانوے مضمون شمار کیے ہیں اور بیان کیا ہے کہ تمام حدیثیں جو ان مضمونوں میں سے کسی مضمون کے باب میں ہوں سب غیر معتبر ہیں۔ علاوہ اس کے اور بہت سے ذی لیاقت محدثین نے احادیث موضوعہ پر بحث کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔

پس ان لوگوں کو جو ہمارے دین کے اصول پر رائے دینا یا ہمارے علماء نے جو واقعات سیر ان کتابوں میں لکھے ہیں ان پر یا ہمارے دین کے مختلف مسائل پر بحث کرنا چاہیں تو ان کو اپنی رائے اور خیال کی تائید میں صرف ان حدیثوں سے حوالہ دینے پر اکتفا

کرنا نہیں چاہیے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ بلکہ مثل ایک محقق کے سب سے پہلے اس ذریعہ کے صدق وصحت کی تحقیق کرنی چاہیے جہاں سے وہ حدیثیں پہنچی ہوں۔

ان ضروری اصولوں کی فراموشی یا ناواقفیت کی وجہ سے غیر ملک کے بعضے مصنفوں سے (شاید نادانستہ) جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری یا تاریخ لکھتے وقت بڑی ناانصافی کا جرم سرزد ہوا ہے علی الخصوص اس وقت جب کہ باقاعدہ اور غیر متعصّبانہ تحقیق کی جائز دلیلوں کے عوض انہوں نے اپنی نالائقی سے ٹھیک تضحیک اور ہجو اختیار کی ہے۔

دوم۔ کتب سیر

مصنفین کتب احادیث نے تو یہ خیال کیا تھا کہ جس مضمون پر وہ کتابیں لکھتے ہیں اور حدیثیں جمع کرتے ہیں ان کو مذہب سے تعلق ہے۔ اور مذہبی مسائل کی بنا برقرار پاویں گی اور ان کی بنیاد پر بے انتہا مسائل اور جدید عقائد اور مناظرت مذہبی پیدا ہوں گ۔ اگر ان میں احتیاط نہ کی جاوے تو مذہب اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ اسی خیال سے انہوں نے راویوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر نہایت کوشش کی اور جس کو معتبر سمجھا اس کی روایت لکھی مگر اہل سیر نے سیر کی کتابیں تصنیف کرتے وقت اس کا کچھ خیال نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کو اس قسم کا مطلق اندیشہ تھا نہ تھا اور کبھی ان کو یہ خیال نہیں تھا۔ کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں کسی عقیدہ یا مذہبہ مسئلہ کی بنیاد قرار پاویں گی اور مذہبی اختلافات اور بدعات کا مادہ ہوں گی۔ اس لیے انہوں نے مثل اہل حدیث کے ان مضامین کی صحت پر جو انہوں نے اس میں لکھے اور ان راویوں کے اعتبار پر جن سے وہ حالات ان کو پہنچے بہت ہی کم التفات کیا۔ ان کی تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں۔ جس کسی نے جو قصہ ان سے بیان کیا انہوں نے

نہایت اشتیاق سے اس کو سنا اور اس قصہ کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کی نسبت ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اس کو اپنی کتاب میں لکھ دیا۔

ان مصنفوں کی غرض نہ تو کسی قصہ کی تصدیق تھی اور نہ کسی روایت کی تصدیق کی تحقیق۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقع کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں اروان قصوں کی صحت یا لغویت کی چھان بین پڑھنے والے کی فشاں تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں۔ یہ رسم بہت جلد عام ہو گئی۔ اول اول تو راویوں کے نام لکھے گئے اور پھر رفتہ رفتہ راویوں کے نام لکھنے کو بھی متروک کر دیا۔ ان کتابوں میں اکثر ایسی روایتیں بھی مندرج ہیں جن کے راوی مصنف کے زمانے سے بہت پہلے گزر چکے تھے اور کچھ پتا نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف نے کس طرح پر اس روایت کو اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ ان کتابوں میں اکثر انبیائے سابقین کے قصے بھی مندرج ہیں اور وہ وہ قصے ہیں جو ایک زمانے میں یہودیوں میں مشہور اور زبان زد تھے اور جن کی اصلیت بالکل محض تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور ان کا رتبہ دیو پری کے قصوں سے کچھ زیادہ نہ تھا اسلیے مسلمانوں کے جملہ علوم میں سے وہ علم جو سب سے زیادہ غور اور تحقیق کا محتاج ہے وہ علم سیر ہے اور جس پر تمام علماء کو نہایت عمیق توجہ کرنی لازم ہے۔

پس ان کتابوں کو صرف یہ امر کہ وہ مشہور اور معروف علمائے سابقین کی تصنیفات سے ہیں اعتبار کا مستحق نہیں کرتا ہے۔ مذہب اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کو ان کے اعتبار کو بہ لحاظ اس اصول کے جس پر خود ان کے مصنفوں نے ان کو تصنیف کیا ہے ساقط سمجھنا چاہیے اور جب تک کہ ان کتابوں کی مندرجہ روایات کی صحت فی نفسہ نہ ثابت ہو لے اور اصول تحقیقات سے ان پر طمانیت نہ ہو لے۔ ان روایتوں کا ان کتابوں میں مندرج ہونا اعتبار کے لیے کافی نہیں ہے۔

ان وجوہ سے تاریخ محمد اسماعیل بخاری، تاریخ محمد جریر طبری، سیرت ابن سعد کاتب الواقدی۔ اور دیگر علمائے متبحر کی مشہور ومعروف تحریریں جیسے مدارج النبوت قصص الانبیاء، معراج نامہ، شہادت نامہ، مولد نامہ وغیرہ اور اسی قسم کی کتابیں سب کی سب یکساں حالت میں ہیں۔

ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر کے ان حالات کو منتخب کرنے میں یورپین مصنفوں نے اس قدر متحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے۔ جو اس مضمون کی عظمت کے شایان ہے بلکہ برخلاف اس کے ازراہ تعصب اور بغض انہوں نے دیدہ ودانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے جس کی شعاعیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور اس طرح پر انہوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ ''کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ جو ارادتاً نہیں دیکھتے''۔

سوم۔ کتب تفسیر

اکثر لئیق شخصوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ بعض نے اس کی بلاغت اور فصاحت آمیز کلام اور خوبصورت اور بے نظیر بیان کی تفسیر کی ہے۔ بعض نے اس کے پڑھنے کا خاص طریقہ مع قرات اور لہجہ کے بتلایا ہے۔ بعضوں نے صرف آیات احکام کی جو قرآن مجید میں تفسیر کی ہے۔ بعض نے اپنا وقت اور اپنی محنت آیات کے شان نزول دریافت کرنے میں صرف کی ہے۔ بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لیے دلچسپ اور عجیب وغریب اور حمقا کے خوش کرنے کے لے دلچسپ اور عجیب وغریب اور حمقا کے خوش کرنے کے لیے دور از عقل وقیاس مضامین جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے جمع کر دیے ہیں۔ بعضوں نے

ایسی تفسیریں لکھی ہیں جو ان تمام مضامین پر حاوی ہیں۔

ان مفسرین نے اپنی تفسیریں لکھنے میں کتاب سیر اور احادیث کی طرف رجوع کیا ہے جن کا بیان ہم ابھی کر چکے ہیں۔ یہ بات نہایت افسوس کے قابل ہے کہ یہ مفسرین ان کے شمار جھوٹی روایتوں اور مصنوعی قصوں کو جن کا موجود ہونا ان کتابوں میں ابھی بیان ہو چکا ہے کام میں لائے۔ بلکہ ایسی روایتیں اور حدیثیں بھی انہوں نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیں جو صرف انہی تفسیروں میں پائی جاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں بھی جو بعض حیثیات سے درجہ اعتبار کا رکھتی ہیں اور جو صحاح ستہ یا صحاح سبعہ کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے نام ہم لکھ آئے ہیں قرآن مجید کی تفسیر کے لیے خاص ابواب مخصوص ہیں جو کتاب التفسیر کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ اگر ان کتابوں کے مضامین کو جو قرآن مجید کی تفسیر کے متعلق ہیں ایک جگہ جمع کیا جاوے تو معدودے چند صفحوں سے زیادہ نہ ہوں گے مگر مفسرین نے نہایت موٹی موٹی جلدیں ایسی بے ہودہ اور نامعتبر روایتوں سے بھر لی ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ایسی تفسیریں اور علی الخصوص وہ جو واعظین کے فائدے کے لیے لکھی گئی ہیں اور جن میں خیالی بے ہودہ قصے انبیاء علیہم السلام کے بھرے ہوئے ہیں اور ملائک اور بہشت اور دوزخ اور ان کے اوصاف وخواص ہیں اور ملائک اور بہشت اور دوزخ اور ان کے اوصاف وخواص بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کتب سیر سے خلاف قیاس بیانات کو پیش کرتے ہیں سراسر غیر معتبر روایات سے مملو ہیں اور وہ روایتیں صرف یہودیوں کے ہاں جاری تھیں مگر خود مذہب یہود میں ان کے معتبر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان تفسیروں میں اکثر ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جو علمائے دین کی طرف منسوب کی گئی ہیں مگر اس امر کا تحقیق کرنا کہ وہ روایتیں درحقیقت ان عالموں کی روایتیں ہیں ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ اس بات کا

دریافت کرنا کہ وہ روایتیں ان مفسرین تک کیوں کر پہنچیں۔

ان تفسیروں کے دو حصے جن میں قرآن شریف کی بلاغت اور فصاحت اور اس کے طرز بیان کی خوب صورتی اور ان کی قرات کے خاص لہجوں کا بیان ہے بلاشبہ نہایت عمدہ اور قابل قدر کے ہیں مگر ان حصوں کے سوا تمام روایتیں اور قصے جو ان تفسیروں میں شامل ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کیوں کہ وہ مثل سچے اور جھوٹے موتیوں کے باہم مخلوط ہیں اور یہ کام خریدار کا ہے کہ اس میں سچے موتیوں کو منتخب کر لے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بدوں مناسب چھان بین اور کافی تحقیقات کے کسی ایسی تفسیر کے قصوں کا حوالہ دے کر ہمارے پاک مذہب پر خورہ گیری اور عیب چینی کی بنیاد قائم کرتا ہے جیسے کہ اکثر یورپ کے مصنفوں نے کیا ہے وہ نہایت غلطی اور دھوکا میں پڑتا ہے۔

غرض یہ کہ یہ تینوں قسم کی کتابیں جن کا اوپر ذکر ہوا مذہبی امور پر لکھنے والے اور بحث کرنے والے کے لیے نہایت بیش بہا اور نہایت بے قدر مادہ کو آن واحد میں جمع کرتی ہیں علمائے محققین اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کیے ہیں جن کے وسیلہ سے وہ اس مخلوط مادہ سے معتد بہ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یورپ کے مصنفین اس سے محروم ہیں۔

اکثر عالم ایسے گزرے ہیں جو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں اپنی نیک دلی سے نہایت سچا اور مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو اپنی قدرت کامہ سے ہر ایک امر کرنے کا پورا اختیار ہے گو وہ کام عقل اور قوانین فطرت کی رو سے کیسے ہی متناقض کیوں نہ ہوں۔ اس مسئلہ کا ان کو ایسا دلی اعتقاد ہے کہ جو کوشش ان کے اس اعتقاد کے سست اور متزلزل کرنے میں کی جاوے یقیناً ناکام ہوگی۔ وہ ہر حجت اور دلیل کے سننے سے یا اس پر ذرا بھی غور کرنے سے جو ان کے دل نشین عقیدہ کے مخالف ہو ضد سے انکار کیے جاویں گے۔ ایسے سادہ مزاج اور صاف باطن آدمیوں کو بہشتی آدمیوں کا لقب دیا گیا ہے:

كما قيل اهل الجنة بله

ان مقدس اور بزرگوار لوگوں نے اپنی تصنیفات میں یہ اختیار کیا رکھا ہے کہ بلا کسی تمیز کے جملہ روایتوں کو معتبر خیال کرتے ہیں اور ہر واقع کو جو اس میں مندرج ہے۔ صحیح سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی روایت مختلف صورتوں میں ان کے پاس پہنچے یا ایک ہی واقعہ کی نسبت متعدد روایتیں جو آپس میں متناقض ہوں ان تک پہنچیں تو وہ ان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ واقعہ متعدد دفعہ اور متعدد صورتوں میں واقع ہوگا جن کا الگ الگ بیان ہر ایک روایت میں ہے۔

پس ایسے لوگوں کی تصنیفات جنھوں نے اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس مضمون کو نہیں لکھا ہے بلکہ اندھادھندی سے مذہبی جوش و حرارت کی بنا پر لکھ ڈالا ہے غیر ملک کے ان علماء کی نکتہ چینی کے قابل نہیں ہے جو اپنے دلائل کو ان کتابوں کی روایات مندرجہ پر مبنی کر کے ان سے ایسے نتائج مستنبط کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مذہب اسلام کے حق میں مضر ہوں۔

اقسام مذکورہ بالا کے سوا ایک اور قسم کی کتابیں بھی ہیں جو شخص ان لوگوں کے لیے لکھی گئی تھیں جو مذہب اسلام پر بغیر کسی وسوسہ کے قوی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں اس غرض سے لکھی گئی ہیں کہ ان لوگوں کا مذہبی اعتقاد زیادہ ہو اور ان کی حرارت مذہبی زیادہ مشتعل ہو جاوے جیسی کتاب شفاء قاضی عیاض ہے جس کی سند پر ہم اسی کتاب سے عبارت پیش کرتے ہیں:

قال القاضی ابو الفضل حسب التعامل ان یحقق ان کتابنا ھذالم نجمعہ لمنکر نبوۃ نبینا ولا لطاعن فی معجزاتہ فنحتاج الی نصیب البراھین علیھا و تحصین حوزتھا حتی لا تتوصل المطاعن الیھا و نذکر شروط المعجزۃ والتحدی وحدہ وفساد قول من ابطل نسخ الشرایع

وردہ بل الفناہ لا ھل ملة الملبین لدعوتہ والصقین لنبوة لیکون تاکیداً فی محبتھم ومنماة لا عمالھم ولیزدا دوایناناً مع ایمانھم

ان مصنفین نے اپنی تصنیفات اور واقعات کا ذکر بلاتمیزان کی صحت اور عدم صحت کے اور بدون کوشش ان واقعات کے اصلی معنی دریافت کرنے کے کیا ہے۔ پس اگر کوئی محقق نکتہ چین اپنی دلیل کو کسی جھوٹی روایت پر جو ایسی کتاب میں منقول ہوں مبنی کرتا ہے تو وہ ایمان داری اور راست بازی سے ہمارے مذہب کی تحقیق اور تدقیق نہیں کرتا۔

اسی قسم کے بعض بزرگوار ذی علم لوگوں نے جو اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں اپنی تصنیف کے دائرہ کو اور بھی وسیع کردیا ہے۔ وہ ہر چیز کے امکان کو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف منسوب کر کے اس بنا پر ہر ایک واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں اور اس کے وقوع کے امکان کو منطقی دلیلوں سے تائید کر کے اپنے مذہب کے مخالف عیب چینوں کو جواب باصواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ کتابیں درحقیقت ایسی مصرع اور مدلل لکھی گئی ہیں کہ کوئی شخص جو کسی کو مانتا ہو اور مذہبی معجزات کا قائل ہو کسی عقیدہ مندرجہ کتب مذکور پر بدون اس کے کہ اپنے مذہب کو بھی ویسے ہی الزامات اور اعتراضات کا مورد بناوے حرف گیری نہیں کرسکتا۔

لیکن اس شخص کے نزدیک جو قوانین قدرت کے برخلاف کسی امر کے ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتا اور وحی اور الہام کو بھی نہیں مانتا ان کتابوں کی دلیلیں جن کی نصف کی بناء مذہب کے اوپر ہے اس آدمی کی مانند ہیں جس کی صرف ایک ٹانگ ہو اور چلنے پھرنے سے عاری ہو۔

ان علماء نے جو اوروں کی نسبت زیادہ ذی علم تھے اپنی تصانیف میں ایک فلسفیانہ قاعدہ اس امر کے ثابت کرنے کے لیے اختیار کیا ہے کہ مذہب علم سے مطابقت رکھتا ہے

انہوں نے ہر روایت کی صحت کی تحقیق کی ہے اور ہر ایک لفظ کے معنوں پر بحث کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ ان علمائے فلسفی میں سب سے پچھلے خیال کیے جاتے ہیں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ایسی تصنیفات جیسی کہ ان کی ہیں کچھ زیادہ مطبوع اور مروج نہ ہوئیں کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کے مضامین عام لوگوں کے احاطہ فہم وادراک سے باہر ہیں اور کچھ اس سبب سے کہ وہ ان بزرگوارمصنفوں کے مطبوع کی خاطر نہیں ہیں جو عقاید مذہبی پر فلسفی دلیلیں لانے پر اعتراض کرتے ہیں اور اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب کے ثبوت پر حکمت سے استمداد کی جاوے۔

پہلی قسم کے علماء کو جنھوں نے اپنے مذہب کے واسطے فلسفی دلائل پیش کرنے میں جان فشانی کی ہے۔ دوسری قسم کے علماء ان کو دین حق کا دشمن قرار دیتے ہیں اور ان کو گمراہ کہتے ہیں جس اتہام سے خود شاہ ولی اللہ صاحب بھی نہیں بچتے۔

لیکن ان کتابوں میں ایک اور نقص بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ دلیلیں جو ان میں مستعمل ہوئی ہیں۔ فلسفہ قدیم کے اصول پر مبنی ہیں جن میں سے اکثر تو رواج سے ساقط یا غلط ثابت ہوگئی ہیں یا علوم جدیدہ میں مختلف طور پر بیان ہوئی ہیں۔ مگر یہ نقص صرف علمائے دین پر ہی موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اور مذہبوں کے عالموں میں بھی جو دین کی بحث اصول فلسفہ پر کرتے ہیں موجود ہے۔ اس لیے ہر مذہب وملت کے عالموں کا جو اسکو پاک اور بے لوث رکھنا چاہتے ہیں یہ فرض ہے کہ ان کتابوں کی جو فلسفہ قدیم کے اصول پر لکھی گئی ہیں نظر ثانی کریں اور فلسفہ جدیدہ کے اصول پر نئی کتابیں لکھیں اور اپنے مذہب کے اصول کو اصول قانون قدرت کے مطابق بحث کرنے کے قابل کریں۔

چہارم۔ کتب فقہ

جب کہ حدیثوں کا یہ حال تھا جو ہم نے اوپر بیان یا تو ان لوگوں کا کام جنھوں نے احکام شرعی کو مستنبط کرنا چاہا نہایت ہی مشکل تھا اور جب کہ کتب حدیث لکھی جا چکیں اس وقت یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ جو عالم کہ سب سے زیادہ لائق تھا اس نے صرف قرآن مجید کو اپنا رہنما سمجھا جس کی صحت وصداقت علی العموم مسلم تھی اور

ا۔ جناب پیغمبر خدا کے زمانے میں قرآن مجید جیسا کہ بالفعل موجود ہے تمام وکمال یک جا لکھا ہوا نہ تھا بلکہ وہ علیحدہ علیحدہ حصوں میں لکھا ہوا تھا اور کچھ آیتیں ایسی تھیں جو صرف لوگوں کو یاد تھیں اور بعض آدمی ایسے بھی تھے جن کو تمام وکمال حفظ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں ان لوگوں نے ان تمام متفرق حصوں کو ایک جگہ جمع کیا جس طرح کہ اب موجودہ حالت قرآن مجید کی ہے اور ان تمام لوگوں نے جنھوں نے اس کو خود پیغمبر خدا کی زبانی سنا تھا اس مجموع کی صحت اور درستی کو تسلیم کیا۔ (سید احمد)۔

بڑے بڑے عالموں نے جو مجتہد ہو جاتے ہیں قرآن اور احادیث کو جو دسیاب ہوئیں (اور کچھ شک نہیں جو افادہ ظن سے زیادہ اور کوئی بات ان سے حاصل نہیں ہوتی تھی) احکام شرع کے لیے ماخذ قرار دیا۔ اول قرآن مجید کو اور بعد اس کے ان حدیثوں کو جن کی صحت پر ان لوگوں کو یقین تھا۔ جنھوں نے ان کو جمع کیا تھا درجہ دیا جاتا تھا اس کے بعد صحابہ کے اقوال اور کاموں کو اور بعض عالم تابعین کے اقوال اور کاموں کو بھی اس کام کے لیے فائدہ مند خیال کرتے تھے۔

جو لوگ کہ اس کام پر متوجہ ہوئے مجتہد اور فقیہ ان کا لقب تھا۔ اکثر ایسی صورتوں پر فقہائے اسلام کے سامنے پیش کی گئیں یا درحقیقت واقع ہوئیں جو قرآن مجید یا احادیث

میں نہیں پائی گئیں اوراسی وجہ سے بادی النظر میں کوئی قطعہ فیصلہ ان صورتوں کا قرآن مجید یا کتب حدیث میں نہیں پایا جاتا۔ اس مجبوری کی حالت میں فقہائے اسلام نے قرآن مجید اوراحادیث میں ایسے اصول کی تلاش کی جو ان صورتوں پر حاوی ہوں اور خوش قسمتی سے وہ اس میں کامیاب ہوئے اور الفاظ کے استعمال اور طرز بیان سے اور ایک حکم کے مطابق جو کسی واقعہ میں ہوا تھا اس کے مشابہ ایک دوسرے واقعہ پر قیاس کرنے سے اس مطلب کو حاصل کیا۔

ان علماء نے بعض اوقات قرآن مجید کے ایسے حکم کو جو کسی صورت سے خاص متعلق تھا عام ٹھہرایا اور کبھی قرآن مجید کے ایسے حکم میں جو ظاہر میں عام ہوتا ہے مستثنیات قائم کیے۔ انہیں علماء نے بعض ایسے اصول و قواعد منضبط کیے جن پر عمل کرنے سے عجیب و غریب مقدمات میں بھی قرآن مجید اور حدیث سے احکام مستخرج ہوسکیں اور یہ ایک نئی شاخ علم دین کی علوم دینیہ میں قائم ہوگئی جو بنام اصول فقہ موسوم ہے اسی بنیاد پر انسان کے تمام افعال کی نسبت احکام استخراج کیے گئے اوراس میں کتابیں لکھی گئیں جو کتب فقہ کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے پچھلی کتاب جو فرقہ حنفیہ کے اصول پر لکھی گئی وہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو شہنشاہ عالم گیر کے حکم سے مرتب ہوئی تھی۔ فقہ کی تمام کتابوں کے مصنفین کا نہایت شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس قدر محنت اور جاں فشانی سے ان کو لکھا ہے اور جس قدر تعظیم و اکرام ان مصنفین کو شایان ہے اتنی ہی قدر و منزلت ان کتابوں کی سزاوار ہے لیکن باستثنائے ان احکامات کے جو خاص کتابوں کی سزاوار ہے لیکن باستثنائے ان احکامات کے جو خاص قرآن مجید سے جن میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا اخذ کیے گئے ہیں اور ان احکامات کے جو ان احادیث سے لیے گئے ہیں جن میں روایتاً اور درایتاً دونوں طرح پر صحیح و معتبر ہونے کا ظن غالب ہے باقی احکامات کو گو کہ فقہائے قرآن مجید اور احادیث ہی سے مستنبط کیا ہو یہ نہ سمجھنا

چاہیے کہ وہ مثل نصوص صحیح کے مذہبی احکام ہیں۔ غیر ملک کے مصنفین اور نکتہ چین محققین نے ایسے مستخرجہ احکام کو اصلی ارکان دین اسلام سمجھنے میں اکثر مغالطہ کھایا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ذی لیاقت علماء جنھوں نے ان احکامات کو اسلام کے اصول اصلی مستخرج کیا ہے۔ یہ نسبت ہمارے بہت بڑے عالم تھے۔ مگر اس اصول پر کہ:

الانسان مرکب من الخطاء والنسیان

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں کچھ خطا نہیں ہے اور وہ سب احکامات مستخرجہ خطاء و غلطی سے بالکل مبرا ہیں۔ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری کتب فقہ دو قسم کے اصول و احکامات سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک ان احکامات اصلی سے جو بغیر کسی شبہ کے منصوص ہیں دوسرے وہ جن کو علمائے مجتہدین نے مستنبط اور مستخرج کیا ہے اور جو اسی وجہ سے ممکن الخطاء خیال کیے جا سکتے ہیں۔ پس ان لوگوں کو جو ہمارے احکام شرعی کی تحقیق و تدقیق کرنا چاہیں فرض ہے کہ اول قسم کے احکام کو دوسری قسم کے احکام سے تمیز کریں کیوں کہ اگر دوسری قسم کے احکام میں کوئی نقص پایا جاوے تو اس کو مذہب اسلام پر عاید نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کا الزام اس عالم کے سر پر ہے جس نے ان احکامات کو استخراج کیا ہے اور جو مذہب اسلام کے ایک فقیہ ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ کا مستحق نہیں ہے۔

مذہب اسلام میں جو چار بڑے بڑے فقیہ اور مجتہد گزرے ہیں جن کی تمام مسلمان پیروی کرتے ہیں ان کی بھی یہی رائے ہے۔

قال الشیخ عبدالوھاب الشعرانی فی الیواقیت کان ابو حنیفه رحمة الله علیه اذا افتی یقول ھذا رای النعمان ابن ثابت یعنی نفسه وھو احسن

۱۔ امام ابوحنیفہ ۸۰ ہجری مطابق ۶۹۹ ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ھ مطابق ۷۶۷ء

میں وفات پائی۔

۲۔ امام مالک ۹۵ھ مطابق ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ھ مطابق ۷۹۵ء میں وفات پائی۔

۳۔ امام احمد بن حنبل ۱۶۴ھ مطابق ۷۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ مطابق ۸۵۵ء میں وفات پائی۔

۴۔ امام شافعی ۱۵۰ ہجری مطابق ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ ہجری مطابق ۸۱۹ء میں وفات پائی۔ (سید احمد)

ما قد رنا عليه فمن جاء باحسن منه فهوا اولیٰ بالصواب.

وقا ل كـان الامام مالک رحمة الله تعالیٰ يقول مامن احد الا هوما خوذمن كلامه و مردود عليه الا الرسول صلى الله عليه وسلم.

ثـم قال كان الامام احمد رحمة الله عليه يقول ليس لاحد مع الله و رسوله صلى الله عليه وسلم كلام و قال ايضاً للرجل لا تلقدو نی ولا تقلدون مالک اولا الا وزاعی ولا النخعی ولا غيرهم وخذوا الا حكام من حيث اخذو امن الكتاب والسنة وروى الحاكم و البيهقى من الشافعی رحمة الله انه قال يوما للمزنی يا ابراهيم لا تقلدنی فی كل ما اقول وانظرنی ذلک بنفسک فانه دين و كان و رحمه الله يقول لا حجة فی قول احد دون رسول الله صلى الله عليه وسلم.

(۶) مذہب اسلام کی روایتوں کی اصلیت اور ان کی ترویج واشاعت کی ابتدا

یا ایھا الذین آمنوا ان جائکم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علیٰ مافعلتم نادمین

تاریخ اسلام کے ابتدا زمانہ سے آج تک قرآن مجید شرع محمدی کا لازوال منبع رہا ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔ ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ خود جناب پیغمبر خدا ہمیشہ قرآن مجید کے موافق کاربند ہوئے ہیں یعنی جو احکام قرآن مجید میں بہ نص صریح مندرج ہیں خواہ استدلالاً اس سے نکلتے ہیں۔ انہیں کے مطابق عمل فرمایا ہے یہ اصول ہر قرن میں ملحوظ رہا اور کوئی قول برخلاف قرآن مجید کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی اصول ہم کو حضرت عائشہ نے سکھایا ہے جب کہ انہوں نے سماع موتیٰ کی حدیث کو قرآن مجید کے برخلاف ہونے کی وجہ سے رد کر دیا۔ پس جو حدیث کہ قرآن مجید کے منشاء کے متناقض ہو اس کو یک لخت غیر معتبر اور موضوع خیال کرنا چاہیے۔

لیکن جب کہ ہم وحی ''غیر متلو'' میں بھی یعنی ایسی وحی میں جس کا مطلب آں حضرت پر القا ہوا ہو اور اس مطلب کو آں حضرت نے اپنے لفظوں میں بیان فرمایا ہو جس پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے اعتقاد رکھتے ہیں تو بلاشک ہم پر واجب ہے کہ احادیث نبی کو جمع کر کے جہاں تک ممکن ہو ان کی تحقیق اور تدقیق کریں۔ مگر جب کہ ہمارا عقیدہ یہ ہے ہ کوئی صحیح

حدیث قرآن مجید کے منشاء کے خلاف نہیں ہوسکتی تو ہم کو اس تحقیقات میں معلوم ہوگا کہ صحیح حدیثیں صرف تین قسم کی ہوسکتی ہیں، اول وہ جو قرآن مجید کے مطابق ہوں اور اس کی تائید کرتی ہوں۔ دوسری وہ جن سے قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر ہوتی ہو۔ اور تیسری وہ جو ایسے امور سے متعلق ہوں جن کا قرآن مجید میں کچھ ذکر نہیں ہے۔

لیکن خود جناب پیغمبر خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ سوائے قرآن مجید کے ان کا تمام کلام وحی نہیں ہے بلکہ وحی وہی ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کی نسبت خود جناب پیغمبر خدا نے ان کا وحی سے ہونا بیان فرما دیا ہے یا ان میں ایسے امور بیان ہیں جو عقائد مذہبی اخلاق عالم عقبیٰ اور روح کے حالات سے علاقہ رکھتے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ بغیر وحی کے معلوم نہیں ہوسکتے، مذکورہ بالا اقسام کے سوا باقی کلام آں حضرت کا وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ اور جس کی نسبت خود آں حضرت نے فرمایا ہے کہ:

انما ان بشرا امرتکم بشئی من امر دینکم فخذہ واذا امرتکم بشئی من رائی فانما ان بشر.

”ایک انسان ہوں جب میں تم کو تمہارے دین کی کسی چیز میں حکم کروں تو تم کو پکڑ لو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کسی چیز میں حکم دوں تو میں بھی انسان ہوں۔

اور حدیث تابیر النخل میں فرمایا ہے کہ:

فانی انما ظننت ظنا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حد ثتکم عن اللہ شیئا فخذو بہ فانی لم اکذب علی اللہ

”میں نے ایک طرح کا گمان کیا تھا اور گمان کرنے میں تم

مجھ سے کچھ جھگڑا مت کرو لیکن جب میں تم کو خدا کی طرف سے تم کو خدا کی طرف سے کوئی بات خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو پکڑ لو۔ کیوں کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں کہتا‘‘۔

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ آں حضرت نے جو بیماریوں کا علاج بتایا یا کسی رنگ کے گھوڑے کو پسند و ناپسند کیا یا کوئی کام آں حضرت نے بہ طریق عادت کیا نہ بطور عبادت کے یا اتفاقیہ کوئی کام بغیر مقصد کے ہو گیا یا آں حضرت کی ایسی باتیں جیسی کہ لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور نیز ایسے کام جو سردار کو لشکروں میں معین کرنے اور ان کے لیے نشانیوں کے قرار دینے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے کے ہیں یہ سب اسی قسم میں داخل ہیں۔ زید ابن ثابت نے کہا کہ میں آں حضرت کے ہمسایہ میں رہتا تھا پھر جب وحی آتی تھی تو مجھ کو یاد فرماتے تھے اور میں اس کو لکھ دیتا تھا۔ پھر جب ہم اسی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو ہمارے ساتھ اسی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو کھانے کا ہی ذکر فرماتے تھے۔ پس سوائے ذکر آخرت کے باقی تمام باتیں تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ بایں اہمہ ہم آں حضرت کے تمام افعال و اقوال کا نہایت ادب کرتے ہیں اور ان کو مقدس اور نہایت نیک خصال اور پاک اقوال اور افعال سمجھتے ہیں مگر رسالت سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔

غرض کہ چار قسم کے افعال آں حضرت کے ایسے ہیں۔ جن پر ہم کو غور کرنی لازمی ہے (۱) وہ جو ہمارے دین سے علاقہ رکھتے ہیں (۲) جو جناب پیغمبر خدا کے مخصوص حالات سے علاقہ رکھتے ہیں (۳) ایسے اقوال جو تمام لوگوں کے حالات پر موثر ہیں (۴) وہ احکام جو سیاست ملکی اور انتظام مدنی سے متعلق ہیں۔

ان میں سے پہلی قسم تو کچھ غور طلب نہیں ہے مگر صرف پچھلی تین قسمیں اس قابل ہیں

کہ ان کی نسبت اس قسم کی تحقیق و تدقیق کی جاوے کہ کون سے ان میں کے از روئے وحی کے ہیں اور کون سے ان میں سے کہ از روئے وحی کے نہیں ہیں اور ہم کو لازم ہے کہ صرف انہیں احادیث کو وحی سمجھیں جن کی نسبت ہم کو ایسا سمجھنے کے لیے کافی دلیل اور ثبوت ہو۔

اگرچہ جناب پیغمبر خدا نے ہم کو بہ تصریح ان کے قدم بہ قدم چلنے بلکہ صحابہ اور تابعین کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے مگر یہ حکم محض متعلق بہ معاملات دین سمجھا گیا ہے۔ ہم مسلمانوں نے بھی حتی الامکان مذکورہ بالا امور میں ان کی پیروی کی کوشش کی ہے۔ مگر اخیر کے تین امروں کی پیروی کرنے میں کتنا فرق ہے۔ کہ پہلی صورت میں یعنی اگر ان کا وحی سے ہونا ثابت ہو تو اس کی اطاعت اور پیروی ہم پر فرض ہے اور دوسری صورت میں ہم اپنی خوشی سے عالم عقبیٰ میں ثواب حاصل کرنے اور اپنے پیغمبر کی محبت اور ان کی تعظیم اور عقیدت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں یا حالات زمانہ کے اس ترک پر ہم کو مجبور کریں تو بغیر اس کے کہ مذہب میں کچھ نقصان عاید ہو یا کسی گناہ کے مرتکب ہوں اس کو ترک کر سکتے ہیں۔

اسی قسم کے خیالات نے ہم کو جناب پیغمبر خدا کی جملہ احادیث کے جمع کرنے اور ان کی تحقیق کرنے پر مجبور کیا۔ جناب پیغمبر خدا کی حیات میں ہی اسلام کی سلطنت جزیرہ عرب میں وسیع ہو گئی تھی اور بے شمار لوگوں نے دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہر مسلمان کی جناب پیغمبر خدا تک رسائی محال تھی اس لیے جناب پیغمبر خدا کے اقوال اور افعال اور عادات کا علم ان مسلمانوں تک پہنچانا جو اقطاع دور و دراز میں رہتے تھے لازم ہوا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا نے اس بات کو پسند کیا جیسا کہ حدیث ذیل میں مذکور ہے۔ پس اسی زمانے سے روایتوں کے بیان کرنے کا رواج ہوا۔

ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ:

عن ابن مسعود قال سسمعت رسول الله صلعم بقول نضرا لله امراً سمع مناشيا فبلغه كماسمعه فرب مبلغ اوعی له من سامع. (رواه الترمذی و ابن ماجه و رواه الدارمی عین ابی الدرداء)

''خدااس شخص کوسیراب کرے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی
اوراس کواس طرح دوسروں کو پہنچایا جیسے کہ مجھ سے سنا تھا۔ سو اکثر
پہنچائی گئی سننے والے سے زیادہ اس کو یاد رکھنے والے ہیں''۔

اگر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب پیغمبر خدا صلعم کی حیات ہی میں چند اشخاص بعض متفرق احادیث کو بھی قلم بند کر لیا کرتے تھے اور آں حضرت کی وفات کے بعد سے اس رواج کو زیادہ ترقی ہوتی گئی مگر ان دونوں زمانوں میں یہ رسم اس قدر محدود تھی کہ کسی خاص غور اور توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ زندہ موجود تھے۔ جنہوں نے خود جناب پیغمبر خدا کا کلام سنا تھا اور جو ایسے نہ تھے کہ ان کو جناب پیغمبر خدا کے اقوال اور افعال اور عادات کی نہایت آسانی سے واقفیت ہو سکتی تھی۔ اور اس لیے احادیث کے جمع کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مگر رفتہ رفتہ جب کہ وہ سن رسید آدمی جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کا زمانہ دیکھا تھا یکے بعد دیگرے انتقال کرتے گئے اس وقت لوگوں کو احادیث کے جمع کرنے کی اشد ضرورت معلوم ہوئی یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں چند دین دار اور پرہیز گار آدمیوں نے جنھوں نے اس دنیائے دون پر لات ماری تھی اور اپنی جان کو محض راہ خدا میں وقف کر دیا تھا۔ احادیث کے جمع کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھالیا تھا۔ کتابیں لکھنی شروع کیں۔ رفتہ رفتہ صحیح اور غیر صحیح کتابوں کا ایک انبار ہو گیا۔

اس سزا کا بیان جس کا مستحق جھوٹ حدیث بیان کرنے والے کو جناب پیغمبر خدا نے قرار دیا ہے

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کی حیات میں ہی آں حضرت کے ارشاد کے مطابق حدیثوں کے اور لوگوں تک پہنچانے کی رسم شروع ہو گئی تھی مگر اس بات کا بیان کرنا ضروری ہے کہ ایک شخص کے دوسرے شخص تک حدیث پہنچانے میں کس قدر احتیاط کرنے کا منشاء آں حضرت کا تھا اور اس منشاء کے ظاہر کرنے کو ترمذی اور مسلم کی حدیثوں کو اس مقام پر ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ:

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلعم اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوه مقعده من النار (رواه الترمذی)

''ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث روایت کرنے میں پرہیز کرو مگر اس قدر جتنا کہ تم جانتے ہو۔ سو جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ کہے گا اس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہیے۔ (ترمذی)''۔

مسلم کی حدیث میں ہے کہ:

عن سمرة بن جندب والمغیرة بن شعبه قال قال رسول الله صلعم من حدث عنی بحدیث یری انه کذب فهو احد الکاذبین (رواه مسلم)

''رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے کسی حدیث کو یہ

جان کر روایت کرے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ خود جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔(مسلم)''۔

مگر باوجود اس احتیاط کے ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں جھوٹی اور بے بنیاد باتیں بعینہ اس طرح پھیل گئی ہیں کہ جس طرح جھوٹی روایتیں اور موضع کتابیں یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج ہوگئی ہیں۔لیکن اتنا فرق ہے کہ علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقائد میں قرار نہیں دیا بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے اور اس لیے انہوں نے ایسی جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو گو کیسے ہی ناپاک اور نیک ارادہ سے انہوں نے ایسا کیا ہو جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی اور ان کو اس آگ سے بچانے میں کوشش نہیں کی۔مگر برخلاف اس کے علمائے مذہب نے عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صحیح اپنے باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔

سرولیم میور صاحب اپنی اردو تاریخ دین مسیحی میں بیان کرتےہیں کہ ''دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بر پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جاوے تو انہیں کی بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے یا نہیں۔آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقہ مذکور تسلیم ہوا۔اس سے البتہ مسیحی بحاثوں کی تیز عقلی نکتہ سجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا۔پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانے کے بعد کثرت سے لکھی گئی تھیں اس طرح کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلے سے لوگ اس پر متوجہ ہوں کر اس کی باتیں زیادہ مانیں گے۔اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتی

تھیں سواسی طرح مسیحی جوفیلسوفوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری کے یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع ہوا۔اور کئی سو برس تک رومی کلیسا میں جاری رہا یہ بات بہت ہی خلاف حق اور قابل الزام شدید کے تھی‘‘ (میور صاحب کی تاریخی دین مسیحی حصہ دوم باب ۳)۔

موشیم نے اپنی کتاب تاریخ مذہبی میں لکھا ہے کہ ’’افلاطونی اور فیثا غورثی حکماء نے صدق اور پاک بازی کی حمایت میں فریب دینے اور جھوٹ بولنے کو جائز ہی قرار نہیں دیا بلکہ مستحسن ٹھہرایا ہے۔ یہودیان ساکن مصر نے اس عقیدہ کو قبل سنہ مسیحی کے ان سے سیکھا ہے۔اس میں اس شخص کو کچھ کلام نہ ہوگا جس کو کہ کتابوں کو مشہور آدمیوں کی طرف منسوب کرنے کی جو بے شمار جعل سازیاں نظمی پیشن گوئیاں اوراسی قسم کی واہیات چیزیں جن کی ایک بری مقدار اس صدی اور آئندہ صدیوں میں ظاہر ہوئی تھی یاد ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کہا تھا برخلاف اس کے اغلب یہ ہے کہ ان کے جزو اعظم کے موجد فرق جات نسطیق بانی ہوئے تھے مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس قصور سے محض مبرا نہ تھے صریح انکار نہیں ہوسکتا‘‘ (ایکلز پاسٹکل ہسٹری باب ۳ صفحہ ۷۰ مطبوعہ ۱۸۶۰ء)۔

ایک اور مقام پر موشیم نے اسی مضمون کو اس طرح پر لکھا ہے کہ ’’لیکن اس کا اس قدر جلد عمل میں آتا ہے کہ مختلف اسباب پر موقوف تھا یا بالخصوص یہ امر کہ حضرت مسیح کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت سی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھیری ہوئی تھیں ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے برے نہ تھے بلکہ وہ وہمی سادی مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات بنام نہاد حواریان مقدس سارے جہان میں مشہور کی گئیں‘‘ (ایکلز پاسٹکل ہسٹری (سیرت)

حصہ دوم باب ۲ صفحہ ۳۶)۔

اس طرز تحریر کے بیان میں جو روایات کے لکھنے میں مستعمل کیا گیا تھا

اس بات کے ظاہر کرنے کو کہ حدیث ایک شخص سے دوسرے تک کس طرح پہنچی محدثین نے چند کلمات بہ طور اصطلاح کے مقرر کیے تھے اور اسی لیے حدیث کے ہر ایک راوی پر واجب تھا۔ کہ انہیں کلمات مخصوص سے جو اس حدیث کے واسطے موزوں ہوں حدیث کو شروع کرتے اور یہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ہر حدیث پر بہ لحاظ بیان کے اسی قدر اعتبار کیا جاوے جس درجہ اعتبار کے وہ سزاوار ہو۔

کلمات مذکورہ یہ ہیں (۱) حدثنا یعنی اس نے مجھ سے کہا (۲) ''سمعتہ یقول''یعنی میں نے اس کو کہتے سنا (۳) ''قال لنا''یعنی اس نے مجھ سے کہا (۴) ''ذکرنا''یعنی اس نے مجھ سے ذکر کیا (۵) ''اخبرنا''یعنی اس نے مجھ کو خبر دی (۶) ''انبانا''یعنی اس نے مجھ کو آگاہ کیا (۷) ''عن فلان''یعنی اس سے۔

اول کے چار کلمے صرف اس صورت میں استعمال کیے جاتے تھے جب کہ کوئی راوی کسی دوسرے شخص سے حدیث کے الفظ بجنسہ بیان کر دیتا تھا۔ پانچواں اور چھٹا کلمہ اس مقام پر استعمال کیا جاتا تھا جب کہ کوئی روای اپنے سے اوپر کے راوی سے کسی امر یا واقعہ کی صحت یا عم صحت کی نسبت سے دریافت کرتا تھا۔ اخیر کلمہ ایک مبہم کلمہ ہے اور اسی وجہ سے یہ امر منقح نہیں ہوسکتا کہ اخیر راوی نے جو دوسرے راوی کا نام لیا ہے وہ حدیث درحقیقت اس

راوی نے بیان کی ہے یا اس کے اور اخیر راوی کے درمیان اور لوگ روایت کرنے والے چھوٹ گئے ہیں۔ اس اشتباہ کے رفع کرنے کو خارجی امور کی تحقیقات ضرور ہوتی ہیں۔ مگر ان کی نسبت علماء کی مختلف رائیں ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ اگر یہ محقق ہو جاوے کہ وہ راوی سلسلہ روایت میں اور راویوں کے نام بہ فریب چھوڑ دینے میں مہتمم نہیں ہے اور وہ ایسے زمانے میں اور ایسے مقام پر رہتا تھا کہ ان کا ایک دوسرے سے ملاقی ہونا ممکن تھا۔ گو کہ اس ملاقات کا ثبوت نہ ہو تو بھی یہ فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور راوی نہیں چھوٹا ہے۔

دوسری رائے جو بوض علما نے مستند کی رائے ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثابت ہونا بھی ضرور ہے کہ وہ دونوں اپنی تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی ملاقی ہوئے ہوں۔

تیسری رائے جو بعض علماء کا قول ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضروری ہے کہ وہ اتنے عرصہ تک یک جا رہے ہوں جو ان کے ایک دوسرے سے حدیث سیکھنے کے واسطے کافی ہو۔

چوتھی رائے بعض عالموں کی یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضرور ہے کہ ایک نے دوسرے سے درحقیقت حدیث سیکھی بھی تھی۔

درجات احادیث کے بیان میں ایک راوی سے دوسرے تک پہنچنے کے لحاظ سے

اول: ''مسند یا مرفوع'' یہ لقب اس حدیث کو دیا جاتا ہے جب کہ راوی صاف

صاف بیان کرتا ہے کہ فلاں بات خود پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا خود کی تھی یا اوروں نے ان کے روبرو کی تھی اور آپ نے منع نہیں فرمایا تھا۔

دوم: ''مرفوع متصل'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک لگاتار یعنی بلافصل پہنچتا ہو تو اس کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

سوم: ''مرفوع منقطع'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ بلافصل پیغمبر خدا تک نہ پہنچے تو اس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

چہارم: ''مرسل یا موقوف'' یعنی وہ حدیث جس کو پیغمبر خدا کے اصحاب نے بیان کیا ہو۔ مگر پیغمبر خدا سے منسوب نہ کیا ہو۔

پنجم: ''مرسل یا موقوف متصل'' اگر راویوں کا سلسلہ اس صحاب تک جس نے اس کو بیان کیا ہے بلافصل چلا گیا ہو تو اس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

ششم: ''مرسل یا موقوف منقطع'' لیکن اگر راویوں کا سلسلہ اس صحابی تک مسلسل نہ ہو تو اس حدیث کا یہ لقب ہوتا ہے۔

اس بات میں کہ آیا حدیث ''مرسل یا موقوف متصل'' کو معتبر اور قابل استدلال خیال کرنا چاہیے یا نہیں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن صحاب کی ایسی حدیث جس میں ایک ایسے واقعہ یا مقام کا مذکور ہو جہاں وہ خود موجود نہیں تھے تو اس حدیث کو کسی طرح بغیر اور کسی سند کے حدیث نبوی کے ہم پایہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ ان علما کی رائے نہایت صحیح اور قرین انصاف ہے جو دوبارہ نزول وحی کے حضرت عائشہ کی روایات کو قابل سند نہیں خیال کرتے کیوں کہ وہ اس زمانے میں موجود نہ تھیں۔

ہفتم: ''مقطوع'' یعنی وہ حدیثیں جو تابعین نے بیان کی ہیں اور ان کو اپنے سے اوپر کے صحابہ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔

ہشتم: ''مقطوع متصل'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ اس تابعی تک برابر چلا جاوے تو اس حدیث کا یہ نام ہے۔

نہم: ''مقطوع منقطع''۔ اگر اس کا سلسلہ اس تابعی تک نہ پہنچے تو اس حدیث کو اس نام سے پکارتے ہیں۔

دہم: ''روایت'' یہ اقسام مندرجہ بالا سے بالکل علیحدہ ہے یہ نام ان حدیثوں کا ہے جو اس طرح پر شروع ہوتی ہیں ''یہ بیان کیا گیا ہے'' یا ''فلاں شخص نے یوں روایت کی ہے'' اس قسم کی روایتیں بازاری گپ سے کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ ایسی ہی روایتوں سے ہمارے مفسرین و مورخین نے اپنی تصنیفات کا حجم بڑھا لیا ہے۔ اور ایسی ہی واہیات اور بے ہودہ باتوں سے ہشامی' طبقات کبیر' کاتب الواقدی' وغیرہ کتابیں سیر و تواریخ کی پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہیں اور جو مایہ افتخار و نازان عیسائی مصنفوں کا ہے جو مذہب اسلام کے برخلاف کتابیں لکھتے ہیں۔

درجات احادیث کے بیان میں بہ لحاظ راویوں کے چال چلن یعنی آن کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے

جب کبھی کسی حدیث کے درجہ صحت کا امتحان راویوں کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے تو اس کا درجہ بہ ترتیب ذیل قرار پاتا ہے۔

اول: ''صحیح'' اس نام سے وہ حدیث موسوم کی جاتی ہے جس کے تمام راوی اول سے آخر تک پکے دین دار اور متقی اشخاص ہوں اور کبھی کسی قسم کے برائی کے ساتھ متہم نہ

ہوئے ہوں بلکہ تدین اور صدق مقال کے واسطے مشہور اور سب لوگوں کے نزدیک مسلم ہوں۔

ایسی حدیثوں کا درجہ اعتبار اس سبب سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ اس قسم کے راویوں نے علیحدہ علیحدہ بلا کسی اختلاف کے اسی حدیث کو بیان کیا ہو مگر ایسی حدیثیں نہایت ہی قلیل ہیں۔

دوم : ''حسن'' اس ملقب سے وہ حدیثیں ملقب ہوتیہیں جن کے تمام راوی اوصاف حمیدہ میں سے اول قسم کی حدیث کے راویوں کے کوئی ہم سری نہ کر سکتے ہوں مگر باایں ہمہ پرہیزگاری اور عام ثقاہت کے ساتھ متصف ہوں اور اس حدیث کی اصلیت بھی غیر مشتبہ ہو۔ اس قسم کی بے شمار حدیثیں ہیں جن سے معتبر کتب احادیث مملو ہیں۔

سوم : ''ضعیف'' یہ نام ان حدیثوں کو دیا گیا ہے جن کے تمام راویوں میں سے ایک شخص بھی اول یا دوم قسم کے راویوں کی مانند نہ ہو۔ ان احادیث کے ضعف کا درجہ دیگر اسباب سے بھی زیادہ یا کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کتب احادیث جو دوسرے درجہ کی کہلاتی ہیں اسی قسم کی احادیث سے بھری پڑی ہیں۔

چہارم : ''غریب'' یہ لقب ان حدیثوں کا ہے جن کے راویوں میں سے کسی نے بجز ایک آدھ حدیث کے اور کوئی حدیث نقل نہ کی ہو جس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ فن حدیث میں کچھ بھی تبحر نہیں رکھتا۔

راویوں کے درجہ اعتبار کے بیان میں ان کے تفقہ فی الدین کے لحاظ سے

تمام صحابہ کبار اور تابعین اور تبع تابعین جب کوئی حدیث آں حضرت کی بیان کرتے ہیں تو ان کے الفاظ بعینہ وہی نہیں ہوتے تھے جو آں حضرت نے فرمائے ہوں اور ایسا کرنا امکان سے بھی خارج تھا مع ہذا خیال کیا گیا ہے کہ بعض دعائیں ایسی ہیں جن کے الفاظ بجنسہ محفوظ ہیں۔ غرض کہ تمام حدیث کے راویوں مُں حدیث کو بالمعنی روایت کرنے کا رواج تھا۔ پس یہ بات قرین قیاس ہے کہ جو لوگ زیادہ علم رکھتے تھے اور تفقہ فی الدین کا ان کو زیادہ ملکہ تھا وہ آں حضرت کے کلام کا بہ نسبت اوروں کے اچھی طرح مطلب سمجھتے ہوں گے اور اوروں کو بھی ٹھیک طور پر بخوبی سمجھا سکتے ہوں گے اس واسطے راویوں کے اعتبار ان کے علم کے سات درجے کیے گئے ہیں

اول: وہ جو علم اور تفقہ میں زیادہ تر ممتاز تھے اور حافظہ بھی قوی رکھتے تھے۔ ایسے اشخاص آئمہ حدیث کہلاتے ہیں۔

دوم: وہ جو پہلوں سے کم درجہ رکھتے تھے۔ اور جن سے شاذ و نادر ہی کسی غلطی کے سرزد ہونے کا احتمال تھا۔

سوم: وہ جنھوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر ان کو اس قدر تعصب نہیں ہو گیا تھا کہ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہوں اور نیز ان کے تدین اور صدیق کلام میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ تھا۔

چہارم: وہ جن کے حالات کی نسبت کچھ اچھی طرح آگاہی نہیں ہے۔

پنجم: وہ جنھوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر ان کا تعصب حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔

ششم: وہ جن کی طبیعت میں شک اور وہم پڑا ہوا تھا اور ان کا حافظہ بھی قابل اعتبار کے نہ تھا۔

ہفتم: وہ جو جھوٹی حدیثیں بنانے میں مشہور اور بدنام تھے۔

علمائے دین کی یہ رائے ہے کہ اول تین درجے کے لوگوں کے بیان کی ہوئی حدیثیں کو باعتبار ان کے مراتب کے صحیح خیال کرنا چاہیے اور اخیر کے تین درجے کے لوگوں کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ باقی رہ گئے چوتھے درجہ کے لوگ ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو جب تک کہ ان راویوں کے حال معلوم نہ ہو قابل اعتبار سمجھنا نہ چاہیے۔

جو روایتیں کہ یہودیوں کے ہاں مذکور تھیں ان کے بیان کرنے سے مسلمانوں کو ممانعت نہ تھی۔

آں حضرت نے فرمایا تھا کہ یہودیوں کے ہاں جو روایتیں ہیں ان کے بیان کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق اس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری میں مذکور ہے اور اسی وجہ سے مسلمان یہودیوں کی روایتوں کے بیان کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن عبداللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلعم بلغوا عنی ولا آیۃ وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج ومن کذب علیٰ متعمدا فلیتبعوا مقعدہ من النار (رواہ البخاری)

”عبداللہ بن عمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہنچاؤ مجھ سے اگرچہ ایک ہی آیت ہو۔ اور حدیث بیان کرو بنی

اسرائیل سے اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ اور جو شخص قصداً مجھ پر
جھوٹ بولے گا تو اس کو اپنا ٹھکانہ آگ میں بنانا چاہیے
(بخاری)"۔

روایات میں اختلاف ہونے کے اسباب

جب کبھی ہم راویوں کی روایتوں میں اختلاف دیکھیں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا نہیں چاہیے
کہ یہ روایتیں راویوں کی بناوٹ ہے جیسا کہ عیسائی مورخ عموماً خیال کرتے ہیں اس لیے
احادیث موضوعہ کے سوا اور بھی قدرتی اسباب ایسے موجود ہیں جن کی وجہ سے روایات میں
اختلاف پڑنا ممکن الوقوع ہے۔ چناں چہ ہم ان قدرتی اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کے
سبب روایتوں میں اختلاف پڑتا ہے۔

اول: حدیث کے مطلب کی غلط فہمی۔

دوم: حدیث کے معنی سمجھنے میں دو راویوں کا باہم اختلاف یعنی ایک ہی حدیث کے
ایک نے کچھ معنی سمجھے اور ایک نے کچھ۔

سوم: حدیث کا مطلب لوگوں سے صاف صاف بیان کرنے کی عدم قابلیت۔

چہارم: راوی کے حافظہ کا تصور کہ یا تو اس نے کسی حدیث کا کوئی جزو چھوڑ دیا ہے۔
یا دو مختلف حدیثوں کو باہم خلط ملط کر دیا ہے۔

پنجم: راوی کا کسی جزو حدیث کی تفصیل کا بیان کرنا اس غرض سے کہ سننے والا بآسانی
اس کو سمجھ جائے لیکن سننے والے نے از راہ غلطی اس تفصلی کو بھی حدیث کا جزو سمجھا۔

ششم: راوی نے اپنی گفتگو میں جناب پیغمبر خدا کے چند کلمات بیان کیے اور سننے

والوں نے اس کے کلام کو حدیث سمجھ لیا۔

ہفتم: کسی راوی نے یہودیوں کی روایتیں بیان کیں اور سننے والے نے ان کو غلطی سے حدیث سمجھ لیا اور اسی ذریعے سے یہودیوں کی روایتوں کا اختلاف مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو آیا۔ اگلے نبیوں اور بزرگوں کے قصے جن سے ہمارے ہاں کی تاریخیں اور تفسیریں سیاہ ہیں سب انہیں ذریعوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

ہشتم: وہ اختلافات جو زبانی روایات کے سلسلہ سے خود بخود عارض ہوتا ہے اور اسی ذریعہ سے معمولی معجزات اور کرامات کی صورت پیدا کر لیتی ہیں

نہم: مختلف حالات جن میں کہ راوی نے آں حضرت کو دیکھا تھا یا کچھ فرماتے سنا تھا یا کرتے دیکھا تھا۔

یہ تما اسباب ایسے ہیں جن کے سبب سے بغیر ارادہ تصع کے قدرتی طور پر روایتوں میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ من جملہ ان کے نویں قسم ایسی ہے کہ باوجود اختلاف کے کل روایتوں کا سچا ہونا ممکن ہے۔

موضوع حدیثوں کا بیان

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمر خدا صلعم کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں اور جو لوگ ایسی شرم ناک جعلسازی کے مرتکب ہوئے تھے وہ مختلف قسم کے لوگ تھے۔

اول: وہ لوگ تھے جو عوام الناس میں کسی نیک رسم یا کسی ثواب کے کام کی ترویج کے خواہاں تھے اور اپنے کام یاب ہونے کی غرض سے انہوں نے کوئی حدیث بنالی۔ اس قسم

کی جعل سازی زیادہ تر ان حدیثوں کے متعلق ہے جن میں چھوٹے چھوٹے نیک کاموں کے کرنے میں بڑے بڑے ثواب بیان کیے ہیں اور نوافل کے پڑھنے میں گناہوں کیبخشے جانے اور قیامت میں اعلی درجے ملنے کے وعدے کیے گئے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کے پڑھنے کی عجیب عجیب خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ بیماروں سے شفا پانے اور رزق میں فراخی ہونے کی خاصلیتیں یا قرآن کی بعض سورتوں کا قیامت میں گناہ بخشوانے کے لیے مفید ہونا بیان ہوا ہے۔ ان موضع حدیثوں کے بنانے والوں کا منشاء یہ تھا کہ لوگ نیک کاموں میں اور قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل کے ادا کرنے پر زیادہ متوجہ ہوں۔ لیکن مذہب اسلام اس قسم کے فریبوں اور جھوٹوں کو پناہ نہیں دیتا بلکہ ان کو جہنم کی آگ میں ڈالتا ہے۔

دوم: واعظین نے اس غرض سے کہ ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو جاویں اور سننے والے عجیب وغریب باتوں کے سننے سے خوش ہوں اور نیز اس غرض سے کہ سنن والوں کے دل میں نرمی اور رحم اور خدا ترسی اور رقت قلب اور نیک کاموں کی رغبت پیدا ہو اور برے کاموں کی دہشت ان کے دل میں پیدا ہو اور خدا کا خوف اور نجات کی امیدیں ان کے دل میں بھڑک اٹھیں بہت سی حدیثیں موضوع کر لیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ ان کے ان افعال سے مذہب اسلام بالکل نفرت کرتا ہے۔ یہ حدیثیں زیادہ تر دوزخ اور بہشت اور ملائک کے حالات وغیرہ سے علاقہ رکھتی ہیں

سوم: وہ لوگ ہیں جنھوں نے مذہب کے مسائل میں اختلافات کیے اور اس تعصب میں جادہ اپنی دلیلوں میں غلبہ حاصل کرنے کی غرض سے اس قسم کی حدیثیں وضع کر لیں جو ان کے لیے مفید مطلب ہوں۔

چہارم: مخالفین مذہب اسلام نے جو اس زمانہ میں زیادہ تر یہودی اور مشرکین تھے۔ بہت سی باتیں سچ اور جھوٹ آں حضرت کی نسبت مشہور کی تھیں اور وہ عرب میں پھیل گئی

تھیں۔ رفتہ رفتہ بطور روایت ے بیان ہونے لگیں اور لوگوں نے غلطی سے ان کو حدیثوں میں شمار کیا۔

ہمارے علماء نے احادیث موضوع اور غلط روایت مروجہ کے دریافت کرنے میں از حد کوشش کی ہے اور اس باب میں اکثر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور صحیح اور باطل روایتوں کی تحقیق اور تمیز کرنے کے لیے قواعد اور اصول منضبط کیے ہیں۔

مقدم اصول جو اس امر کی تحقیق کے لیے علما نے قرار دیے ہیں وہ یہ ہیں کہ احادیث کے الفاظ اور طرز عبارت کا امتحان کیا جائے۔ ہر حدیث کے مضمون کو قرآن مجید کے احکام اور عقائد و مسائل مذہبی مستخرجہ قرآن اور احادیث مستند سے مقابلہ ہو۔ احادیث کے منشاء اور بیان کی تحقیق اور تدقیق کی جاوے کہ اس میں کوئی ایسا تاریخی واقعہ تو نہیں ہے جو از روئے تاریخ کے غلط ہو یا اس میں ایسے عجائبات تو نہیں بیان ہوئے جن کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو۔ جن حدیثوں میں اس قسم کی باتیں پائی جاتیہیں وہ موضوع خیال کی جاتی ہیں

مختصر طور پر اس کتاب کے پڑھنے والے جان لیں گے کہ جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں ان میں سے کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا لحاظ ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یعنی راوی نے صاف اور مصرح طور پر بیان کر دیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی۔ سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع ہو۔ پیغمبر خدا سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقویٰ اور تدین اور نیک اعمال کے لیے مشہور ہوں۔ ہر راوی کو اپنے ماسبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہوں۔ ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہو تا کہ یہ امر متیقن ہو جاوے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہو گا اور اوروں کو بھی ٹھیک طور پر سے سمجھا دیا ہو گا۔ حدیث کا منشاء احکام مندرجہ قرآن مجید یا عقائد مذہبی مستخرجہ قرآن یا حدیث مستند سے متناقض نہ ہو۔ اس میں عجائبات و غرائبات دور از عقل بیان نہ ہوں

بلکہ منشاء حدیث کا اس قسم کا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو۔

کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جاوے کسی عقیدہ مذہبی کی بنا ہو سکتی ہے۔ مگر با ایں ہمہ اس میں ایک اور شبہ کا عارض ہونا باقی رہ جاتا ہے یعنی وہ حدیث اس لیے کہ صرف ایک ہی شخص کی روایت ہے مفید یقین نہیں ہو سکتی بلکہ افادہ ظن کرتی ہے۔

اس شبہ کے سبب سے احادیث مستندہ کے بھی تین درجے قائم کیے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں: (۱) متواتر (۲) مشہور (۳) خبر آحاد۔

متواتر۔ وہ حدیثیں کہلاتی ہیں جن کو جناب پیغمبر خدا کے زمانہ سے لے کر جملہ اصحابہ کبار اور علمائے دین نے ہر ایک زمانہ میں پے در پے بالاتفاق صحیح اور مستند تسلیم کر لیا ہو اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی جرح و قدح نہ کی ہو ہر زمانے کے علماء کا قول ہے کہ صرف قران مجید ہی حد تواتر کو پہنچا ہے مگر بعض حدیثوں کو بھی متواتر بتاتے ہیں اور ان کی تعداد پانچ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ایسی احادیث پر بلا تکلف اعتبار کرنا اور ان پر معتقدانہ عمل کرنا واجب ہے۔

مشہور: ان حدیثوں کو کہتے ہیں جو متواتر کے درجہ تک نہ پہنچی ہوں مگر زمانے کے عالموں نے ان کے صحیح ہونے کو تسلیم کیا ہو۔ یہ وہ حدیثیں ہیں جو ہماری کتب احادیث میں جو معتبر گنی جاتی ہیں منقول ہیں اور اس باعث سے ان کی صحت بالعموم مسلم ہے اور ہمارے بعض عقائد مذہبی بھی ان پر مبنی ہیں گو کہ وہ درایتاً تنقیح اور تنقید کے امتحان سے بری نہیں ہیں۔

خبر آحاد۔ ان حدیثوں کا نام ہے جو مذکورہ بالا حدیثوں کے اوصاف تک نہیں پہنچیں اور اسی قسم کی حدیثیں بہت کثرت سے حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ علمائے اسلام اس باب میں کہ اس پچھلی قسم کی حدیثوں پر کوئی عقیدہ مذہبی مبنی ہو سکتا ہے یا نہیں مختلف الرائے ہیں۔

جن لوگوں نے کہ احادیث کے جمع کرنے کا بوجھ اٹھایا تھا ان میں سے جو سب سے اعلیٰ اور افضل اور ائمہ حدیث کہلاتے تھے انہوں نے اپنی ہمت صرف اس بات پر مصروف کی تھی کہ راویوں کے اعتبار کی کماحقہ تحقیق کرنے کے بعد حدیثوں کو لکھیں اور انہیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں صحاح میں داخل ہیں۔ اور بعضوں نے اس بات پر ہمت مصروف کی تھی کہ جس قدر حدیثیں ان کو ملیں وہ جمع کر لیں انہیں ہوئی کتابیں دوسرے درجہ کی گنی جاتی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جامعین حدیث نے ایک ایسی حدیث کو نہ اختیار کیا ہوگا جو علانیہ بادی النظر میں غلط ہو مگر جس قدر کہ حدیثیں انہوں نے منتخب کر کے جمع کر لیں۔ اس پر ان کو از روئے درایت کے تحقیق اور تدقیق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے یہ کام اپنے سے بعد کے لوگوں پر چھوڑا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کے بعد ان کی حدیثوں کی ایسی وقعت لوگو ل کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی کہ ان کو بجز خاص علمائے محققین کے درایتاً ان حدیثوں کی تنقیح اور تنقید کی جرات نہیں ہوئی۔ مگر از روے مذہب اسلام کے ہر ایک مسلمان کا حق ہے کہ ان کی حدیثوں کی درایتاً تنقیح اور تنقید کرے۔ ہمارے مورخیننے اور مفسرین نے جو کام کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام دلدر اور ناقص اور ضعیف حدیثوں کو اپنی تصنیفات میں جگہ دیتے ہیں۔

عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علمائے اسلام نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں اور درایت کے تو نام سے بھی واقف نہیں ہیں جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جن میں بجز بدترین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے ہیں اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ ان کی یہ مایہ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گزرتی ہے تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جو انکی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرف اوقات

پر افسوس کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے شبہات کی تردید

اگرچہ ہم نے مسلمانوں کی روایتوں کا پورا پورا اور بہ تفصیل بیان کیا ہے تاہم بہ نظر تحقیق اس آگاہی کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہم کو اپنے نبی کی سوانح عمری لکھنے والے دو لئیق عیسائی مصنفوں سے حاصل ہوئی ہے یعنی اے اسپرنگر ایم ڈی اور سر ولیم میور ایل ایل ڈی سے۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے اس مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی پڑا ہوا اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر دیا ہو اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز کو بھی ہاتھ سے کھو دیا ہو۔ مگر ان کا ایک بیان قابل غور ہے وہ کہتے ہیں ہ کتب دینیات اہل سنت و جماعت کے ہاں چھ کتابیں ہیں کہ کتب دینیات اہل سنت و جماعت کے ہاں چھ کتابیں سب سے معتبر ہیں یعنی صحیح بخاری، مسلم، سنن ابو داؤد، ترمذی نسائی ابن ماجہ۔ ان کے علاوہ بھی کتابیں ہیں جو اکثر سابق پر مبنی ہیں جن کی سنیوں کے ہاں بہت قدر ہے۔ مثلاً (واضح ہو کہ بعض ناموں کی صحت جو انگریزی میں لکھے ہوئے تھے نہیں ہو سکی) دارمی، دار قطنی، ابن عیینہ، اصمعی، برقانی، احمد سنی، بیہقی، حمیدی خطابی، بغوی، رزین، جرزی، ابن الاثیر، مبارک ابن جوزی، نووی۔

اب اول تو یہ اخیر کی چودہ کتابیں نامیں سے جس قدر سے کہ ہم واقف ہیں پہلی چھ

کتابوں پر مبنی نہیں ہیں سوائے مشکوۃ کے جو بغوی کی ہے اور اکثر ان میں کی غیر معتبر اور غیر مستند ہیں اور ان میں جو حدیثیں مذکور ہیں وہ ان چھ کتابوں میں نہیں ہیں دوسرے یہ کہ کوئی حدیث ہو خواہ وہ پہلی قسم ی کتابوں میں ہو خواہ دوسری قسم کی کتابون میں نہ کسی مذہبی عقیدہ کی بنا پر قرار پائی ہے۔ نہ صحیح اور مستند تسلیم ہوتی ہے جب تک کہ وہ ان قواعد سے جو اوپر مذکور ہوئے صحیح نہ ثابت ہوتی ہو۔

سر ولیم میور نے کسی قدر طوالت کے ساتھ اسلام کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بحث کی ہے مگر ہم بافسوس بیان کرتے ہیں کہ ان کی طرز تحریر سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ قابل اس کے کہ ایک غیر جانبدارانہ ار آزادانہ تحقیق ارو جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ مستخرج کریں۔ ان کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ یہ سب روایتیں جھوٹی اور لوگوں کی محض بناوٹیں اور ایجادیں ہیں اور اول ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے گو وہ امر حق کچھ ہی کیوں نہ ہو جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشاء ہوتا ہے یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے۔ ان کے طرز استدلال ہی سے ان کی غرض ظاہر ہو جاتی ہے ۔ وہ اس فقرہ سے مطلب کو آغاز کرتے ہیں کہ ''اگلے مسلمانوں کی عادتیں روایت کے رواج کی موید تھیں'' فرماتے ہیں کہ ''اپنے نبی کے کاموں اور باتوں سے زیادہ اور کس بات پر مسلمانان سابق سرگرمی سے بحث کرتے'' اس کے بعد صاحب موصوف یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ ''ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد صلعم کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کر دیا۔ ان کے پیرووٗں کے دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ محمد صلعم کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں ...... اسی مادہ سے اقدر کچیر روایتیں وجود میں آئیں ۔ جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لیے واقعات کو کوئی اندازہ سر دست موجود نہ ہوتا تو حافظے کو قوت واہمہ

کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی'' ''صحاب کبار کی روایتوں کی تعظیم اور حرمت جو زمانہ مابعد میں لوگوں کو تھی'' وہ بقول صاحب موصوف ''امتداد ایام کا اثر تھا جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا''۔

اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نیک اور پرہیز گار شخص کا کیا حال ہوگا اگر اس کی ہر بات اور ہر حرکت کو دغا بازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں اور جس قدر خراب معنی ہمارا حسد ایجاد کر سکے ان کے اوپر عائد کریں۔

کیا حضرت موسیٰ کے تمام معجزات ''ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا' ان یا ید بیضا۔ ''دریا کا خون کی مانند ہو جانا'' ''مینڈکوں کی وبا'' اور ان معجزات جو ان کے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے ''بحر احمر میں بنی اسرائیل کے لیے رستہ کا کھل جانا'' من وسلویٰ کا آسمان سے برآمد ہونا'' پتھر کی منقش لوہوں کا ملنا جن پر خدا تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا'' خدا تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا اور ان کو ''میری منتخب قوم'' کے خطابات سے سرفراز کرنا اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو ''میرا پہلوٹا'' بیٹا کہہ کر ممتاز کرنا۔ کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے نہیں کہہ سکتے؟ جن کو اس نبی کے سرگرم پیروؤں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد یا وضع کیا ہو۔ جنھوں نے بہ سبب ''متشکیانہ تعظیم'' اور ''شائقانہ تکریم'' کے امتداد زمانہ میں اپنے نبی کو ''عجیب وغریب اوصاف سے'' متصف کر دیا۔ کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰ پر اسی طرح صادق نہیں آسکتی ہے کہ ''ان کی وضع شان کو دھیان اور مراقبہ سے عروج حاصل ہوا اور جس قدر دور زمانہ ان کے پیروؤں سے انکو کرتا ہے۔ اس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام و

سلام رکھتا تھا زیادہ دندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا۔ دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدریں حاصل ہیں اور ایسے سامانوں سے جو انسان کے امکان اے برہ ہیں گھرے ہوئے ہیں'' حضرت عیسیٰ اور ان کے بااعتقاد اور سرگرم متعین کا اس وقت کیا حال ہوتا کا گر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا جن میں حضرت عیسیٰ کی کراماتی پیدائش اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا یعنی حسب قانون وحدت فی الثلیث کے اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔

لیکن عقل وفہم کی تعظیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع آتی ہے جنھوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت او عظمت حاصل کی ہو۔ اور اس امر سے بھی البتہ انکار نہیں ہوسکتا۔ کہ ہر مصنف کو لازم ہے کہ جب اوروں کی تحریرات اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کرلے۔

محمد رسول اللہ کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنھوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف مصروف کردیا تھا۔ وہ امر حق کو مانتے تھے اور اس جہان فانی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے وہ ایمان دار صادق القول اور نیک طینت تھے اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے بدیں غرض کہ احادیث نبوی کا ایک مجموعہ ہوجاوے دور دراز تک کے سفر اختیار کیے تھے۔ انہوں نے احکا وقت کے ہاتھ میں سخت تکلیفیں اٹھائیں تھیں۔ ان کو بے شمار دقتیں پیش آئیں اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو یہ مشکل خیال میں آسکتی تھیں۔ بایں ہمہ انہوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی اور ان کو انجام تک پہنچایا جس سے صریح ثابت ہے کہ ان کو دینی اور نیک نیت وجہوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی۔

اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہو سکتے کہ ان کے افعال کو ریا کاری اور فریب کی طرف منسوب کریں اور یورپین تصنیفات کے اس بے بنیاد بیان پر کہ محض بناوٹی ایجا چیں ہیں ان کی بے جا تحقیر کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''ترقی پذیر سلطنت کی احتیاطیں قرآن کے مجموعہ سیاست کی افزایش کی خواہاں ہوئیں۔ جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادہ وضع اور لامحدود نظام مدنی کے واسطے بخوبی کفایت کرتی تھی ان کی اولاد کی روز افزوں احتیاجوں کے واسطے غیر مکتفی ہوگئی۔'' وہ کہتے ہیں کہ 'یہ اور اسی کے قسم کے اسباب قرآن کے معدود اور معرا مسائل کی توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے''۔

اس بیان میں سر ولیم میور نے دو طرح کی غلطیاں کی ہیں ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت اور مجموعہ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے اور انہوں نے احادیث نبوی کو محض باغراض دینی جمع کیا تھا۔ ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے، یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے کہ مسلمانوں نے امور متعلق سیاست کو الہامی سمجھا ہو۔ خود جناب پیغمبر خدا اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہ سے صلاح لیتے تھے اور اس اصلاح کے مطابق کاربند ہوتے تھے۔ اس زمانہ کے بعد بھی ان روایتوں کو جو سیاست سے متعلق تھیں کسی نے الہامی نہیں سمجھا۔ چنانچہ ان کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں قران مجید اور نیز جناب پیغمبر خدا نے ہر چیز متعلق سیاست اور انتظام مدن کو باستثنائے چند اصول عام کے بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں۔ پس مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنی روز افزوں احتیاجوں کے واسطے قرآن مجید کی تکمیل کے

لیے حدیثوں کی تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ ہاں بلاشبہ مسلمانوں یہ خواہش تھی کہ ہر امر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے اسی طرح پر کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی اور یہ اس محبت وعشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبر کے ساتھ رکھتے ہیں اور اسی کے لیے ہر قوم کی احادیث کو جمع کرتے ہیں۔ پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی۔ مگر افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین تاویل میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد سر ولیم میور صاحب یہ فقرہ لکھ کر کہ ''اولاً قرآن ہی چل وچلن کا نافذ قانون تھا'' یہ بیان کرتے ہیں کہ ''پھر وہ اپنی غرض اصلی کے واسطے مکتفی نہ ہوا اور اس نقص کی تلافی سنت یعنی پیغمبر صاحب کے احکام اور افعال سیکی گئی'' اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے یعنی پیغمبر خدا نے کبھی اپنے آپ کو خطا سے مبرا اقرار نہیں دیا۔ بجز اس صورت کے جب اللہ تعالیٰ کی طرف اے القاء ہوتا تھا۔ مگر اس نئے عقیدہ نے یہ بات تراش لی کہ پیغمبر صاحب کے ہر قول وفعل میں ایک الٰہی غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔

ہم مسلمانوں کا معاملات دینی و دنیوی میں اپنے پیغمبر کی تقلید میں کوشش کرنا خواہ وہ امور دین سے علاقہ رکھتے ہوں خواہ امور دنیا سے خواہ امور سیاست مدن سے اور خواہ امور متعلق عادت اور عبادت سے دوسری چیز ہے اور اس بات کا اعتقاد کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسل کا کون سا قول اور از روئے وحی کے غیر قابل خطا تھا اور کون سے افعال صحابہ کے مشورہ سے کیے گئے تھے جن کو وحی سے کچھ تعلق نہ تھا دوسری چیز ہے۔ سر ولیم میور نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے خواہ خود غلطی میں پڑ کر ہماری نسبت ناانصافی سے یہ اعتقاد منسوب کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کے ہر قول وفعل میں ایک اللہ اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم مسلمان قول وفعل اپنے پیغمبر کے اسی ادب اور عظمت

سے دیکھتے ہیں۔ جیسے کہ ایک نبی اولولعزم کے اقوال اور افعال ادب اور عظمت کے مستحق ہیں

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''روایتوں کی بناوٹ اور اشاعت کا کام عوام الناس کے فائدوں اور سلطنت کے ملکی حالات پر اس قدر موثر تھا کہ بطور خود لوگوں کی سرگرمی پر بالکل چھوڑ دینے کے قابل نہ تھا'' اور اپنے بیان کی تائید میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مندرجہ ذیل فقرہ کو نقل کرتے ہیں کہ قسطلانی شرح بخاری س ان کو ہاتھ لگا تاھ اور وہ فقرہ یہ ہے: ''چوں کہ پیغمبر صاحب کے ہر معتبر اور صحیح بیان کی جو دستیاب ہو سکے قلم بند کر دینے کی ضرورت اشد تھی اس لیے خلیفہ عمر نے ایک گشتی حکم اس باب میں جاری کیا اور بالتخصیص ابوبکر بن محمد کو روایات کے جمع کرنے پر مامور کیا''۔

اگر قسطلانی نے یہ مضمون لکھا تو محض غلط ہے۔ حضرت عمرؓ حدیثوں کے جمع کرنے کے خود مخالف تھے جس کو سر سلیم میور نے بھی قبول کیا ہے ل۔ اور جو عنقریب معلوم ہوگا۔ کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا۔ ہ علانیہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کا یہ بیان ہیے کہ ''خلیفہ عمر نے تمام احادیث موجودہ کے باقاعدہ جمع کرنے کا گشتی حکم جاری کیا تھا'' ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تا مام کتب احادیث میں سے ایسی نشان دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو۔ برخلاف اس کے ہم اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بل استثناء ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفا کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے۔ اس زمانہ کے خلفا جناب پیغمبر خدا کے خلیفہ نہ تھے بلکہ سلاطین اور بادشاہ تھے کیوں کہ سلسلہ خلافت کا جناب رسالت مآب کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہو گیا تھا۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں و

اقدی سے نقل کرتے ہیں۔ان روایتوں میں اخیر روایت یہ ہے کہ خلیفہ عمر جانشین ابوبکر نے سنت کے قلم بند کرنے کا ارادہ کیا اور ایک مہینہ تک اس باب میں اللہ جلشانہ سے دعا کی۔ لیکن آخرکار جب اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہوئے تب یہ فرما کر باز رہے کہ ’’مجھ کو ایک قوم کا ذکر یاد ہے جنھوں نے اسی قسم کی تحریرات قلم بند کری تھیں اور کتاب ربانی کو چھوڑ کر ان پر عمل کیا تھا‘‘۔

یہ روایت جس طرز میں واقدی نے نقل کی ہے وہ ایسی ہے جیسی کہ اس قسم کی روایتوں میں ایک افواہی باتیں شامل ہو جاتی ہیں۔ دراصل بات صرف اتنی ہے کہ حضرت عمرؓ احادیث جمع کرنے کے برخلاف تھے اور ان کو یقین تھا کہ حدیثوں کو ٹھیک ٹھیک طور پر جمع ہونا نہایت مشکل ہے۔اور ان کے جمع ہونے سے بلاشبہ ایسی ہی خرابی پیدا ہوگی۔جیسی کہ یہود کے ہاتھ پیدا ہوگئی۔

اختلاف روایات کے اسباب یعنی انسان کے حافظہ کا عام ضعف‘ غلطیاں مبالغے‘ تعصب‘ حمایت اور نیز وہ تفرقہ اور وہ فساد جو بعد شہادت حضرت عثمان کے اسلام میں پھیل گیا تھا سر ولیم میور نے بیان فرمایا ہے۔اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ’’اسی صدی پر روایات موجودہ کی باقاعدہ تلاش شروع ہوئی اور باضابطہ لکھی گئیں۔وہ نمونہ اس وقت ڈھالا گیا تھا کم سے کم اپنی مخصوص ہئیت پر برابر چلا آیا‘‘۔

ہم کو اس مقام پر اختلاف روایات سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ ہم اس کو اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ اگر سر ولیم میور کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں بایں ہمہ انہوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے

ہیں۔ حالاں کہ تحقیق اور غیر متعصّبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے اور نیز مطابق اپنے عقیدہ کے ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب الام اور بانی اسلام کی نسبت معترض ہوتے۔ تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنھوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی امر ضروری کی کوتاہی پائی جاتی ہے مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوش گواری سے ہضم کر جاتے ہیں اور دوسروں کی نسبت عجیب و غریب پیرایہ میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔

اگر سر ولیم میور کی محض غرض ہیکہ روایات اسلام کا لغو اور غیر معتبر اور موضوع ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاوے تب بھی مذہب اسلام کی کچھ بے حرمتی اور ذلت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس امر کو کچھ چھپا نہیں رکھا۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر کتابیں حدیث صحیحہ کی اور غیر صحیحہ میں تمیز کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان کی صحت اور درجہ اعتبار کے جانچنے کے لیے اصول و قواعد اور سخت امتحانات قرار دیے گئے ہیں اور جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے مجرم ٹھہرائے گئے ہیں۔

عیسوی مذہب میں جھوٹی روایتوں کی کثرت

ہم اس بات کے بیان سے باز نہیں رہ سکتے کہ اس باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا بدترین ہے۔ مذہب عیسوی میں موضوعہ کتابوں اور بے شمار رسالوں

کی وجہ سے کتب دینی جو روزانہ ہر کلیسا میں مستعمل ہوتی تھیں وہ بہت بڑھ گئی تھیں اور دین دار لوگوں کے باہم بے انتہا مناقشوں اور قضیوں کے باعث ہوگئی تھیں جب کہ قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول یا تو ن جملہ اغراض کے جن کے واسطے اس نے مجلس نی (نیسا) کو ۳۲۰ء میں جمع کیا تھا ایک یہ بھی غرض تھی کہ صحیح اور موضوع اناجیل میں تمیز کی جاوے۔

والٹیر لکھتا ہے کہ ''عیسائیان سابق اس بات سے موردنفرین تھے۔ کہ انہوں نے عیسیٰ کے نام پر صنعت توشیح میں چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کیے تھے اور حضرت عیسیٰ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جس زمانہ میں کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا حضرت مریم کے خطوط اور افعال مصنوعی اناجیل' جھوٹے معجزات اور اور ہزاروں جعل سازیاں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے تھے یہاں تک کہ حضرت عیسی کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد بھی کثیر ہوگئی تھی۔

وہ اہم مسئلہ در بارہ الوھیت مسیح' جس نے کلیسائے نصارے میں ہلچل ڈال دی تھی۔ مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ءؑ میں منعقد کی تھی۔ اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے مسیح کی الوھیت سے انکار کیا۔ اور اس پر حجت کی کہ لیکن نہایت' سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیح خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں (نعوذ باللہ) اریس جو من جملہ اٹھارہ بشپ ہائے معترضین کے تھا فرقہ یونیٹیرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا۔ یعنی ان لوگوں کا جو حضرت مسیح کی الوحیت کے منکر تھے۔ اور اسی بنا پر بالزام بے دینی جلاوطن کیا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کیبعد اس کو قسطنطنیہ میں پھر بلا لیا اور اپنے عقائد کو فوقیت بخشنے میں کامیاب ہوا۔ حتیٰ کہ وہ تمام صوب جات روم میں انہوں نے رواج پایا۔ باوجود اس کے کہ اس کے سخت مخالف آثاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا از حد کوشش کی۔ اسی مجلس نیس کی کارروائی

کے تتمہ میں مرقوم ہے کہ آبائے کلیسا نے اس امر کی تحقیق میں نہایت ششدر ہوکر کہ توریت اورانجیل میں کون سے صحیف صحیح اورکون سی غیر صحیح ہیں ان سب کو بلاتمیز ولحاظ ایک قربان گاہ پر رکھ دیا۔ سنا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں منعقد ہوئی تھی جن میں ان امور کی جو روح القدس کے بارہ میں مجلس نیس نے غیر منفصل چھوڑ دیے تھے تشریح کی گئی تھی اوراسی موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس بلا شک وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے اوباپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہوکراس نے احترام حاصل کیا ہے۔ ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بہ مقام افیسس مجتمع ہوئی تھی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریم بلاشک ام اللہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰ کی دو صفتیں تھیں اورایک وجود۔ نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ اختلاف وتفرقہ عظیم واقعہ ہوا جس کے بعد شہر روم میں تخمینا انتیس خون ریز مشاجرات کرسی پوپ کے حصول کے واسطے واقع ہوئے"۔

☆☆☆

اسلامی روایات پرسر ولیم میور کی تنقید اور واس کا تحقیقی جواب

سرولیم میوران مضرت آمیز اسباب کا ذکر کے جو خلیفہ مامون الرشید کی متعصّبانہ عمل

داری میں اپنی کارروائی کور ہے تھے اور یہ بیان کر کے کہ ''روایتوں کا عام طور سے جمع ہونا ایسے ہی اسباب کی وجہ سے عمل میں آیا'' یہ فرماتے ہیں کہ ''خراب اور بے اصل مادہ کی کثرت خود مسلمانوں ہی کی چھان بین کے اندازہ سے قیاس کی جا سکتی ہے ان کا قول ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر ویل کی رائے قابل اعتماد اور لائق تعریف ہے''۔ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ ''ایسے وقت میں روایات زبانی پر اعتماد کرنے نے جب کہ وہ حافظہ سے منتقل ہوتی آئی تھیں اور ہر روز نئے نئے اختلافات اسلام میں پیدا کرتی تھیں اختراع اور بناوٹ کے لیے ایک وسیع رستہ کھول دیا جب کہ کسی دینی یا دنیاوی معاملہ کی حمایت کی ضرورت ہوتی تو اس سے سہل کوئی بات نہ تھی کہ پیغمبر صاحب کی کسی زبانی روایت کا حوالہ دیتے۔اس قسم کی روایات کی اصلیت اور جس طور سے کہ محمد صلعم کے نام کو تمام دروغ اور بے ہودہ ممکنات کی تائید میں بدنام کرتے ہیں اس امر سے صاف صاف ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ بخاری نے جو علماء سے روایات حاصل کرنے کے واسطے ملکوں ملکوں پھرا تھا بہت سے برسوں کی چھان بین کے بعد اس بات پر قرار پکڑا کہ من جملہ چھ لاکھ روایات کے جن کا اس زمانہ میں مروج ہونا تحقیق ہوا تھا صرف چار ہزار معتبر اور مستند تھیں اور منتخب تعداد میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا وسواس مجبور ہوتا ہے۔اس زمانہ کے بالیاقت جامعین کے تجربہ سے بھی یہی منکشف ہے اسی طرح ابوداؤد کی نسبت بھی یہی سنا گیا ہے کہ پانچ لاکھ روایتوں میں سے جو اسنے جمع کی تھیں چار لاکھ چھیانوے ہزار کو صرف مستند قرار دیا گیا''۔

اس جگہ ہم اس بات پر کہ تعداد اور روایات خارج شدہ کی کیا اصلیت ہے اور کس اصول پر خارج شدہ روایتیں خارج کی گئی تھیں اور آیا کہ اس سے ان کل روایتوں خارج شدہ کا موضوع ہونا لازم آتا ہے یا نہیں بحث کرنی نہیں چاہتے۔بلکہ ہم ڈاکٹر ویل اور سر ولیم میور دونوں کی رائے سے متفق ہو جاتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کا بھی

افسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ویل کے اس بیان کے بہ موجب کاربند ہونے کے بجائے کہ ''چار ہزار روایات منتخبہ بخاری میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا وسواس مجبور ہوتا ہے'' یورپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے اول نمبر پر ہیں بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کر اپنی تصنیفات کو واقدی' ہشامی' مولود نامہ' معراج نامہ' اور اور کتابوں پر جن میں بجز بے ہودہ باتوں کے اور کچھ نہیں ہے اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ'' جامعین نے گو کہ وہ غیر معتبر روایات کے اخراج میں بے دھڑک تھے روایات معتبر کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کا برتاؤ نہیں کیا'' اس کی تشریح وہ اگلے جملہ میں اس طرح پر کرتے ہیں کہ ''مضمون روایت سے کچھ بحث نہ تھی بلکہ محض نام ہی جن کی طرف وہ روایت منسوب ہوتی تھی مسئلہ اعتبار کو حل کر دیتے تھے۔ اگر یہ نام الزام سے مبرا ہوتے تو روایت مستند قرار پاتی۔ کوئی بے ہودگی کیسی ہی صریح کیوں نہ ہو کسی روایت کو جو اس امتحان میں پوری ہوئی روایات ہوتی روایات مستندہ کے رتبہ سے خارج نہیں کر سکتی تھی۔

سر ولیم میور کا یہ بیان ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے مگر انھوں نے اس موضوع سے جس پر جامعین حدیث نے حدیثوں کو جمع کیا غور نہیں کیل۔ جس وقت کہ حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اور اول اول ان کے جمع ہونے کا کام شروع ہوا تھا تو پہلا کام جامعین حدیث کا یہ تھا ک جہاں تک ممکن ہو صرف ان راویوں کی معتبری تحقیق کر کے ان حدیثوں کو قلم بند کر لیں بشرطیکہ بادی النظر میں کوئی ایسا امر جو اس حدیث کی صحت اور نامعتبری کے لحاظ سے ان کے مضامین میں تھا اس کا وقت ان جامعین کو نہیں ملا تھا کیوں کہ پہلا ہی کام جو انھوں نے کیا وہی نہایت سخت اور مشکل تھا۔ اگرچہ پچھلے لوگوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی جنھوں نے

حدیثوں کو باعتبار راویوں کے جمع کیا تھا ایسا ادب اور ایسی عظمت جم گئی تھی کہ اکثروں نے اس دوسرے کام کی نسبت جو باقی رہا تھا توجہ نہ کی۔لیکن بہت سے علماء محققین ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے اور اس کے لیے قواعد بھی منضبط کیے ہیں اور اصول حدیث کی معتبری اور نامعتبری قرار دینے کو فن درایت سے موسوم کیا ہ۔قطع نظر اس کے اس وقت ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ بہ لحاظ اصول درایت کے جس کتاب کی حدیث پر چاہے اس کے معتبر اور نامعتبر ہونے کی بحث کرے اور جس کو نامعتبر سمجھے اس کو نہ مانے۔

سر ولیم میور اپنے بیان کے ضمن میں راویوں کے ایمان دار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہتے ہیں کہ موضوع روایتیں معتبر روایتوں کے ساتھ مخلوط ہوگئی ہیں اور یہ غرض تمیز مابین صحیح اور موضوع روایتوں کے اس طرح پر لکھتے ہیں۔کہ ''امور جن پر کسی روایت کے اعتبار کا غلطہ بالخصوص منحصر ہونا چاہے یہ معلوم ہوتے ہیں ک (۱) آیا مسلمانوں میں بالعموم مضمون مروی کی جانب رعایت اور طرف داری پائی جاتی تھی یا نہیں (۲) دوم یہ کہ آیا راویوں میں کسی خاص غرض تعصب یا کسی غرض کے آثار پائے جاتے ہیں یا نہیں اور (۳) سوم یہ کہ آیا راوی کو واقعات کے علم کا بذات خود موقع ملا تھا یا نہیں۔

ان تین قواعد معینہ سر ولیم میور میں اخیر کے دو قواعد کے تسلیم کرنے میں ہم کو کچھ کلام نہیں ہے کیوں کہ یہ دو بھی من جملہ انہیں قواعد کے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے قاعدہ اول کی نسبت ہم حیران ہیں کہ بغیر زیادہ کسی تفصیل کے ہم اس کو اس بات کے لیے کہ آیا فلاں حدیث صحیح ہے یا غلط اور کس قدر صدق یا کذب اس میں موجود ہے کس طرح پر قاعدہ قرار دیں۔

اس حیرانی کے رفع کرنے کو ہم نے اس تفصیل کی طرف رجوع کی جو اس کی نسبت

سر ولیم میور نے تحریر فرمائی ہے۔ وہ مذکورہ بالا امر پر دو طرح سے نظر ڈالتے ہیں یعنی زمانہ کے لحاظ سے اور مضمون کے لحاظ سے۔ زمانہ کو وہ چند حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ اس وقت تک شمار کرتے ہیں ''جب تک کہ محمد صلعم کی شہرت شروع نہیں ہوئی تھی'' وہ بیان کرتے ہیں کہ ''پیغمبر صاحب کے اس زمانہ کے حالات کے شاہد یا تو عمر میں ان سے چھوٹے یا ان کے برابر ہیں اس واسطے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیش تر کے واقعات یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شاہدت معتبر نہیں ہے۔ اور ان کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہد کیے ہوں گے''۔

بہ ظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے اول یہ فرض کرلیا ہے کہ جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ ''روایت کی سب سے پہلی ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا'' مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اوثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئیتھی۔ دوم یہ کہ صاحب موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کرلیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنھوں نے جناب پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے یہ امر تاریخی واقعہ کے برخلاف ہے اور صحابہ بھی بہ لحاظ عمر میں اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت کے ذرا پیش تر کے واقعات اور نیز ان کی بچپن اور جوانی کے حالات کو بہ چشم خود مشاہدہ کیا ہو اور نیز ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔

علاوہ اس کے کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہاں معاینہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا شہادرت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائتہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کرلیا ہے

سراسر انحراف کرتا ہے۔ گواھان معاینہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے۔اور کسی واقعہ کے صدق یا کذب کو ضرور قائم کردیتے ہیں۔صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کی نسبت کوئی معتبر گواہ معاینہ تصدیق کرے فی الفور تسلیم کرلیا جاتا ہے اور صورت ثانی میں تواتر اور کثرت راویوں کی اس کی صحت کو بتلاتی ہیں۔پس جناب پیغمبر خدا کے کسی زمانہ کے واقعات کی تصدیق میں ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان مسلمہ قوانین کی شہادت ے بہ موجب جو انسان کے قوائے عقلی نے بدون لحاظ کسی مذہب کے مرتب کیے ہیں گواہ کے بیان کے صدق کا امتحان کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی واقعہ کی جانب توجہ بالتخصیص مائل نہ ہوت واس کی نسبت کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی اور بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد ایسے گواہ زیادہ سے زیادہ توقع یہ ہوسکتی ہے کہ واقعات قابل الذکر کا عام طور پر بیان کردے"اس اصول کو جب صاحب موصوف جناب پیغمبر کی سوانح عمری کے اس زمانہ تک جب کہ بقول ان کے جناب پیغمبر خدا ایک فریق کے سرگروہ ہوگئے نہایت شد ومد سے مستعمل کرتے ہیں اور اس کو اس زمانہ کے پیش تر وسعت دیتے ہیں جب کہ بقول ان کے"آں حضرت نے علانیہ دعویٰ نبوت کیا تھا اور شرک سے ممانعت کی تھی اور اہالیان مکہ سے کھلم کھلا لڑائی اختیار کی تھی"۔اور اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب تک کہ انہوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے۔

سر ولیم میور کے اس فرضی اصول کو جو انہوں نے اپنی ذہانت سے اختراع کیا ہے ہم بلا وسواس مان لیتے اگر ہم اس تردد میں نہ ہوتے ہ اگر یہ اصول مان لیا جاوے تو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی اس سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پیش تر وقوع

میں آئی تھی کیا کیا جاوے گا۔ کیا ''ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی۔'' اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا۔

ہم کو جناب پیغمبر خدا کے اس زمانہ کی سوانح عمری کی بہ نسبت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے حالات قبل از پیدائش اور وقت پیدائش اور ان کے ایام طفولیت اور ایام جوانی کی سوانح عمری سے زیادہ غرض ہے۔ کیوں کہ ہم جناب پیغمبر خدا کے کسی واقعہ ما قبل ولادت اور ان کے کسی سوانح عمری ایام طفولیت کو ایسا نہیں پاتے جس کی صحت پر آں حضرت کی نبوت کی صحت کا دارومدار ہو۔ ہم کو آنحضرت کے تمام حالت زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آں حضرت کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو۔ مگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے باب میں ایسا نہیں ہے ان دونوں انبیاء علیہم السلام کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے۔ ہم کو کس طرح اس امر کا یقین ہوسکتا ہے کہ وہ لامعلوم بچہ ج کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا۔ جس کو کہ تمام دنیا حضرت موسیٰ کہتی ہے۔ اور ہم کو کس طرح اس بات کا یقین کلی ہوسکتا ہے ک وہ بچہ جس کو ہم ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' اور عیسائی ابن اللہ کے خطابوں سے مخاطب کرتے ہس اور جس کی نسبت یقین ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل میں سے تھا اور وہی تھا جس کو اب عسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا اثبات کرنا ایسا محال اور ایسا غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی چیز محلا اور غیر ممکن کا ثابت کرنا ہے۔ اگر ہم سر ولیم میور صاحب کے اصول مندرجہ بالا کو صحیح تسلیم کرلیں تو ہم کو اندیشہ ہے۔ کہ مبادا ہمارے مذہب کے حق میں مضر ہو کیوں کہ ہم بھی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ چوں کہ اس خیال

سے ہمارا دل تھراتا ہے کہ اس لیے ہم سے یہ امید ہرگز رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم ایسے ضرر رساں اصول کو منظور کر لیں گے۔

ہم کو صرف اس زبانی بیان سے کہ سر ولیم میور صاحب کا اصول صحیح ہے تسکین نہیں ہوتی بلبہ ہم زیادہ بحث کر کے اس سقم کو دریافت کریں گے جس سے محمد رسول اللہ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ کے حالات کو صحیح ماننے میں حیرانی ہوتی ہے۔

یہ سقم جس کو ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں سر ولیم میور کے الفاظ ''بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد'' کے غیر مصرح ہونے سے واقع ہوا ہے اور ایسا کلام شہادت مسلمہ قوانین کے برخلاف ہے۔ ان کو بجائے ان الفاظ کے اس طرح کہنا چاہیے تھا ''ایسے زمانے کے انقضا کے بعد جو ایک جائز تحقیق اور نتیجہ کی صحت کے احتمال کو غیر ممکن کر دے'' لیکن جناب پیغمبر خدا کے غیر مشہور زمانہ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گزرا تھا زمانہ رواج روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے جنہوں نے پیغمبر خدا کی پیدائش ان کا بچپن، ان کا لڑکپن اور انکی نوجوانی دیکھی اور گو بہ قوم سر ولیم میور کے ''ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا'' تاہ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دیدہ باتوں کو بھول گئے ہوں۔

برخلاف اسکے جب کہ ''ایک بے کس یتیم بچہ ایک محض بے شر باشندہ'' ایک ایسا شخص ''جس کی نسبت تمام سکنائے مکہ میں سب س کم یہ گمان ہوسکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں'' اوجرب کہ ''ایسا غیر مشہور شخص ایسا خاص چال وچلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اس کے خاندان اس کے ہمسایوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس اس کا مقتضی ہے کہ ہر شخص جو اس سے قربت

رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے تگا اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں اور جن کی نسبت وہ سب معاینہ کے گواہ ہوں''۔

سر ولیم میور آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ ''ضرور یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جملہ صورتوں میں جن پر کوئی قاعدہ من جملہ قواعد متذکرہ صدر کے موثر ہوتا ہو صراحت ایک بڑی علامت بناوٹ کی ہوگی اور عیسائیوں کے لیے فن تحقیق اور تدقیق کے اسی قسم کے قانون کا اختیار کرنا بہتر ہوگا۔ کہ ہر روایت جس کی ابتدا واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بے ہودہ ہے۔ اس سے ہمارا (یعنی عیسائیوں کا) بے ہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے پیچھا چھوٹ جاوے گا جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی جزوی علامات نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں''۔

جب کہ ہم نے یہ ثابت کر دیا کہ سر ولیم میور کے مذکورہ بالا قواعد شہادت کے اصول مسلمہ کی رو سے سراسر غلط ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو نتیجہ ان قواعد سے مستنبط کیا ہے کہ ''صراحت ایک بری علامت بناوٹ کی ہوگی'' وہ بھی غلط ہے اور جناب پیغمبر خدا کی زندگی کے زمانہ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا ہے۔ ان کا یہ بیان کہ ''ہر روایت جس کی ابتدا واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بیہودہ ہے'' قانون شہادت کے خلاف ہے۔ اگر وہ اس طرح پر کہتے کہ ''وہ روایت جس کا راوی۔ نہ یہ کہ جس کی ابتدائے روایت۔ واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان بیہودہ ہے'' تو گنجائش تھی۔

وہ نتیجہ جو سر ولیم میور نے عیسائیوں کے فن تحقیق و تدقیق کے قانون کو روایات اسلام

پر مستعمل کرنے سے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ ''بیہودی قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جاوے گا۔ جن میں یہ کہ گند ہے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی علامتیں نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں''۔ لیکن ہم کو اس بات کے کہنے سے نہایت افسوس ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے اس استنبات میں بھی غلطی کی ہے کیوں کہ یہ استنباط بھی شہادت کے مسلمہ قوانین کے سراسر خلاف ہے جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل غیر ممکن معلوم ہوتی ہوں تو ابناء پر جو شبہ پیدا ہوتا ہے راوی کی نسبت ہوتا ہے کہ اس کو کیوں کر بہ تفصیل یاد رہی نہ مضمون روایت کی نسبت کیوں کہ اس کا صحیح ہونا چیز امکان سے خارج نہیں ہے۔ اور اس لیے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جامعین روایات کو قواعد منضبطہ اور اس کے حافظہ پر اعتماد ہو اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کو بھی صحیح تسلیم کرنے میں کچھ شک وشبہ نہیں رہتا۔

اس کے بعد سر ولیم میور دوسرے زمانہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی ''وہ جداگانہ حصہ زمانہ کا جو محمد (صلعم) کے مشہور حصہ عمر اور فتح مکہ کے مابین حائل ہوتا ہے''۔ ان کے کل بیان کا لب لباب یہ ہے کہ ہم ان روایات کو معتبر تسلیم نہیں کرتے جن میں ''بناوٹ کے افعال'' ''بے بنیاد اتہامات'' اور مبالغہ آمیز الزامات جو محمد (صلعم) کے مخالفوں کی طرف عائد ہوتے ہیں منقول ہیں۔ کیوں کہ تمام کفار نے جو مکہ کے رہنے والے خواہ مدینہ کے رہنے والے تھے سب نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور تمام یہودی عیسائی اور مشرکین نکال دیے گئے تھے اور اب کوئی شخص وہاں نہ رہا تھا۔ جو ایک طرفہ بیان کی تردید کرتا اور چوں کہ خود محمد (صلعم) کفار پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرات ہوتی اور اسی وجہ سے ''اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے'' اور مورخین ہمیشہ ''اس شہادت کی طرز پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگاتے رہتے تھے''۔

بغیر اس کے کہ ہم اس مقام رپ بیان کوطور دیں یا یہ کہیں کہ صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین پر بھی صادق آتا ہے۔خصوصاً اس زمانہ پر جب کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تاھ۔اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی' ایمان داری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوھر جو انان کے قوائے اخلاق کا مادہ ہیں لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یک لخت ہو کر محو ہو گئے ہوں اور وہ سب یک دل یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوں یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو۔یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معاینہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات کے غلط بیانی کی عدم امکان پر دلالات کرتا ہے۔

ذاتی میلان پر غور کرنے کے وقت سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ''راوی کی اس ہوس نے کہ محمد صاحب کی صحبت میں بار پاوے' کیوں کہ ان کے نام کے ساتھ ''شرافت وحرمت مربوط تھی اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کی باعث تھی'' اور اس ہوس نے کہ ''محمد صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے علاقہ قریبہ حاصل کرے'' کس واسطے کہ '' وحی میں مذکور ہونا سب سے بڑی ممکن الحصول عزت شمار کی جاتی تھی'' خلاف فطرت واقعات کے اختراع یا مبالغہ پر جرات بڑھائی اور ''روایات کے مبالغہ غلط بیانی اور نیز ایجاد کی باعث ہوئی''۔

جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرف دار بن

جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں۔ یہ کس طرح پر خیال آ سکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر خدا کی سنت کا اتباع ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ راستہ ہو اوران کے احکام سے سرتابی کرنا ضلالت ابدی کا موجب ہے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب ے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی' فریب دہی اور ریاکاری میں یک لخت مبتلا ہو گئے ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر طرح کی بداعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں۔ بطور مثال کے کسی مذہب کو لو۔ ہندو مذہب کو' بدھ مذہب کو' دیگر مشرکین کے مذہب کو' یہودی مذہب کو' عیسوی مذہب کو مع اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک' پروٹسٹنٹ' یونی ٹیرین' ٹینیٹیرین' ویزولنز' بپٹسٹ' جمپرز' مورمنز' وغیرہ کو تو ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی' صداقت' ایمان داری' راست بازی' سرگرمی' راسخ الاعتقادی اور جان نثاری پاؤ گے اور اپنے نبی کے احکامات اور اپنے مذہب کے قوانین سے انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پاؤ گے۔ ہم کو اپنے بیان کی تائید اور تصدیق کے لیے من جملہ ہزاروں مثالوں کے صرف ایک ہی مثال کافی ہو گی۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کہ زید ابن ثابت سے حضرت ابوبکر نے قرآن کے اجزائے منتشرہ کو ایک جگہ جمع کرنے کا اشارہ کیا تو کچھ عرصہ تک زید خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے اور پھر جو ہوش و حواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خود اور غصہ اور بے صبری سے ملے ہوئے جوش سے استفسار کیا کہ ایسے کام کرنے کی جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا آپ کیوں جسارت کرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آ سکتا ہے کہ ان لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اوران کی تعظیم کرتے تھے اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو

نہیں جانتے تھے فی الفور ایسی برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل اور خوار کر دیا ہو اور ایسے گناہ عظیمہ ان سے سرزد ہوئے ہوں۔

اسی طرح کی متعصّبانہ طبیعت سے سر ولیم میور آگے چل کر یہ بیان کرتے ہیں کہ ''قوم اس باب میں غیر مشتبرہ شہادت رکھتے ہیں کہ رعایت اور جانب داری نے روایت پر ایک گہرا اور مستقل نقش کر دیا'' اس کے بعد صاحب موصوف روایات موضوعہ کے رواج کے بہت سے اسباب کے ضمن میں یہ کہتے ہیں کہ ''قومی میلان عموماً تمام اسلام میں پھیلا ہوا ہے اس وجہ سے زیادہ مضر ہے''۔ اسی طرح ''محمد صاحب کی توقیر اور ان کو عجیب و غریب اوصاف سے متصف کرنے کی خواہش'' سر ولیم میور کے نزدیک تمام قصوں کی ابتدا آں حضرت سے ہوئی تھی۔ کیوں کہ سر ولیم میور بموجب اپنے اعتقاد کے ذرا بھی شک نہیں رکھتے کہ ''اصلی واقعات ایک وہم ناک خیال کی رنگ آمیزی سے اس طرح اراستہ یا مبدل ہو گئے ہیں'' اس کے بعد سر ولی میور کہتے ہیں کہ ''محمد صاحب کی توقیر کی اسی عام خواہش کی جس طرف ان مسلم معجزات کو بھی منسوب کرنا چاہیے۔ جن سے کہ ان کی سب سے ابتدائی تاریخیں بھی مملو ہیں'' اس کے بعد سر ولیم میور نے اپنی بیانتہا خفگی ان یہودی اور عیسائی عالموں پر ظاہر کی ہے جنھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی بشارت کا ذکر کیا ہے۔ سر ولیم میور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کو بھی موضوع اور بے اصل اس وجہ سے بتلاتے ہیں کہ ''پیغمبر اسلما کو حضرت اسماعیل کی اولاد میں خیال کرنے کی خواہش اور شاید ثابت کرنے ی کوشش ان کی حیات میں ہی شروع ہوئی تھی'' بعد اس کے وہ کہتے ہیں کہ ''دلیل خلف سے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے یعنی وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں اس لیے کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں۔ عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں کیوں کہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی'' پھر وہ کہتے ہیں کہ

''اس معاملہ کی حالات کی وجہ سے اس مقام کو قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گزشتہ کو ثابت کیا گیا ہے غیر ممکن ہے۔ کیوں کہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتا نہیں معلوم ہوتا''۔

یہ خلاصہ ہے سر ولیم کے ایک طول طویل بیان کا جس سے صریح ثابت ہوتا ہے کہ وہ محققانہ تحریر نہیں ہے بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے کہ جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے جو اپنے بیانات اور اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے۔ اور جو اپنے مذہب کے سوا اور مذہب کی باتوں پر اور بالخصوص ایسے مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی نہ کسی طرح مضرت پہنچی ہو نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جاوے۔ تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذاہب کے بارے میں بیان کیا کرتے تھے۔

سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ 'روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی تھیں کیوں کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا کل خارج ہو گئیں کیوں کہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوتی تھی''۔

مگر یہ کیسا غلط بیا ہے اور کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ نہایت صاف اور بے لا زبان میں بیان کرتے ہیں گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخ واقع ہے۔ اور شک و شبہ کی گنجائز نہیں رکھتا ہے اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ ہم نہایت دل جمعی سے اس معاملہ کو محض یہ کہہ کر دفعتاً بے کرتے ہیں کہ ''اس معاملہ کی حالت کی وجہ سے اس مقام کو اس قدر کامل طور پر ثابت کرنا...... غیر ممکن ہے کیوں کہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہے''

کیا اس طرح پر دلیل کرنا ایک تعصب کا اثر نہیں ہے؟ مع ہذا سر ولیم میور کا یہ بیان بھی صحیح نہیں ہے کہ کیوں کہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت استعمال کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے ہم تسلیم کرتے ہیں مگر ہم ان کے اس تہتک آمیز اسباب کی طرف منسوب ہونے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیے ہیں اعتماد کرنے سے انکار کرتے ہیں کیوں کہ یہ اختلافات محض ان وجہوں سے عارض ہوئے ہیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

ہم کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عیسائی مصنفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف غلط اور بے جا اتہامات ہی نہیں لگائے ہیں بلکہ بدوں کسی وجہ سے اپنے دل میں یہ سمجھ کر خوش ہوئے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کے نام پر پاک پر انہوں نے دھبہ ثابت کیا ہے کچھ بھی تعجب اور ملال نہیں ہوا ہے کیوں کہ بے اصل بات کچھ بھی تعجب اور ملال کے لائق نہیں ہوتی۔ مگر ان بے اصل خیالات کی بنا پر اے اسپرنگر ایم ڈی سے معلوم ہوتی ہے جنہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ایک جرنل یعنی رسالہ میں اور بعد ازاں اپنی کتاب بائی او گرافی آف محمد میں اس مضمون پر بحث کی تھی۔ سر ولیم میور کی عمدہ خصلت اور لیاقتوں کی قدر سے جو ہمارے دل میں تھی اور ان کی بہت بڑی مہارت مشرقی علم ادب کی وجہ سے ہم کو قوی امید ہوئی تھی کہ وہ ڈاکٹر اسپرنگر کے یک طرفہ بیانات اور الزامات کی کما حقہ موشگافی کریں گے۔ اور ایک سنجیدہ تحقیقات اور منصفانہ رائے سے رسول عرب کی معصومیت کی حمایت کریں گے مگر افسوس ہے کہ وہ امید کیسی بے اثر نکلی۔

تحقیق قصہ غرانیق

ڈاکٹر اسپرنگر سورہ ''والنجم'' کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی اوران کوتسلیم کرلیا۔اور جب کہ وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا۔اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ کے حوالہ پرمبنی کرتے ہیں۔

سرولیم میوراس مضمون پریوں بحث کرتے ہیں کہ ''یہ ظاہرایک خوب معتبر قصہ موجود ہےجس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے وہ اپنے بیان کوواقدی اورطبری کے بیان پرمبنی کرتےہیں اور خاص کرایک دلچسپ عبارت پر جو کہ اس قصہ میں اسناد کی تشریح میں مصنف کے مواہب لدنیہ نے لکھی ہے'' جو اعتراضات وشکوک کواسلام کی ضرراورفساد عقیدہ کے خوف کی طرف منسوب کرتا ہے۔

مصنف مواہب لدنیہ نے اپنی کتاب میں اس مضمون پرتمام مختلف روایتوں اورعلماء کی رایوں کولکھ دیا ہے اوراس لیے ہم اس مقام پراس کتاب کا بجنسہ نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں اوراسی کے ساتھ اس کی کامل تشریح بھی کریں گے اوراس غرض سے کہ مطلب سمجھنے میں اسانی ہومواہب لدنیہ کی عبارت کوجداگانہ دفعات میں منقسم کرتے ہیں۔

وقدم نفرمن مهاجرة الحبشة حين قواء عليه السلام والنجم اذا هوى حتى بلغ افرائيتم اللات والعزى و منات الثالثة الاخرىٰ القى الشيطان فى امينة اى فى تلاوت تلك الغرانيق العلىٰ وان شفاعتهن لترجىٰ فلما ختم السورة سجد صلى الله عليه وسلم وسجد معه المشركون لتوهمهم انه ذكر الهتهم يخير و فشى ذلك بالناس واظهره

الشيطان حتى بلغ ارض الحبشة ومن بها من المسلمين عثمان ابن مظعون و اصحابه وتحدثوا ان اهل مكة قد اسلموا كلهم وصلوا معه صلى الله عليه وسلم وقدا من المسلمين بمكة فاقبلوا سسراعاً من الحبشة.

''اول: چند لوگ حبش سے ہجرت کرنے والوں میں سے آئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی ''والنجم اذا ہوی'' (قسم ہے ستارہ کی جب نیچے آتا ہے) یہاں تک کہ جب آں حضرت آیت پر پہنچے ''افرئیتم اللات والعزی ومنات الثالثۃ الاخریٰ'' (کیا تم نے دیکھا کہ لات اور عزیٰ کو اور پھر منات کو جو تیسرا ہے) تو شیطان نے ان کی تلاوت میں یہ الفاظ ڈال دیے ''تلک الغانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترجیٰ' (یہ بڑے بت ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے) پس جب آنحضرت نے سورہ ختم کی تو سجدہ کیا۔ مشرکوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا کیوں کہ ان کو یہ گمان ہوا تھا کہ رسول اللہ نے ان خداؤں کو بھی بھلائی سے یاد کیا ہے۔ اور یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور شیطان نے اس کو مشہور کر دیا۔ یہاں تک کہ ملک حبش میں اور وہاں کے مسلمانوں میں جو وہاں تھے یعنی عثمان بن مظعون اور ان کے ساتھیوں میں یہ خبر عام ہوئی۔ ان لوگوں نے آپس میں گفتگو کی کہ مکہ کے سب لوگ اسلام لائے اور آنحضرت کے ساتھ نماز پڑھی اور مسلمانوں کو مکہ میں امن ہو گیا۔ وہ لوگ بڑی تیزی سے حبش سے روانہ ہوئے۔''

ولما تبين المشركين عدم ذلك رجعوا الى اشدما كانوا عليه

''دوم: اور جب مشرکین کو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے تو پہلے سے زیادہ سختی پر مائل ہوئے''۔

وقد تکلم قاجی عیاض رضه فی الشفاء علی هذه القصة وتوهین اصلها بما یشفی ویکفی لکن تعقب فی بعضه کماسیاتی.

''سوم: قاضی عیاض نے ''شفاء'' میں اس قصہ پر اور اس کی اصل کے سست ہونے پر کافی وشافی گفتگو کی ہے۔ لیکن اس کے بعض حصوں پر گرفت کی گئی ہے جیسا کہ آتا ہے''

وقال الامام فخر الدین الرازی مما لخصته من تفسیر ہ هذه القصة باطله وموضوعه لا یجوز القول بها قال الله تعالیٰ وما ینطق عن الهوی ان هوا الا وحی یوحی وقال الله تعالیٰ سنقرئک فلا تنسیٰ.

''چہارم: امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ جیسا کہ میں نے ان کی تفسیر کا ملخص سمجھا ہے۔ کہ یہ قصہ جھوٹ ہے اور گڑھا ہوا ہے۔ اس کا بیان کرنا جائز نہیں خدا نے کہا کہ ''آں حضرت اپنی خواہش نفسانی سے نہیں بولتے۔ وہ نہیں ہے مگر وحی جو کہ وحی بھیجی گئی'' اور خدا نے کہا ''ہم تم کو پڑھاویں گے سو تم نہ بھولو گے''۔

وقال البیهقی هذه غیر ثابتة من جهة النقل ثم اخذ یتکلم فی ان رواة هذه القصة مطعونون.

''پنجم: بیہقی نے کہا کہ یہ ثابت نہیں ہے روایت کی رو سے۔ پھر بیہقی نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ اس قصہ کے راوی مطعون ہیں''۔

وایضا فقد روی البخاری فی صحیحه انه علیه السلام قراء سورة النجم وسجد معه المسمون والمشرکون والانس والجن و لیس فیه حدیث الغرانیق بل روی هذا الحدیث من طرق کثیرة ولیس فیها البتة حدیث الغرانیق.

''ششم: نیز بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ نجم پڑھی اوراس کے ساتھ مسلمانوں اور مشرکوں اورآدمی اور جن نے سجدہ کیا۔ اس روایت میں غرانیق کی حدیث نہیں ہے۔ بلکہ یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مروی ہے مگرکسی میں غرانیق کی حدیث مذکورنہیں ہے''۔

ولا شک ان من جوز علی الرسول تعظیم الاوثان فقد کفر لان من المعلوم بالضرورة ان اعظم سعیه کان فی نفیٰ الاوثان ولو جوزنا ذلک ارتفع الامان عن شرعه و جوزنا فی کل واحد من الاحکام والشرایع ان یکون کذالک ویبطل قوله تعالیٰ یا ایها الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالته فانه لا فرق فی الفعل بین النقصان فی الوحی والزیادة فیه فبهذوه الوجوه عرفنا علی سبیل الاجمال ان هذا القصة موضوعة و قیل ان هذه القصة من وضع الزنادقة لا اصل لها انتهی.

''ہفتم: اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو شخص اس بات کو جائز رکھے کہ رسول اللہ نے بتوں کی تعظیم کی تو وہ کافر ہے۔ کیوں کہ یہ تو بداہتاً معلوم ہے۔ کہ آں حضرت کی بڑی کوشش بتوں کا مٹانا تھا اوراگر ہم نے اس بات کو جائز رکھیں تو شریعت پر کچھ اعتبار نہ رہے گا۔ اورہم کو

کل احکام وشریعتوں میں ایسا ہی جائز خیال کرنا لازم آئے گا اور خدا
کا یہ قول باطل ہو جائے گا کہ اے رسول خدا کی طرف سے جو تجھ پر
اتارا گیا ہے اس کو لوگوں کو پہنچا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے اپنی
رسالت کو نہیں ہنچایا۔ کیوں کہ یہ کام کے اعتبار سے وحی کے گھٹانے
میں اور زیادہ کر دینے میں کچھ فرق نہیں ہے پس ان دلیلوں سے ہم
نے مجملاً جان لیا ہے کہ قصہ گھڑا ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قصہ
زندیقوں کے موضوعات سے ہے جس کی کچھ اصل نہیں ہے"۔

ولیس کذلک بل لها اصل فقد اخرجها ابن ابی حاتم والطبری و ابن النمنذر من طرق عن شعبة عن ابی بشر عن سعید ابن جبیر وند ابن مردویه البزار وابن اسحاق فی السیرة و موسیٰ ابن عقبة فی المغازی و ابو معشرفی السیرة کمانبه علیه الحافظ عماد الدین ابن کثیر وغیره.

"ہشتم: اور ایسا نہیں ہے کہ بلکہ اس کی ایک اصل ہے کیوں
کہ اس کو روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم وطبری وابن المنذر نے متعدد
طریقوں سے شعبہ سے انہوں نے ابو بشر سے انہوں نے سعید ابن
جبیر سے اور اسی طرح ابن مردویہ اور بزار اور ابن اسحاق نے سیرت
میں اور موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں اور ابو معشر نے سیرت میں جیسا
کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے"۔

لکن قال ان طرقها کلها مرسلة وانه لم یرها مسندة من وجه صحیح وهذا مستعقب بما سیاتی.

"نہم: لیکن کہا ہے کہ اس کے سب طریقے مرسل ہیں اور یہ

کہ وہ صحیح طور سے مسند نہیں کی گئی ہے۔ اوراس پر اعتراض کیا گیا
ہے۔ جیسا کہ آگے آتا ہے“۔

کذانبہ علی ثبوت اصلها شیخ الاسلام و الحافظ ابو الفضل العسقلانی فقال اخرج ابن ابی حاتم و الطبری وابن المنذر و من طرق عن شعبة عن ابی بشر عن سعید ابن جبیر قال قراء رسول الله علیه وسلم بمکة والنجم فلما بلغ افرائیتم اللات و العزی ومنات الثالثة الاخری القی الشیطان علی لسانه تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتهن لترجیٰ فقل المشرکین ماذکر الهتنا بخیر قبل الیوم فسجد و سجد وافنزلت هذه الایه وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة الایه

”دھم : اروا سی طرح اس کے اصل ثابت ہونے پر شیخ
الاسلام اور حافظ ابوالافضل عسقلانی نے تنبیہہ کی ہے کہ سو کہا ہے کہ
روایت کیا ہے ابن ابی حاتم اور طبری المنذر نے متعدد طریقوں سے
شعبہ سے انہوں نے ابو بشر سے انہوں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ
انہوں نے پڑھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ”والنجم“ کو
پس جب پہنچے آیا پر

افرئیتم اللات و العزی ومنات الثالثة الاخریٰ

شیطان نے آنخضرت کی زبان پر یہ الفاظ ڈال دیے

تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتهن لترجیٰ

پس کہا مشرکوں نے آج سے پہلے کبھی محمدؐ نے ہمارے

خداؤں کو بھلائی سے یاد نہیں کیا تھا پھر آں حضرت نے سجدہ کیا
اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا پس یہ آیت اتری

وما ارسلنا من قبلکل من رسول ولا بنی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة

اخیر آیت تک۔

واخرجه البزار وابن مردودیه من طریق امیه بن خالد ون شعبة فقال فی اسناده عن سعید ابن جبیر عن ابن عباس فیما احسب ثم ساق الحدیث سقال البزار لا یروی متصلا الا بهذا الاسناد تفود یو صله امیه بن خالد وهو ثقة مشهور.

"یازدھم: اور روایت کیا ہے اس کو بزار نے اور ابن مردودیہ نے امیہ بن خالد کی روایت سے امیہ نے شعبہ سے۔ پس کہا "اس کی اسناد جہاں تک میں جانتا ہوں سعید ابن جبیر کی روایت ابن عباس سے ہے" پھر حدیث بیانکرنے لگے اور بزار نے کہا یہ حدیث اتصال کے ساتھ صرف اسی اسناد سے مروی ہے اس ے وصل کرنے میں امیہ بن خالف متفرد ہے او مشہور ثقہ ہے۔

وقال انما یروی هذا من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس انتهیٰ و الکلبی متروک لا یعتمد علیه.

"دوازدھم: اور کہا کہ یہ روایت کی گئی ہے کلبی کے طریقہ سے اس نے ابوصالح سے اور اس نے ابن عباس سے انتہیٰ۔ اور کلبی چھوڑ دیا گیا ہے اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا"۔

وكذا اخرجه النحاس بسند اخر فيه الواقدی وذکرها ابن اسحاق فی السیرة مطولا و اسندها عن محمد ابن کعب ولک ابن عقبة فی العغازی عن ابن شهاب عن الزهری و کذا ابو معشر فی سیرة له عن محمد ابن کعب القرضی و محمد ابن قیس و اورده من طریقة الطبری و اورد ابن ابی حاتم من طریق اسباط عن السدی ورواه ابن مردودیه من طریق عباد ابن صهیب عن یحییٰ ابن کثیر عن اکلبی ابن صالح وعن ابی بکر الهذلی و ایوب عن عکرمة و سلیمان التیمی عن من حدثه ثلاثتهم عن ابن عباس واوردها الطبری من طریق العوفی عن ابن عباس و معنا هم کلهم فی ذلک و احد و کلها سوی ریق سعید ابن جبیر اما ضعیف و اما منقطع لکن کثرة الطرق تدل علی ان للقصة اصلاً.

''سیزدھم: اوراسی طرح اس کونحاس نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔جس میں واقدی ہے اوراس کوابن اسحاق نے کتاب سیرت میں تفصیلاً ذکر کیا ہےاوراس کومحمد بن کعب سےاسناد کیا ہےاوراسی طرح ابن عقبہ نے مغازی میں ابن شہاب سےاوراس نے زہری سےاوراسی طرح ابومعشر نے سیرت میں محمد بنکعب قرضی کے طریقہ سے ومحمد بن قیس کے طریقہ سے۔اورطبری نے اسی کے طریقہ سے لایا ہے۔اورابن ابی حاتم لایا ہےاسباط کے طریقہ سے وہ سدی سے۔اورابن مردودیہ نے اس کوروایت کیا ہے طریقہ عباد بن صہیب سے وہ یحییٰ بن کثیر سے وہ کلبی سے وہ ابوصالح سے اورابوبکر ھذلی سے اورایوب سے وہ عکرمہ سے اورسلیمان تیمی نے ان تین

شخصوں سے جنہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور طبری اس
کو عوفی کے طریق پر ایا ہے اور وہ ابن عباس سے اور سب کا مطلب
ایک ہی ہے اور وہ سب طریقے سوائے سعید ابن جبیر کے طریقہ کے
یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں لیکن بہت سے طریقوں کا ہونا اس بات پر
دلالت کرتا ہے کہ قصہ کی کچھ اصل ہے۔

مع ان لها طريقين اخرين مرسلين رجا لهما على شرط الصحيح احد هما ما اخرجه الظبرى من طريق يونس ابن يزيد من ابن شهاب حدثنى ابوبكر ابن عبدالرحمن بن الحرث عن ابن هشام فذكر نهوه والثانى ما اخرجه ايضا من طريق الممتمر ابن سليمان وحماد ابن سلمة كلاهما عن دائود ابن ابى هند عنن العاليه .

''چہاردھم: باوجود اس کے کہ اس کے دو اور طریقے ہیں جو
مرسل ہیں۔ اور ان کے راوی صحیح کی شرط کے موافق ہیں۔ ایک وہ
جس کو طبری نے روایت کی اہے یونس ان یزید کے طریقہ سے یونس
نے ابن شہاب سے کہ حدیث بیان کی مجھ سے ابوبکر عبدالرحمٰن بن
الحرث نے بن ہشام سے پس اسی طرح ذکر کیا اور دوسرے وہ جس
کو طبری نے روایت کیا معتمر بن سلیمان کے طریقہ سے اور حماد بن
سلمہ کے طریقہ سے دونوں نے داؤد بن ابی ہند سے داؤ دعالیہ سے
''۔

قال الحافظ ان حجر وقد تجراء ابن العربى كعادنى فقال ذكر الطبرى فى ذلك روايات كثيرة لا اسل لها وهو اطلاق مردود عليه وكذا

قول القاضی عیاض هذا الحدیث لم یخرجه اهل اصحة ولا رواه ثقة بسند سلیم متصل مع ضعف نقله و اضطراب روایة و انقطاع اانیده ویکذا قوله ومن حکیت عنه هذه القصة من التابعین والمفسرین لم یسندها احد منهم ولا رفعها الی صاحب و اکثر الطریق عنهم فی ذلک ضعیفة واهیة.

''پانزدھم: کہا حافظ نے ابن حجر نے جرات کی ابن العربی نے اپنی عات کے موافق پس کہا کہ ''ذکر کیا طبری نے اس باب میں بہت سی روایتوں کو جن کی کچھ اصل نہیں ہے'' اور یہ مطلقاً حکم لگانا رد کیا گیا ہے اواسی طرح قاضی عیاض کا قول ہے کہ اس حدیث کو صحت والوں نے نہیں روایت کیا۔ اس کے ساتھ اس کی نقل کرنے والے ضعیف ہیں اور اس کی روایتوں میں اضطراب ہے ۔ اور اس کی سندیں منقطع ہیں۔ اوراسی طرح قاضی عیاض کا یہ قول کہ تابعین و مفسرین میں سے جن سے اس قصہ کی حکایت کی گئی ہے کسی نے اس کو سند نہیں کیا اور نہ کسی نے اس کو کسی صاحب کی طرف مرفوع کیا ہے اور اکثر طریقے جو ان سے مروی ہیں ضعیف ہیں اور واہی ہیں۔

قال و قدتبین البزار انه لا یعرف من طریق یجوز ذکره الا طریق ابی بشر عن سعد بن جبیر من الشک الذی وقع فی وصله واما الکلبی فلا یجوز الراویة عنه لقوة صعفه ثم رده من طریق النظر بان ذلک لنوقع لا ارتد کثیر ممن اسلام قال ولم ینقل ذلک انتہیٰ.

''شانزدھم: کہا کہ بزار نے بتا دیا کہ یہ حدیث کسی ایسے

طریقہ سے مروی نہیں ہے جس کا ذکر کرنا جائز ہو بجز اس طریقہ کے جو ابو بشر نے سعید بن جبیر سے رویات یا ہے۔ لیکن با ایں ہمہ اس کے وصل میں شک واقع ہوا ہے۔ لیکن کلبی۔ تو اس سے روایت کرنی جائز نہیں ہے۔ بوجہ اس کے ضعف کے۔ پھر اس حدیث کو عقلاً رد کیا ہے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے۔ حالانہ یہ کہیں منقول نہیں انتہیٰ۔

وجمیع ذلک لا یتمشی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت و تباینت مخارج دل ذلک علی ان لها اصلا وقد ذکرنا ان ثلاثة اسانید منها علی شرط الصحیح وهی مراسیل یحتج بمثلها من یحتج بالمرسل و کذا من لا یحتج به لا عتضاد بعضها ببعض. (مواهب).

”ہفتدھم: اور یہ سب باتیں قواعد احادیث کے مطابق نہیں چل سکتیں کیوں کہ جب حدیث کے بہت سے طریقے ہوں اور انکے مخرج جداگانہ ہوں۔ تو اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کے کچھ اصل ضرور ہے۔ اور ہم نے بیان کیا ہے کہ تین سندیں ان میں سے صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور دو مرسل ہیں اور ان مثل سے دلیل لاتے ہیں۔ وہ لوگ جو مرسل سے دلیل لاتے ہیں اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو مرسل سے دلیل نہیں لاتے۔ کیوں کہ بعض طریقہ سے بعض سے تقویت ہوتی ہے۔“۔

اس قصہ کی نسبت مصنف مواہب لدنیہ نے جو طول طویل بیان کیا ہے وہ اس مقام پر ختم ہوتا ہے۔ مگر مصنف مواہب لدنیہ نے اخیر کو جو یہ بات بیان کی ہے کہ ”روایت کے

متعدد مخرج ہونے سے اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ ان کی کچھ اصلیت ہے اور تین سندیں جن کا سلسلہ آں حضرت تک نہیں پہنچا ہے۔ صحیح تصور کرنے کے لائق ہیں اور جو لوگ کہ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آں حضرت تک نہ پہنا ہو صحیح تصور نہیں کرتے وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کریں گے'' یہ بیان اس کا محض غلط ہے۔ جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں اور جو خود اس نے بیان کی ہیں۔ باہم مختلف ہیں اور روایات مختلفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس کے متعدد مخارج ہیں۔ اور روایات مرسل یعنی جس کا سلسلہ آں حضرت تک نہ پہنچتا ہو گو کہ اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو قابل سند نہیں ہے جب تک کہ اس کی تائید کے لیے کوئی روایت مستند موجود نہ ہو تو اور نیز وہ روایت قرآن مجید کے مخالف نہ ہو لیکن جب کوئی روایت مثل روایت مذکورہ بالا کے قرآن مجید کے احکام کے برخلاف ہو۔ اور جب کہ وہ جناب پیغمبر خدا کے ان تمام حالات کے برخلاف ہو جو شرک کے مٹانے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصول سے اتفاق نہ رکھتی ہو اور معہذا ایسی مختلف اور مشتبہ ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے اور کہنے والا بھی محقق نہ ہوا ہو تو ایسی روایت از روئے عقل اور انصاف کے کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے۔ جن میں اس روایت کے داخل کرنے کو مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی ہے۔

وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔ اب یہ سوال ہو سکتا ہے کہ سر ولیم میور اس قدر اعتماد کے ساتھ کس بنا پر یہ فرماتے ہیں کہ ''بہ ظاہر ایک خوب مستند قصہ موجود ہے۔ جس سے محمد صاحب کا مشرکین کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کر لینا ثابت ہوتا ہے''۔

اس روایت کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا اس کتاب کے پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔ خود مصنف مواہب لدنیہ نے جو روایتیں اس کی نسبت لکھی ہیں انہیں سے اس کی صحت اور عدم صحت کا سراغ لگاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فقرہ:

تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجیٰ

ہرگز جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔ کیوں کہ مصنف مواہب لدنیہ میں لکھا ہے جیسا کہ فقرہ دوم میں ہم ن نقل کیا ہے کہ ''جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی''۔

جناب پیغمبر خدا کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے یعنی جب آنجناب مکہ میں تشریف رکھتے تھے کہ کفار مکہ آنحضرت کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور ہر طرح پر جوان کا وحشیانہ بغض ایجاد کرسکتا تھا آں حضرت کو تکلیف دیتے تھے۔ کفار مکہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ آں حضرت کو نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے تھے اور جب کہ آنحضرت خدائے واحد کی حمد وثنا بیان فرماتے تھے مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت سورہ نجم نماز میں پڑھ رہے تھے تو کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی۔

یعنی جب کہ جناب پیغمبر خدا سورہ نجم پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر پہنچے

افرئیتم اللات و العزیٰ ومنات الثالثۃ الاخریٰ

تو مشرکین میں سے کسی نے بتوں کی تعریف کی غرض سے یہ جملہ کہا

تلک الغرانیق العلیٰ و ان شفاعتھن لترجیٰ

اور جب کہ جناب پیغمبر خدا نے سجدہ کیا۔ مشرکین نے بھی براہ برابری اپنے بتوں کو سجدہ کیا۔ مشرکین میں اس بات کا اختلاف ہوا۔ کہ وہ جملہ کس نے کہا۔ کچھ عجب نہیں کہ مشرکین سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا مگر ان کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا اور اس لیے آنحضرت سے زیادہ دشمنی پر مستعد ہو گئے۔ اس وقت کے مسلمان ہوگز یقین نہیں کر سکتے تھے۔ کہ آں حضرت نے وہ جملہ فرمایا ہو۔ اور کہنے والا بھی متحقق نہیں ہوا۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ شیطان نے کہا تھا بعد اس کے جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت پہنچی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا۔ جو لوگ سیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتیتھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا دے سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلا ہوا معلوم ہوا نہوں نے ہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے۔ کیوں کہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیے تھے۔ مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر صاحب نے وہ لفظ کہے تھے۔ با ایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جناب رسول خدا کے اصحاب میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی نہج پر پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلنا خیال نہیں کیا۔ کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو۔ بلکہ نہ کسی نے صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے ان کو بیان کیا ہے۔ یہی بے سرو پا باتیں ہیں۔ جن کا ذکر طبری اور واقدی اور ابن اسحاق نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے وہ جملہ مشرکین میں سیکسی نے کہا تھا اسکی تشریح خود مواہب لدنیہ کی ایک روایت میں مندرج ہے۔ جس کو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

اس روایت کا ترجمہ یہ ہے:

وقیل انہ لما وص الی قولہ ومناۃ الثالثۃ الاخری خشی المشرکون

ان یاتی بعد ھایشی ایذم آلھتھم بہ فبادر وا الی ذلک الکلام فخلطوہ فی تلاوۃ النبی صلعم علی عادتھم فی قولھم لا تسمعوا لھذا القرآن و الغوافہ ونسب ذلک الی الشیطان لکونہ الحامل لھم علی ذلک اوالمراد بالشیطان شیطان والانس (مواھب)

''اور کہا گیا ہے کہ رسول اللہ جب اس آیت پر پہنچے'' ومناۃ الثالثۃ الاخری) ومشرکوں کو یہ ڈر ہوا۔ کہ اس کے بعد کچھ ایسی چیز نہ پڑھیں جن میں ان کے خداؤں کی مذمت بیان کریں پس وہ لوگ فوراً یہ کلام کرنے لگے اور رسول خدا کی تلاوت میں ملا دیا۔ اپنی اس عادت کے موافق جیسا کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس قرآن کو سنو مت اواس میں گڑ بڑ کر دو۔ اور یہ بات منسوب ہوگئی شیطان کی طرف۔ کیوں کہ اس نے ان لوگوں کو اس پر آمادہ کیا تھا یا شیطان سے مراد آدمیوں کے شیطان ہیں (یعنی شریر آدمی)''۔

روایات کے معتبر قرار دینے کے لیے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''جب کسی روایت میں محمد صاحب کی تحقیر کے کلمات ہوں مثلاً بعد ہجرت کے اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو یا کار خیر میں ناکام ہونا یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشاء اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جاوے تو اس کے تسلیم کرنے کو قوی دلیلیں ہیں۔ کیوں کہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں اختراع کر لی جاویں یا مخترع ہو کر محمد صاحب کے متبعین میں رواج پا سکیں''۔

درحقیقت کسی روایت کی صحت کے اثبات کا یہ ایک عجیب طرز ہے! کیا ہم کسی کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے موضوع اور مخترع کیا

تھا۔ اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں یا وہ کسی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پا گئی تھیں اور جن کی نسبت علماء نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں نے پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں۔ دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بے ہودہ روایتیں اور قصے آں حضرت کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سیکہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں اختراع کر لیے تھے۔ پس ان مذکورہ بالا وجوہات سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا کوئی دلیل ان کی صحت کی نہیں ہو سکتی۔

تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ ''قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایت اختراع کر لی جاوے یا مخترع ہو کر متبعی محمد صاحب میں رواج پا سکے'' یہی ان کی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے ہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مخترع ہیں۔

آں حضرت صلعم کے خضاب لگانے پر بحث

سر ولیم میو نے ایک اور نیا قاعدہ ایجاد کرتے ہیں اور اس کا نام ''تلون آمیز اختراع'' قرار دیتے ہیں اور اس کی مثالیں اس طرح پر بیان کرتے ہیں کہ ''مثلاً بیس گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب خضاب کیا کرتے تھے اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں۔ بعض صرف اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بہ چشم خود اس امر کو پیغمبر صاحب کی زندگی میں مشاہدہ کیا تھا۔ بلکہ ان کی وفات کے بعد آپ کا بال جس پر کہ رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا۔ اور بیس گواہ جن کو ایسے ہی عمدہ ذریعے واقفیت کے حاسل تھے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر

صاحب نے کچھ خضاب نہیں کیا اوران کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے سفید بال نہایت کم تھے کہ گنتی میں آسکتے تھے۔اورآں حضرت نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں کیا۔ جولوگ کہ ہمیشہ حاضر باش رہتے تھے ان کا یہی بیان ہے۔ جوکہ سفید بال ہونے سے پہلے اکثر بال بھورے ہوجاتے ہیں۔تو جن لوگوں نے ان کے بھورے بالوں کودیکھا خیال کیا کہ خضاب کیے ہوئے ہیں اورانہوں نے آں حضرت کا خضاب کرنا بیان کیا ل۔ اور اسی بھورے بال کو دکھا کر استدلال کیا۔ خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے۔ بلکہ حدیث میں اس شے کا ذکر ہے جس کوپیغمبر خدا کے بروقت غسل کے اپنے سر پر ملتے تھے۔پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف حالات مذکورہ بالاک سبب قدرتی اسباب سے وقوع میں آسکتا ہے ان کو دیدہ و دانستہ عیارانہ بناوٹیں نہیں کہہ سکتے اور نہ ان روایتوں کواور نہ اسی قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سر ولیم میور نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض روایتیں کہہ سکتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی مہر

بعداس کے سر ولیم میور اس قسم کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ خاتم نبوی کے باب میں جس میں کوئی جانب داری مطالب خاندانی یا عقیدہ کے مضر نہ تھی نہایت متناقض روایتیں ہیں ایک فریق کا قول ہے کہ اپنے مرالات پر مہر لگانے کی ضرورت سے پیغمبر صاحب نے خالص چاندی کی ایک انگشتری بنوائی تھی۔ دوسرے فریق کا قول ہے کہ خالد ابن سعید نے اپنے واسطے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی

تھی اور محمد صاحب نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا۔ ایک تیسری روایت یہ ہے کہ ان انگشتری کو عمر ابن سعد حبش سے لائے تھے۔ اور چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ ابن جبل نے اس مہر کو اپنے لیے یمن میں کھدوایا تھا۔ بعض روایتوں میں منقول ہے کہ حضرت محمد صاحب اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے اور بعض میں لکھا ہے کہ الٹے ہاتھ میں۔ بعض روایات میں مندرج ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رکھا کرتے تھے۔ اور بعض میں ہے کہ باہر کی طرف کو۔ بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر جملہ ''صدق اللہ'' منقش تھا او بعض سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ ''محمد رسول اللہ تھا'' اب یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں کیوں کہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد صاحب کی وفات کے بعد اسی انگشتری کو ابوبکر اور عمر اور عثمان نے زیب انگشت کیا تھا اور عثمان کے ہاتھ سے چاہ غریس میں گر پڑی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ نہ تو پیغمبر صاحب نے اور نہ کبھی ان کے خلفائے راشدین نے کوئی انگشتری پہنی''۔

جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا گیا ہے بلاشبہ نہایت افسوس کے قابل ہے اور سر ولیم میور کی طبیعت سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان سر ولیم میور کا کہ ''یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں'' محض غلط ہے اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری نے کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کی ہو؟ یا چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول والی علیحدہ ہو۔ کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ ابن جبل والی پر جملہ ''صدق اللہ'' اور جناب پیغمبر خدا کی بنائی ہوئی انگوٹھی پر جملہ ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا؟ کبھی آں حضرت نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو اور کبھی الٹے ہاتھ میں اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہو اور کبھی باہر کی طرف۔ اس انگوٹھی کو آں حضرت اور خلفاء راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں

رہتے تھے جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا کہ کبھی انگوٹھی پہنی ہی نہیں تھی جو کہ سر ولیم مییو ر نے غلطی ے یا دانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری کے متعقل کیا ہے اس لیے اپنی دلیل میں بلا تفصیل بیان کرتے ہیں کہ وہی انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی ۔ حالانکہ وہ صرف وہ انگشتری تھی جس پر جملہ ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا۔ پس ان روایتون میں سے کوئی روایت بھی متناقض نہیں ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی اور دل نشین نقوش و خیالات کو اس قدر آزادی دے ری ہے ک ان کو حجت و برہان کی صرط مستقیم سے منحرف کر دیا ہے اور ہر شے متعلق باسلام کو گو کیسی ہی ساہد اور قری قیاس کیوں نہ ہو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل کیا ہے اور اس کو جعل سازی اور ایجاد و اختراع وغیرہ کے ناموں سے بدنام کرتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تجربہ کاری سے بہ حیثیت ایک اعلیٰ درجے کے عالم ہونے کے یقینی امید تھی کہ ان کو اس بات سے مطلع کر دے گی کہ محض بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل و ثبوت نہ ہو۔ ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کے باعث ہوتے ہیں جن کی حمایت ان سے توقع کی گئی ہو۔

اسلام میں جھوٹ بولنا جائز نہیں

ہر صحیح دماغ اور ذی ہوش شخص کو اس بات کے معلوم ہونے سے ملال ہو گا کہ سر ولیم میور نے قواعد فن تصنیف سے اس قدر انحراف کیا ہے کہ دین اسلام کے الفاظ ذیل میں ایک

بے جا اتہام عاید کرتے ہیں یعنی وہ فرماتے ہیں کہ ''مقدس جھوٹ کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے۔ مروجہ دینیات اسلام کی رو سے بعض حالتوں میں روا ہے کہ خود پیغمبر صاحب نے اپنے احکام ونظیر سے اس عقیدہ کی ترغیب کی ہے کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے''۔ اس عبارت کے حاشی میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے ہاں عام اعتقاد یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے اول کسی شخص کی جان بچانے کے واسطے۔ دوم صلح اور اتفاق کرانے کے واسطے۔ سوم عورت کی ترغیب دینے کے واسطے۔ چہارم سفا یا مہم کے وقت میں۔

ان کی مثالیں بھی ایک صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ اور فرماتے ہیں کہ اول کی نسبت تو پیغمبر صاحب کی صریح منظوری موجود ہے۔ عمار ابن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انہوں نے رہائی پائی۔ پیغمبر صاحب نے اس فعل کر پسند کیا اور فرمایا کہ ''اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا'' (کاتب الواقدی صفحہ ۲۲۷)ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا اور جب تک کہ ان سے محمد صاحب کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی ان کو نہ چھوڑا۔ اور جب وہ پیغمبر صاحب کے پاس آئے اور انہوں نے حال پوچھا تو کہا یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ جب تک کہ میں نے آپ کی مزمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا۔ پیغمبر صاحب نے پوچھا کہ تو اپنے دل کا کیا حال پاتا ہے۔ تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے۔ اس وقت محمد صاحب نے یہ فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا۔ محمد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے۔

سرولیم میور کی نکتہ چینی ہر ایک شخص کو تعجب میں ڈالتی ہوگی۔ شیکسپیئر کا قول ہے ''دیکھو

کہ کس طرح سادہ قصہ تم کو دھوکا دے دے گا'' اول تو ان روایتوں ک جس کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے دوسرے جن الفاظ می صاحب موصوف نے ان مضامین کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں یعنی زیادہ تر عام اور غیر معین ہیں۔ سر ولیم میور اول جھوٹ بولنے کے جواز کا ''کسی کی جان بچانا'' بیان کرتے ہیں۔ اول تو یہی غلط ہے کیوں کہ بہ موجب ان روایتوں کے جو انھوں نے بیان کی ہیں ''اپنی جان بچانا'' لکھتے اور اس بے دھڑک اور پر جرات بیان کی بجائے سر ولیم میور کو لازم تھا کہ جملہ شرائط اور قیود اور مواقع کی جو صدق سے اس طرح انحراف کرنے کو جائز ٹھیراتے ہیں تصریح کر دیتے۔ جس فبیپندہ اور معیوب پوشاک میں سر ولیم میور نے اس مضمون کو ملبوس کیا ہے اگر وہ اتار لی جائے تو وہ اصلی نتائج جو بذریعہ جائز اور منصفانہ دلیل اور صحیح مقدمات سے مستنبط ہوں گے یہ ہوں گے کہ ''اگر کفار یا کوئی بے رحم و جفا کار اشخاص جبر اور اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی ایسے آدمی سے یا اس شئے کا انکار کرا لیں جس کو کہ وہ اپنے دل سے اور ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس کے اوپر وہ ایسی مصیبت میں بھی دلی اعتقاد رکھتا ہو تو ایسے حال میں اگر وہ اس سے انکار کرے تو سزائے ارتداد کا ہرگز مستوجب نہیں ہے۔''

جبر یہ مواعید سے انحراف کے جواز کی تصدیق فرانسس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ہوتی ہے یعنی اس بادشاہ کو چارلس خامس نے جنگ پاویا (۱۵۲۵ء) میں مقید کر کے ماڈرڈ کے پر ذلت صلح نامہ کا بالجبر اقبال کرے دستخط کر کے ماڈرڈ بادشاہ فرانس نے مخلصی پاتے ہی اپنے قول و قرار پر قائم رہنے سے بہ عذر اجبار انکار کیا اور پوپ کلیمینٹ سابع نے درحقیقت اسی کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔

آدمی کے افعال کے جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے اور اسی بنا پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں۔ کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے بہ سبب

ازیت اور قتل کی دھمکیوں کے لکھوا اور کرا لیے گئے ہوں اسی درجہ سے ویسی سزا کے مستوجب ہیں جیسے کہ اس شخص کے کلمات اور حرکات جو بلا اجبار وا کراہ اس سے سرزد ہوئے ہوں۔

یہ اصول جس سے کہ اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور جو محض ایک بے خطا اور قدرتی فطرت کا بے کم و کاست سچا نمونہ ہے اور جس کو سر ولیم میور نے البتہ قابل الاعتراض اور خراب صورت میں بیان کیا ہے۔قرآن مجید میں نہایت سادہ اور صریح طور پا بالفاظ ذیل بیان کیا گیا ہے کہ:

من کفر باللہ من بعد ایمانه الامن اکره و قبله مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرا فعلیهم غضب من الله ولهم عذاب عظیم .
(سورۃ النحل آیت ۱۰۸)

"جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا بعد ایمان لانے کے۔مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔لیکن جس نے کفر کے ساتھ سینہ کھولا پس اس پر خدا کا غصہ ہے اور ان پر بڑا عذاب ہے"۔

اس آیت پر فقہا نے غور کی ہے اور اس کے حکم کا مقصد دو طرح پر قرار دیا۔اول عزیمت یعنی باوصف اذیتوں اور تکلیفوں اور قتل کے خوف سے جو کفار اس پر روا رکھیں۔وہ ظاہر امیں بھی اسی سچ پر قائم رہے جس پر وہ ایمان رکھتا ہے۔دوم رخصت یعنی ایسی حالت مُں اس کو اپنے بچانے کے لیے اجازت ہے کہ ظاہر میں اس ایمان کا جس کی تصدیق اس کے دل میں ہے بہ طور تقیہ کے انکار کرے اور دشمنوں کی ایذا سے نجات پاوے۔البتہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ سر ولیم میور نے اس حقیقت کو اس مقدس جھوٹ پر محمول کیا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا اور اس پر بھی ہم کو نہایت تعجب آتا ہے کہ انہوں نے اپنے مدعا کو

عجیب اختصار اور اقتصاد کے ساتھ ادا کیا ہے یعنی ان چند لفظوں میں کہ ''کسی کی جان بچانے کے واسطے'' جس کے بیان کے لیے قرآن مجید میں بھی باوجود اس کی مشہور و معروف مختصر البیانی کے ایک پوری آیت درکار ہوئی ہے۔

دوسرا موقع جواز کذب کا بہ قول سر ولیم میور کے وہ ہے جب کہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ امر روایت ذیل سے بہ خوبی ثابت ہے۔ اس روایت کا ترجمہ انگریزی زبان میں جو انہوں نے فرمایا ہے کہ وہ حسب مندرجہ ذیل ہے۔

''وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے واسطے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے گو وہ کلمات دروغ ہوں''۔

مگر یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے۔ اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے جس کو مشکوۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہ اس مقام پر لکھتے ہیں۔

اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ:

عن ام کلثوم قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیس الکذب الذی یصلح بین الناس فیقول خیر او ینمی خیرا (متفق علیہ مشکوۃ)

''ام کلثوم نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسل نے فرمایا کہ نہیں ہے جھوٹا وہ شخص جو صلح کرا دے درمیان آمیوں کے پس کہے بھلائی اور پہنچاوے بھلائی''۔

قاضی بیضاوی نے اس کی شرح اس پر کی ہے کہ:

قال القاضی بیضاوی ای یبلغ ما یسمعہ ویدع شرہ (کرمانی).

''پہنچاوے وہ باتیں جو منوا دیں اس کو اور چھوڑ دے شر کی

باتوں کو''۔

سر ولیم میور کی عربی علمیت کو خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ بجائے اس کے وہ خود اصل حدیث پر غور کرتے اور خود اس کا صحیح ترجمہ لکھتے انہوں نے کپتان ای این میتھیو کے غلط ترجمہ مشکوۃ کو اختیار کیا ہے اور کپتان میتھیو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ ''گو وہ کلمات دروغ ہوں'' اپنے ترجمہ میں بڑھا دیے ہیں اور وہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے بیان نہ کرے۔اور قصداً کی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوء بات کہے اور کوئی بات نہ کہے تو اس پر بھی کذاب کا اطلاق ہوتا ہے اس لیے جناب پیغمبر خدا نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں داخل نہیں ہے یعنی جو سزا کہ ایسے شخص کے لیے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے اس سزا کا مستحق نہیں ہے''۔

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''کسی عورت کو ترغیب دینے میں'' اور ''سفر یا مہم میں'' سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ''بہ لحاظ تیسرے موقع کے ہمارے پاس ایک افسوس آمیز نظیر موجود ہے کہ محمد صاحب نے ماریہ قبطیہ کے معاملے میں اپنی ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے معیوب نہ سمجھے اور بہ لحاظ چوتھے موقع پر ان کا معمول تھا کہ بہ وقت ترتیب مہمات (باستثنائے مہم تبوک) اپنے مدعائے اصلی کو پوشیدہ رکھتے تھے اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے''۔

سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے۔کوئی صحیح روایت

اس معاملہ میں قابل موجود نہیں ہے اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کی بابت ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور چوں کہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سیاوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے۔ پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔ جب کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو مشتہر کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کریں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہی۔ جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے عزم جنگ مشتہر نہیں کیا گیا تھا اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکا ہو بلاشبہ خلاف اخلاق اور صداقت کے ہے۔ لیکن جب جنگ کا اشتہار دے دیا جاوے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو صداقت کے خلاف نہیں ہے۔

عیسائی مذہب میں جھوٹ بطور رکن مذہبی

تعجب ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آرہا ہے مسلمانی مذہب پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ مقدس جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا کیوں کہ اس کا تصور ہی اس صدق حقیقی کی نقیض ہے جو قرآن مجید کا لب لباب ہے اور جو ہر ہے اور اس کی ہر سطر میں جلوہ نما ہے۔ برخلاف اسکے یہودیوں اور عیائیوں کے ہاں جیسا کہ تاریخ سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے من جملہ ارکان مذہبی کے مقدس جھوٹ بھی ایک رکن تھا اور ہم کو اس بات کے سننے سے تعجب آتا ہے کہ مقدس پال حواری نے اس کو برا بھی نہیں سمجھا تھا گناہ سمجھنا تو درکنار جیسے کہ خود عیسائی عالم اس امر کو مقدس پال کے اس کلام

سے ثابت کرتے ہیں کہ جہاں انہوں نے فرمایا ہے کہ "اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اوراس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لیے میں گنہگار گنا جاتا ہوں"۔(پال کا خط رومیوں کو باب ۳ ورس ۷)۔

اب ہم تاریخ کی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا ذکر کرتے ہیں جو عیسائی مذہب میں مروج تھا۔ کتاب کرشچین مایتھولوجی ان ویلڈ میں مرقوم ہیکہ "کلیسا وہ شریف اور راست باز فرزند یعنی موشیم جس کی سند اور مسلمہ صداقت میں پادریوں کو کبھی کلمانہیں ہوا ہے امرذیل کی تصدیق کرتا ہے پیروان افلاطون وفیثا غورث نے اس امر کو ایک اصول قرردیا تھا کہ صدق وپرہیزگاری کے مطالب کی ترقی کی غرض سے دھوکا دینا اور نیز بروقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ یہودیان سکنائے مصر نے حضرت عیسیٰ کے آنے سے پیش تر اس اصول کو ان سے (یعنی پیروان افلاطون وفیثا غورث سے) سیکھا اوراخذ کیا تھا جیسا کہ بے شمار تحریرات سابقہ سے بلا حجت واعتراض ثابت ہے اور عیسائیوں پر اس مضر غلطی نے ان دونوں ذریعوں سے اثر لیا ہے۔ جیسا کہ ان بے شمار کتابوں کو جن کو نامی وگرامی اشخاص کی طرف سے اتہاما منسوب کیا ہے ظاہر ہے کہ خلاصہ صدر صرف دوسری صدی کی طرف اشارہ کرتا ہے جب کہ بے شمار اناجیل وخطوط وغیرہ حسب بیان موشیم غلط موضوع ہوئی تھیں اور غلط منسوب کی گئی تھیں۔ مگر چوتھی صدی میں اس مروجہی اصول میں کہ دینی مطالب کی ترقی کے واسطے دھوا کا دینا اور جھوٹ بولنا نہایت ثواب کا کام ہے۔ بہت کم استثناء وقوع میں آئے ہیں...... بلانڈل دوسری صدی کے ذکر میں بیان کرتا ہے کہ خواہ مزدوروں اور کذابوں کی اشد بے حیائی خواہ معتقدین کی قابل افسوس سریع الاعتقادی کے لحاظ سے یہ ایک نہایت خراب زمانہ تھا اور مقدس جھوٹ میں اور سب زبانوں سے سبقت لے گیا تھا...... کسوبن اس طرح پر شاکی ہے کہ مجھ کو دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں ا

سبات کے دریافت ہونے سے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی کو اپنے اختراعات سے مدد دینے سے ناموری سمجھتے تھے بدیں غرض کہ ہمارے نئے عقیدہ کو عقلائے کفار گوش دل سے سنیں'' (صفحہ ۸۰۔۸۲)۔

اسی کتاب میں یہ بھی بیان ہے کہ ''اور جب کبھی معلوم ہوتا تھا کہ انجیل ہر امر میں اہل دین کے مطالب یا حکام ملکی کے اغراض کے جوان سے ساز رکھتے تھے موافق نہیں ہے تو ضروری تحریفات کر لی جاتی تھیں اور اطرح طرح کے مقدس جھوٹ اور جعل سازیاں کچھ مروج ہی نہ تھیں۔ بلکہ بہت سے پادریوں نے ان کو جائز قرار دیا تھا''۔ (صفحہ ۵۲)

اس کتاب میں ایک اور مقام پر یہ بیان ہے ''اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں بجز اس کے جو نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے کس واسبے کہ ان اہل سیر کی روایتیں اور حکایتیں جو اس زمانہ میں گزرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں یہ محض مقدس جھوٹ اور جعل سازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ صدی آئندہ میں ان سے بھی سبقت لیے گیا جس کا کلام حق کو چھانٹ چھانٹ کر دین کے عام مطالب سے موافق کر دینے میں کوئی ہم سر نہ تھا۔ وہ خود براہ فخر بیان کرتا ہے کہ ''جس سے ہمارے دین کی عظمت و نام آوری بڑھے میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اس کی تحقیر و تذلیل کی طرف مائل ہو میں نے سب چھوڑ دیا ہے'' (صفحہ ٦٦)۔

متعدد اہل سیر کی تحریرات میں عدیم الامکان ریاضت اور عام سفلہ پن کی جو عیاشی و بدوضعی کی طرف مائل ہے ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے شہوات جسمانی اور خوف ایمانی کے مابین غلبہ حاصل کرنے کی صریح کوششیں اکثر قابل تضحیک معلوم ہوتی ہیں گو بعض ان کی لذات دیرینہ سے ثابت ہوتی ہیں لذات جدیدہ کی خواہش ان میں مستتر معلوم ہوتی ہے مگر

یہ صرف طبیعت انسانی کے ضعف کی وجہ سے ہے اور ہم کو صرف اسی وقت رنج آمیز حیرت ہوتی ہے کہ جب وہ صفات ملکوتی کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے خام اور بے ہودہ عقائد جو لاطینی زبان میں بیان ہیں پادریان کیتھلک کے ہر وعظ و خطبہ میں مخلوط ہیں اور حواریان ذی الہام کے عقائیج اور نیز حضرت مسیح کے ملفوضات کی نسبت زیادہ تر منقول ہوتے ہیں لیکن یہ امید ہے کہ ٹریٹولین کے خیالات لاطائل ڈی ہابی ٹیومولیرس اور سنٹ باسل کی ڈی ویروارجی نے ٹےٹی نو جوان عورتوں کو نہیں دکھلائی جائیں گی۔ تمام بے اعتقاد مصنف جنہوں نے احکام الٰہی کا فلسفہ کی رو سے امتحان لیا ہے دین عیسوی کو کفر بتا کر مضرت پہنچانے مین اس قدر ساعی نہیں ہوئے جس قدر کہ حضرت اہل سیر ہوئے ہیں۔ انہوں نے چشمہ آب ہی کو زہریلا کر دیا ہے اور ان بے اعتقاد مصنفین نے اس کا پانی پینے سے لوگوں کو باز رکھا ہے۔ ان کی سریع الاعتقادی نے جو اس وجہ سے عارض ہوئی تھی کہ وہ طبائع و معاملات انسانی سے محض ناتجربہ کاری اور علوم طبیعی سے بالکل ناواقفیت رکھتے تھے انجیل کی بے شرمانہ تحریفات و تصرفات کی استعانت سے کلیسائے روم میں عجیب و غریب بے ہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر شائع کر دیا ہے جن کو باوجود داد و فریاد عقل کے خود اعتقادی اب بھی ہضم کر جاتی ہے۔ صرف اسی قدر مضرت ان سے نہیں پہنچی ہے انہوں نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلی کر دیا انہوں نے اس مقولہ کی (جس کو میں موشیم کے الفاظ میں لکھتا ہوں) تلقین کہ دھوکا دیا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان ذریعوں سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں ثواب ہے کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مطلق العنان اصول نے دروغ گوئیوں اور جعل سازیوں کے چشمہ کا دھانہ کھول دیا جس کا پانی ابتدا دین عیسوی کی سرزمین میں مثل طوفان کے چھا گیا اور ان فریبوں اور باطنی ذخیروں کو جو فی زمانناعیسائیان رومن کیتھولک کو انگشت نما اور بدنما کرتے ہیں رواج دیا۔ اہل سیر میں اول سے لے کر آخر تک سب سے بڑا

خاصہ یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کفر آمیز سفلگی سریع الاعتقادی تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے باایں ہمہ ایسے لوگوں کو جانشینیان پطرس حواری نے پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں لکھا ہے۔

سر ولیم میور کو مناسب تھا۔ کہ ان حالات پر خیال کر کے اسلام کی نسبت مقدس جھوٹ کی بے جا طور پر تہمت لگانے کی کوشش نہ فرماتے۔ اسلام سرتا پا صدق ہے۔ وہ نہایت درجہ کے صدق اور راست بازی کا دین ہے اور اسی حیثیت سے اور سب دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے فوقیت کے دعوے کا مجاز ہے۔

☆☆☆

(۷) قرآن جناب پیغمبر خدا پر کس طرح نازل ہوا

انه القران کریم فی کتاب مکنون لا یمسه الا المطهرون

قرآن مجید جناب پیغمبر خدا پر حضرت موسیٰ کی طرح پتھر کی تختیوں پر کھدا ہوا نازل نہیں ہوا تھا اور نہ اس بات کی ضرورت پڑی تھی کہ ان کے ٹوٹ جانے کے سبب اس کے ضائع ہو جانے کا خوف ہوا ہو اور پھر آں حضرت کے اصحاب کے لیے اس کی دوبارہ نقل پتھر کی تختیوں پر کھودنے کی ضرروری پڑی ہو۔ اسکے نزول کی نسبت کوئی امر عجائبات سے بھرا ہوا نہ تھا کیوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دل سینا کا پہاڑ تھا اور مسلمانوں کے دل پتھر کی لوحیں تھیں ۔خدا فرماتا ہے کہ:

وانہ لتنزیل رب العالمین نزل به الروح الامین دلی قبلک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین وانه لفی زبر الاولین (سورہ شعرا)

''بے شک وہ اتارا ہوا ہے عالموں کے پروردگار کا۔ اس کو اتارا ہے روح الامین نے اوپر تیرے دل کے تا کہ تو ہو ڈرانے والوں میں سے (اس کو اتارا ہے)عربی زبان واضح میں اور بے شک وہ ہے اگلے کے صحیفوں میں''۔

نزول قرآن کے متعلق عائشہ صدیقہ کی روایت

عن عایشه ان الحارث ب هشام سال یا رسول الله صلعم فقل یا رسول الله کیف یا تیک الوحی فقال رسول الله صلعم احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس هو اشد علی فیفصم عنی وقد وعیت عنه ماقال و احیانا بتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاوعی ما یقول ......(متفق علیه).

''حضرت عائشہ صدیقہ نزول وحی کی کیفیت اس طرح بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے آں حضرت سے پوچھا کہ یا رسو ل اللہ آپ پر وحی کیوں کر اترتی ہے۔آپ نے فرمایا کہ کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ کو بہت سخت معلوم ہوتی ہے پس پھر مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے اور میں یاد رکھا جو کہا کہ کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس میں یاد رکھتا ہوں جو کہتا ہے''۔

جو طریقہ نزول وحی کا اس حدیث میں رسول خدا نے بتایا اس میں کوئی عجیب امر یا اسرار نہیں ہے لیکن بالفعل ہم اس مضمون کو اور وحی کی حقیقت کے بیان کو چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ ہمارا ارادہ ہے کہ جب پیغمبر خدا کی سوانح عمر کے اس مقام پر پہنچیں گے۔ جب کہ

آں حضرت پر اولا وحی نازل ہوئی تھی اس وقت ہم اس کو شرح و بسط سے بیان کریں گے۔

وحی یعنی قرآن مجید جب نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا یا نہیں

آں حضرت کے زمانہ سے پیشتر اور نیز آں حضرت کے زمانہ میں ملک عرب میں کوئی معین یا با قاعدہ طریقہ تعلیم کا جاری نہیں تھا۔ عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب۔ ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں بے شمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی پہلے یعنی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے پچھلوں کے مقابلہ میں امی کہلاتے تھے۔ اگر چہ ان دونوں قسموں کے لوگوں میں بہت ہی کم فرق تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی سبب سے آں حضرت کا لقب امی ہو گیا تھا۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق میں بے شمار معتبر اور مستند روایات اور احادیث سے ہوتی ہے اور اس کے برخلاف ایک بھی روایت ایسی نہیں پائی جاتی جو کسی قدر بھی معتبر ہو۔ درحقیقت اگر آں حضرت کو لکھنا پڑھنا آتا ہوتا تو ان کے صحابہ رفقا اور متبعین اس امر میں کسی طرح سکوت اختیار نہ کرتے اور ان کی ازواج مطہرات اور ان کے عزیز اور اقربا اور بالخصوص ان کے چچا جنھوں نے ان کو پالا تھا بے خبر نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ایسی جرات ہو سکتی تھی۔ کہ اپنے قبیلہ کے سامنے خلاف واقعہ اپنے آپ کو امی فرماتے اور قرآن مجید میں بھی اپنے تئیں اسی لقب سے ظاہر کرتے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں مخالفین کو گرفت کا آسان موقع ہاتھ آ جاتا اور

شاید اسلام کی تصدیق پر ان کو ہر گز یقین نہ آتا۔ قطع نظر اس کے ایک ایسی خفیف بات کے چھپانے سے جناب پیغمبر خدا کو کیا فائدہ تھا۔ ان کا لکھا پڑھا ہونا منصب نبوت کے کسی طرح مخالف نہ تھا اور نہ اس سے قرآن مجید کی شان اور اس کے معجزہ میں اور بے مثل فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق آ سکتا تھا کیوں کہ حروف کے لکھ لینے یا پڑھ لینے سے کوئی انسان فصیح و بلیغ نہیں ہوسکتا تھا ایسا فصیح و بلیغ جس کا مثل عرب کے بڑے بڑے فصحا میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

اسلام کے مورخوں میں سے کسی کو اس بات کا انکار نہیں ہے کہ اس زمانہ میں فن تحریر کا عرب میں رائج تھا اور کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور اوروں کا لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ اس زمانہ کے بڑے بڑے شاعر اپنے قصیدوں کو کعبہ کی دیواروں اور دروازوں پر آویزاں کرتے تھے۔ چنانچہ قصائد سبعہ معلقہ اسی نام سے مسلمانوں میں معروف و مشہور ہیں اس وقت عرب میں بے شک فن تحریر کا رواج تھا مگر بہت کم لوگ اکو جانتے تھے اور بمقابلہ نہ جاننے والوں کے ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وحی جو آں حضرت پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تھی دو قسم کی تھی: اول وہ تھی جس کے بجنسہ الفاظ پیغمبر خدا پر نازل ہوتے تھے اور بجنسہ وہی الفاظ پیغمبر پڑھ کر سناتے تھے دوسری وہ جس کا مطلب پیغمبر خدا پر القا ہوتا تھا اور پیغمبر خدا اپنے الفاظ میں اس کو بیان کرتے تھے اول قسم کی وحی کو ہم اصطلاحاً وحی متلو یا قرآن یا کلام اللہ کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی وحی کو وحی غیر متلو یا حدیث۔

جب کہ قرآن مجید کی کوئی آیت پیغمبر خدا پر نازل ہوتی تھی تو آں حضرت کسی کاتب کو بلواتے تھے اور بجسنہ وہی الفاظ جو ذریعہ وحی کے القا ہوتے تھے لکھوا دیتے تھے تا کہ لوگ اس کو بہ خوبی یاد کر لیں اور وہ محفوظ رہیں۔ خود قرآن مجید کی اکثر آیتیں جیسے کہ

الم ذلک الکتاب

اور آیت

لا یمسه الا المطھرون

اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گو پچھلی آیت کی دوسری حقیقت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات نازلہ کے لکھ لینے کی رسم اوائل ایام نزول وحی سے اختیار کی گئی تھی کیونکہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آں حضرت کے مکہ سے ہجرت کرنے سے پیش تر یعنی اس زمانے میں جب کہ اسلام کا آغاز تھا اور وہ ایک ضعف کی حالت میں تھا ان معدود لوگوں کے پاس جو ایمان لے آئے تھے ان وحیوں کی نقلیں موجود تھیں اور حضرت عمر کے خاندان میں بھی ان کے مسلمان ہونے سے پہلے اس کی ایک نقل تھی اس لیے کہ ان کی بہن مسلمان ہو گئی تھیں۔

جب کوئی قرآن کی ایسی آیت نازل ہوتی تھی کہ اس کے پہلے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہوتی تھی تو سمجھا جاتا تھا کہ نئی صورت شروع ہوئی ہے چنانچہ:

عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل علیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم (رواہ ابو دائود).

''ابو داؤد نے ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ آں حضرت صلعم سورۃ کا علیحدہ ہونا نہیں جانتے تھے جب تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہو۔''

پوری سورۃ وقت واحد میں نازل نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض آیتیں کسی وقت اور بعض آیتیں کسی وقت نازل ہوتی تھیں اور اسی وجہ سے کسی صورت ی آیتیں بہ ترتیب لکھی نہیں

جاتی تھیں بلکہ جدا جدا چمڑوں یا اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کی چھال پر لکھی جاتی تھیں۔

اس بات کے ثبوت میں کہ جو کچھ چمڑوں یا ہڈیوں یا کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا گیا تھا وہ بالکل محفوظ اور متعدد لوگوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ چار معتبر حدیثیں موجود ہیں۔

پہلی حدیث

ابن عباس کی ہے جو بخاری میں منقول ہے:

عن ابن عباس قال جمعت المهكم فى عهد رسول الله صلعم فقلت له وما المحكم قال المفصل (بخارى باب تعليم الصبيان القرآن).

''ابن عباس نے کہا کہ میں نے محکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع کیا میں نے ان سے کہا کہ محکم کیا۔ انہوں نے کہا مفصل۔

دوسری حدیث

قتادہ کی بھی بخاری میں موجود ہے:

حدثنا قتادة قال سئلت انس بن مالك منجمع القرآن على عهد النبى صلعم قال اربعة كلهم من الانصار ابن بى كعب. معاذ ابن جبل و زيد بن ثابت و ابو زيد. (بخارى باب القراء).

''قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے انسا بن مالک سے پوچھا کہ آں

حضرت کے زمانے میں قرآن کس نے جمع کیا کہا چار شخص نے جو چاروں انصار تھے۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابو زید۔

تیسری حدیث

انس کی بخاری میں موجود ہے:

عن انس قال مات النبی صلعم ولم یجبع القرآن غیر اربعة ابو الدرداء معاذ بن جبل و زید بن ثابت و ابو زید (بخاری باب القراء).

"انس کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات کی اور چار شخصوں کے سوا کسی نے قرآن نہیں جمع کیا۔ ابودرداء، معاذ بن جبل، زیب بن ثابت، ابوزید۔"

چوتھی حدیث

وہ حدیث ہے جس میں بیان ہے کہ حضرت ابوبکر کی خلافت میں زید بن ثابت نے جب قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کرنا چاہا تو قرآن مجید کی تمام آیتیں جو مختلف وقتوں میں نازل ہوئی تھیں اور مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں اور مختلف اشخاص کے قبضہ میں تھیں ان سب کو منگا کرا کٹھا کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریرات سب موجود اور محفوظ تھیں۔

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کیوں کر ہوئی اور کس نے کی

ہم کو واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب خود جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور ان کی ہدایت اور حکم کے موافق عمل میں آئی تھی جیسے کہ:

وعن ابن عباس قال قلت لعثمان ما حملكم على ان عمدتم الى الانفال وهى من المثانى والى البراة وهى من المائين فقرنتم بينهما ولم تكتبوا بسم الله الرحمن الرحيم ووضعتموا ها فى السبع الطوال ما حملكم على ذلك قال عثمان كان رسول الله صلعم مما ياتى عليه الزمان ينزل عليه السور ذوات العد دوكان اذا نزل عليه شئى دعا بعض من كان يكتب فيقول ضعوا هولاء الايات فى السورة التنى يذكر فيها كذا وكذا و كانت الانفال من اوائل ما نزل بالمدينة و كانت براة من تصتها شبيهة بقصتها فقبض رسول الله صلعم ولم يبين لنا ان انها منها فمن ابل. ذلك قرنت بينهما ولم اكتب سطر بسم الله الرحمان الرحيم ووضعتها فى السبع الطوال . (رواه احمد و الترمذى و ابودائود).

"ابن عباس کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباس نے حضرت عثمان سے کہا کس چیز نے تم کو آمادہ کیا انفال کی طرف کہ وہ مثانی میں سے ہے اور براءۃ کی طرف کہ وہ مائین میں سے ہے۔ تمہارے اس ارادے کا پھر ان دونوں کو ملا دیا اور بسم اللہ الرحمان الرحیم کو نہیں لکھا۔ اور ان دونوں کو سبع طوال میں رکھا اس بات پر تم کو کس چیز نے آمادہ کیا۔ عثمان نے کہا۔ حضرت پر بہت سی آیتوں والی

سورتیں ایک مدت میں اترتی تھیں۔ اور جب آپ پر کچھ اترتا تھا تو
آپ ان میں سے یا کسی کو جو لکھا کرتے تھے بلا کر فرماتے تھے۔ کہ
ان ایتوں کو اس سورت میں رکھو جس میں ایسا ایسا ذکر کیا گیا ہے۔
اور انفال ان میں سے جو اول مدینہ میں اتری ہیں۔ اور براءۃ سب
سے آخیر میں اتری۔ اور اس کا قصہ اس کے قصہ سے ملتا ہوا تھا پھر
آں حضرت کا انتقال ہو گیا اور آپ نے بتایا نہیں کہ وہ اس سے
ہے۔ پس اس وجہ سے میں نے ان دونوں کو ملا دیا۔ اور بسم اللہ
الرحمان الرحیم کی سطر نہیں لکھی۔ اور ان دونوں کو سبع طوال میں رکھا۔''

بخاری کی ایک اور روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے ستر سورتیں خود
اں حضرت کے منہ سے سن کر یاد کر لی تھیں چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ:

عن شقيق بن سلمة قال خطبنا عبدالله فقال والله لقد اخذت من فی رسول الله صلعم بضعا وسبعين سورة (بخاری باب التاليف القرآن).

''عبداللہ نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ بخدا میں نے آں حضرت
کے منہ سے کچھ اوپر ستر سورتیں لیں (یعنی سیکھیں)۔''

ایک اور روایت میں بخاری ان لوگوں کینام بیان کرتا ہے۔ جنھوں نے قرآن مجید کو
حفظ کر لیا تھا اور ان کے نام یہ ہیں عبداللہ ابن مسعود' سلام' معاذ بن جبل' ابی ابن کعب' اور
ایک روایت میں آیا ہے کہ منجملہ مقتولین جنگ یمامہ کے جو پیغمبر خدا کی وفات کے تھوڑے
ہی بعد ہوئی تھی۔ ستر شخص ایسے شہید ہوئے تھے۔ جن کو قرآن مجید بالکل حفظ تھا۔

ان تمام روایتوں سے دو امر بخوبی ثابت ہوتے ہیں کہ اول یہ کہ گو جناب پیغمبر خدا کی
حیات میں قرآن مجید چمڑے وغیرہ پر کیسی ہی بے ترتیبی سے لکھا ہوا موجود ہو۔ مگر جن لوگوں

نے کہ پوری سورتیں یاد کرلی تھیں ان میں آیتوں کی بالکل ترتیب تھی اور وہ ترتیب یقینی آں حضرت کی ہدایت اور حکم کے موافق تھی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو ترتیب وار حفظ کرلیا تھا۔اس سے یہ دلیل مستنبط ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی آں حضرت ہی کے فرمانے سے لوگوں کو معلوم ہوگئی تھی۔

جناب پیغمبر خود بھی قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی اس کے پڑھتے رہنے کی ہمیشہ ہدایت کرتے تھے

اس مضمون کی نسبت ہم کو کچھ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ صرف ان معتبر اور مستند حدیثوں کا نقل کردینا کافی ہے۔جس سے امر مذکورہ کا ثبوت ہوتا ہے اور جن سے پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد رکھنے میں جس ترتیب سے کہ پیغمبر خدا نے فرما دیا تھا کس قدر لوگوں کو توجہ تھی اور وہ حدیثیں یہ ہیں۔

پہلی حدیث

بخاری کی ہے۔اس میں بیان کیا گیا ہے کہ:

عن عثمان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خیر کم من تعلم القرآن وعلمه (رواه البخاری).

''حضرت عثمان سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں اچھا وہ شخص ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا''۔

دوسری حدیث

مسلم کی ہے:

عن عقة بن عامه قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم ونحن فی الصفة فقال ایکم یحب ان یعذ وکل یوم الی بطحان اعقیق فیاتی بناقتیتن کم دین فی غیرا ثم ولا قطع رحم قلد ا یا رسول الله کلنا نحب ذلک قال افلا یغد احد کم الی المسجد فیعلم او یقرا ایتین من کتاب الله خیر له من ثلث واربع خیر له من اربع ومن اعداد هن من الابل (رواه مسلم)

''عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے۔ اور ہم لوگ صفہ میں تھے۔ پس فرمایا کہ تم لوگوں میں سے کس کو یہ پسند ہے کہ ہر روز صبح کو بطحان یا عقیق جائے اور دو اونٹنیاں لائے بغیر اس کے کہ مرتکب جرم ہو یا قطع رحم کرے۔ ہم لوگوں نے کہا یا رسول اللہ یہ تو ہم سب لوگ چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پس تم لوگ مسجد میں ہر صبح کو آ کر دو آیتیں کتاب اللہ کی نہیں سیکھتے یا نہیں پڑھتے جو دو اونٹنیوں یا اس کے لیے بہتر ہیں اور تین تین سے بہتر ہیں اور چار چار سے بہتر ہیں اور جتنی ہوں اتنی اونٹنیوں سے

بہتر ہیں''۔

تیسری حدیث

مسلم اور بخاری دونوں کی ہے:

عن عایشة قالت قال یا رسول الله صلعم الماهر بالقرآن من السفرة الكرام البورة والذی یقرا القرآن و یتتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران (متفق علیه).

''حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو قرآن کا ماہر ہو وہ پاکیزہ بزرگ نیک لوگوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں دقت اٹھاتا ہے اور اس پر شاق ہے اور اس کو دوہرا ثواب ہے''۔

چوتھی حدیث

بھی مسلم اور بخاری دونوں میں موجود ہے:

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلعم لا حد الا علی اثنین رجل آتاه الله القرآن فهو یقوم به اناء ایل و آناء النهار ورجل اتاه الله مالا فهو ینفق منه اناء اللیل و انا ء النهار (متفق علیه)

''ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

رشک کے قابل صرف دو شخص ہیں ایک وہ جس کو خدا نے قرآن دیا ہو (یعنی اس کو قرآن پڑھنا آتا ہو) اور وہ برابر دن رات تلاوت کرتا رہے اور ایک وہ جس کو خدا نے مال دیا ہو اور وہ برابر دن رات خرچ کیا کرے (یعنی خیرات دیا کرے)۔"

پانچویں حدیث

پانچویں حدیث کو بھی مسلم اور بخاری دونوں نے نقل کیا ہے:

عن ابی موسیٰ قال قال رسول الله صلعم مثل المومن الذی یقراء القرآن مثل الا ترجة ریحها طیب و طعمها طیب و مثل المومن الذی لا یقراء القراان مثل التمره لا ریح لها و طعمها حلو و مثل المنافق الذی لا یقراء القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح وطبعهار ومثل المنافق الذی یقراء القرآن مثل الریحانه ریحها طیب و طعمهامر (متفق علیه).

"ابوموسیٰ کہتے ہیں کہ آں حضرت نے فرمایا جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے اس کا مزا بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی۔ اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال چھوارے کی سی ہے۔ خوشبو بھی نہیں اور مزہ میٹھا ہے اور جو منافق قرآن نہیں پڑھاتا اس کی مثال اندرائن کی سی ہے خوشبو کچھ نہیں اور مزا کڑوا۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریحاہ کی ہے خوشبو اچھی اور مزا کڑوا۔"

چھٹی حدیث

چھٹی حدیث کونسائی اور ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے:

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلعم تعلموا القرآن فاقرواه فان مثل القرآن لمن تعلم فاقوآء قام به کمثل جواب محشو مسکا تفوح ريحه کل مکان و مثل من تعلمه فرقد وهونی جوفه کمثل جواب اوکی علی مسلک . (رواه الترمذی و النسائی وابن ماجة)

''ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکھو قرآن اور پڑھاؤ۔ کیوں کہ جو شخص قرآن سیکھے اور پڑھے اوراس پر قائم رہے اس کے لیے قرآن ایسا ہے جیسے ایک کیسہ مشک سے بھرا ہوا۔ اس کی خوش بو ہر جگہ پھیلتی ہے اور جو شخص قرآن سیکھ کر سو گیا ہو اور وہ اس کے پیٹ میں ہو وہ مثل اس کیسہ کے ہے جو مشک بھر کر بند کر دیا ہو۔''

ساتویں حدیث

ساتویں حدیث کو بیہقی نے نقل کیا ہے:

عن ابن عمر قال قال رسول الله صلعم ان هذه القلوب تصداء کما يصدا الحديد اذا اصابه الماء قيل يا رسول الله ما وجلاء ها قال کثرة ذکر

الموت وتلاوت القرآن . (رواه البيهقی)

''ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہ دلوں کو بھی مورچہ (زنگ) لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو لگتا ہے لوگوں نے کہا یارسول اللہ پھر وہ صاف کیوں کر ہو فرمایا موت کو بہت یاد کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے سے''۔

آٹھویں حدیث

بخاری اور مسلم دونوں میں ہے:

عن عبدالله بن مسعود قال قال لی رسول الله صلعم علی المنبرا اقراء علی قلت اقراء علیلک و علیک انزل قال انی احب ان اسمعه من غیری فقرائت سورة النساء حتی اتیت الی هذه الایة فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید و جئنا من کل امة بشهیدا و جئنابک علی هولاء شهیدا قال حسبک الان فالفتفت الیه فاذا عیناه تذرقان (متفق علیه)

''عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ منبر پر مجھ سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ قرآن سناؤ۔ میں نے کہا کہ اآپ کے آگے میں پڑھوں اور آپ پر تو نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ دل پسند ہے کہ دوسرے سے سنوں پس میں نے سورہ نساء پڑھی یہاں تک کہ میں اس آیت پر آیا'' فکیف اذا جئنا من کہ امة بشهید وجئنا بک علی هولاء شهیدا'' (یعنی پس کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ

لائیں گے اور تجھ کو ان سب گواہوں پر گواہ لائیں گے) آپ نے فرمایا اچھا بس۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپ کی آنکھیں آنسو گرا رہی تھیں''۔

نویں حدیث

ابوداؤد میں بیان ہوئی ہے:

عن ابی سعید الخذری قال جلست فی عصابة من ضعفاء المهاجرین و ان بعضهم لیستتر ببعض من العری و قاری یقوم علینا اذ جاء رسول الله صلعم فقال علینا فلما قام رسول الله صلعم سکت القاری فسلم ثم قال ما کنتم تصنعون قلنا کنا نستمع الی کتاب الله قع فقال الحمد الله الذی جعل من امتی من امرت ان اصبر نفسی معهم قال فجلس و سلطنا لیعدل بنفسه فنا قال بده هکذا فتحلوا او بزرت وجوههم له فقال البشر و ایا معشر صعالیک المهاجرین بالنور التام یوم القیمة تدخلون اجنة قبل اغنیاء الناس بنصف یوم ذلک خمسمائة (رواه ابو دائود).

''ابوسعید کہتے ہیں کہ میں ضعیف مہاجروں کے ایک گروہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور ان میں سے بعض بعض سے بوجہ عریانی چھپتے تھے۔ اور ایک قاری ہم پر قرآن پڑھتا تھا اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اور کھڑے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم جب کھڑے ہوئے تو قاری چپ ہو گیا آپ نے سلام کیا اور فرمایا کہ تم کیا کر رہے تھے۔ ہم لوگوں نے کہا کہ خدا کی کتاب سن رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کا شکر ہے جس نے میری امت میں سے ایسے لوگوں کو کیا جن کے ساتھ مجھے صبر کرنے کا حکم ہے۔ کہا ابوسعید خدری نے کہ پھر آنحضرت ہم لوگوں کے بیچ میں بیٹھ گئے تاکہ اپنے کو ہم لوگوں کے برابر کریں۔ پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ پس پس لوگ گرداگرد بیٹھ گئے اور سب کا منہ آں حضرت کی طرف تھا پس فرمایا کہ اے مفلس مہاجرین تم کو خوش خبری ہو نور کامل کی قیامت کے دن۔ تم لوگ جنت میں مال داروں سے آدھے دن پہلے جاؤ گے اور یہ پانچ سو برس کا ہو گا۔''

نازل ہونا قرآن کا سات قرائتوں میں یا قرات مختلفہ میں

اختلاف قرات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے سبب سے عیساء مصنفوں کو نہایت دھوکا پڑا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں میں اختلاف ہے اسی طرح کا اختلاف قرات قرآن میں بھی ہے۔ حالانکہ وہ دونوں بالکل مختلف ہیں اور جو اسباب کہ عہد عتیق اور عہد جدید میں قرات مختلفہ کے پیش آئے ہیں۔ اس سے اور قرآن مجید کی قرات سبعہ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہم قرآن مجید کی قرات سبعہ یا اختلاف قرات کو انہیں معنوں میں لیں جن معنوں میں کہ عیسائیوں نے لیا ہے تو بہ آسانی کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہم مسلمانوں کے قرآن مجید میں اختلاف قرات مطلق نہیں ہے۔

عہد عتیق اور عہد جدید میں جو اختلاف قرات ہے اس کی بنیاد اور اس کے اسباب اور اس کے نتائج رورنڈ مسٹر ہارن نے یہ بیان کیے ہیں کہ ''دو یا زائد قرات میں سے صرف ایک ہی قرات صحیح ہوسکتی ہے اور باقی کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی'' مگر قرآن مجید مٰں نیہ بات نہیں ہے کیوں کہ تمام اختلاف قرات اس معنی میں جس میں کہ مسلمانون نے اس اصطلاح کو قرار دیا ہے جس قدر قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح اور سب درست ہیں گو ظاہر میں یہ امر کیسا ہی متناقض معلوم ہوتا ہو۔

رورنڈ مسٹر ہارن نے عہد عتیق اور عہد جدید میں قرات مختلفہ کے واقع ہونے کے یہ اسباب بیان کیے ہیں (۱) ''ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) منقول و منہ میں سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا (۳) کاتبوں کا بدوں کسی کافی سند کے متن کی عبادت کی اصلاح کی خواہش کرنا (۴) قصداً تحریفات کا کرنا جو کسی طریق کے حصوں مدعا کے واسطے کی گئی ہوں''۔ ان اسبب کو قرآن مجید کی اختلاف قرات سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ قرآن مجید میں جو اختلاف قرات ہیں ان کے اسباب حسب تفصیل ذیل ہیں:

اول: تمام قرآن مجید یا اس کی سورتیں ایک وقت میں نازل نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ کوئی آیت کسی سورت کی کسی وقت میں اور کوئی آیت کسی وقت میں نازل ہوتی تھی۔ ایک سورت ابھی ختم نہیں ہونے پاتی تھی ک دوسری سورت نازل ہونی شروع ہوتی اور ایسی چند آیتیں نازل ہوئیں جن کا مضمون اس سورت کی آیتوں سے جو پہلے نازل ہوچکی تھی بالکل مختلف تھا اور یہ سورت ابھی نامکمل رہ کر ایک اور سورۃ نازل ہونی شروع ہوگئی اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ تمام آیتیں جس طرح پر نازل ہوئیں علیحدہ علیحدہ چمڑوں کے ٹکڑوں پر اور بے ترتیبی سے لکھی ہوئی رہیں۔ اگرچہ پیغمبر خدا صلعم نے تمام آیتوں کو جن سے قرآن مجید کی آیتوں کی نقلیں منتشر حالت میں موجود تھیں ان سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا اس سبب سے

آیتوں کو بہ ترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔

دوم: نقطوں کا اختلاف۔ قدیم تحریر میں جس کے نمونے اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ نقطوں کے دینے کا بہت کم رواج تھا۔ فعل مضارع کے پہلے حرف ''ی'' غائب کے صیغہ براور حرف ''ت'' حاضر کے صیغہ پر آتی ہے۔ لکھنے میں ان دونوں حرفوں کی ایک ہی صورت ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ پہلے حرف کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں اور دوسرے حرف کے اوپر دو نقطے ہیں۔ نقطوں کے لکھنے کا قدیم تحریر میں رواج نہ ہونے سے کسی نے اس حرف کو ''ی'' پڑھا اور کسی نے ''ت'' اور علماء نے اس کو اختلاف قرات قرار دیا۔

سوم: عرب کی مختلف قوموں میں جو مختلف اقطاع میں رہتی تھیں مختلف لہجے تھ اور ہر ایک قوم اپنے لہجہ میں قرآن مجید کی آیتوں کو پڑھتی تھی اور اخلاف لہجہ کو بھی علما نے اختلاف قرات میں داخل کیا ہے۔

چہارم: اعراب کا اختلاف۔ قدیم تحریر میں لفظوں پر اعراب دینے کا بھی دستور نہ تھا اور نہ اہل عرب کو کہ عربی خود ان کی مادری زبان تھی اعراب دینے کی ضرورت تھی۔ مگر بعض دفعہ جملوں کے دو طرح پر ربط دینے سے اعراب میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے لوگ بعض الفاظ ک اعراب میں اختلاف رکھتے تھے مثلاً وضو کی آیت میں جو لفظ ''ارجلکم'' واقع ہ بعضوں نے خیال کیا کہ اس کا عطف ''وجوھکم'' پر ہے جو اسی آیت میں واقع ہے اور اسی سبب سے انہوں نے ''ارجلکم'' کے ''ل'' کو مفتوح پڑھا۔ اور بعضون نے اس کا عطف ''رؤسیکم'' پر خیال کیا اور ''ارجلکم'' کے ''ل'' کو مکسور پڑھا۔ اگر چہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں مگر علماء نے اس کو بھی اختلاف قرات میں داخل کیا حالاں کہ در حقیقت یہ ایک بحث نحو کے قواعد سے متعلق ہے نہ اختلاف قرات سے

پنجم: عربی زبان سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی مادہ کے افعال کے لیے عربی زبان میں متعدد ابواب ہوتے ہیں اور ان ابواب سے ایک ہی مادہ کے مختلف طرح پر صیغے مشتق کیے جاتے ہیں اور گو وہ لکھنے میں ایک ہی صورت کے ہوں مگر ان کا تلفظ مختلف ہو جاتا ہے اس وجہ سے بعض لفظوں کو قرآن مجید کے کسی شخص نے کسی باب میں مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا اور کسی نے دوسرے باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا۔ عرب میں بعض قومیں ان ابواب میں سے کسی باب کا استعمال نہ کرتی تھیں اور بعض قومیں کسی باب کا اواسی سبب سے ان الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ اس قسم کا اختلاف بھ بہت ہی شاذ و نادر قرآن مجید میں ہے۔ علمائے اسلام نے اس کو بھی اختلاف قرآن میں داخل کیا حالاں کہ وہ صرف عربی زبان کے قواعد صرف سے متعلق ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگا کہ کتب عہد عتیق اور عہد جدید پر عیسائی عالموں نے جن معنی کو اختلاف قرات کا اطلاق کیا ہے اور ج واسباب اس کے بیان کیے ہیں۔ اس سے اور قرآن مجید کے اختلاف قرات سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے اگر اختلاف قرات کے وہی معنی قرار دیں جو عیسائی عالموں نے قرار دیے ہیں تو اس کا قرآن مجید کی نسبت استعمال کرنا صریح غلطی اور خطا ہے۔

جو امور ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان کی توضیح کے لیے ہم چند حدیثوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

پہلی حدیث

ابوداؤد اور بیہقی کی ہے اس نے جابر سے بیان کیا ہے کہ:

عن جابر قال خرج علینا رسول الله صلعم و نحن نقراء القرآن وفینا الاعرابی والعجمی فقال اقرئوا افکل حسن و سیجبی اقوام یقیمونه کما یقام القدح یتعجلونه ولایتا حلونه. (رواه ابودائود البیهقی فی شعب الایمان).

''جابر کہتے ہیں کہ آں حضرت ہم لوگوں کے سامنے تشریف لائے اور ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم میں عربی و عجمی دونوں قسم کے لوگ تھے پس فرمایا کہ پڑھو سب اچھا ہے اور آئندہ ایسی قومیں آئیں گی کہ اس کو سپاٹے سے پڑھیں گی تیر کے سپاتے کی مانند جلدی کریں گی اور ٹھہر کر نہ پڑھیں گی''۔

دوسری حدیث

ترمذی کی ہے اس نے ابی بن کعب سے بیان کیا ہے:

عن ابی ابن کعب قال لقی رسول الله صلعم جبرائیل فقال یا جبرئیل انی بعثت الی امة امیین منهم العجوز والشیخ الکبیر والغلام والحجاریة والرجل الذی لم یقراء کتابا قط قال یا محمد ان القرآن انزل

علی سبعة احرف (رواہ الترمذی).

''ابی بن کعب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے ملے پس فرمایا کہ اے جبرئیل میں مبعوث ہوا ایک جاہل امت کی طرف جس میں بوڑھے اور بوڑھیا اور لڑکا و لڑکی اور ایسے آدمی ہیں۔ جنہوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی جبرئیل نے کہا۔ اے محمد قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔

تیسری حدیث

بخاری اور مسلم کی ہے ان دونوں نے ابن عباس سے بیان کیا ہے کہ:

عن ابن عباس ان رسول الله صلعم قال اقراء نی جبرئیل علی حرف فراجعته فلم ازل استزیده ویزیدنی حتی انتهی الی سبعة اجرف قال ابن شهاب بلغنی تلک السبعة الا حرف انما هی فی الامر یکون واحد الا یختلف فی حلال ولا حرام . (متفق علیه).

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو جبرئیل نے قرآن پڑھایا ایک حرف پر پھر میں نے ان سے دوہرا کر پڑھوایا پس میں برابر زیادہ پڑھواتا رہا اور وہ زیادہ کرتے گئے یاں تک کہ سات حرف (یعنی قرات) تک پہنچے ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ ساتوں حرف معلوم ہوئے و مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ کسی حلال و حرام میں ان سے اختلاف نہیں پڑتا۔''

چوتھی حدیث

بخاری اور مسلم کی ہے ان دونوں نے حضرت عمر سے بیان کیا ہے:

عن عمر بن الخطابؓ قال سمعت هششام بن حكيم بن حزم يقره سورة الفرقان على غير ما اقراء هاو كان رسول الله صلعم اقرينبها فكدت عن اعجل عليه ثم امهلته حتى انصرف ثم لبيته بردائه فجعت به رسول الله صلعم فقلت يا رسول الله انى سمعت هذا تقراء سورة الفرقان على غير ما اقراء فيها فقال رسول الله صلعم اراء فقراه القراة التى سمعته يقراء فقال رسول الله صلعم هكذا انزلت ثم قال لى اقراء فقرات فقال هكذا انزلت ثم قال لى اقراء خضرات فقال هكذا انزلت ان القرآن نزل على سبعة احرف فاقرائو ما تيسر منه (متفق عليه و اللفظ لمسلم)

"عمر بن خطاب نے کہا کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورہ فرقان پڑھتے سنا خلاف اس کے جس طرح میں پڑھتا ہوں اور مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا۔ پس قریب تھا کہ میں ان پر جلدی کروں پھر میں نے ان کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ پھر کر چلے پھر میں ان کو چادر سے پکڑ کر رسول اللہ صلعم کے پاس لایا اور کہا کہ یا رسول اللہ میں نے ان کو سورہ فرقان اور طرح سے پڑھتے سنا۔ اس طرح سے نہیں جس طرح آپ نے مجھ کو پڑھایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کو چھوڑ دو کہ پڑھیں بس انہوں نے اسی طرح پڑھا جیسا کہ میں ان سے سن چکا تھا۔ پس رسول اللہ نے

فرمایا۔اسی طرح اتری ہے۔پھر مجھ کو کہا پڑھو۔میں نے پڑھا تو فرمایا اسی طرح اتری ہے۔قرآن سات حرفوں پر اترا ہے جس طرح آسان ہو پڑھو۔

پانچویں حدیث

پانچویں حدیث بخاری کی ہے انہوں نے ابن مسعود سے بیان کیا ہے کہ:

عن ابن مسعود قال سمعت رجال فقروء سمعت النبی صلعم یقراء خلافها فجیت به النبی صلعم فاخبرته فعرفت فی وجهه الکراهة فقال کلا کما یحسن فلا تختلفوا فان من کان قبلکم اختلفو من کان قبلکم اختلفو فهلکوا (رواه البخاری).

"ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا اور رسول اللہ صلعم کو اس کے برخلاف پڑھتے سنا۔پس میں اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا اور اس بات کی اطلاع کی ۔پس میں نے حضرت کے چہرہ پر ناگواری دیکھی ۔پھر آپ نے فرمایا کہ تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو سو اختلاف مت کرو۔تم سپ پہلوں نے اختلاف کیا تو ہلاک ہوئے"۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ہر شخص کو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید اختلاف قرات اور توریت اور انجیل اختلاف قرات میں بہت بڑا فرق ہے اروہ اختلاف قرات ج کو ہم نے مداول میں داخل کیا ہے یعنی آیتوں کا آگے پیچھے اور الٹ پلٹ پڑھنا اور وہ

اختلاف حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں قریب قریب معدوم ہو گیا تھا جب کہ زید بن ثابت نے قرآن مجید کے مختلف حصوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور جب حضرت عثمان کی خلافت کے عہد میں جنہوں نے زید ابن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھیں اس اختلاف کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

حاضر اور غائب کے صیغوں کا اختلاف جو صرف ی اور ت کے لفظوں کے سبب سے تھا وہ باقی رہا۔ موجودہ قرآنوں میں اختلاف قرات بھی لکھا جاتا ہے نہایت احتیاط سے حاشیہ پر ان اختلافات کو لکھ دیا جاتا ہے۔ مگر قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو ظاہر ہے۔ کہ وہ اختلاف نہایت قلیل اور شاذ و نادر ہیں اور معہذا ان سے اصی مطلب اور احکام قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تلفظ کا اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہو گیا ہے۔ کیوں کہ قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کوششیں کام یاب ہوئی ہیں۔ قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا اس کو پڑھا کرتے تھے لیکن جو کہ اس زبان سے بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ اور قوموں سے ادا نہیں ہو سکتا اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا مثلا اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے۔ مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید کے پڑھنے میں محسوس ہو گا نہ اس کے املا میں اور اسی لیے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آ سکتا اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔

اعراب کا اختلاف بھی چند مقام میں جو بلحاظ قواعد صرف ونحو کے وقوع میں آیا ہے اب تک موجود ہے اور اسی قسم کی تفسیروں میں اس کی نسبت ہر ایک امر کی تشریح کی جاتی

ہے۔ ابواب کے اختلاف سے جو صیغوں میں تلفظ کا اختلاف ہے ۔ وہ بھی بعض بعض جگہ موجود ہے۔اس کی بھی تصریح اسی قسم کے قرآن مجید کے حاشیوں پر کی جاتی ہےاور تفسیرون میں ان پر پوری بحث ہے۔

مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد میں کچھ اثر واقع نہیں ہوتا اور جو الزام کہ عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قران کی آیات کی تصرف کرنے اور کمی وہ بیشی کرنے کا یا اپنی کتاب مقدس میں قصداً غلط اصلاحیں کرنے کا یا کسی فریق کے مدعا کے حاصل کرنے کے لیے تعریف کرنے کا یا کسی آیتوں کو چھپا ڈالنے کے الزام عائد نہیں ہوسکتا۔علم ادب کی ایک شاخ ہ جو بالتخصیص قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کا نام تجوید ہے۔اس پر بہت کتابیں لکھی گئی ہے اور علماء نے شرح وبسط سے اس سے اس کی شرحیں کی ہیں۔

قرآن مجید کی آیات میں ناسخ ومنسوخ ہونے کا بیان

عیسائی عالموں نے الفاظ ناسخ ومنسوخ کے معنی سمجھنے میں جس کا اطلاق علمائے اسلام نے بطور اصطلاح کے آیات قرآنی پر کیا ہے۔ بہت بڑی غلطی کی ہے۔انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا بےکار کر دیا ہے ۔ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ کیوں کہ علمائے اسلام نے جو دینیات کے مسائل کے محقق ہیں ان معنوں سسے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں مختلف معنی قرار دیے ہیں۔مسلمانوں کا اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فرض ہے کہ خدا تعالیٰ علیم اور علما

لغیوب ہے۔ یعنی اس کو ماضی اور حال اور استقبال کا یکساں علم ہے۔ پس اگر ناسخ اور منسوخ کے یہ معنی سمجھے جاویں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اپنے حکم سابق کو کسی حکم مابعد سے بدیں وجہ سے کہ اس پہلے حکم میں کچھ نقصان تھا منسوخ کر دیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حکم سابق کے وقت خدا تعالیٰ کی صفت علم کامل میں کچھ نقصان تھا اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ علمائے اسلام نے جن معنوں میں لفظ ناسخ و منسوخ کو استعمال کیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کا لفظ اصطلاحاً دو چیزوں پر اطلاق: ایک نبی سابق ایسی شریعت پر جو دوسرے نبی کی شریعت سے تبدیل ہوگئی ہو۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی زوجہ کی حیات میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کرسکتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی زوجہ کی زندگی میں اس کی بہن سے نکاح نہیں کرسکتا۔ لیکناس کے مرنے کے بعد کرسکتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی زوجہ کو طلاق دے دے اور گھر سے باہر کر دے اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی زوجہ کو کسی صورت میں طلاق نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو۔ آں حضرت نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا۔ لیکن اس پر یہ قید لگائی کہ اگر بغیر اشد ضرورت اور معقول وجہ کے ایسا کرے تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا۔

الفاظ ناسخ و منسوخ کا استعمال جو علمائے اسلام نے شریعت انبیاء سابقین کی نسبت کیا ہے اور جس کا یہ مقصود ہے کہ ناسخ سے وہ شریعت مراد ہے جو شریعت نبی سابق کو غیر واجب العمل کر دے اور منسوخ سے وہ شریعت سابق مراد ہے جو غیر واجب العمل ہوگئی ہو۔ ان معنون میں تو قرآن مجید کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی

جو شریعت اسلام کو غیر واجب العمل کر دے۔ مگر ہم انبیائے سابقین کی شرح کے منسوخ ہونے پر زیادہ بحث نہیں کریں گے بلکہ صرف اس مختصر بیان پر ختم کریں گے کہ علمائے اسلام نے شریعت انبیائے سابقین اور بھی ناسخ ومنسوخ ہونے کا اطلاق ان معنوں میں نہیں کیا ہے۔ جو عیسائی خیال کرتے ہیں۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ قرآن مجید کی وہ آیت جس کو ہم ذیل میں لکھتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت کے دوسری آیت کے منسوخ ہونے سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ اور نہ اس سے اس بات پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن مجید کی ایک آیت قرآن مجید کی دوسیر آیت کو منسوخ کرتی ہے۔ کیوں کہ اس آیت میں جو کچھ بیان ہے وہ انبیائے سابقین کی شریعت کے ناسخ ومنسوخ ہونے سے متعلق ہے نہ قرآن مجید کی ایک آیت کے دوسری آیت سے اور وہ آیت یہ ہے:

ما یرد الذین کفرو من اهل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم والله یختص برحمته من یشاء والله ذو الفضل العظیم. ما ننسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها ا و مثلها الم تعلم ان الله علی کل شئی قدیر . (سورة بقر. آیت ۹۹ و ۱۰۰).

”اہل کتاب جو کافر ہوئے اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے خدا کی طرف سے کوئی بھلائی اترے اور خدا خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے اور خدا بڑی فضیلت والا ہے۔ ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے اچھی لاتے ہیں یا اس کے برابر۔ کیا تو یہ نہیں جانتا کہ خدا ہر شے پر قدرت رکھتا ہے“۔

مذکورہ بالا آیتوں میں سے کوئی ذی فہم شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کا قرآن مجید کی دوسری آیت سے منسوخ ہونا پایا جاتا ہے بلکہ صاف اس میں اہل کتاب کا ذکر ہے اور اہل کتاب جو اس بات کے مخالف تھے کہ ان کی شریعت کے برخلاف کوئی حکم نہ ہو اس کی نسبت خدا نے کہا ہے کہ ہم آیت یعنی حکم شریعت اہل کتاب کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس آیت سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسیر آیت کو منسوخ کرتی ہے بلکہ اس کو صریح شریعت اہل کتب یا رسوم مشرکین سے علاقہ ہے جن کی طرح خاص اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی وبیشی کی گئی ہے۔

وسرے ناسخ ومنسوخ کی اصطلاح کا اطلاق علماء نے قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث پر بھی کیا ہے۔ لیکن نہ ان معنوں میں جو عیسائی سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ایسے احکام ہی جو امر واحد سے علاقہ رکھتے ہیں۔ مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں اور جب کہ وہ حالت باقی نہیں رہتی تو وہ حکم جو اس حالت سے متعلق تھا غیر واجب العمل ہو جاتا ہے اور دوسرا حکم جو اس حالت تبدیل شدہ سے مناسب ہو صادر ہوتا ہے ایسی حالت میں علمائے اسلام حکم اول پر منسوخ اور وار حکم ثانی پر ناسخ کا اطلاق کرتے ہیں مگر اسکے بعد یہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ حکم اول میں کسی قسم کا نقص تھا بلکہ وہ حالت خاص جس کے واسطے وہ حکم مناسب تھا باقی نہیں رہی اسلیے وہ حکم بھی واجب التعمیل نہیں رہا۔ لیکن درحقیقت منسوخ نہیں ہوا کیوں کہ اگر احیاناً وہی حالت پھر ظہور پذیر ہو تو وہی پہلا حکم واجب العمل ہوگا اور دوسرا حکم واجب التعمیل نہ رہے گا۔

مثلاً جب شراب پینے کی امتناع کا حکم نازل ہوا تو آں حضرت نے سبز رنگ کے پیالوں کا استعمال بھی جو عرب میں بالتخصیص شراب پینے کے لیے مخصوص تھے منع فرمایا ۔مگر جب شراب پینے کا حکم عموماً سب لوگوں کو معلوم ہو گیا اور اس کا رواج بھی اٹھ گیا اس وقت آنحضرت نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کی اجازت دے گی۔اسی قسم کی ایک یہ مثال ہے ہ جب تک مسلمان مکہ میں رہے جہاں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان ان کے محکوم تھے اس وقت تک ان کو اپنے حکام کے ہاتھ سے ہر قس کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم رہا۔لیکن جب کہ مسلمان ان کی عمل داری کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے گئے تو اس وقت جہاد کرنے کے احکام صادر ہوئے ان دونوں مثالوں میں علمائے اسلام نے اصطلاحاً حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ سمجھا ہے لیکن اگر پہلی صورتیں پیش آویں تو وہی پہلے حکم واجب التعمیل ہوں گے۔

مختلف امور میں بعض احکام شریعت حضرت موسیٰ کے ایسے تھے کہ جب تک خاص احکام ان کی نسبت آں حضرت پر نازل نہیں ہوئے آں حضرت نے انہیں حکموں پر عمل کیا۔ مگر جب خاص حکم نازل ہوئے تو ان کے مطابق کاربند ہوئے اور علماء اسلام نے ان احکام موسوی پر بھی منسوخ اور ان احکام خاص پر ناسخ کا اطلاق کیا۔ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحیں ہیں جو علماء نے مقرر کی ہیں۔محققین علمائے اسلما کا عقیدہ ہے کہ ناسخ و منسوخ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت مستعمل نہیں ہوئے ہیں۔

جعفر کی حدیث میں جو یہ روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے فرمایا کہ:''میرا کلام قرآن مجید کو منسوخ نہیں کرتا ہے مگر قرآن مجید کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے اور قرآن مجید کی ایک ایک آیت ایک کو منسوخ کرتی ہے'' اور ابن عمر کی حدیث میں جو روایت ہے کہ ''میرا

ایک کلام میرے دوسرے کلام کو منسوخ کرتا ہے۔ جس طرح کہ قرآن کی بعض آیتیں قرآن کی بعض آیتوں کو منسوخ کرتی ہیں'' ان حدیثوں کے معتبر سند نہیں ہے اس لیے تسلیم کے قابل نہیں ہیں۔

اس باب میں ابن ماجہ کی حدیث نہایت معتبر اور صحیح ہے جو ان حدیثوں کے برخلاف ہے اور جن سے ان لوگوں کی رائے کی جو قران کی ایک آیت سے دوسری آیت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں بخوبی تردید ہوتی ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن عمرو ابن شعیب ان ابیہ عن جدہ قال سمع النبی صلعم تو مایتدارون فی القرآن فقال انما ھلک من کان قبلکم بھذا ضربوا کتاب اللہ بعضہ ببعض و انما نزل کتاب اللہ یصدق بعضہ بعضا فلا تکذبوا بعضہ ببعض فما علمتم منہ فقولوا بہ و جھلتھم فو کلوہ الی عالمہ (رواہ احمد و ابن ماجہ).

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو سنا کہ قرآن میں جھگڑا کرتے ہیں۔ پس فرمایا کہ تم سے جو پہلے لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی سے ہوئے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا (یعنی رد کیا) اور خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو۔ پس بعض سے بعض کی تکذیب مت کرو۔ اس میں سے جو جانو وہ کہو اور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو''۔

اس حدیث سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی کسی آیت کی ناسخ ہے نہ کوئی آیت منسوخ ہے

مگر عالموں میں یہ بھی اختلاف ہے کہ لفظی بحث پر مبنی ہے کیوں کہ دونوں فریق یعنی

وہ لوگ جو ناسخ و منسوخ کے ہونے کے قائل ہیں اور جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں دونوں مباحثوں سے ایک ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس لیے ہم اس مقام پر ان پہلی دو حدیثوں کے نامعتبر اور غیر مستند ہونے پر بحث کرنی بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ دونوں فریقوں کا بہ لحاظ حقیقت حال کے ایک ہی عقیدہ ہے۔

ایک زمانہ کے بعد جب کہ فقہائے اسلام نے قرآن مجید کے اوامر اور نواہی کا استنباط شروع کیا اور کتب فقہ کا تالیف ہونا شروع ہو گیا تو انہوں نے الفاظ ناسخ و منسوخ کو زیادہ وسیع اصطلاح میں استعمال کرنا شروع کیا اور جس پر نہ تو ان الفاظ کے لغوی معنی کا اور نہ ان معنوں کا جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ٹھیک ٹھیک اطلاق ہو سکتا ہے۔

مثلاً انہوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہے اور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی کہ جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا تو انہوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے چنانچہ ہم ایک مثال سے اس امر کی زیادہ تر تشریح اور توضیح کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی ایک یہ آیت ہے کہ:

والذین یتوفون منکم و یذرون ازواجاً وصیةً لازواجھم متاعاً الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسھم من معروف فی انفسھن من معروف واللہ عزیز حکیم (سورہ بقر آیت ۲۴۱)

''اور جو لوگ تم میں سے وفات پاتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں بیبیاں۔ وصیت کر جاویں اپنی بیبیوں کے لیے فائدہ دینا ایک برس تک بن نکالے پس اگر نکل جاویں پس نہیں گناہ ہے تم پر اس

چیز میں کہ کریں وہ اپنے حق میں کچھ بہتری اور اللہ غالب ہے دانا ہے۔''

اس آیت سے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنے مرنے کے بعد ازواج چھوڑ جاویں ان کے پاس ایک برس کے نان ونفقہ کے لیے وصیت کو جاویں تا کہ عورت (جو کہ اجہان میں اپنے تمام حوائج ضروری میں اپنے خاوند کی محتاج ہوتی ہے) اپنے رنج ومایوسی کے ایام میں خاوند کے مرجانے سے مصیبت اور تکلیف میں نہ پڑے۔ ہمارے فقہا نے بیان کیا ہے کہ اس آیت سے تین حکم نکلتے ہیں (۱) شوہر پر واجب ہیکہ زوجہ کے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جاوے۔ (۲) زوجہ شوہر متوفی کی جائداد میں سے ایک سال سے زیادہ کے نان ونفقہ کی مستحق نہین ہے۔ (۳) زوجہ شوہر کی وفات کی تاریخ سے سال بھر تک کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی''۔

جب کہا فقہا نے اپنی ذہانت سے یہ قرار دیا ہے کہ اس آیت سے یہ تین مسئلے نکلتے ہیں تو ان کو ایک اور آیت نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے:

والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھن اربعة اشھر وعشرا فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انسھن بالمعروف . واللہ بما تعملون خبیر ولا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبة النساء او اکننتم فی انفسکم علم اللہ انکم ستذکرر و نھن ولکن لا تواعد وھن سرا الا ان تقولو ا قولا معروفا.(سورہ بقر آیت ۲۳۴ و ۲۳۵)

''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں تو انتظار کرائیں (یہ عورتیں) اپنی جانوں کو چار مہینے اور دس دن۔ پس جب پہنچیں اپنی مدت کو پس تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔

اس چیز میں کہ وہ اپنے حق میں بھلائی سے کوئی بات کریں اور خدا اس
چیز سے خبر رکھتا ہے جو تم کرتے اور اور نہیں گناہ ہے تم پر اس بات میں
کہ اشارہ تم نے عورتوں سے پیغام نکاح کیا ہو یا تم نے اپنے دل میں
چھپا رکھا ہو۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان کو یاد کرو گے مگر ان سے خفیہ وعدہ
مت کرلو بجز اس کے کہ اچھی بات کہو"۔

اس آیت میں انہیں فقہا نے اس میعاد کی تصریح اور تعیین پائی جس عورت کو شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے سے نکاح کرنا نہیں چاہیے اور انہوں نے سمجھا کہ یہ تعیین میعاد پہلی آیت کے تیسرے حکم سے جو انہوں نے ازخود اپنی ذہانت سے قرار دے لیا تھا مختلف ہے تو انہوں نے پہلی آیت کے تیسرے حک کو بہ لفظ منسوخ تعبیر کیا اور پچھلی آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا۔

اس کے بعد ان کو ایک اور آیت پر نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے:

ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیه توصون بھا اودین (سورہ نساء آیت ۱۴)

"اور ان کے لیے چوتھائی حصہ ہے تمہارے ترکہ میں سے
اگر تمہارے کوئی اولاد نہ ہو پس اگر کوئی ہو تو ان کے لیے آٹھواں حصہ
ہے تمہارے ترکہ میں سے بعد وصیت کے جو تم نے کی ہو یا قرضہ
ہو"۔

اس آیت سے انہوں نے یہ دیکھا کہ بیوہ عورت کے لیے اس آیت میں صاف صاف معین حصہ شوہر کے ترکہ میں سے معین ہے تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلی آیت سے جو انہوں نے پہلا اور دوسرا حکم استخراج کیا تھا وہ دونوں حکم بھی اس آیت سے منسوخ ہو گئے

اور یہ آیت ان کی ناسخ ہے۔

ہر سمجھ دار آدمی یہ بات جانتا ہے کہ مذہب اسلام کا فقہا کا ایسا درجہ نہیں ہے جیسا کہ عیسائی مذہب میں پوپ کا درجہ ہے جس کو عیسائی خطا اور نسیان سے مبرا سمجھتے ہیں مسلمانوں کے مذہب میں قرآن مجید ہر شخص کی دسترس میں ہے اور ہر شخص کو اس میں حق بات تلاش کرنے کا اختیار ہ۔ ہر مسلمان اس بت کا مجاز ہے کہ اگر وہ چاہے تو مذکورہ بالا تینوں مسئلوں کو جو فقہا نے مذکورہ بلا آیت سے اخذ کیے ہیں اور جو در حقیقت ایک مسئلہ بھی ان مسئلوں میں سے اس آیت سے اخذ نہیں ہوسکتا نہ مانے اور صاف کہہ دیکہ ان آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ نہیں ہے پس کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ قرار دینا صرف فقہاء کی رائے ہے جو انہوں نے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقہ کی تسہیل کے لیے اختیار کی ہے مگر اس سے یہ بات کہ در حقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے لازم نہیں آتی۔

مگر افسوس یہ ہے کہ عیسائی عالموں نے جو سمجھا ہے اس میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے۔ مشہور و معروف مورخ گبن اور ہمارے زمانہ کے بڑے عالم سر ولیم میور نے ناسخ اور منسوخ کی اصطلاحوں کے صحیح اور اصلی معنوں سے جن میں ہمارے فقہا نے ان کو مستعمل کیا تھا ناواقفیت کی وجہ سے صریح مظالطہ کھایا ہے اور وہ خیالات بیان کیے ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ ''مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل اندازہ کی بجائے آیات قرآن (مجید) محمد (صلعم) کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں۔ ہر وحی ان کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول سے کہ کسی پلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیل یا ترمیم ہوگئی ہے رفع ہوگیا ہے''۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ ''اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے مگر مسلمان اس اجتماع ضدین کی تطبیق کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں، تاہم بجبوری ان کو معترف ہونا پڑا ہے کہ قرآن میں کم سے کم دوسو پچیس آیتیں منسوخ ہیں''۔

اس خطبہ کے شروع میں ہم نے بیان کیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دو قسم کی وحی نازل ہوتی تھی: اول وحی متلو یعنی کلام اللہ اور دوم وحی غیر متلو یعنی حدیث۔ یہ ممکن ہ ک بعض شخصوں نے غلطی سے دوسری قسم کی وحی کو پہلی قسم کی وحی سمجھا ہو اور ان کو قرآن مجید میں نہ پا کر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہوگئی ہٰں اور جو کہ ان کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی اس لی قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا خود اس کی غلطی ہ۔ علاوہ اس کے اس بات کے فرض کر لینے کے لیے کہ کوئی آیت ایسی تھی کہ جس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی اس لیے قرآن مجید سے خارج رکھی گئی تھی کوئی سند نہیں ہے۔ چنانچہ اس امر کی نسبت اس خطبہ کے اخیر میں پوری بحث کریں گے۔

کیا جناب پیغمبر خدا قرآن مجید کی کوئی آیت بھول گئے تھے

ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جناب پیغمبر خدا کو تمام قرآن من اولہ الیٰ آخر جو نازل ہوا تھا یاد تھا اور کبھی کوئی آیت آں حضرت نہیں بھولے نہ اپ کے دل سے محو ہوئی۔ او تمام آیتیں جو آپ پر نازل ہوئیں تھیں آپ کاتبوں سے لکھوا دیتے تھے اس کی سند میں قرآن

مجید کی ایک آیت اور بخاری کی ایک حدیث کا لکھ دینا کافی ہے قران کی آیت یہ ہے کہ:

سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء الله (سورہ صبح اسم آیت ٦)

''ہم تجھ کو پڑھا دیں گے سو تو نہ بھولے گا مگر جو خدا چاہے''۔

بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر اس طرح پر کی ہے کہ:

(سنقرئک) عل لسان جبرئیل و سنجعلک قاریا بالھام القراۃ (فلا تنسیٰ) اصلامن قوۃ الحفظ مع انک مامی لیکون ذلک آیۃ اخری لک (الا ماشاء الله) نسبانه بانه نسخ تلاوته وقیل المرادیه القلة والندرة ......لماروی انه علیه السلام اسقط انه علیه السلام اسقط آیة فی الصلوۃ فحسب ابیؓ انها نسخت فساله فقل نسیتها او نفی النسیان راسافان القلة تستعمل للنفی (بیضاوی).

''(ہم تجھ کو پڑھا دیں گے) جبرئیل کی زبان سے یا تجھ کو قاری کریں گے قرات کے الہام سے (پس تو نہ بھولے گا) ہرگز حافظہ کی قوت سے باوجودہ تو ان پرھ ہے تاکہ یہ ایک نشانی ہو دوسری تیرے لیے (مگر جو خدا چاہے) ان کا بھلا دینا اس طرح پر کہ اس کی تلاوت منسوخ کر دی اور کہا گیا کہ اس سے مراد کم ہونا اور نادر ہونا ہے اس لیے کہ روایت ہے کہ آں حضرت نے ایک آیت نماز میں چھوڑ دی۔ پس پر ابی رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ وہ منسوخ ہو گئی۔ حضرت سے پوچھا آپ نے فرمایا کہ میں بھول گیا۔ یا بھولنے کی مطلقاً نفی مراد ہے۔ کیوں کہ قلت کا لفظ نفی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بیضاوی نے اول تو یہ لکھا ہے کہ ''فلا تنسیٰ'' سے یہ مطلب ہے کہ پیغمبر صاحب قرآن کو ہرگز نہیں بھولنے کے۔ ''الا ما شاء اللہ'' کے لفظ میں اس نے تین رائیں قائم کی ہیں: ایک یہ کہ منسوخ شدہ آیت کو بھول جاویں گے یہ صرف اس کی رائے ہے قرآن مجید سے اس پر کوئی نص نہیں ہے دوسری رائے اس نے ایک حدیث پر قائم کی ہے کہ آپ ایک آیت پڑھنی بھول گئے تھے۔ اگر ہم اس حدیث کو صحیح تسلیم کر لیں تو بھی اس سے بھول جانا کسی آیت کا یعنی دل سے محو ہو جانا ثابت نہیں ہو سکتا۔ تیسری رائے اس کی نسیان سے قطعی انکار کی ہے۔ یہ رائے صحیح ہے گو کہ جو وجہ اس نے لکھ ہے وہ خود اسکے دل کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔

قرآن مجید کا طرز بیان یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے قادر مطلق ہونے کے اظہار کے لے ہر ایک حکم اور ہر ایک امر کے ساتھ جملہ استثنائیہ فرماتا ہے مگر اس سے درحقیقت یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقع بھی ہوگ ا بلکہ اس سے محض اظہار قدرت مراد ہوتا ہے۔ اس کی سینکڑوں مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ پس اس مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ درحقیقت آں حضرت کسی آیت کو بھول گئے تھے یا بھول جاویں گے۔ بلکہ صرف اظہار قدرت کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کا کوئی جزو نہیں بھولو گے لیکن جس کو خدا چاہے۔ زمخشری جو علم عربیت کا بہت بڑا عالم ہے یہی بات لکھتا ہے کہ اس جملہ سے استثناء مراد نہیں ہے اور اس کی مثال اس طرح پر دی ہے کہ مثلاً:

فی الکشاف کما تقول لصاحبک انت سھیمی فیما املک الا ماشاء اللہ لا یقصد استثناء شی (کشاف).

''کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کہ جو کچھ میری ملکیت میں ہے اس میں تو بھی شریک ہے مگر جو خدا چاہے تو اس طرح کہنے سے

کسی چیز کا استثناء کرنا شریعت سے مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس
مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے کسی آیت کا مستثناء کرنا مقصود نہیں
ہے''۔

بخاری میں اسی کے متعلق دو حدیثیں حضرت عائشہ سے مذکور ہیں۔ پہلی حدیث یہ
ہے کہ:

عن عایشه سمع النبی صلعم رجال یقرا فی المسجد فقال یرحمه الله لقد اذکرنی کذا وکذا آیته من سورة کذا (بخاری باب نسیان القرآن)

''عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص
کو مسجد میں پڑھتے سنا پس کہا کہ خدا اس پر رحم کرے مجھ کو یہ آیتین
اس سورۃ سے یاد دلائیں''۔

دوری حدیث یہ ہے کہ:

عن عائشة قالت سمع رسول الله صلعم رجا یقرا فی سورة باللیل فقال یرحمة الله لقد اذکرنی کذاوکذا آیته کنت انسیتها من سورة کذا. (بخاری باب نسیان القرآن)

''حضرت عایشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے ایک شخص کو ایک سورۃ پڑھتے سنا رات کو پس فرمایا کہ خدا اس
پر رحم کرے مجھ کو فلاں فلاں آیتیں یاد دلائیں جن کو میں فلاں سورۃ
سے بھول گیا تھا''۔

اول تو ان حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجد میں ہوا تھا اور اس

بات پر یقین نہیں ہوسکتا کہ حضرت عائشہ خود موجود تھیں۔ کیوں کہ اس کا کوئی اشارہ ان حدیثوں میں نہیں ہے اور اس لیے یہ حدیثیں قابل استدلال نہیں ہیں۔ دوسری وجہ ان حدیثوں کے قابل استدلال نہ ہونے کی یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ وہ آیت کون سی تھی جس کو آں حضرت بھول گئے تھے اور نہ یہ بیان کیا ہے کہ کس سورۃ کی وہ آیت تھی۔ قطع نظر اس کے مسلمان جو نسیان سے انکار کرتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی آیت آں حضرت کے سینہ مبارک سے محو نہیں ہوگئی تھیں کہ ہمیشہ کے واسطے معدوم ہوگئی ہوں۔ اگر اس نسیان کو جو ان حدیثوں میں مذکور ہے تسلیم بھی کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف اتنا ہے جس وقت اس شخص نے وہ آیت پڑھی اس وقت آں حضرت کو اس کا خیال نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خوب یاد دلایا۔ یہ امر بمتقاضائے بشریت ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ ہم بشریت سے آں حضرت کو مبرا نہیں کرتے ہیں۔ اس آیت کا یاد آ جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آں حضرت کے سینہ مبارک سے وہ آیت محو نہیں ہوئی تھی۔

قرآن مجید حضرت ابوبکر کی خلافت میں کس طرح جمع ہوا

قرآن مجید کے جمع ہونے کا صحیح اور کامل بیان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں بخاری کی ایک صحیح اور معتبر حدیث میں مذکور ہے جس کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے کہ:

عن زید ابن ثابت قال ارسل الیٰ ابوبکرؓ عند مقتل اهل الیمامة فاذا عمر بن الخطاب عنده قال ابوبکرؓ ان عمرؓ اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقرا القرآن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن

فیذهب کثیر من القرآن والی 'اری ان تامر بجمع والیٰ قلت لعمر کیف تفعل شئیا لم یفعله رسول الله صلعم قال عمر هذا والله خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلک ورایت فی ذلک الذی رای عمر قال زید قال ابوبکر انک رجل شاب عاقل لا نتهمک وقد کنت تکتب الوحی لارسول الله صلی الله علیه وسلم نتبع القرآن فاجمعه الله لو کلفونی نقل جبل من الجبال ماکان اثقل علی مما امرنی به من جمع القرآن قال قلت لابی بکر کیف تفعلون شیئا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال هو والله خیر فلم یزل ابوبکر براجعنی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر و عمر فتتبعت القرآن اجمعه من العسب واللخاف و صدور الرجال حتی وجدت اخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجدها مع احد غیره ''لقد جائکم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم '' حتی خاتمة براة وکانت الصحف عند ابی بکر حتی توفاه الله ثم عند حفصة بنت عمر (رواه البخاری)

''زید ابن ثابت کہتے ہیں کہ مجھ کو ابوبکر نے اہل یمامہ کے قتل کے زمانہ میں بلا بھیجا۔ عمر بن خطاب بھی وہاں موجود تھے ابوبکر نے کہا کہ عمر میرے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کے دن قرآن کے قاری کثرت سے قتل ہو گئے اور میں ڈرتا ہون کہ اور موقعوں پر بھی قاری کثرت سے مقتول ہوں۔ تو قرآن بہت ا جاتا رہے گا اور میری رائے یہ ہوگی کہ تم قرآن کے جمع کرنے کا حکم کرو۔ میں نے عمر سے کہا تم وہ کام کیوں کر کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کیا

عمر نے کہا خدا کی قسم یہ بات عمدہ ہے۔ عمر اسی طرح مجھ سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس کے لیے کھول دیا اور میں نے بھی اس کام میں وہ فائدہ دیکھا جو عمر نے سوچا تھا۔ زید کہتے ہیں کہ ابوبکر نے کہا کہ تم جوان عاقل آدمی ہو تم پر ہم بدگمانی نہیں کر سکتے اور تم رسول اللہ صلعم کے لیے وحی لکھا کرتے تھے پس قرآن کی جستجو کر کے اس کو جمع کرو۔ سو خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کے ہٹا دینے کو کہتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا کہ قرآن جمع کرنے کا حکم گراں معلوم ہوا میں نے ابوبکر سے کہا کہ تم لوگ وہ کام کیوں کر کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ ابوبکر نے کہا خدا کی قسم یہ اچھا کام ہے۔ ابوبکر اسی طرح اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس کے لیے کھول دیا جس کے لیے ابوبکر و عمر کو خیال دلایا تھا۔ پس میں قرآن کو تلاش کر کے جمع کرنے لگا ہڈیوں اور سفید پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینہ سے یہاں تک کہ سورہ توبہ کا اخیر میں نے ابوخزیمہ انصاری کے پاس پایا اور کسی کے پاس نہیں پایا ”لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم“ سے براۃ کے اخیر تک اور سب قرآن ابوبکر کے پاس تھے یہاں تک کہ خدا نے ان کو وفات دی پھر عمر کے پاس تھے۔ ان کی زندگی تک پھر حفصہ کے پاس جو عمر کی بیٹی تھیں۔“

مذکورہ بالا حدیث سے تین امر قرار واقعی تصریح ہوتی ہے:

اول: حضرت عمر کے اس کہنے سے کہ یمامہ میں بہت سے قرآن کے قاری قتل ہو

گئے ہیں اور مجھ کو اندیشہ ہیکہ اگر اور مقاموں میں سخت لڑائی ہو اور قرآن کے قاری بہت مارے جائیں تو اا کثر حصہ قرآن کا ضائع ہو جاوے گا۔ اس قول سے پایا جاتا ہے کہ اس وقت تک بہت سے قاری جن کو قرآن مجید ج قدر کہ آں حضرت پر نازل ہوا تھا بخوبی یاد تھا موجود تھے۔

دوم: ہم کو بدرجہ یقین ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو قرآن مجید حفظ یاد تھا۔

سوم: اس میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں تھی جو تلاش کے بعد چمڑے یا ہڈیوں یا اور کسی چیز پر لکھی ہوئی نہ ملی ہو۔

ان تمام بیانوں سے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں اور نیز عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث سے جس کو ہم ابھی نقل کریں گے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ زید ابن ثابت نے کل قرآن مجید کو بے کم و کاست جمع کر لیا تھا اور یہ قرآن جو بالفعل ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے بجنسہ وہی ہے۔ کوئی چیز اس میں چھوٹی ہوئی نہیں ہے۔

عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ:

عن عبدالعزیز بن رفیع قال دخلت انا و شدا د بن معقل علی ابن عباس فقال له شداد بن معقل اترک النبی صلعم من شئی قال ما ترک الا ما بین الدفتین قال و دخلنا علی محمد بن الحنیفة فسالنا فقال ما ترک الا ما بین الدفتین (بخاری).

”میں اور شداد بن معقل ابن عباس کے پاس گئے۔ شداد نے ان سے کہا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چھوڑا ابن عباس نے کہا کچھ نہیں چھوڑا مگر دو دفتیوں کے درمیان میں (یعنی قرآن) کہا اور گئے ہم محمد بن حنفیہ کے پاس اور ان سے بھی پوچھا

انہوں نے کچھ نہیں چھوڑا مگر دو دفتیوں کے درمیان میں‘‘۔

حضرت عثمانؓ جامع الناس علی القرآن کی خلافت میں قرآن مجید کی نقلوں کا تقسیم ہونا

وہی قرآن جس کو زید بن ثابت نے جمع کیا تھا حضرت عثمان کی خلافت تک محفوظ چلا آتا تھا۔ حضرت عثمان نے اپنی خلافت میں اس کی متعدد نقلیں مختلف ممالک میں بھیجیں۔ چنانچہ یہ امر نہایت تفصیل کے ساتھ بخاری کی ایک حدیث میں مذکور ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن انس بن مالک ان حذیفه بن الیمان قدم علی عثمان و کان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینیة و ازربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراة فقال حذیفة لعثمان یا امیر المومنین ادرک هذه الامة قبل انیختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود و النصارٰی فارسل عثمان الی حفصة ان ارسلی الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیک فارسلت بها حفصة الی عثمان فامر زید ابن ثابت و عبدالله بن الزبیر و سعد بن العاص و عبدالرحمان بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القر شیین الثلثة اذا اختلفتم انتم و زهد ابن ثابت فی شی من القرآن (وفی حدیث فی عربیة من عربیة القرآن‘‘ باب نزل القرآن بلسان قریش) فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم

ففعلوا حتى اذا نسخوا الصحف فى المصاحف رد عثمان الصحف الى حفصة وارسل الى كل افق يمصحف مما نسخوا و امر بما سواه من القرآن فى كل صحيفة او مصحف ان بحرق قال ابن شهاب و اخبرانى خارجة بن زيد بن ثابت انه سمع زيد بن ثابت قال فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا المصحف وقد كنت اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقراء بها فالتمسنا ها فوجد نامع خزيمة بن ثابت الانصارى من المومنين رجال صدقوا ماعاهد والله عليه فالحقنا ها فى سورتها فى المصحف (رواه البخارى).

''حذیفہ بن یمان عثمان کے پاس آئے اور وہ عراق والوں کے ساتھ اہل شام سے لڑے تھے۔ آرمینہ اور آزر بیجان کی فتح میں۔ تو حذیفہ کو ان لوگوں کا قراۃ قرآن میں مختلف ہونا رنج دہ ہوا۔ حذیفہ نے عثمان سے کہا کہ اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو قبل اس کے قرآن میں مختلف ہو طرح یہود و نصاریٰ مختلف ہوئے عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے ہمارے پاس بھیج دو ہم نقل کر کے واپس کر دیں گے۔ حفصہ نے عثمان کے پاس وہ صحیفے بھیج دیے۔ عثمان نے زید ابن ثابت وعبداللہ بن الزبیر وسعد بن العاص وعبدالرحمان بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا کہ سو ان لوگوں نے ان کو مصحفوں میں نقل کیا اور عثمان ن تین قریشی گروہوں سیکہا کہ جب تم لوگ اور زید ابن ثابت قرآن کی کسی چیز میں اختلاف کرو (اور ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کی کسی عربیت کے متعلق اختلاف کرو دیکھو باب نزول

القرآن بلسان قریش) تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو کیوں کہ
قرآن انہیں کی زبان میں اترا ہے ۔ پس ان لوگوں نے ایسا ہی کیا
یہاں تک کہ جب صحیفوں کو مصحفوں میں نقل کرلیا تو عثمان نے صحیفے
حفصہ کے پاس واپس بھیج دیے اور جو قرآن کے نسخے نقل ہوئے ۔
ان کو ملک کے ہر ایک حصہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جو کچھ
کہ کسی صحیفہ یا مصحف میں ہو سب جلا دیا جاوے ابن شہاب کہتے ہیں
کہ مجھ کو خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی کہ انہوں نے زید بن
ثابت سے سنا کہ وہ کہتے تھے۔ کہ میں نے ''احزاب' کی ایک آیت
نہیں پائی قرآن کی نقل کرتے وقت اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے اس کو پڑھتے سنا تھا۔ پس ہم نے اس کی جستجو کی ۔ پر
خزیمہ بن ثابت انصری کے پاس یہ آیت پائی۔ ''من المومنین رجال
صدقوا ماع اھد واللہ علیہ'' پس اس کو اس کی سورت میں مصحف میں ملا
دیا۔''

یاد رکھنا چاہیے کہ جملہ

اختلافھم فی القرات

سے وہی اختلاف قرات مراد ہے جس کا بیان شرح و بسط سے اوپر ہو چکا ہے اور

جملہ

فی عربیة من عربیة القرآن

جس کو ہم نے دو خطوط ہلالی میں لکھا ہے اور جو ایک اور حدیث کا ٹکڑا ہے اس کا
مطلب کو زیادہ واضح کرتا ہے اور حضرت عثمان کی خلافت میں جو نقلیں تیار ہوئی تھیں وہ بالکل

مطابق اصل کے تھیں اوران میں کسی طرح تغیر وتبدل یا کمی بیشی نہیں کی گئی تھی لہجہ یا صیغوں کے تلفظ کا جو اختلاف عرب کی زبانوں میں تھا اس کا بھی کچھ نشان نہ تھا۔

زید بن ثابت کی پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ توبہ کا اخیر حصہ خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا تھا۔لیکن اس روایت میں بیان ہے کہ سورہ احزاب کی ایک آیت حزیمہ انصاری کے پاس سے نکلی تھی۔ان دونوں بیانوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے کیوں کہ جس زمانہ میں سورہ توبہ کا آخری حصہ بھی خزیمہ کے پاس سے ملا ہوگا اور سورہ احزاب کی آیت بھی انہیں کے پاس سے نکلی ہوگی۔اس آخیر کی روایت سے یہ سمجھنا کہ احزاب کی آیت پر وقت نقل کرنے قرآن کے دستیاب ہوئی تھی یہ غلطی ہے کیوں کہ یہ ذکر ھی اس روایت میں اسی وقت کا ہے کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں زید ابن ثابت نے قرآن جمع کیا تھا اور اگر فرض کریں کہ یہ ذکر اس وقت کا ہے جب کہ قرآن کی نقلیں ہوئیں تھیں تو بھی ممکن ہے کہ اس جمع کیے ہوئے قرآن میں سے وہ آیت کسی طرح خراب ہوگئی ہو اور پھر تلاش سے خزیمہ کے پاس سے ملی ہو۔یا ابن شہاب کو یا حضرت انس کو اس روایت کے بیان کرنے میں کچھ اشتباہ واقع ہوا ہو۔

قرآن مجید کا اپنے طرز میں کامل ہونا اس کے الہامی الاصل ہونے کو ثابت کرتا ہے

اس موقع پر ہم بشپ مڈلٹن کے بیان کو جو ایک عالم اور فاضل آدمی تھا نظر انداز نہیں کر سکتے وہ بیان کرتا ہے کہ ''یونانی توریت اور انجیل سے بالکل جہالت اور وحشیانہ پن ظاہر

ہوتا ہے اور جملہ عیوب سے جن کا کسی زبان میں پایا جانا ممکن ہے بھری ہوئی ہیں۔ مگر ہم کو ازروئے فطرت کے خود بخود یہ توقع ہوتی ہے کہ الہامی زبان کا سلیس اور لطیف عمدہ پر اثر ہوتا ہے اور اس کا عام کلام کی قوت اور اثر سے بھی متجاوز ہونا ضرور ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہوسکتی ہے جس میں کسی قسم کا نقص ہو خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو افلاطون کی سی لطافت اور سسرو کی سی بلاغت کا متوقع ہونا چاہیے۔

اب چوں کہ قرآن مجید اپنی طرز میں کامل ہے اس واسطے اس کا الہامی الاصل ہونا لازم آتا ہے اور اسی طرح سے اس کا الہامی الاصل ہونا اس کے کامل النوع ہونے پر دلالت کرتا ہے کیوں کہ انسان سے جو خود ضعیف البنیان اور مرکب من الخطاء والنسان ہے کوئی کامل اور بے عیب شے پیدا نہیں ہوسکتی۔ اسی امر کی نسبت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیتیں دعویٰ کرتی ہیں۔

پہلی آیت یہ ہے خدا فرماتا ہے کہ:

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتو بسورۃ من مثلہ وادعوا شھدا کم من دون اللہ ان کنتم صادقین فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار رلتی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین (سورۃ بقر آیت ۲۱ و ۲۲)

”اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری پس لاؤ اسی کی سی ایک سورۃ اور بلاؤ اپنے گواہوں کو خدا کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پس اگر نہ کرو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو بچو اس آگ سے جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

دوسری آیت یہ ہے خدا فرماتا ہے کہ:

قل لئن اجتمعت الانسا والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولا کان بعضھم لبعض ظھیرا (سورہ بنی اسرائیل آیت ۹۰)

''کہہ دے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اتفاق کریں کہ اس قرآن کا مثل لائیں تو نہ لاسکیں گے گو ایک دوسرے کے مددگا رہوں''۔

ان آیتوں کا مقصود و مدعا وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے ہکہ انسان ضعیف البنیان کی بنائی ہوئی کوئی چیز کامل النوع نہیں ہوسکتی بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جو خود ذات کامل ہے ہر شے کامل النوع کا مخرج ہے اور یہ امر اس بات پر غور کرنے سے اور بھی زیادہ واضح اور غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ قدرت کی سب سے زیادہ سادہ اور سب سے کم پیچیدہ اشیاء میں سے ایک چیز کی بھی کسی مصنوعی شے نے ہم سری نہین کی ہے سبقت لے جانا تو در کنار۔

اگرچہ یہ بات ممکن ہے کہ انسان کوئی ایسی چیز بناوے جو اور مصنوعی چیزوں کے وسیع دائرہ میں یکتائی کا دعویٰ کرے اور باوجود اس کے کہ اور اشخاص اس کی خوبی تک پہنچنے کے لیے بہت کچھ جدوجہد کریں اور اس تک نہ پہنچ سکیں تاہم اس کو کامل النوع کہنا ٹھیک اور جائز نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کی خوبی چار چیزوں سے ثابت ہوتی ہے (۱) اس کے نہایت صاف اور شستہ دل رپ اثر کرنے والی اور رجھانے والی فصاحت و بلاغت سے (۲) اس کے اصول متعلق بہ دینیات سے (۳) اس کے اخلاقی اصول سے (۴) قانون سیاست اور انتظام مدن کے اصول سے جو اس میں مندرج ہیں ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو محض اہل عرب سے متعلق تھی کیوں کہ قرآن مجید انہیں کی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہی دعویٰ بے مثلی کر رہے تھے۔ باقی تین چیزیں تمام جہان کی طرف خطاب کی گئی تھیں اور ہم اپنے

مخالفوں اور حریفوں کے روبرو جرات اور اعتماد سے دعویٰ کرتے ہیں کہ کسی غیر الہامی شخص نے اس کا مثل نہ تو پیدا کیا ہے اور نہ کوئی قیامت تک پیدا کر سکے گا۔

جو اصول کہ ہم نے اوپر بیان کیے ہیں ان سے مشہور مورخ گبن محض ناواقف تھا اور اسی لیے ناواقفی کے سبب سے اس نے مغالطہ کھایا ہے جہاں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ''پیغمبر خدا حرارت مذہبی یا جوش کی حلات میں اپنی رسالت کی صداقت کو اپنے قرآن کی خوبی پر منحصر کرتے ہیں۔ اور انسان اور ملائک دونوں کو اپنے قرآن کے ایک صفحہ کی بھی خوبیوں کی برابری کرنے کے لیے قس دلاتے ہیں اور جوش سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا بے نظیر کلام صرف اللہ تعالیٰ کا ہی ہوسکتا ہے' یہ دلیل نہایت استحکام کے ساتھ ایک سرگرم عرب کی طرف خطاب کی گئی ہے جس کا دماغ ایمان اور کیفیت کے واسطے موزوں ہے اور جس کا کان سریلی آوازوں سے مسرت اندواز ہوتا ہے اور جس کی بے علمی انسانی ذہانت کے ایجادوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ طرز بیان کی فصاحت اور بلاغت ترجمہ کے ذریعہ سے یورپ کے کافروں تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ اس کے قصے اور احکام اور بیان کی اس بے انتہا ناموزوں بے ربطی کو جس سے کسی قسم کا تصور و خیال بہت کم پیدا ہوتا ہے جو کبھی تو خال پر غلطاں ہوتا ہے اور کبھی بادلوں کے پار ہو جاتا ہے نہایت بے صبری کے ساتھ پڑھتے ہیں''۔ مگر ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کی بے مثل فصاحت و بلاغت کا دعویٰ محض اہل عرب کے واسطے مخصوص نہ تھا اور ملک کے لوگوں کے لیے اس لیے مسٹر گبن کا بیان کچھ اس دعویٰ کے مخالف نہیں ہوسکتا۔

پھر یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ ''اگر قرآن مجید کی تحریر استعداد انسانی سے متجاوز ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈی موستھنیز کی فلپکس کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیے'' مگر ہم کسی ایسی مصنوعی شے کے وجود کے امکان کا اوپر اقرار کر چکے ہیں جس کی خوبی سے کوئی اور

چیز ہم سری نہ کر سکے اور جو اسی نوع کی اور مصنوعی اشیاء کے تمام دائرہ میں ہمیشہ دعویٰ یکتائی کرتی رہے با ایں ہمہ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ وہ اپنی نوع میں کامل ہو۔

یہی مورخ پھر بیان کرتا ہے کہ ''اوصاف الٰہی کا بیان رسول عرب کی قوت مدرکہ کو اعزاز بخشتا ہے لیکن ان کے بلند ترین خیالات صحیفہ ایوب کی ذی شان سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں''۔

ہم مسٹر گبن کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کر سکتے کیوں کہ مسٹر گبن میں قرآن مجید اور صحیفہ ایوب کے باہمی تفرق کی نسبت حکم دینے کا مادہ نہیں ہے۔ لیکن ہم بدوں خوف اعتراض کے کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم اور عربی دانوں نے قرآن مجید کو بہ لحاظ فصاحب و بلاغت کے بے مثل قرر دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے سبقت نہیں لے گئی اور نہ لے جا سکے گی۔ لبید سا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورہ بقر کی چند آیتوں کو سن کر متحیر ہو گیا اور اس کی بلاغت کا انسانی قوت سے برتو ہونے کا اقرار کیا اور آں حضرت کی رسالت کو قبول کر لیا۔

چند اور عیسائی عالموں نے بھی اسی کے موئد رائیں قرآن مجید کی نسبت لکھی ہیں جن کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ ''میرے نزدیک قرآن مجید میں سچائی جوہر اور اس کے تمام معاین میں موجود ہے جس نے کہ اس کو وحشی عربوں کی نظروں میں بیش بہا کر دیا تھا۔ سب سے اخیر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے اخیر جو عمد گیاں ہیں وہ اپنے میں رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف کی بنا پر صرف اسی سے ہو سکتی ہے''۔

مسٹر گاڈفری ہگنز لکھتے ہیں کہ ''حضرت مسیح کی انجیل کی طرح قرآن مجید غریب آدمی

کا دوست اور غم خوار ہے۔ بڑے آدمیوں کی دولت مند آدمیوں کی ناانصافی کی ہر جگہ مذمت کی گئی ہے وہ آدمیوں کی باعتبار مدارج کے توقیر نہیں کرتا ہے۔ یہ امر اس کے مصنف کی لازوال نیک نامی کا موجب ہے (خواہ وہ محمد عرب کے نامی پیغمبر ہوں یا اسکے تیسرے خلیفہ عثمان) اور (واضح ہو کہ گاڈفری ہگنز کا یہ اعتقاد تھا کہ قرآن مجید عثمان کا تصنیف کیا ہوا ہے) کہ اس میں ایسا ایک بھی کوئی حکم نہیں بتلایا جا سکتا جس میں پولیٹیکل خوشامد و رواداری کی طرف ذرا سا بھی میل ہو اور جس طرح کہ ویسٹ منسٹر ریویو نے منصفانہ رائے دی ہے کہ اگر کسی خودمختار مشرقی حاکم کو کوئی چیز کبھی روک سکتی ہو تو وہ غالباً قرآن مجید کی ایک بے تکلف آیت کسی باجرات مظلوم کی زبانی ہوگی"۔

ایک اور مصنف نے کوارٹرلی ریویو میں قرآن مجید کی نسبت یہ مضمون لکھا ہے کہ "ان تبدیلیات مضامین میں جو مثل برق کے تیز و طرار ہیں اس کتاب کی ایک نہایت بڑی خوبصورتی پائی جاتی ہے اور گیتھ کا یہ سچا قول ہے کہ جس قدر ہم اس کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ ہمیشہ در کھنچتی جاتی ہے یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے اور پھر متجب کرتی ہے اور آخر کار فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے"۔

وہی مصنف ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ "شادی اور غم، محبت اور بہادری اور جوش کے وہ عظیم الشان اظہارات جن کی محض ضعیف آواز ہائے بازگشت ہمارے کانوں پر اثر کرتی ہے محمد کے وقت میں پوری پوری آواز رکھتے تھے اور محمد کو س سے زیادہ نامی اور گرامی لوگوں سے کچھ ہم سری ہی کرنی نہیں پڑی تھی بلکہ ان پر فوقیت حاصل کرنی تھی اور اپنے کلام کو اپنی رسالت کی علامت اور دلیل گردا ننا پڑا تھا"۔

ایک اور مقام پر یہی مصنف لکھتا ہے کہ: "ہم دفعتاً از راہ ترجیح اس عجیب کتاب کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہاں بڑا

جہاں اور روم کی سلطنت سے وسیع تر فتح کر لی اور جس قدر زمانہ کہ روم کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔ایسی کتاب جس کی اعانت سے جملہ بنی سام میں یہی ہوگ بہ حیثیت سلاطین کے یورپ میں آئے تھے جہاں کہ اہل فینشیا تاجروں کی حیثیت سے اور یہود پناہ گیروں یا قیدیوں کی طرح آئے تھے یہی لوگ مع اپنے پناہ گیروں کے یورپ کو انسانیت کی روشنی دکھلانے کے واسطے آئے تھے۔ یہی لوگ جب کہ تاریکی محیط ہورہی تھی یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندہ کرنے اور اہل مغرب اور اہل مشرق کو فلسفہ، طب، ہئیت ' اور نظم لکھنے کے خوش نما اور دل چسپ فن سکھلانے اور علوم جدیدہ کے بانی مبانی ہوئے تھے۔اور ہم لوگوں کو غرناطہ کی تباہی کے دن پر ہمیشہ کے واسطے کو رلانے آئے تھے''۔

مسٹر سیل اس طرح لکھتے ہیں کہ '' یہ بات علی العموم مسلم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے انتہا کی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔لیکن اور زبانوں کی بھی کسی قدر آمیزش ہے گو وہ آمیزش بہت ہی قلیل ہے۔ وہ لاکلام عربی زبان کا نمونہ ہے اور زیادہ پکے عقیدہ کے لوگوں کو یہ قول ہے اور نیز اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا (گو بعض فرقوں کی مختلف رائے ہے) اور اسی واسطے اس کو لازوال معجزہ قرار دیا ہے۔ جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنی ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے اور خود محمد نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لیے اسی معجزہ کی طرف رجوع کیا ہے اور بڑے بڑے فصحائے عرب نے (جہاں کہ اس زمانہ میں اس قسم کے ہزارہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ شغل اور حوصلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت لائق اور فائق ہو جاویں) علانیہ کہلا بھیجا تھا اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ بھی بنا دو۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ

اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان ذی لیاقت لوگوں نے دراصل تعریف وتوصیف کی تھی جن کا اس کام میں مبصر ہونا مسلم ہے منجملہ بے شمار مثلوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہوں۔لبید ابن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد کے زمانہ میں بڑے زبان آوروں میں تھا خانہ کعبہ کے دروازے پر چسپاں تھا (یہ ایک نہایت اعلیٰ تصنیف کے واسطے مرعی تھا) اور کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیفات کو پیش کرنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔لیکن جب کہ تھوڑی ہی عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورة کی آیتیں اس کے مقابلہ میں لگائی گئیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکین میں سے تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر بحر تحیر میں غوطہ زن ہوا اور فی الفور اسلام قبول کرلیا اور بیان کی اکہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں ...... قرآن کا طرز تحریر عموماً خوش نما اور رواں ہے بالخصوص اس جگہ جہاں کہ وہ پیغمبرانہ وضع اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات پر مبہم ہے اور مشرقی ڈھنگ کے موافق پر حیرت صنعتوں سے مرصع اور روشن اور پر معنی جملوں سے مزین ہے اور اکثر جگہ اور علی الخصوص اس مقام پر جہاں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان ہے نہایت اعلیٰ درجہ اور رفیع الشان ہے''۔

سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مورخوں کی غلطیاں نسبت قرآن مجید کے

عیسائی عالموں نے قرآن مجید کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اگرچہ وہ صریحا لغو اور بے ہودہ ہے تاہ اس پر نظر ڈالنے اور ان غلطیوں کو بیان کرنے سے درگزر نہیں کی جاسکتی۔

مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری باتوں میں ترجمہ کرتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یورپ کی زبان میں جس قدر س کے ترجمے ہوئے وہ غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کیے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ: ''اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا کہ ہر لفظ قالب تبدیل متن اور شائستہ معنی سے دلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت پر جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب مشرح اس کے ساتھ لگ ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا ہے جن کی وساطت سے یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی''۔

مگر ہم بعض عیسائی مصنفوں کے جیسے مسٹر سیل ہیں شکر گزار ہیں کہ انہوں نے قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ کرنے میں بہت کوشش کی ہے۔ اگر اس میں کہیں غلطی ہے تو مفسرین کی صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز نہ کرنے کے سبب سے ہے جو حقیقت مسٹر سیل کے لیے ایک نہایت مشکل کام تھا۔

مگر ان عیسائی عالموں پر تعجب ہوتا ہے جنہوں نے عجیب عجیب خیالات اور ایسے ایسے خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں ہے قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں۔ ہمفری پریڈو ڈین آف ناروچ نے لکھا ہے کہ ''محمد (صلعم) لوگوں کو سکھاتے تھے کہ اس کتاب (یعنی قرآن) کا اصلی مسودہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے اور جبرائیل میرے پاس ایک ایک سورۃ کی نقل جس کی لوگوں میں شائع کرنے کی حسب موقع ضرورت ہوا کرتی ہے لایا کرتے ہیں''۔

یہ بیان ایک ایسا بے ہودہ بیان ہے کہ جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے۔ جب

کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گزرتا ہے۔ تو وہ متعجب اور متحیر رہ جاتے ہیں۔ کہ یہ کہاں سے اور کیوں کر لکھا گیا ہے۔

مشہور مورخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''وجود قرآن بقول آں حضرت کے یا اس کے متبعی کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے اور نور کے قلم کے ذریعے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پر لے آئے ہیں''۔

لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق ایک فلسفی مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا۔

ڈین پریڈو کی نادرست مگر دل چسپ ایجادیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ''محمد (صلعم) کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور انہوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا تھا جس کا نام صندوق رسالت تھا اور ابوبکر نے جو ان کے جانشین ہوئے سب اول اس کو جمع کیا کیوں کہ جب مسیلمہ نے انہیں کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے متبعین میں شائع کی۔ اس وقت ابوبکر نے محمد (صلعم) کے قرآنکو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا''۔

یہ چند مثالیں منجملہ ان سینکڑوں بے ہودہ باتوں کے جو عیسائی مصنفوں کی جملہ تحریرات میں اسلام کی نسبت پائی جاتی ہیں۔ سر ولیم میور ایک معقول قاعدہ مصنفی کا برتا ہے اور اپنے استدلالات میں مسلمانوں کی دینیات سے کس قدر واقفیت ظاہر کی ہے۔ لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے بحث کے واسطے صرف ان روایتوں کو منتخب کیا ہے جن کو خود

مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیا ل کرتے ہیں۔ یا ان کے مطلب اور مقصد میں مختلف الرائے ہیں۔

انہوں نے اولاً اپنی تمام لیاقتوں کو اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا ہے کہ محمد صلعم کے عہد میں نوشت وخواند عرب میں معلوم نہ تھی اور ''وحی بالعموم کھجور کے پتوں یا چمڑے یا پتھروں یا اور ایسی بے جوڑ اشیا پر جو سر دست دستیاب ہوتیں......لکھ لی جاتی تھی''۔ مگر اس امر سے ہم نے خود اقرار کیا ہے اور کسی مسلمان کو اس سے کبھی انکار نہیں ہوا بلکہ اس کو تو ہم قرآن مجید کے لفظ بہ لفظ محفوظ ہونے کا جیسا کہ پیغمبر خدا پر نازل ہوا تھا سب سے قوی دلیل خیال کرتے ہیں۔

سر ولیم میور آیات کے منسوخ ہونے کے نسبت کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کرتے ہیں جو کہ حسب قاعدہ اسلام درست نہیں ہے اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے مثلاً ان کا بیان ہے کہ ''اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مدعا تھا جو ایسے حالات کی وجہ سے عارضی ہوا تھا جس کی عظمت بہت جلد جاتی رہی اور یہ امر مشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ آیا پیغمبر صاحب کا منشاء اس قسم کی آیات سے ان کی عام عظمت یا ان کی ترویج تھی یا نہیں۔ قرینہ اس کو نہیں چاہتا کہ ان حصووں کے نگاہ رکھنے کی انہوں نے کوشش کی ہو۔''

یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معن نہ سمجھنے کے سبب یا غلط سمجھنے کے سبب ہوئی ہے۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی مطلق کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جاویں جس میں سے مسلمان فقیہوں نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب کوئی آیت عارضی مدعا کی قرآن مجید میں موجود نہ تھی اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں کار کسی اور ویلس سے مندرجہ ذیل روایتیں نقل کرتے ہیں ''ایک روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے محمد صلعم کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور جب صبح کو اکو کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کی نسبت پیغمبر صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اڑ گئی۔ اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزہ نما مضمون اور اضافہ کر دیا گیا ہے کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا''۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا نام بھی معلوم نہیں گروشیش کے کبوتر کی مانند ایک صریح ایجاد ہے اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور بلاشک بناوٹ ہے۔

سر ولیم میور نے ایک نئی اصطلاح ''وحی کامل'' کی مسلمانوں کے مذہب میں قائم کی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے موافق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ ''وحی کامل سے میری مراد بلاشک اس وحی سے ہے جو محمد (صلعم) کے آخیر زمانہ مںں موجود اور مروج تھی علاوہ اس کے جو شاید ضائع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو''۔

اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں۔ شاید ''آیات محکم'' کا ترجمہ سر ولیم مور نے وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم کے وہ معنی نہںں ہیں جو سر ولیم میور کی اصطلاح کو تسلیم کریں تو وحی کامل کا اطلاق ان سب وحیوں پر ہوگا جو جناب پیغمبر خدا پر نازل ہوئی تھیں اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضائع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی ہے۔

قرآن مجید کی ترتیب کی نسبت سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ''قرآن جس طرح کہ ہمارے زمانے تک چلا آتا ہے اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلعم) نے اس کے ہمیشہ اسی تسلسل میں پڑھنے کے واسطے فرمایا

ہو۔ مضامین کی ابتر ملاوٹ زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی، کسی جزو کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس سے پیش تر واقع ہونا جو بہت عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہو، کیس احکام کا ایسے احکام کے پیچھے ملحق ہونا جو اس کی تنسیخ یا ترمیم کرتا ہو۔ یا کسی دلیل کا دفعتاً ایسے فقرہ کے حائل ہو جانے سے منقطع ہو جانا جو اس کے مقصد کے موافق نہ ہو یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا در حقیقت کوئی کام ترتیب محمد (صلعم) کی حیات میں مستعمل اور مروج تھی"۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اس طرز میں جس میں کہ قرآن مجید ہے ایسی با قاعدہ ہے اور بہ لحاظ معنی کے اپنی طرز خاص میں ایسی منظوم ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ بہت سی کتابیں محض اس علاقہ کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے مابین موجود ہے۔ قرآن مجید کی عبارت ایسی موجز اور مختصر ہے کہ دو آیتوں کے علاقہ باہمی کی جن کے معنی بادی النظر میں ایک دوسرے سے بے گانہ معلوم ہوتے ہس کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہوتے ہیں" گونجنے والی اور سامعہ خراش ابتر خام بے سری، مکرر بیانی، طول کلام الجھاوٹ، نہایت خام اور مہمل" جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ وہ خدا کا کلام ہے از بجنسہ وہی الفاظ لکھ لیے گئے ہیں کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سیان کو محذوف رکھتا ہے مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا۔ عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ شان نزول آیتوں کی ان کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اسلیے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے۔ مگر مسلمانوں کو ایسا نہیں ہوتا۔

ہم افسوس سے بیان کرتے ہیں کہ سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں ہیں۔ اگر وہ کسی مخصوص آتیوں کو نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جا بجا بے ربطی ہو یا ان براہین کا جو ان کے نزدیک دفعتاً کسی ایسے فقرہ کے حائل ہونے سے منقطع ہو گئے ہوں جو ان کے مدعا سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس وقت ہم یقیناً صاحب موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے اور آیات کے واقعی علاقہ باہمی کی نشاندہی کر دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ بہ لحاظ سر ولیم میور کے اس بیان کے ''جو کسی احکام کے پیچھے کسی ایسے احکا کے ملحق ہونے کے باب میں ہے جو اس کی ترمیم یا تنسیخ کرتا ہو'' بارہا ہم لکھ چکے ہیں کہ ان اصلی معنوں کی ناواقفیت جن میں کہ علماء اسلام نے اصطلاحات ناسخ و منسوخ کو دراصل استعمال کیا ہے ایسے لئیق مصنف ک قل سے ایسا بیان نکلا ہے۔

حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں قرآن مجید کے یک جا جمع ہونے کے طریقہ کو بیان کرتے ہوئے سر ولیم میور حضرت عثمان کی خلافت کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ ''اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی حفصہ کے گھر سے دستیاب ہوئی اور ایک پر غور نظر ثانی عمل میں آئی۔ اگر زید اور ان کے ساتھیوں میں کوئی اختلاف ایا گیا تو ساتھیون کی رائے کو ترجیح دی گئی اس وجہ سے کہ محاورہ قریش سے واقف تھے اور اس نئے مجموعہ کی اس طرح سے مکی زبان میں تطبیق کر دی جس میں کہ پیغمبر صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا''۔

سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مخرج دریافت کرنے مٰں ہم نہایت حیران ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے مذکورہ بالا بیان میں تین جملے علانیہ اعتراض کے قابل ہیں: (۱) نظر ثانی (۲) اس طرح سے تطبیق کر دی (۳) نیا مجموعہ۔ کسی قسم کی روایات سے ہم کو ثابت نہیں ہوتا کہ زید کے جمع کیے ہوئے

قرآن مجید پر کبھی نظر ثانی ہوئی ہو۔جس حدیث میں کہ اس امر کا تذکرہ ہے اور جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔اس میں یہ الفاظ ہیں "فنسخوھا فی المصاحف" یعنی انہوں نے اس کی چند نقلیں کرلیں۔مگر اس میں پر غور نظر ثانی کا کچھ ذکر نہیں۔

اس حدیث میں یہ عبارت بھی ہے کہ:

اذا اختلفتم انتم و زید ابن ثابت فی شی من القرآن

یعنی جب کہ تم میں اور زید ابن ثابت میں قرآن مجید کے اندر کسی چیز میں اختلاف واقع ہو۔اگرچہ وہ چیز ج میں کہ ان کو اختلاف واقع ہو بہت سے احتمالات کی گنجائش رکھتی ہے لیکن ہم اس کے بعد ہی اسکی تشریح پاتے ہیں جہاں کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ

فکتبوہ بلسان قریش

یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو۔اب یہ صریح ظاہر ہے کہ وہ چیز اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ بھی نہ تھی۔بخاری کی حدیث سے جو نقل کی گئی ہے یہ امر اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ:

فی عربیۃ من عربیۃ القرآن

یعنی اگر تم کو قرآن کی عربیت کی کسی عربتی میں اختلاف ہو۔ان لفظوں سے زیادہ تر تلفظ اور مد اور ادغام اور نون ہائے تنوین سے علاقہ معلوم ہوتا ہے جو عربی عبارت کے پڑھنے میں مختلف قومیں عرب کی استعمال کرتی ہیں۔اس جملہ کے کہ "اس طرح سے مکی زبان سے تطبیق کر دی" یہ معنی ہیں کہ کچھ اختلاف واقع ہوا تھا اور جامعین نے اس کو بدل دیا۔مگر حدیث سے یہ بات نہیں پائی جاتی بے شک جامعین کو کہا گیا تھا کہ اگر کچھ اختلاف تم میں ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ درحقیقت ان میں اختلاف واقع ہوا تھا پس سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ "انہوں نے مکی زبان سے تطبیق کر دی" صحیح نہیں ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ سر ولیم میور نے لفظ ''نیا مجموعہ'' کس بنا پر استعمال کیا ہے اور کس جگہ سے ان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ اس امر کی نسبت وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں اس طرح پر تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے واسطے کہا گیا ہے کہ قرآن اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے زبان عربی کی سات مختلف زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد (صلعم) ہی اس کے خیال کے بانی اور موئد ہوئے ہوں بدیں غرض کہ ایک ہی آیت قرآنی کی مختلف الالفاظی کی دقت رفع ہو جاوے'' یہ عبارت ایک ایسی طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے کہ جس پر ہم افسوس کرتے ہیں ایسے لوگون پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، پاک باطنی۔ راست بازی کے واسطے ممتاز ہوں دغا، فریب، اور ریا کاری کا الزام لگانا بہان جائز کے معینہ قوانین اور اخلاق اور تہذیب کے مسلم اصول کے خلاف ہے ہم اس امر کو اکتابکے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے کیوں کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاک باز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسے ہی تعظیم وتکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ۔ معہذا کیا سر ولیم میور اس بات سے ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد اور بغیر مد اور بغیر ادغام اور بانون تنوین اور بغیر نون تنوین پڑھنے سے جو عرب کی مختلف قوم کے مختلف طریقے تھے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا تھا۔ لیکن درحقیقت لفظ میں یا معنی میں کچھ نہیں ہوتا۔ یا لفظ کا ایک ہی مادہ مختلف صورت سے بلا تبدیل اصلی مادہ لفظ اور معنی کے پرھا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ الحمد میں لفظ (مالک) کا ہے قدیم تحریر میں اس کی یہ صورت ہے ''ملک'' یہ لفظ ملک بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ ملاک بھی پڑھا جا سکتا ہے لام کی تشدید سے اور مالک بھی پڑھا جا سکتا ہے پس اگر اس لفظ کو کسی عرب نے کسی طرح پڑھا ہو باوصف اختلاف تلفظ کے کوئی تبدیل مادہ لفظ یا معنی میں نہیں ہے۔ لیکن قریش کی زبان میں

مالک کا لفظ جاری تھی اور اس کا قائم رکھنا کون سے اعتراض کا مقام ہے

سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا وہ مقتضا اس مقصد کا تھا جس مقصد سے انہوں نے کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ ''دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو'' اور ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ تک ایسی ہی رہے گی اور اس امر کی تصدیق اس پیشن گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے خدا فرماتا ہے:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون

یعنی تحقیق ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم بالتحقیق اس کی حفاظت کریں گے۔

سر ولیم میور اپنے بیانات کے اثنا میں فرماتے ہیں کہ ''اگر ابوبکر کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو ایسی جلدی وہ کیوں کر خراب ہو جاتا اور اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہوتا''۔ ہم نہایت صاف طور پر اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ وہ کسی کی نظر ثانی کا محتاج ہوا تھا اور نہ اس میں نظر ثانی کی گئی تھی بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں۔

قرآن مجید میں اختلاف کے سبب جو سر ولیم میور نے بیان کیے ہیں وہ صحت سے بالکل معرا ہیں ہم قرات مختلفہ کے ذیل میں جس قدر کہ اس مضمون کی نسبت بینا کرنا ممکن تھا شرح وبسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

سر ولیم میور آگے چل کر بیان فرماتے ہیں کہ ''لیکن جب کہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید جس حیثیت سے اس کو پیغمبر صاحب نے چھوڑا تھا اب بجنسہ ویسا ہی موجود ہے۔ اس دعویٰ کے واسطے کہ خود پیغمبر صاحب نے ہی بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی

ہوں بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے‘‘۔

مگر ہم کہتے ہیں کہ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ درحقیقت بعض آیتیں ایسی تھیں کہ پیغمبر خدا نے ان کو خارج کر دیا تھا اس وقت تک بلا شبہ یہ بات کہ جس حیثیت سے قرآن پیغمبر صاحب نے چھوڑا تھا بجنسہ ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ حدیث عبدالعزیز سے اوپر بیان ہو چکا ہے اور تمام وحی قرآنی جو آں حضرت پر نازل ہوئی تھیں قرآن میں موجود ہیں اس بات کی کافی دلیل ہے کہ پیغمبر خدا نے نہ کسی آیت کو تبدیل کیا ہے اور نہ کسی آیت کو خارج کیا ہے۔ مگر ہم کسی جگہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اس مضمون پر کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کریں گے پس اس جگہ اس وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اپنے مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق پر مندرجہ ذیل سندیں پیش کرتے ہیں اور ان بیانات کو کاتب الواقدی سے نقل کرتے ہیں کہ ’’عمر نے ابی ابن کعب کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے ہ بہ تحقیق بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں کیوں کہ ابی کہا کرتا ہے کہ میں نے پیغمبر صاحب کو یوں فرماتے سنا ہے اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبر صاحب نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے ابی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں۔

سر ولیم میور نے جیسا کہ ان کی تحریر سے پایا جاتا ہے اس مضمون کو توڑ مروڑ دیا ہے اور جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمر سے منقول ہے سراسر خلاف ہے اور اس عبارت کا کہ ’’بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں‘‘ اس حدیث کا پتا بھی نہیں ہے۔ ہم اس حدیث کو بجنشہ بے کم و کاست ذیل میں مندرج کرتے ہیں اور ہو حدیث یہ ہے:

حدثنا عمرو بن علی قال حدثنا یحییٰ قال حدثنا سفیان عن حبیب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال قال عمر اقرانا ابی و اقضانا علی وانا لندع من قول ابی وذلک ان اھیا یقول لا ادع شئیا سمعته من رسول الله صلعم وقد قال الله تعالیٰ ما ننسخ من آیة او ننسھا (بخاری کتاب التفسیر).

> ''ابن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابی بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں اور ہم لوگ ابی کا قول چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ بات ہے کہ ابی کہتے ہیں میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا اور حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ما ننسخ من آیۃ او ننسھا۔''

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمر بعض آیات قرآنی کو جن کو ابی پڑھا کرتے تھے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات استخراج کرنے کے متعلق ہے ابی قرآن مجید کی ہر ایک آیت سے جو حکم مستخرجہ کو صحیح خیال کرتے تھے اور جملہ احکام مستخرجہ کو صحیح خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ظواہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضرور نہیں جیسے ک اہل ظواہر کا مذہب ہے۔ لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی رائے اس کے برخلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ابی سب سے عمدہ قرآن پڑھنے والا ہے اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام وقوانین مستخرج کر سکتے ہیں اس واسطے ہم چھوڑ دیتے ہیں ابی کے قول کو یعنی جو ابی نے قرآن سے حکم کا استخراج کیا ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علی سے

اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری اس تشریح کی تصدیق خود اسی حدیث کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ ''اقضانا علی'' کیوں کہ اگر یہ حدیث محض قرات مختلفہ سے متعلق ہوتو یہ جملہ اس کے بقیہ حصہ سے کچھ علاقہ نہ رکھے گا۔

ہمارے اس بیان کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بخاری نے جو مسلمانوں کے ہاں نہایت نامی اور مقدس اور مستند محدثین میں سے ہے کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ وہ احکامات ناسخ ومنسوخ سے بحث کرتا ہے نہ اس جگہ جہاں کہ اس نے قرات مختلفہ کا بیان کیا ہے مگر بخاری نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں اس مقام پر بھی بیان کیا ہے جہاں کہ اس نے قاریوں کے باہمی اختلاف پر بحث کی ہے چنانچہ اس حدیث کو بھی ہم نقل کرتے ہیں اور اس بات پر بھی بحث کریں گے کہ ان دونوں حدیثوں میں سے کون سی حدیث صحیح ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

حدثنا صدقة ابن الفضل قال اخبرنا یحییٰ عن سسفین عن حبیب بن ابی ثابت عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال قال عمرؓ علیؓ اقضانا وابی اقرانا وانا لندع من لحن ابی و ابی یقول اخذته من فی رسول الله صلی الله علیه وسلم فلا اترکه لشئی قال الله تعالیٰ ما ننسخ من آیة او ننسها نات بخیر منها او مثلها (بخاری باب القراء).

''ابن عباس سے رویت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا علیؓ ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاضی ہیں اور ابی ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاری ہیں اروہم لوگ ابی کی قرات کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابی کہتے ہیں کہ میں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے لیا ہے پس اس کو کس طرح نہ چھوڑوں گا اللہ تعالیٰ نے کہا ما ننسخ من آیۃ

او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (یعنی جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اسے اچھی یا اس کے برابر لاتے ہیں)۔''

اس حدیث میں وہ لفظ جس کا ترجمہ ہم نے قرات کیا ہے ''لحن'' ہے مگر جو کہ قرآن مجید اور اس کی آیتوں کا ایک ہی لحن ہے اس لیے آیات قرآنی کی تلاوت پر بھی لحن کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ پچھلی حدیث دو وجہ سے مشکوک ہے: اول یہ کہ گو اس حدیث کے اور نیز حدیث ماسبق دونوں کے راوی ایک ہیں مگر پہلی میں لفظ ''قول'' اور دوسری میں لفظ ''لحن'' مستعمل ہوا ہے اس لیے ہمارا عقیدہ ہے کہ صدقہ ابن فضل اس حدیث کے راوی نے لفظ ''لحن'' کو بجائے ''قول'' کے براہ غلطی استعمال کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں دو جملے ہیں ایک ''علی اقضانا'' اور دوسرا ''ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا'' ان دونوں جملوں کو قرآن کی قرات مخصوص سے قیاس قابل کوئی علاقہ نہیں ہے اس واسطے ہماری رائے ہے کہ صدقہ نے پہلی حدیث کے سمجھنے میں اور دوسری حدیث کے بیان کرنے میں علانیہ غلطی کی ہے لیکن بغرض اختتام حجت تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ پچھل حدیث بھی صحیح ہے تو اس سے زیادہ اس کے اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے کہ حضرت عمر نے حضرت علی مرتضیٰ کے لحن کو ابی کے لحن پر ترجیح دی ہے۔ بہرکیف سر ولیم میور نے براہ زبردستی اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا ہے کہ ''حضرت عمر نے کہا کہ ہم بالتحقیق بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں''۔

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ''ابن عباس نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ بن مسعود کا پڑھنا پسند ہے کیوں کہ محمد (صلعم) ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبرائیل سے پڑھوایا کرتے تھے اور اپنی وفات کے سال میں اس کو دو مرتبہ

پڑھوایا تھا اور عبداللہ دونوں مرتبہ حاضر تھے اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوئی تھی اس کو مشاہدہ کیا تھا''۔

اس روایت کے اخیر حصہ کی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور نہ ہم اس کو کسی مستند اور صحیح حدیث میں پاتے ہیں اور اگر بالفرض وہ واقدی میں موجود بھی ہے جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا۔ تب بھی وہ اعتبار کے مستحق نہیں ہے کیوں کہ تمام نامعتبر اور بے سند روایتیں جو واقدی میں ہیں ٹام مور کے قصہ لالہ رخ سے کچھ زیادہ اعتبار کی مستحق نہیں ہیں اور اگر ہم بفرض اتمام حجت اس کی اصلیت تسلیم کرلیں تو بھی سر ولیم میور کا یہ فرج کیا ہوا عقیدہ کہ ''قرآن مجید میں شاید بعض ایسی آیتیں نہ ہوں جو ایک زمانہ میں نازل ہوئی ہوں مگر بعد کو منسوخ یا ترمیم ہوگئی ہوں'' کیوں کر ثابت ہوتا ہے ۔ باقی رہی یہ آیت کہ:

ماننسخ من آیة او ننسهانات بخیر منها او مثلها

اس پر ہم پہلے بحث کرچکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ شریعت یہود سے علاقہ رکھتی ہے نہ آیات قرآن سے۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیوں کے ضمن میں بعض روایات کو قرآن مجید کی آیتوں کے اخراج یا عدم اندراج کی تمثیلات کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

اول بیر معونہ کی روایت کو لکھا ہے کہ ''بیر معونہ پر ستر مسلمانوں کے شہید ہونے پر محمد (صلعم) نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کے پیغام کے پہنچنے کا دعویٰ کیا جس کو مختلف راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح پر نقل کیا ہے:

بلغوا قرمنا عنا انا لقیا ربنا فرجی عنا و رضینا عنه (کاتب الواقدی)

تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کردی گئی''۔

اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے۔ مزید ے برآں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ ''تمام مسلمان ان کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی'' محض بے بنیاد ہے اور کسی معتبر اور مستند روایت میں پایا نہیں جاتا اوا گر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھا تھا اور درحقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔

دوسری روایت سر ولیم میور نے متعلق احکام زنا کے لکھی ہے کہ ''عمر کی نسبت کہا گیا ہے کہ اپنی خلافت میں اہل مدینہ سے اس طرح گفتگو کی'' اے لوگو اس بات کی احتیاط رکھو کہ اس آیت کو بھول نہ جاؤ جو زنا کی نسبت سنگ ساری کا حکم دیتی ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم دو سزاؤں کو یعنی بیاہے اور بے بیاہے اشخاص کی زنا کاری کی بابت کتاب اللہ میں نہیں پاتے ہیں تو ان کا میں یہ جواب دیتا ہوں کہ میں نے پیغمبر صاحب کو زنا کی پاداش میں سنگ سار کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اسی پر ہ نے ان کے بعد عمل درآمد کیا ہے اور واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی بات قرآن میں درج کر دی تو میں نے اس کو قرآن میں درج کر دیا ہوتا کیوں کہ میں نے بہ تحقیق اس آیت کو پڑھا ہے کہ:

والشیخ والشیخۃ اذا زنیافا رجموھما البتہ (کاتب الواقدی اور ویلس)

اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے اصلی حدیث کی غلط بیانی اور غلط نمائی ہے اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ کہ

والشیخ والشیخۃ اذا زنیافا رجموھما البتہ

اصل حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے کہ کبھی مسلمانوں نے اس کو

قرآنی آیت سمجھا ہو دوسرے اس فقرہ کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ قطع نظر عربوں سے کوء یجی ادنیٰ درجہ کا عربی دان بھی اس کو نہ لکھے گا چہ جائے اس کے وہ خدا کا کلام ہو۔ مگر ہم اس امر کو ابتدا سے بیان کریں گے اور اس بیان کے اثنا میں اصلی حدیث کو بھی نقل کریں گے جس سے ثابت ہوگا کہ عربی فقرہ مذکورہ بالا اس میں نہیں ہے۔

والـلاتی یا تین الفاحشة من تسائکم فاستشهدو اعلیهن اربعة منکم فـان شهـدوانـا مسکـو هن فی البیوت حتی یتو فاهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا (سوره نساء آیت ١٩)

''قرآن مجید میں زنا کی سزا یہ ہے کہ اور تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کریں تو ان پر چار گواہ لاؤ۔ پس اگر وہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں روک رکھو یہاں تک کہ وہ اپنی موت سے مریں یا خدا ان کے لیے کوئی راہ نکالے''۔

دوسری آیت جب میں زنا کی سزا کی تفصیل ہے وہ یہ ہے:

الزانی والزانیة فاجلدوا کل واحد منها مایة جلدة (سوره نور آیت ٢)

''زانی اور زانیہ ہر ایک کو ان میں سے سو کوڑے مارو۔

بعد اس کے پیغمبر خدا نے زنا کے باب میں اس طرح فرمایا جو ذیل کی روایت میں بیان ہوا ہے:

عـن عبـادة بـن الـصـامـت قال......قال خذوا عنی قد جعل الله لهن سبیلا الثیب بـالثیـب والبـکر بالبکر الشیب جلد مایة ثم رجم بالحجارة والبکر جلد مایة ثم نفی سنة (مسلم باب حد الزنا)

''عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ کہا......لو مجھ سے خدا

نے ان کے لیے رستہ نکالا ثیب ثیب کے ساتھ اور باکرہ باکرہ کے
ساتھ ثیب کو سو کوڑے مارے جائیں گے پھر سنگ سار کیا جاتا ہے
اور باکرہ کو سو کوڑے مارے جائیں پھر ایک برس جلاوطن کر دینا کافی
ہے''۔

اوراس میں کچھ شک نہیں کہ خود پیغمبر صاحب نے یہودی مرداورعورت کو جو زنا کاری کے مجرم قرار پائے تھے یہودی شریعت کے موافق سنگ سار کرنے کی اجازت دی تھی اروا گر یہ بھی تسلیم کرلیں کہ یہودی کے سوااور کسی کو بھی آں حضرت نے سنگ سار کیا تھا تو بھی اس بات کا ثابت کرنا غیر ممکن ہے کہ بعد نزول اس آیت کے جس میں زنا کی سزا کا حکم ہے آں حضرت نے ایسا حکم دیا ہو۔ اسی طرح مسلم کی اس حدیث کی نسبت جو اوپر مذکور ہے ثابت کرنا مشکل ہے کہ وہ حدیث سورہ نور کی آیت کے بعد کی ہے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد زنا کی سزا کی نسبت اختلاف رائے ہوا۔ جس کا ہونا ضرور تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں اور ایک حدیث کی بنا پر اوپر مذکور ہوئیں تین مختلف رائیں پیدا ہوئیں۔

اول: سورہ نساء کی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ''ان کو اپنے مکانوں سے باہر نہ جانے دو یہاں تک کہ موت ان کو ٹھکانے لگائے یا اللہ تعالیٰ ان کے واسطے کوئی سبیل نکال دے' اس آیت کے آخر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے کہ جو مسلم کی حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ بیاہے ہوئے اشخاص کو بجرم زنا سو درے لگانے چاہئیں اوسنگ سار کرنا چاہیے اور کنوارے شخصوں کو سو درے لگانے چاہئیں اور ایک سال کے واسطے جلاوطن کر دینا چاہیے۔ کچھ عجب نہیں ہے کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھا ہو۔

دوم: بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ سورہ نساء کی آیت سورہ نور کی آیت سے

منسوخ ہوگئی ہے اور زنا کی سزا خواہ اس کا مرتکب کوئی بیاہا ہوا شخص ہو خواہ کوارا سو درے قرار پائے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے مسل کی حدیث کی کچھ وقت نہیں کی اور اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں (۱) یہ کہ محقق نہیں ہے کہ وہ قول آں حضرت کا جو مسلم کی حدیث میں ہے سورہ نور کی آیت کے بعد کا ہے۔ (۲) یہ کہ جب تک کسی امر میں کوئی خاص حک نازل نہیں ہوتا تھا تو آں حضرت یہود کی شریعت کے موافق عمل فرمایا کرتے تھے اور اس لیے مسلم کی حدیث حجت کے قابل نہیں ہوسکتی۔

سوم: بعض لوگ اس بات کو تو تسلیم کرتے تھے کہ سورہ نساء کی آیت تو سورہ نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے۔ مگر جو کہ سورہ نساء کی آیت میں کوئی قطعی سزا مذکور نہیں ہے اس لیے مسلم کی حدیث میں جو سزا ہے وہ بیاہے ہوئے شخصوں کے لیے سزا ہے اور سورہ نور کی آیت میں جو سزا ہے وہ کوارے لڑکوں کے لیے سزا ہے۔ مسعودی کی بھی اسی قسم کی رائے معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختلاف رائے آج تک چلا آتا ہے کیوں کہ معتزلی اور خارجی جو مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں اور معتزلی فرقہ کے لوگ عربیت میں بڑا اعالی درجہ رکھتے ہیں۔ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگ سار کرنا نہیں ہے اور اس خطبہ کے راقم کی بھی گو وہ ان دونوں فرقوں سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو بلکہ سنی مذہب کی بھی یہی رائے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر وہ رائے رکھتے ہیں جس کا ہم نے تیسری قسم میں بیان کیا ہے اور اس لے جب کہ وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو۔

واقدی نے اس حدیث کو زیادہ افراط وتفریط کے ساتھ لکھا ہے اور سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں اس کو بجنسہ نقل کیا ہے۔ اصل حدیث جو مسلم میں منقول ہے ہم ذیل میں مع

ترجمہ کے لکھتے ہیں:

قال عمر ابن الخطاب وو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ عث محمد ا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق انزل علیہ الکتاب فکان ھما انزل اللہ علیہ آیۃ الرجم قرآنا ھاو عینا ھاو عقلناما فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رجمنا بعدہ باخشیٰ ان طال بالناس زمان ان بقول قائل مانجد الرجم فی کتاب اللہ تعالیٰ فیضلو ابترک فریضۃ انزلھا اللہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ اوکان الجل او العتراف (مسلم باب حد الزنا).

''عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسل کے منبر پر بیٹھے تھے کہا کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق بھیجا۔ ان پر مقرر یے ہوئے حکم اتارے سوان چیزوں میں سے جو ان پر اللہ نے اتاریں رحم کا سایہ تھا ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کی ااور خیال کیا سو رحم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ہم نے ان کے بعد رحم کی امیں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گزر جائے پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رحم کو خدا کے مقرر کیے ہوئے احکام میں نہیں پاتے پس تو گمراہ ہوں گے اس فرض چھوڑنے سے جس کو خدا نے اتارا اور رجم حق ہے خدا کے مقرر کیے ہوئے حکم میں اس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاھا ہوا ہو۔ مردوں اور عورتوں میں سے۔ جب دلیل قائم ہو جاوے یا حمل رہ گیا ہو یا خود ان کو اقرار ہو۔ (مسلم باب حد الزنا)

اما قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فقد جعل اللہ لھن سبیلا فاشارۃ الی

قول الله تعالیٰ فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت اویجعل الله لھن سبیلا فبین النبی صلعم ھذا ھو ذلک السبیل واختلف العلماء فی ھذہ الایة فقیل ھی محکمة و ھذالحدیث مفسرلھا و قیل منسوخة بالایة التی فی اول سورة النور وقیل ان ایة النور فی البکرین وھذہ الایة فی الثیبین (نووی)

''لیکن آں حضرت کا قول کہ ''خدا نے ان کے لیے رستہ نکالا '' اللہ کے اس قول کی طرح فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفھن الموت او یجعل اللہ لھن سبیلا (یعنی پس ان کو روک رکھو گھروں میں یہاں تک کہ موت ان کو اٹھالے یا خدا ان کے لیے رستہ نکالے) اشارہ ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رستہ کا بیان کر دیا۔ اور عالم لوگ مختلف ہوئے ہیں اس حکم میں پس کہا گیا کہ وہ محکم ہے ار یہ حدیث اس کی مفسر ہے اور کہا گیا کہ وہ منسوخ ہے اور حکم سے جو سورہ نور کے اول میں ہے۔ اور کہا گیا کہ ''نور'' کا حکم باکرہ کے باب میں ہے اور یہ حکم ثیبہ کے باب میں ہے (نووی)۔

قول فکان مما انزل الله علیه ایة الرجم فرانا ھاعیناھا وعقلنا ھا اراد به ایة الرجم ''الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھا البته'' (نووی)

''حضرت عمر کا یہ قول کہ ''ان چیزوں میں سے جو خدا نے ان پر اتاریں، رجم کا حکم تھا ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا۔ اس سے مراد رجم کا یہ حکم ہے ''الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة'' (یعنی جب میں بوڑھا اور بوڑھی زنا کریں تو ان کو ضرور سنگسار

کرو)۔(نووی)''۔

وفی ترک الصحابة کتابة هذه الاية دلالة ظاهرة ان لامنسوخ لا یکتب فی المصحف (نووی).

''اور صحابہ نے جو اس حکم کا لکھنا چھوڑ دیا تو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ منسوخ قرآن میں نہیں لکھا جاتا (نووی)''۔

قوله فاخشیٰ ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب الله فیضلوا بترک فریضة هذا الذی خشیة قد وقع من الخوارج ومن وافقهم (نووی)

''حضرت عمر کا یہ قول کہ میں ڈرتا ہوں کہ جب زیادہ زمانہ گزر جاوے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حکم میں سے نہیں پاتے پس لوگ گمراہ ہوں گے ایک فرض کے چھوڑنے سے یہ ڈر جو حضرت عمر کو تھا خارجیوں اور ان کے موافقوں سے اس کا ثبوت بھی ہو گیا (نووی)۔

واجمع العلماء علی وجوب جلد الزانی البکر مائة ورجم المحصن وهو الثیب ولم یخالف فی هذا واحد من اهل القبلة الاما حکی القاضی عیاض وغیره عن الخوارج وبعض المعتزلة کالنظام واصحابه فانهم لم یقولو ا بالرجم (نووی)

''اور اجماع کیا ہے عالموں نے اس پر کہ جو زانی بکر ہو اس کو کوڑے پیٹنا واجب ہے اور بیاہو ہوا اور ثیب ہو اس کو سنگسار کرنا واجب ہے اور اس امر میں اہل قبلہ میں سے ایک شخص نے بھی

اختلاف نہیں کیا سوائے اس کے کہ قاضی عیاض وغیرہ نے خارجیوں
اور بعض معتزلہ سے جیسے نظام اور اس کے متبعین سے نقل کیا ہے کیوں
کہ یہ لوگ رجم کے قائل نہیں ہیں (نووی)۔

اس ترجمہ میں ہم نے لفظ ''آیت'' اور ''کتاب'' کے ترجمہ میں ''حکم'' کا لفظ مستعمل کیا ہے، ہم اس باب میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں، مگر ہمارا مخالف اس ترجمہ پر معترض ہونے کا مجاز ہے اور کہہ سکتا ہیکہ الفاظ ''آیت'' اور ''کتاب'' ہی کیوں نہ مستعمل کیے اس لیے ہم دوسرا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس میں ''آیت'' کا ترجمہ ''آیت'' اور ''کتاب'' کا ترجمہ ''قرآن کیا ہے اس ترجمہ کے پڑھنے والوں پر ظاہر ہو گا کہ اگر اس طرح پر ترجمہ کیا جاوے تو حدیث کیسی مہمل اور بے معنی ہو جاتی ہے۔

دوسرا ترجمہ: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر بیٹھے تھے یہ کہا کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ ولم کو برحق بھیجا ' ان پر قرآن اتارا۔ سوان چیزوں مُں سے جو ان پر اللہ نے اتاریں رجم کی آیت تھی۔ ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا کہ سو رجم کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور ہم نے ان کے بعد رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گزر جانے پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو قرآن میں نہیں پاتے۔ پس تو گمراہ ہوں گے اس فرض کے چھوڑنے سے جس کو خدا نے اتارا اور رجم حق ہے۔ قرآن میں اس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاہا ہوا ہو مردوں اور عورتوں میں سے جب دلیل قائل ہو جائے یا حمل رہ گیا ہو یا خود ان کو اقرار ہو (مسلم)۔

کیا اس حدیث کے یہ دو فقرے کہ ''ہم قرآن میں رجم کا حکم نہیں پاتے'' اور یہ فقرہ کہ ''بے شک رجم قرآن میں ہے'' ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں؟

اس لفظی بحث کو چھوڑ کر اب ہم اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ عبارت جس کو سر ولیم میور واقدی سے نقل کرنا بیان کرتے ہیں کہ ''اور واللہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی چیز قرآن میں درج کر دی تو میں اس کو قرآن مجید میں درج کر دیتا ہوں کیوں کہ بہ تحقیق میں نے اس آیت کو سنا ہے:

والشیخ والشیخة اذا ذنیا فارجمو هما البته

اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے اور نیز اپنی کامل آگہی کی غرض سے ہمارے مفسرین اور اہل سیر نے تمام مہمل اور بے ہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے بہ کمال آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام تحقیق مسلمان ان کو مہمل تصور کرتے ہیں اور اسلام ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

نووی مسلم کی شرح میں لکھتا ہے کہ لفظ ''حکم'' سے جس کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے منجملہ ان احکامات کے جو پیغمبر خدا پر نازل ہوئے تھے' آیت رجم بھی تھی اور ہم نے اس آیت کو دیکھا اور پڑھا اور سمجھا تھا اور وہ آیت

الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما البته

ہے۔ اس کے بعد نووی یہ بیان کرتا ہے کہ چوں کہ آیت مذکورہ کا قرآن مجید میں کہیں پتہ نہیں ہے اس لیے یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں کی گئی تھیں۔

مگر ہر ذی فہم شخص سمجھتا ہے کہ نووی کا یہ بیان نہ تو کوئی حدیث نبوی ہے اور نہ کوئی حکم مذہبی ہے' بلکہ ایک مفسر کی محض رائے ہے معہذا یہ رائے بھی تسکین بخش نہیں ہے کیوں کہ اس

پر یہ اعتراض عائد ہوتے ہیں: (۱) یہ کہ نووی نے اس امر کے ثبوت کی کوشش بھی نہیں کی کہ آیت مذکورہ درحقیقت قرآنی آیت تھی (۲) یہ کہ وہ اس بات کی بھی کوئی دلیل پیش نہیں کرتا کہ حضرت عمر کی مراد اسی آیت سے تھی (۳) اس نے ان دونوں باتوں کو بلا دلیل غلطی سے صحیح تصور کر کے یہ نتیجہ باطل مستنبط کیا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ ہماری اکثر کتب سیر وتفاسیر ایسی ہی روایات اور احادیث سے مملو ہیں جو مفروضات باطل پر مبنی ہیں اور بجز مصنف ہی کے قیامت کے اور کسی چیز سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ عیسائی مصنف ان کی تحقیق سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اور ان کو صحیح حدیثیں تصور کر لیتے ہیں اور بہ کمال شوق اسلام کی نسبت بے اصل الزامات ان پر مبنی کرتے ہیں۔ اس مقام پر ہم کو اس امر سے کہ رجم کا حکم اسلام میں ہے یا نہیں زیادہ بحث نہیں ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ جس کو آیت رجم کہا جاتا ہے وہ کبھی قرآن کی آیت نہیں تھی اور نہ کبھی قرآن مجید سے خارج کی گئی تھی۔

آیتوں کے اخراج اور عدم اندراج کی بابت سر ولیم میور نے تیسری مثال مارکیس کی نقل کی ہوئی روایت بیان کی ہے، جو سونے کی گھاٹی کے باب میں تھی اور جو قرآن مجید میں مندرج ہونے سے رہ گئی ہے۔ چوتھی تمثیل میں وہ عبداللہ ابن مسعود کے اس قصہ کو پیش کرتے ہیں، جس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رات کو اپنے ورقوں میں سے ایک آیت کو غائب پایا۔ پانچویں تمثیل میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں، جو مکہ کے معبودان مجازی کے بارہ میں تھی۔ لیکن ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے خود یہ بات کہ کر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں، اس جھگڑے کو چکا دیا ہے۔ پس ہم کو مردہ کے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔

☆☆☆ اختتام ------------------------ حصہ دوئم

اردو کا کلاسیکی ادب

مقالات سرسید

آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی سیرت طیبہ
کے متعلق بارہ تحقیقی اور تنقیدی مقالات

جلد یازدہم حصہ سوئم

مرتبہ

مولانا محمد اسماعیل، پانی پتی

خانہ کعبہ کے تاریخی حالات

(اسلام سے قبل)

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین

عرب کے ملک میں جو نہایت قدیم روایات اس زمانہ سے جب کہ قرآن مجید کا ذکر بھی نہ تھا، برابر چلی آتی ہے اور جس کو عرب کی تمام قومیں بغیر کسی شبہ اور اختلاف کے پشت در پشت مانتی چلی آئی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل ان کے شریک تھے۔

قرآن مجید میں اس گھر کے بننے کی جو خبر آئی ہے۔ وہ بھی اسی قدر ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (سورہ بقرہ . آیت ۱۲۱)

> ”جب کہ ابراہیم و اسماعیل نے اس گھر کی بنیادیں اٹھائیں تو انہوں نے یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے پروردگار! اس گھر کو ہم سے قبول کر۔ بے شک تو اس دعا کو سننے والا ہے اور دلی نیت کو جانتا ہے“۔

اس دعا سے جو اس کے بنانے والوں نے کی اور قرآن مجید کی اور بہت سی آیتوں سے جو اس کے بعد ہیں بہ خوبی ظاہر ہے کہ یہ گھر خدا کے واسطے یعنی اس کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا جیسے کہ اس زمانہ میں لوگ مسجد بناتے ہیں۔

قرآن مجید میں کعبہ کو بالتصریح (مسجد) کہا گیا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ:

انما المشکرون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام ام بعد عامهم هذا (سوره توبه . آیت ۲۸)

''مشرک ناپاک عقیدہ کے ہیں۔ وہ اس برس کے بعد سے اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) کے پاس نہ آویں''۔

اور ایک جگہ اور خدا نے فرمایا کہ:

لقد صدق الله رسوله الرویا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء الله (سوره فتح آیت ۲۷)

''خدا نے اپنے رسول کو یہ سچا خواب دکھلایا بالکل ٹھیک کہ ''بے شک تم داخل ہوگے اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) میں انشاءاللہ ''۔

جس زمانہ میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں اس زمانہ میں کعبہ کے گرد وہ مکانات نہیں تھے جو اب ہیں اور جو حرم کہلاتے ہیں اور جن کا مطلب یہ ہے کہ مسجد داخل حد حرم ہے لیکن خاص کعبہ وہ مسجد ہے' جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا اور اسی خاص عمارت کو قرآن مجید میں مسجد الحرام کہا ہے۔

قرآن مجید میں کوئی خاص زمانہ کعبہ کی تعمیر کا نہیں بتایا ہے۔ صرف دو صفتیں اس کی

بیان ہوئی ہیں، ایک ''بیت العتیق'' یعنی نہایت پرانا گھر دوسرے ''اول بیت وضع للناس'' یعنی سب سے پہلا گھر جو آدمیوں نے خدا کی عبادت کرنے کو بنایا گیا جس قاعدہ پر حال کے زمانہ کے مورخ پرانے زمانہ کا حساب لگاتے ہیں اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سنہ کی بیالیسویں صدی میں یعنی حضرت عیسیٰ سے انیسوی صدی ماقبل میں کعبہ بنا تھا پس اگر اسی حساب کو صحیح مانا جاوے تو بھی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں تک کہ اس کا حال معلوم ہوا ہے، کعبہ سے پہلے کوئی خدا کا گھر خدا کی عبادت کے لیے نہیں بنایا گیا تھا، بلکہ سب سے اول کعبہ بنا تھا۔

ہم صرف عرب کی روایت اور قرآن مجید کی آیت ہی کو اس بات کے ثبوت کے لیے کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے پیش کرنے پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے ثبوت کے لیے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں اور جن کو ان لوگوں نے لکھا ہے جس کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چنانچہ امر مذکورہ کا ثبوت مفصلہ ذیل مقدمات کے ملانے اور ان سے نتیجہ نکالنے سے بہ خوبی حاصل ہوتا ہے۔

مقدمہ اول

ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اسی نواح میں یعنی حجاز میں بسایا جہاں اب کعبہ ہے

ہم اس کے ثبوت کے لیے ایسی مذہبی یا تاریخی روایتوں پر جو متنازعہ ہیں اور جن کے الفاظ کے معنی یا مصداق پر بحث ہے توجہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایسے واقعات پر استدلال کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتے ہیں' اوران کو ایسے لوگوں نے تحقیق کیا ہے جن کو اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے تھے ا۔ نبایوث ۲۔ قیدار ۳ ادبئیل ۴ میسام' ۵۔ مشماع' ٦۔ دوماہ' ۷۔ مسا' ۸ حدر' ۹۔ تیما' ۱۰۔ یطور' ۱۱۔ نافیس' ۱۲۔ قیدماہ اور یہ سب حجاز میں آباد تھے جہاں مکہ ہے۔

پہلا بیٹا حضرت اسماعیل کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصہ میں آباد ہوا۔ ریورنڈ گاڑی پی کاری ایم نے اپنے نقشہ میں اس کا نشان ۲۸ و ۳۰ درجہ عرض شمالی اور ۳۶ و ۳۸ درجہ طول مشرقی کے درمیان میں لگایا ہے۔

دوسرا بیٹا حضرت اسماعیل کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا

روورنڈ مسٹر فاسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاء نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے، جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں اور زیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ مُس شہرالحزراور نبت سے پایا جات اہے جو اصل میں القیدار اور نایاث ہیں اہل عرب کی یہ روایات کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے دوسرے یہ کہ یہ بات یہ خوبی ثابت ہے کہ یورینیس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں، گیدری یعنی قیدری دری یعنی مختلف قیدری اور گدڑ و ناتئ یعنی قیداری کدریتی یعنی قیدری، چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول صفحہ ۲۴۸ میں مندرج ہے پس بہ خوبی ثابت ہ کہ قیدار حجاز میں آباد تھا۔

روورنڈ گاٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶ و ۲۷ عرض شمالی و ۳۷ و ۳۸ طول مشرقی کے درمیان لگایا ہے۔

تیسرا بیٹا حضرت اسماعیل کا اوبئیل ہے بموجب سند جوزیفس کے اوبئیل بی اپنے ان دونوں بھائیوں کے ہم سایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا بیٹا حضرت اسماعیل کا مسام ہے مگر اس کی سکونت کے مقام کا پتہ نہیں ملتا۔

پانچواں بیٹا حضرت اسماعیل کا مشماع ہے ریورنڈ مسٹر فاسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مشماع لکھا ہے اسی کو یونانی ترجمہ سبٹو ایجنٹ میں مسما اور جوزیفس نے مسماس و بطلیموس نے مسمیز لکھا ہے اور عرب میں اسی کی اولاد بنی مسما کہلاتی ہے پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا عرب نجد کے اولا آباد ہوا تھا۔

چھٹا بیٹا حضرت اسماعیل کا دوماہ تھا مشرقی اور مغربی جغرافیہ داں قبول کرت ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔

ساتواں بیٹا حضرت اسماعیل کا مسا تھا ریورنڈ مسٹر فاسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ بیٹا مسوپوٹیمیا میں آباد ہوا مگر یہ صحیح نہیں ہے کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا جب حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا نام قائم ہے' ریورنڈ گاٹری بی کری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۳ درجہ اور ۳۰ درجہ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ اور ۳۰ درجہ طول شرقی میں قائم کیا ہے۔

آٹھواں بیٹا حضرت اسماعیل کا حدر تھا اور عہد عتیق میں حداد بھی اس کا نام ہ یمن میں شہر حدیدہ اب تک اسی کا مقام بتلا رہا ہے' اور قوم حدیدہ جو یمن کی ایک قوم ہے اسی کے نام کو یاد دلاتی ہے۔ زھیرمی مورخ کا بھی یہی قول ہے اور ریورنڈ مسٹر فاسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں بیٹا حضرت اسماعیل کا تیما تھا ان کی سکونت کا مقام نجد ہے اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے

دسواں بیٹا حضرت اسماعیل کا یطور ہے ریورنڈ مسٹر فاسٹر بیان کرتے ہیں کہ اس کا مسکن جدور میں تھا جو جبل کسیرنی کے جنوب میں اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں بیٹا حضرت اسماعیل کا نافیش تھا' ریورنڈ مسٹر فاسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربیا ڈزرٹا میں ان کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں بیٹا حضرت اسماعیل کا قیدماہ تھا انھوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی تھی غرض کہ اہل جغرافیہ کی تحقیقاتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل اور ان کی اولاد کا مسکن حجاز تھا۔

مقدمہ دوم

حجراسود اور قربانی کی رسم کو اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص ابراہیم سے تعلق ہے

خود حضرت ابراہیم اور تمام ان کی اولاد میں یہ رواج تھا کہ خدا کی عبادت کی جگہ پر بہ طور ایک نشان کے لنبا بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور اس کو مذبح یعنی قربانی گاہ اور بیت اللہ قرار دیتے تھے اور وہاں خدا کی عبادت بجالاتے تھے' اور اس کے نام پر قربانی کرتے تھے پس کعبہ میں اسی رسم کا برابر جاری چلا آنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس معبد کی اصل ابراہیم سے ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ پتھر اور قربانی اور بیت اللہ نام رکھنے کی رسم ابراہیم سے چلی آتی ہے توریت مقدس سے جس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں کرسکتا ثابت ہوتی ہے۔

کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷ میں لکھا ہے کہ ''تب خداوند نے ابراہام کو دکھلائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا'' اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے

نام سے اس کو موسوم کیا۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی آٹھویں آیت میں ہے کہ بلوطستان ممری میں جو جبرون میں ہے' ابراہیم جا رہا تھا اور وہاں خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لیے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ ان کی اولاد میں بھی جاری تھا چنانچہ کتاب پیدائش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ بیر شبع میں اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھلائی دیا اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا۔

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے۔

کتاب خروج باب ۲۵ میں لکھا ہے کہ ''اگر میرے لیے پتھر کا مذبح بناوے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیوں کہ اگر تو اسے اوزار لگاوے گا تو اسے ناپاک کرے گا''۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ درس ۴ میں لکھا ہے کہ ''اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے موافق بارہ ستون بنائے گئے''۔

اور کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۸۔۱۹۔۲۲ میں لکھا ہے کہ ''یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا' لے کے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا''۔

اور اس مقام کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا۔

اور کہا کہ ''یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا ہے خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہو

گا''۔

ان آیتوں سے بہ خوبی یہ ثابت ہے کہ ابراہیم اوراس کی اولاد کا یہ طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لیے مذبح ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کرکر بناتے تھے کبھی اس کے ساتھ کوی ء مکان بھی بنادیتے اور کبھ پتھر کو کھڑا کرنے کے بعد بناتے تھے اوراس کو بیت اللہ کہتے تھے۔

بالکل یہی حالت کعبہ کی اور حجر اسود کی ہے جوایک بن گھڑا لمبا پتھر ہے پہلے صرف حجر اسود کھڑا کیا تھا پرھ جب وہاں کعبہ بنایا تو اس کے کونہ میں اس کو لگا دیا۔

توریت میں صرف بنی اسرائیل کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں اور بنی اسماعیل کا اس میں ذکر نہیں ہے مگر ملکی روایتوں یا جاہلیت کے اشعار میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ارزقی کی کتاب اخبار مکہ سے پایا جاتا ہے کہ بن گھڑا پتھر کھڑ کر کر خدا کی عبادت گاہ بنانا صرف بنی اسرائیل ہی میں نہ تھا بلکہ بنی اسماعیل میں بھی بہ کثرت رائج تھا۔

چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ:

ان بنی اسماعیل و جرهم من ساکنی مکة ضاقت علیهم مکة فتفسحوا فی البلاد والتمسوا المعاش لیزعمون ان اول ما کانت عبادة الحجارة فی بنی اسماعیل انه کان لا یظعن من مکة ضاعن منهم الا احتملوا معهم من حجارة الحرم تعظیما للحرم و صبابة مبکة وبالکعبة حیث ما حملوا وضعوه فطافوا به کالطواف بالکعبة حتی سلخ ذلک بهم الی ان کانوا یعبدون ما استحسنوا من الحجارة واعجبهم من حجارة الحرم خاصة حتی خلفت الخلوف بعد الخلوف و نسوما کانوا علیه واستبدلوا بدین ابراهیم و اسمعیل وغیره فعبدوا الاوثان . (صفحه ۷۲).

''بنی اسماعیل و جرہم جو مکہ میں رہتے تھے وہاں رہنے کی ان کو

گنجائش نہ ہوئی تو وہ ملک میں نکلے اور معاش کی تلاش میں پڑے پس
لوگ خیال کرتے ہیں کہ اولا پتھر کا پوجنا بنی اسماعیل میں اس طرح
شروع ہوا کہ جب ان میں سے کوئی مکہ سے جاتا تو حرم کے پتھروں
میں سے ایک پتھر اٹھا لیتا' حرم کو بزرگ سمجھ کر اور مکہ اور کعبہ کے شوق
میں جہاں اترتے تو اس پتھر کو رکھ لیتے اور اس کے گرد مثل کعبہ کے
طواف کرتے' پھر اس کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی' کہ جو پتھر اچھا
دیکھتے اور جو حرم کا پتھر عجیب اور اچھا معلوم ہوتا اس کی عبادت کرتے
۔اس طرح پشتوں پر پشتیں گزر گئیں اور بھول گئے جو بات پہلی تھی اور
ابراہیم اور اسماعیل کے دین کو بدل دیا اور بتوں کو پوجنے لگے''۔

مسلمانوں کی کتابوں میں اس پتھر کی نسبت نہایت قصہ آمیز روایتیں لکھی ہیں اور ترمذی اور ابن ماجہ و دارمی مُں بھی چند عجیب عجیب روایتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ یہ پتھر نہایت پرانا ہے اور حضرت ابراہیم کے ساتھ منسوب ہونے سے قدیمی ہونے پر تقدس اور زیادہ ہو گیا ہے ویسے ہی لوگوں نے اس کی نسبت جیسا کہ پرانی باتوں کی نسبت دستور ہے' قصہ آمیز اور تعجب انگیز روایتیں بنالی ہیں۔قرآن مجید میں اس پتھر کا مطلق ذکر نہیں ہے اگر درحقیقت وہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ روایتوں کے بنانے والوں نے بیان کیا ہے تو ممکن نہ تھا کہ باوجودیکہ قرآن مجید میں کعبہ کے بننے کا ذکر ہے اور پتھر کا ذکر نہ کیا جاتا۔جس قدر روایتیں اس پتھر کی نسبت آئی ہیں سب مجروح و مرجوح ہیں اور کسی کی سند قابل اعتبار کے نہیں ہے اور نہ ان کا سلسلہ درستی اور صحت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے مگر ان روایتوں کا خلاصہ بیان کرنا خصوصاً ان کا جو ترمذی و ابن ماجہ و دارمی میں ہے خالی از لطف نہ ہوگا۔

روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ ''یہ پتھر حضرت جبرائیل بہشت سے لائے تھے اور وہ

اول اول دودھ کی مانند سفید تھا لیکن انسان کے گناہوں نے اسے سیاہ کردیا‘‘ ایک روایت کا یہ مضمون ہیکہ ’’وہ بہشت میں کے جواہرات میں کا ایک لعل بے بہا ہے خدا نے اس کی چمک دمک لے لی ہے‘ اگر نہ لیتا تو تمام دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک منور ہو جاتی‘‘ ایک اور روایت میں ہے کہ ’’قیامت کے دن اس پتھر کے دو آنکھیں اور ایک زبان ہو گی جن کے ذریعہ سے وہ ان کو پہچان لے گا اور ان کے نام بتادے گا جنھوں نے اس دنیا میں اس کو بوسہ دیا ہے‘‘ ایک لامذہب نے اس روایت کو سن کر کہا کہ جب دنیا میں اس کی کی آنکھیں ہی نہیں ہیں تو وہ قیامت میں آنکھیں ملنے سے کیوں کر شناخت کر لے گا۔ ایک احمق مسلمان نے جواب دیا کہ خدا کی قدرت سے۔ لامذہب بولا کہ پھر آنکھیں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بالفرض اگر کوئی ان روایتوں کو صحیح تسلیم کرے تو ان کے الفاظ کے لغوی معنی نہیں لیے جاویں گے‘ بلکہ ان کو بہ طور استعارہ قرار دیا جاوے گا اور اس صورت میں ان کا مقصود یہ ہو گا کہ کسی آدمی کے افعال جو اس نے دنیا میں کیے ہیں‘ قیامت میں پوشیدہ نہیں رہیں گے۔ اس قسم کے مضامین کو استعارہ میں بیان کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اس کو بآسانی سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے ہاتھ گواہی دیں گے کہ اس نے ان سے کیا کیا کیا ہے اور اس کی زبان ان سب باتوں کو بیان کرے گی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی ہیں اور جس زمین پر وہ اترا اترا کر غرور اور تکبر کی چال سے چلا تھا وہ اس کی گواہی دے گی۔ ان سب روایتوں کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا ہر ایک کام خدا سے مخفی نہ رہے گا‘ اگرچہ اب بھی مخفی نہیں ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں اور ان موضوع روایتوں نے ایسی خرابی ڈال دی ہے کہ اصلی و صحیح بات بھی تاریکی میں پڑ گئی ہے۔ مگر ارزقی نے ایک روایت کتاب اخبار مکہ میں لکھی ہے اگر اس کے زواید اور مبالغہ آمیز باتوں سے جو اس میں شامل ہیں‘ قطع نظر کی جاوے تو اس سے

اصلیت اس کی کسی قدر معلوم ہوتی ہے۔ بعد ایک قصہ بیان کرنے کے اس میں لکھا ہے کہ:

وکان اللہ عزو جل استودع الرکن باقبیس حین غرق اللہ الارض زمن نوح و قال اذا رایت خلیلی مبنی بیتی فاخرجه له الخ (کتاب اخبار مکه صفحه ۲۲).

> ''حجراسود کو اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح کے زمانہ میں ابوقبیس پہاڑ کو سپرد کر دیا تھا اور اس کو سمجھا دیا تھا کہ جب تو میرے خالص دوست یعنی ابراہیم کو دیکھے کہ وہ میرا گھر بناتا ہے تو اس پتھر کو نکال دیجیو۔''

ہر ایک اس روایت سے سمجھ سکتا ہے کہ صحیح بات صرف اس قدر ہے کہ یہ پتھر جبل ابوقبیس میں کا جو مکہ کے پاس ہے ایک پتھر ہے۔ حضرت ابراہیم نے مثل اپنی عادت و طریقہ کے اول اس پتھر کو بہ طور مذبح کے کھڑا کیا جب ان کی اولاد یہاں مستقل رہنے لگی تو انہوں نے مکان مذبح بھی بنایا اروا س پتھر کواس کے کونہ میں لگا دیا۔

اسی کتاب میں یہ بھی ایک ٹھیک روایت لکھی ہے کہ:

وانما شدة سواده لانه اصابة الحریق مرة بعد مرة فی الجاهلیة والاسلام فاما حریقه فی الجاهلیت فانه ذهبت امراة فی زمن قریش تجمر الکعبة فطارت شرارة فی استار الکعبة فاحترقت الکعبة واحترق الرکن الاسود و اسود و توهنت الکعبة فکان هوالذی هاج قریشا علی هذا هدمها وبناء ها و اما حریقه فی الاسلام ففی عصر ابن الزبیر ایام حاضرة الخصین بن نمیر الکندی احترقت الکعبة و احترق الرکن فتفلق بشلات فلق حتی شعبه ابن الزبیر بالفصة فسواده لذلک (صفحه ۳۲)

''وہ دو دفعہ آتش زدگی میں جلنے کے سبب سے اس قدر کالا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ زمانہ جاہلیت میں قریش کے زمانہ میں ایک عورت کے ہاتھ سے کعبہ کے پردہ میں خوشبو لگاتے وقت آگ لگ گئی تھی، جس کے سبب سے کعبہ اور حجر اسود دونوں جل گئے تھے اور حجر اسود کالا ہو گیا تھا اور ایک دفعہ زمانہ اسلام میں ابن زبیر کے وقت میں کعبہ میں آگ لگ گئی تھی اور حجر اسود جل کر تین ٹکڑے ہو گیا تھا اور ابن زبیر نے اس کے گرد چاندی کا حلقہ چڑھا دیا تھا''۔

یہ پتھر جو کعبہ کے کونہ میں لگایا گیا تھا، اس سے مقصود اس پتھر کی پرستش نہ تھی، بلکہ صرف اس لیے لگایا گیا تھا کہ کعبہ کا طواف (جس کی حقیقت ہم بیان کریں گے) شروع ہونے اور ختم ہونے کی نشانی ہو۔

حدثنی جدی قال حدثنا سفیان بن عیینة عن مجاهد عن الشعبی قال لما امر ابرهیم ان یبنی البیت و انتهی الی موضع الحجر قال لا اسماعیل آتنی بحجر لیکون علما للناس یبدون منه الطواف فاتاء بحجر فلم یرضه فاتی ابراهیم بهذا الحجر ثم قال اتانی به من لم یکلنی علی حجرک. (کتاب اخبار مکه صفحه ۲۹)

''چنانچہ کتاب اخبار مکہ ارزقی میں لکھا ہے کہ جب ابراہیم کو حکم ہوا کہ خدا کا گھر بناوے اور جب وہ بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں اب حجر اسود ہے تو انھوں نے اسماعیل سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تا کہ وہ لوگوں کے لیے ایک نشانی ہو اور وہ اسی سے طواف شروع کیا کریں وہ ایک پتھر لائے، ابراہیم نے اس کو پسند نہیں کیا، پھر ابراہیم کو یہ پتھر

مل گیا پھر ابراہیم نے (اسماعیل کے اس سوال کے جواب میں کہ یہ پتھر کہاں سے آیا) کہا کہ اس نے دیا جس نے تیرے پتھر کے بھروسہ پر مجھے نہیں رکھا''۔

مقتدر باللہ ابوالفضل جعفر ابن متعضد کے عہد میں جو ۲۹۵ ہجری میں خلیفہ ہوا تھا قرامطہ حجر اسود کو کعبہ سے اکھاڑ کر لے گئے تھے مدت بعد پھر لا کر رکھ دیا۔

مقدمہ سوم

کعبہ بلاشبہ بیت العتیق ہے

ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مورخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے، مسٹر گبن جیسا کہ وہ نہایت مشہور مورخ ہے ویسا ہی نہایت بڑا عالم اور فلسفی ہے اس نے اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''کعبہ کی صحیح قدامت سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے' ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تھیمو ویت اور سبیین کے بیان میں ایک مشہور و معروف معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجے کے تقدس کی تمام اہل عرب تعظیم کرتے تھے'' اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابراہیم کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔

سر ولیم میور صاحب اس پر ایک معترضانہ تقریر لکھتے ہیں کہ ''جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیم و اسماعیل سے ہے کیوں کر قیاس ہو سکتا ہے۔ عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی، بلکہ آں حضرت صلعم کے زمانہ سے بہت مدت پہلے اہل مکہ کی عام رائے تھی، ورنہ

قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اس کا ذکر نہ ہوتا اور نہ بعض مقامات کے نام‘ جو کعبہ کے گرد واقع ہیں ابراہیم واسماعیل سے متعلق کیے جاتے‘ جیسا کہ وہ متعلق کیے گئے ہیں‘‘۔

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ سرولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے‘ جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے‘ اس سے عرب کی اس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پیش تر اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ کو اور ان تمام مراسم کو جو کعبہ سے علاقہ رکھتی ہیں‘ ابراہیم سے تعلق ہے‘ اس کی اصلیت وصحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے‘ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنی جرھم نے اور تمام مختلف عرب کی قوموں نے اس کو ابراہیم واسماعیل سے منسوب کیا تھا۔ عرب ایک بت پرست قوم تھی اور ابراہیم بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا۔ اس لیے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیم و اسماعیل سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیم یا اسماعیل سے منسوب نہ کرتیں باوجود اس مغایرت ومنافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم کرنا کہ کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیم واسماعیل سے تعلق ہے علانی اس کی صحت واصلیت کی دلیل ہے نہ اس کے برخلاف‘ جیسا کہ سرولیم میور نے تصور کیا ہے‘ اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیش تر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لیے دلیل ہے نہ ہمارے مخالف کے لیے۔

مقدمہ چہارم

سر ولیم میور کے اعتراضوں کی تردید

سر ولیم میور نے اپنی کتاب مسمی لائف آف محمد میں بلا کسی دلیل اور کسی ثبوت کے ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا' انکار کیا ہے اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جوان کے دل میں آئی حقیقت واقعہ قرار دیا ہے جن کی تردید ہم کرنا چاہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے خیال کی فرضی سچائی کے قائم کرنے کو جو فی نفسہ سچ نہیں ہے حسب تفصیل ذیل وجوہات قائم کی ہیں۔

اول: انہوں نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ مکہ کے قریب اسماعیل کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے سب بناوٹ اور قصہ ہے اور ہر قسم کی تواریخی سچائی اور احتمال سے مبرا ہے۔

لیکن اس بات کے کہنے سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بات بیان کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل میں اور رسومات میں اور مذہب میں یقطان اور اسماعیل سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آئی تھی اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمن اور سخت عداوت رکھتے تھے اور روز خانہ جنگیاں اور باہمی لڑائیاں کرتے تھے اس ایک بات پر متفق ہو گئے تھے۔

عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے ثابت ہوتا ہے کہ یقطان نے عرب کا مورث اعلیٰ تھا ان تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں کیوں کہ ایسے موقع پر بہ مقابل ثبوت کے صرا نکار کر دینا کافی نہیں ہے۔

یونانی مورخ اہل جغرافیہ حجاز میں اسماعیل کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں یونانی مورخوں نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیل کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں ان سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں۔

دوم: وہ فرماتے ہیں مگر صرف از راہ خود پسندی کہ ''عقیدہ باطل کے اصلی اجزا میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہو' حجر اسود کا بوسہ دینا کعبہ کے گرد طواف کرنا مکہ اور عرفات اور منا میں رسمیات کا ادا کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان خیالات اور اصول سے کسی طرح کا تعلق نہی ہے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچیں۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں یا ان کو بت پرستی کے اس اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرھم یا بنی قطورہ یا ازدایت یا کوئی اور قوم جو یمن سے نقل مکانی کر کے مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی''۔

مگر ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیم یا بنی اسرائیل کی تمام رسمیات سے جو ان کے ہاں جاری تھیں یک لخت چشم پوشی کر لی ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسمیات میں اور بنی اسرائیل کی رسمیات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔

حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیم' اسحاق' یعقوب' اور موسیٰ بناتے تھے (دیکھو کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷ و ۸ باب ۱۳ ورس ۱۸ و باب ۲۶ ورس ۲۵ و باب ۲۸ ورس ۱۸ و ۱۹ و ۲۲ کتاب خروج باب ۲۱۰ ورس ۲۵ و باب ۲۴ ورس ۴) بوسہ کے خاص فعل کی نسبت ہم جدا لکھیں گے۔ اس مقام پر جو سر ولیم میور نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے ایک عام

مقصد بیان کرنا معلوم ہوتا ہے یعنی پتھر کی تعظیم مگر انہوں نے ان پتھروں کی اس تعظیم کو
فراموش کردیا جو ابراہیم اسحاق ویعقوب وموسیٰ کرتے تھے یہ بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس
جانتے تھے خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے یعقوب نے ان پر تیل ڈالا (دیکھو
پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۹) جو اس زمانہ کے دستور کے موافق غایت الغایت تعظیم پرستش کے
قریب تھی۔ یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی۔ دیکھو کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۲۲۔
خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تا کہ تمہاری شرم گاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے
(دیکھو کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۶) پس اب کون سا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے جو اس قسم
کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیمؑ میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور حجراسود کی اس
خفیف تعظیم کو (اگر وہ ہو بھی) بنی ابراہیم کی رسم سے جدا کر عرب کے بت پرستوں کی رسم
بتاتے ہیں۔

ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسے کہ کعبہ ہے' اگر ابراہیم
کی رسومات سے نہ تصور کیا جاوے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ) جس نے مقام گبعون بیابان
میں خدا کا گھر بنایا (دیکھو کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۴ و کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۱
ورس ۲۹)

اور وہ کون تھا (یعنی داؤد) جس نے خرمنگاہ ارنان بیوسی کو خدا کا گھر بنان کو مول لیا
اور پتھر ولکڑی ولوہا و پیتل اس کے بنانے کو جمع کیا (دیکھو کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۲)۔

اور وہ کون تھا یعنی (سلیمان) جس نے بعد کو خرمنگا ارنان بیوسی میں نہایت عالی
شان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس کا نام ملا (دیکھو کتاب تاریخ ایام دوم باب
۴)۔

پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ

عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت عجیب بات ہے۔

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے (حج کی حقیقت ہم بینا کریں گے) سر ولیم میور کو اس رسم کی نسبت ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا جس کہ اولاً وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے یہ بات ثابت کر لیتے کہ ابراہیم واسحاق ویعقوب نے جو مذبح اور بیت اللہ بنائے تھے ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے اور واسطے کہ توریت سے موسیٰ کے وقت سے پیش تر صرف خدا کے نام یا عبادت کے لیے ان گھروں کا بننا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی قوی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا طریقہ یہی تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسماعیل کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہئیت کو اب تک قائم رکھا ہے۔

ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بہ خوبی جانتے ہیں کہ حج خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا حج کو خانہ کعبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ کا حج ہوتا ہے۔

عرفات: ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیم اور اس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے ہزاروں جگہ توریت میں آیا ہے کہ ’’خدا ابراہیم کو مرئی ہوا خدا اسحاق کو مرئی ہوا خدا یعقوب کو مرئی ہوا‘‘ خدا موسیٰ کو مرئی ہوا اور پس ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں جس پہاڑ پر جو مکہ کے قریب ہے خدا ابراہیم واسماعیل کو مرئی ہوا اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے۔ معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا۔ جو اس کی نسبت کہا کہ اسکو ابراہیمی رسول یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں

رکھتی۔ یہ خاص امر ابراہیم کی نسل میں مروج تھا۔ اس مقام پر ہم اس کے مطلب پر کہ خدا کیوں کر دکھائی دے سکتا ہے بحث نہیں کرنا چاہتے اور نہ ان الفاظ کے مطلب و مراد سے بحث منظور ہے بلکہ یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات کا استعمال بجز خاندان اسماعیل کے دنیا میں اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا اور اس لیے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ابراہیم سے ثابت ہوتا ہے۔

یہی مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں بس قدوس کر قدوس کہہ کر یاد کرتے ہیں اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم سے۔

منا کا مقام صرف قربانی کے لیے ہے وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا ہے منا اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اور اس لیقربانی نذر کرنے کے لیے وہ مقام قرار دیا گیا ہے ہاں ابراہمی اور یعقوب و اسحاق اور موسیٰ اور داؤ داور سلیمان کی قربانی اور مذہب اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اور اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوش بو یعنی چرانس پسند آتی تھی مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتیہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں پس اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منا کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے۔ کیوں کہ ہر ذی

عقل اس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا (اس امر کی تحقیق کہ مذہب اسلام میں قربانی کیا چیز ہے ہم جداگانہ لکھیں گے)۔

کسی ملک کو مذہب اسلام نے مقدس نہیں ٹھہرایا بلکہ مقدس جگہ کو جو خاص خدا کی پرستش کو مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی مقدس ٹھہرایا ہے یہ بھی ابراہیم ہی کا طریقہ تھا اور برابر اس کی اولاد میں چلا آتا تھا جہاں وہ خانہ خدا یا مذبح بناتے تھے اس کو مقدس ٹھہراتے تھے ۔موسیٰ کو خدا نے کہا کہ ینا کے پہاڑ کے لیے حد ٹھہرا اور اس کو مقدس کر (کتاب خراج باب ۱۹ ورس ۲۳) وہ کون تھا (یعنی خدا) جس نے کہا (مقام مقدس مرا احترام نمائید (سفر لویان باب ۲۶ ورس ۲) اسی طرح بیت المقدس کو مقدس ٹھہرایا خانہ کعبہ کے لیے بھی جب سے وہ بنا ایک حد ٹھہرائی گئی جو حرم کہلاتی ہے اور اس کو اس مقدس نام کے ادب کے لیے جس کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی مقدس ٹھہرایا تھا یہ بھی ایک نہایت عمدہ ثبوت اس بات کا ہے کہ بیت اللہ کو اور حرم کو مقدس ٹھہرانا خاص ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے نہ بت پرستوں کی رسم سے۔

ہاں سر ولیم میور کی ایک بات کو میں تسلیم کروں گا کہ جب رجب اور ذیقعدہ اور ذلحجہ اور محرم کے چار مہینوں کا مقدس ٹھہرانا زمانہ جاہلیت کی رسم تھی اور ان کو مقدس امراد سے ٹھرایا تھا کہ ان مہینوں میں زمانہ جاہلیت کے عرب لڑائی نہیں لڑتے تھے عرب کی قومیں نہایت مفسد اور خانہ جنگ تھیں برسوں تک آپس میں لڑائی جاری رہتی تھی اور ان چار مہینوں میں عام قوموں کو مکہ میں آنا اور حج کرنا اور کعبہ کے بتوں کو پوجنا ہوتا تھا پس ان سب قوموں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دونوں میں لڑائی موقوف رہے گی پس یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان مہینوں کا اشہر حرم نام رکھا تھا مگر سر ولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی ان کو مقدس مانا ہے حالاں کہ مذہب اسلام نے اس کی تقدیس کو رد کر دیا ہے اور کوئی مہینہ مسلمانی مذہب میں مقدس نہیں رہا ہے اسلام نے کہا ہے کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے

گئے ہیں نامیں تم لڑائی کی ابتدامت کرو لیکن اگر کفار لڑیں تو لڑو۔

خدا تعالیٰ سورہ توبہ میں فرماتا ہے کہ:

ان عـدة الشهـور عـنـدالـلـه اثنا عشر شهرا فی کتاب الله یوم خلق السـمـوات والارض مـنها اربعة حرم ذلک الچین القیم فلا تظلموا فیهن انفسکم وقاتلوا المشر کیین کافه کما یقاتلو نکم کافه (سورہ توبه).

> ”گنتی مہینوں کی اللہ کے نزدیک برکے بارہ مہینے ہیں خدا کے مقرر کیے ہوئے حکم میں جب سے کہ آسمان وزمین پیدا کیا (یعنی لوند کے مہینہ کا اس میں حساب نہیں ہے) انہی میں سے چار مہینے وہ ہیں جن کو اہل عرب اشہر حرم کہتے ہیں یہی ٹھیک حساب ہے اب خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان چار مہینوں پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ تم ان بارہ کے بارہ مہینوں میں آپس میں مت لڑو۔ اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں۔ پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں اشہر حرم نہیں مانے جاتے بلکہ بارہ کے بارہ مہینے ایک سے ہیں“۔

ضمیر فیھن کی اثنا عشر شھرا کی طرف راجع ہے نہ اربعۃ کی طرف۔

سوم: وہ فرماتے ہیں کہ ”عرب کے خاص طریقے سبیین ازم اور بت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا“۔

ہم کو اس بات کے قبول کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں جاری تھے ان میں بہت کچھ رسومات بت پرستی کی شامل ہوگئی تھیں۔ سبیین ازم یعنی سائبین کا مذہب بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہا تھا اس میں ہزاروں باتیں کفر وشرک و

کواکب کی پرستش کی داخل ہوگئی تھیں اور وہ بگڑا ہوا مذہب اور بت پرستی آپس میں مل کر زمانہ جاہلیت میں اس نے نہایت عجیب صورت پیدا کی تھی۔مگر جو خاص باتیں ابراہیم کے مذہب کی ان مین پائی جاتی تھیں ان کو بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب کرتے ہیں ان کی غلطی ہے خانہ کعبہ کو اور ابراہیمی اور اسماعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں (اور جس کی اصل ہم بیان کریں گے) سبیین ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا۔پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور خاص عرب کا دستور بیان کرتے ہیں (اگر درحقیقت وہ پتھر کی پرستش ہی ہو) خاص ابراہیم کا طریقہ تھا جیسا کہ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں یہ طریقہ خاص ابراہیم سے پیدا ہوا اور یعقوب و اسحاق اور اسماعیل اور موسیٰ نے اس کی پیروی کی جو بن گھڑے اور ننگے پتھروں کو ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے اور ان پر تیل چڑھاتے تھے خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈی کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے غرض کہ جو کچھ ان کی نسبت کہو ہم تسلیم کرلیں گے مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیمی نہ تھا بلکہ خاص عرب کے بت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہوسکتا کیوں کہ ان کی غلطی علانیہ ثابت ہے۔

ا۔ مذہب صائبہ

ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سر ولیم میور نے مکہ کی ابتدا اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے اور ہر ایک کو بلا دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد سر ولیم میور بالطبع (جو درحقیقت ایسا ہی ہونا ضرور تھا) اپنے عالی دماغ اور تر و تازہ موجزن ذہن کے ایجادات کو عرب کی واقعی تاریخ کے مطابق کرنا ناممکن پاتے

ہیں۔مگر جس طرح کہ سر ولیم میور کا خیال بہت بلند اور فکر بہت تیز ہے اس کی بہنسبت ان کے قلم تیز رفتار کی جولانی بھی کچھ کم نہیں ہے۔پس وہ ایک لمحہ میں اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں۔مگر جوکہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی وہ باتیں نہ تو تواریخی واقعات ہیں اور نہ عرب کی مختص المقام روایتیں اور نہ کتاب مقدس کی سچی باتیں بلککہ صرف سر ولیم میور کے عجیب وغریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں اور کسی قسم کی معتبر سند اور ہر ایک قسم کی تائید وتصدیق سے مبرا ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کو اپنے اس خطبہ میں ذکر کرنا محض بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

(ا)تعمیر ابراہیم

پرانی باتوں کے ساتھ ہمیشہ قصے اور کہانیاں لوگ ملا دیتے ہیں ان کو مقدس ومتبرک بنانے کو ایسے ایسے واقعات ان کے ساتھ منسوب کر دیتے ہیں کہ جن کی کچھ بھی اصل نہیں ہوتی مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ مکہ کی نسبت جو حالات روایتوں میں مذکور ہیں ان کا بھی یہی حال ہے قرآن مجید میں بہت تھوڑے لفظ ہیں اور نہایت مختصران کا مطلب ہے کہ ابراہیم نے خدا کی عبادت کے لیے مسجد بنائی اور خدا سے دعا کی کہ تو اس کو اپنے مبارک نام پر قبول کر۔مگرم ورخین نے اس پر وہ حاشیے چڑھائے اور وہ واقعات لگائے کہ نعوذ باللہ خدا کو بھی معلوم نہ تھے۔پس ایک مصنف شخص کا یہ کام نہیں ہے۔کہ ان جھوٹی باتوں کو جن کو ہم خود جھوٹا کہتے ہیں مذہب اسلام قرار دے اور پھر اس پر اعتراضات کی بنا قائم کرے کیوں کہ وہ تو بنائے فاسد علی الفاسد ہے اور نہ اس شخص کو جس کے دل میں اسلام کی جانب سے کچھ شبہ پیدا ہوا ہو یہ مناسب ہے کہ ان جھوٹی روایتوں میں ڈگمگاوے کیوں

کہ وہ تو خود جھوٹی ہیں۔ مگر جو واقعات کہ مبالغہ آمیز تقدس کے ساتھ بیان ہوتے ہیں ان میں اصلی واقعات بھی شامل ہوتے ہیں اس لے ہر عقل مند و منصف کو لازم ہے کہ ان اصلی واقعات کو ان جھوٹی باتوں سے تا بہ مقدور چھانٹ لے اور پھر اس پر جو وہ چاہے اپنی رائے قائم کرے۔

تمام روایتیں جو مکہ کی نسبت کتابوں میں مندرج ہیں۔ سب ی سب نا معتمد غیر مستند ومشتبہ ہیں اور ان میں سچی اصلی بات کے ساتھ بہت کچھ جھوٹ اور قصے و کہانیاں شامل کر دیے ہیں مگر جس قدر کہ سچ ہے وہ ان سے بخوبی ممیّز ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم اس خطبہ میں اسی قدر تحریر پر اکتفا کریں گے جس قدر کہ ہمارے نزدیک سچ ہے۔

فبنا البیت وجعل طوله فی السماء تسعة ازرع و عرضه فی الارض اثنین وثلاثین ذراعا من الرکن الاسود الی الرکن الشامی الذی عند الحجر من وجهه وجعل عرض ابین الرکن الشامی الی الرکن الغربی الذی فیه الحجر اثنین وعشرین ذارعا وجعل طول ظهراها من الرکن الغربی الر الرکن الیمانی احدوثلاثین ذراعا وجعل عرض شقها الیمانی من الرکن الاسود الی الرکن الیمانی عشرین ذراعاً (کتاب اخبار مکه ازرقی ص ۳۱)

”حضرت ابراہم نے بیت اللہ بنانے کو پہاڑ کی گھاٹی میں جہاں اس قسم کی عمارتیں بنانے کو بالطبع جگہ پسند کی جاتی ہے جگہ پسند کی اور زیادہ تر پسند رکرنے کی وجہ یہ تھی کہ کہ چشمہ زم زم کے نہایت قریب تھی وہاں انہوں نے حضرت اسماعیل کی شرکت سے کعبہ یعنی مسجد بنائی کتابوں میں اس کا ارتفاع نو درعہ اور ایک طرف کا عرض

بیس اور ایک طرف کا بائیس اور ایک طرف کا طول اکتیس اور ایک طرف کا بتیس لکھا ہے اگر یہ پیمائش صحیح ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نیک زمانہ میں پیمائش کے آلات نہ تھے اور قائمے زاویے نہیں نکل سکتے تھے غالباً اسی وجہ سے ہر مقابل کے ضلعے مساوی نہیں بن سکے''۔

جو پیمائش کہ مذکور ہوئی ہے اس کے مطابق ہم اس مقام پر نقشہ کعبہ کا ثبت کرتے ہیں جس سے اس کی قطع بخوبی معلوم ہوگی۔ دائیں طرف جو حصہ نقطوں سے گھرا ہوا ہے حضرت ابراہیم کے وقت میں وہ بھی کعبہ میں داخل تھا۔ قریش نے تعمیر کے وقت اس قدر چھوڑ دیا تھا۔ کعبہ کے اندر جو نقطہ دار نشان ہیں وہ ان ستونوں کے ہس جو قریش نے بناتے تھے اور اب وہ نہیں ہیں بعوض اس کے عبداللہ ابن زبیر نے تین ستون بنائے ہیں جن کے سیاہ نشان بیچ میں بنے ہوئے ہیں غرض کہ جس قدر سیاہ سیاہ ہے وہ اب موجود کعبہ ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیواریں ہی دیواریں بنی تھیں چھت نہ تھی اور دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا اور اس میں نہ کواڑ چڑھے تھے نہ کنڈی لگی تھی اور بلا شبہ اس زمانہ کی حالت ایسی تھی کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں گو وہ خدا ہی کا گھر بنایا گیا ہو اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عمارت کے ایک بیرونی گوشہ پر طواف کے بے شمار کرنے کو جس سے اس کی ابتدا اور انتہا معلوم ہو سکے ایک لمبا پتھر لگا دیا جو حجر اسود کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قیاس کرنے کی وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ پتھر غالباً اسی قسم کا پتھر ہے جیسا کہ ابراہیم خدا کی عبادت کے لیے کھڑا کر لیا کرتے تھے جس کو مذبح یا قربانی گاہ یا آلٹر کہتے ہیں۔ اس چار دیواری کے اندر ایک کنواں کھودا تھا جس کو خزانہ کعبہ کہتے ہیں اور جو کچھ نذر و نیاز کعبہ میں آتی تھی وہ اس میں رکھ دیتے تھے تاکہ چوری سے محفوظ رہے۔

(۲) تعمیر بنی جرھم

قالو اوتوفی اسماعیل ودفن فی الحجر کانت امه قد دفنت فی الحجر ایضا وترک ولدا من رعلة ابنة مضاض بن عمرو الجرھمی فقال مضاض بامر ولد اسماعیل کلفھملانھجم بنو بنته فلم یزل امرجرھم یعظم بمکة ویستفحل حتی روا البیت وکانوا ولاته وحجابه وولاة الاحکام بمکة فجائسیل فدخل البیت فانھدم فعادته جرھم علی بناء ابراھیم وکان طرله فی السماء تسعة اذرع . (کتاب اخبار مکه صفحه ۴۸)

’’کعبہ کی عتمر کے بعد حضرت اسماعیل اسکے محافظ رہے جب ان کا انتقال ہوا تو بنی جرھم کو اس میں مداخلت ہوئی۔ کیوں کہ وہ ان کے قریب تر رشتہ دار تھے اور بنی اسماعیل کے خیر خواہ ومحافظ تھے۔ مضض بن عمرو جرھمی جو نانا اسماعیل کے بیٹے کا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں سب اختیار لے لیا۔ بنی جرھم کے اختیار کے زمانہ میں پہاڑی نالہ آیا اور کعبہ میں پانی چڑھ گیا اور کعبہ ڈھے گیا‘ جس کو بنی جرھم نے انہیں بنیادوں پر جو ابراہیم نے بنائی تھیں اور اسی صورت پر پھر بنالیا‘ اس کی بلندی زمین سے نو زرعہ تھی۔

ہم کو کسی تاریخ سے اس تعمیر کا زمانہ نہیں معلوم ہوا اور اسی سبب سے ہم کوئی زمانہ اس کی تعمیر کا قرار نہیں دے سکتے۔

(۳) تعمیر عمالیق

عرب میں جو لوگ آباد ہوئے وہ تین ناموں سے مشہور ہیں۔ ایک عرب البائدہ۔ ایک عرب العاربہ اور ایک عرب المستعربہ۔ عرب البائدہ وہ لوگ کہلاتے تھے جن میں عاد و ثمود اور جرہم الاولیٰ اور عمالیق اولیٰ تھے۔ وہ قومیں برباد ہو گئیں اور تاریخ کی کتابوں میں ان کا بہت کم حال ملتا ہے اور سب قومیں ابراہیم سے اور بناء کعبہ سے پہلے تھیں۔

عرب العاربہ کی وہ قومیں ہیں جس کی نسل یقطان یا قحطان سے چلی ہے اور تمام قبائل عرب اسی نسل سے ہیں۔ حمیر بھی انہی کا ایک قبیلہ ہے اور بنی حمیر میں بھی ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے تھا جو مکہ میں بستا تھا۔ اس پچھلی قوم نے بنی جرہم پر غلبہ پا لیا تھا اور کعبہ کی مختار ہو گئی تھی اس زمانہ میں اس قوم عمالیق ثانی نے کعبہ کو پھر بنایا جو غالباً پہاڑوں کے نالے چڑھ آنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

بعض مورخوں نے ان دونوں قوموں میں تمیز نہیں کی اور عرب البائدہ میں جو قوم عمالیق تھی اس کی نسبت تعمیر کعبہ کو خیال کیا اور جو کہ وہ قوم بنی جرہم سے پہلے تھی، اس لیے لکھ دیا کہ عمالیق نے قبل بنی جرہم کے تعمیر کعبہ کی تھی، حالانکہ اس زمانہ میں نہ ابراہیم تھے نہ کعبہ تھا۔

مورخوں کی اس غلطی میں پڑنے کا سبب ان کا ایک اور غلط خیال بھی ہے۔ مسلمانوں میں بہت سی ایسی روایتیں جو دیو پری کے قصہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں موجود ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ کعبہ پہلے عرش کے نیچے چار ستون کے چوکھمبے کی طرح بنایا گیا تھا۔ اس کے ستون زبرجد کے تھے اور یاقوت احمر کی پچی کاری سے ڈھنکے ہوئے تھے۔ اس گھر کا نام تو بیت المعمور ہوا پھر خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر اسی کے مقابل اتنا ہی بڑا اور اسی شکل کا

گھر بناؤ‘ اور وہ اس جگہ بنایا گیا جہاں اب کعبہ ہے‘ مگر افسوس ہے کہ وہ فرشتے اچھے انجنئر نہ تھے۔ حضرت آدم کے پیدا ہوتے ہوتے وہ گھر نہ رہا تھا کہ حضرت آدم کو پھر بنانا پڑا مگر نوح کے طوفان نے پھر اس کو ڈھا دیا۔ تب نوح نے بنایا پھر اسی طرح ٹوٹتا ڈھتا رہا۔ یہ سب جھوٹی روایتیں قرآن مجید کے ایک لفظ عتیق کی بنا پر بنالی گئی ہیں جن میں سے ایک جگہ کی بھی کچھ اصل نہیں ہے۔ اسی قسم کی جھوٹی روایتیں ہیں جنھوں نے اسلام کی سچائی کو چھپا دیا اور ہر سمجھ دار کے دل میں جب وہ غور کرتا ہے اسلام کی طرف سے شبہ ڈال دیا۔ مگر ان کو سمجھنا چاہیے۔ کہ اسلام مشتبہ نہیں ہے بلہ اس قسم کی روایتیں مشتبہ اور جھوٹی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور نادان مورخ ان روایتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جب کہ انہوں نے قدامت مکہ ایسی پرانی فرض کر لی جو آدم سے بھی پرانی ہے تو اب ان کو اس بات کے کہنے میں کہ جو ہم سے پہلے عمالیق نے تعمیر کی تھی پاک نہیں رہا۔

ایک فرانسیسی مورخ اپنی کتاب ''موسومہ ڈائی کراٹیکن ڈراسٹ مکہ'' میں حضرت علی کی روایات سے لکھا ہے کہ بنی جرھم نے اور اس کے بعد عمالیق نے (یعنی عمالیق ثانی نے) کعبہ کی تعمیر کی۔

عمالیق ثانی کی تعمیر کا زمانہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی ایک صدی پیش تر وہ لوگ مکہ پر قابض تھے اس لیے کہ جذیمہ بادشاہ دوم خاندان حیرہ کی ایک نہایت سخت لڑائی عمالیق سے ہوئی تھی جس میں عمیالیقوں نے شکست فاش پائی تھی اور یہ واقعہ سن عیسوی سے تخمیناً سو برس پیش تر ہوا تھا۔

(۴) تعمیر قصیٰ

ایک مدت بعد پھر کعبہ میں کچھ نقصان آ گیا اور بجز اس کے کہ سیلاب سے نقصان پہنچا ہو جواب بھی کبھی آ جاتا ہے اوکوئی سبب نقصان کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت قصی ابن کلاب نے اس کو بنایا۔ اگر چہ اس تعمیر کا زمانہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہے، مگر چوں کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ قصیٰ چھ پشت پیش تر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، اس لیے غالباً یہ تعمیر دو سو برس تر آنخضرت صلعم کی ولادت سے ہوئی تھی۔

(۵) تعمیر قریش

فلما احترقت الکعبه توهنت جدرانها من کل جانب و تصدعت و کانت الخرف و الا ربعة مظلة و السیول متواترة ولمکة سیول عوارم فجا سیل عظیم علی تلک الحال قد خل الکعبة و صدع من ذلک قریش نزعا شدیدا وها بواهد مها و خشوا ان مسوها ان ینزل علیهم العذاب (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۷)

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کا سن شریف تخمیناً بارہ چودہ برس کا ہوگا یعنی تیسری دھائی ماقبل سیال اظہار نبوت میں کعبہ کے غلاف میں آگ لگی اور کعبہ کی دیواریں آتشزدگی کے سبب بودی ہو گئیں اور کئی جگہ سے پھٹ بھی گئیں اسی عرصہ میں پہاڑی نالوں کی جنھیں عرب سیل عوارم کہتے ہیں کثرت ہوئی اور ایک نالہ نہایت زور وشور سے آیا او خانہ خدا میں پانی بھر گیا اور دیواریں پھٹ گئیں اور گرنے کو ہوئیں تب قریش نے اس کے بنانے کی فکر

کی۔

فبینا هم علی ذلک ینظرون و یتشاورون اذ اقبلت سفینة الروم اذا کانت بالشعیبة وهی یومئذ ساحل مکة قبل جدة انکسرت فسمعت بها قریش فرکبوا الیها فاشتروا خشبها و اذنو الاهلها ان یدخوا مکة نیبیعون ما معهم من متاعهم ان لا یعشروهم ...... فکان فی السفینة رومی نجار بناء یسمی با قوم فلما قدموا بالخشب مکة قالوا لو بیننا بیت ربنا فاجمعوا الذلک و تعاونوا علیه وترافدو فی النفقة. (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۷).

”معلوم ہوتا ہے کہ قریش فن تعمیر عمارت سے بہت کم واقف تھے اور وہ اس فکر میں تھے کہ اس کو کون بناوے اور کیوں کر بناویں۔ا س درمیان میں رومیوں کا جو اس زمانہ میں عیسائی اور رومن کیتھلک مذہب ک تھے ایک جہاز بندرگاہ مکہ میں آیا۔ اس زمانہ میں جدہ بندرگاہ نہ تھا بلکہ شعیب بندرگاہ تھا اور وہاں وہ جہاز ٹوٹ گیا جب قریش نے یہ بات سنی تو وہاں گئے اور اس کی لکڑی مول لے لی اور جہاز والوں کی خاطر داری کی اور کہا کہ تم مکہ میں آؤ اور اپنا اسباب بیچ لو ہم تم سے محصول بھی نہیں لینے کے۔ اس جہاز میں ایک عیسائی رومن کیتھلک انجینئر بھی تھا اور باقوم اس کا نام تھا اس سے خواہش کی کہ وہ خدا کے گھر کو بناوے پس لوگوں نے اس کام میں مدد کی اور اخراجات جمع کرنے کی تدبیر شروع کی“۔

فنقلوا الحجاره و رسول الله یومئذ غلام لم ینزل علیه الوحی ینقل

معهم الحجارة علی رقبته. (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۷)

''سب لوگ مل کر پتھر ڈھوتے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زمانہ میں اگرچہ تھوڑی عمر تھی مگر آنحضرت بھی پتھر ڈھونے میں شریک تھے''۔

فلما اجتمع لهم ما یریدون من الحجارة والخشب وما یحتاجون الیه عدوا الی هدمها...... فهابت قریش هدمه و قالوا منیبدا فیهدمه فقال الولید بن المغیرة انا ابدئکم فی هدمه انا شیخ کبیر فان اصابنی امر کان قددنا اجلی و ان کان غیر ذلک لم یرزانی فعلا البیت و فی یده عتلة بهدمه بها......فهدمت قریش معه حتی بلغوا الاساس الاول الذی رفع علیه ابراهیم و اسمعیل القواعد من البیت (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۸ او ۱۰۹).

''جب کہ پتھر و لکڑی سب جمع ہوگئی تو انہوں نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر سب وہم و وسواس میں گرفتار تھے او ڈرتے تھے کہ اگر ڈھاویں گے تو خدا جانے کیا آفت آوے گی۔ ولید بن مغیرہ نے اپنا دل کڑا کیا اور کہا کہ میں ڈھانا شروع کرتا ہوں۔ میں بڈھا تو ہو ہی لیا ہوں اگر کچھ آفت آوے گی تو مرنے کو تو ہو ہی رہا ہوں۔ چنانچہ ولید ابن مغیرہ کعبہ کی دیوار پر چڑھا اور کدال سے ڈھانا شروع کی پھر سب ڈھانے لگے اور بنیاد تک جس پر سے حضرت ابراہیم نے چنائی شروع کی تھی برابر کردیا''۔

فلما اجمعوا ما اخرجوا من النفقة قلت النفقة ان تبلغ لهم عمارة

البیت کله فتشا و روافی ذلک فاجمع ریهم علی ان یقصروا عن القواعد و یحجروا ما یقدرون علیه من بناء السبیت و یترکوا بقیته فی الحجر علیه جدار مدار یطوف الناس من وراه ففعلوا ذلک و بنوا فی بطن الکعبة اساسا یبنون علیه من شق الحجر و ترکوا من وراه من بناء البیت فی الحجرستة اذرع و شبرا فبنوا علی ذلک (کتاب اخبار مکه صفه ۱۰۹)

''جب سب ڈھا چکے تو معلوم ہوا کہ جو کچھ سامان انہوں نے جمع کیا ہے وہ اس کے سب کے بنانے کو کافی نہیں ہے۔ قریش نے کعبہ کی عمارت کو بہ نسبت سابق کے دو چند مرتفع بنایا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر و مصالح وغیرہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ غالباً لکڑی اس قدر نہ تھی۔ جس سے کل کعبہ کی چھت بن سکے۔ اس لیے انہوں نے اس کو چھوٹا کر کر بنایا چھ ذرعہ اور ایک بالشت زمین حجر کی طرف چھوڑ دی اور اس طرف عرض میں ایک جدید بنیاد کھود کر دیوار چن لی جواب ہماری نقشہ میں سیاہ بنی ہوئی ہے۔''

فلما وضعوا ایدیهم فی بناها قالوا ارفعوا بابها من الارض و اکبسوها حتی لا تدخلها السیول ولا ترقا الا یسلم ولا یدخلها الا من اردتم ان کرهتم احد ادفعتموه ففعلوا ذلک . (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۹)

''انہوں نے کعبہ کو چار ذرعہ اور ایک بالشت کرسی دے دی اور اس قدر کسی پر دروازہ بنایا تا کہ نالے کا پانی پھر اندر نہ گھسے اور کوئی شخص بغیر سیڑھی کے نہ چڑھ سکے اور اس حکمت سے جس کو چاہیں نہ

جانے دیں۔ حال کے زمانہ میں کعبہ کے اندر جانے کو داخلی کہتے ہیں''۔

حتی انتهوا الی موضع الرکن فاختلفوا فی وضعه و کثر الکلام فیه و تنافسوا فی ذلک...... فقال ابو امية بن المغيرة يا قوم انما ارددنا البرولم نردالشر فلاتحاسدوا ولا تنافسوا فانکم اذا اختلفتم تشتت امورکم و طمع فیکم غیرکم لکن حکموا بینکم اول من یطلع علیکم من هذا الفج قالو ارضینا وسلمنا فطلع رسول الله صلی الله علیه وسلم قالو ا هذا الامین قدر ضینا به فحکموه فبسط ردائه ثم وضع فیه الرکن فدعا من کل ربع رجلا فاخذوا باطراب الثوب...... فرفع القوم الرکن وقام النبی صلی الله علیه وسلم علی الجدر ثم وضعه بیده . (کتاب اخبار مکة صفحه ۱۰۹ او ۱۱۰)

''جب بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں حجر اسود لگانا تھا تو آپس میں جھگڑا و تکرار ہوئی۔ ایک قبیلہ کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے دوسرا کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے۔ بڑی خیر ہوئی کہ ابوامیہ بن مغیرہ کے سمجھانے سے سب لوگ اس بات پر راضی ہوگئی کہ جو سب سے پہلے اس رستہ سے آوے وہی فیصلہ کے لیے حکم بدا جاوے۔ ان سب کی خوش قسمتی یہ ہوئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے تشریف لائے۔ اگرچہ حضرت عمر کی چھوٹی تھی۔ مگر سب امین امین کہہ کر چلا اٹھے۔

آنحضرت نے بہ تائید روح القدس وہ فیصلہ فرمایا کہ سب متحیر

ہو گئے آپ نے ردائے مبارک بچھائی اور حجر اسود کو اس میں رکھا اور سب قوموں کے سرداروں کو کہا کہ سب مل کر چادر پکڑ کر اٹھاویں اور وہاں تک لے چلیں جہاں جانا ہے۔ سب نے اسی طرح مل کر اٹھایا اور جب کونے کے پاس لائے تو آنحضرت نے اس کو وہاں رکھ دیا۔ متقدمین ومتاخرین علما اس واقعہ کو واقعہ قبل بعثت کہتے ہیں۔ مگر میں ان لفظوں سے متفق نہیں ہوں کیوں کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقت ولادت سے ہی مبعوث تھے۔"

البنی ولو کان فی بطن امه فبنوا حتی ارفعوا اربعة اذرع و شبرا ثم کسبوها ووضعوا بابها مرتفعا علی هذا الذرع...... فقال لهم یا قوم الرومی اتحبون ان تجعلو ا سقفها مکبسا او رمسطحا فقالوا بل ابن بیت ربنا مسطها قال فبنوه مسطحا وجعلو ا فیه ست دعائم فی صفین فی کل صف ثلاث دعائم...... وجعلوا ارتفا عها من خارجها من الارض الی اعلاها ثمانیة عشر ذراعا و کانت قبل ذلک تسعة اذرع فزادت قریش فی ارتفا عها فی السماء تسعة اذرع آخر...... وجعلوا میزابها یسکب فی الحجر و جعلوا درجه من خشب فی بطنها فی الرکن الشامی بصعد منها الی ظهرها. (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۱۰).

"جب کہ یہ تنازعہ رفع ہو گیا تو تعمیر شروع ہوئی جتنا کہ کعبہ پہلے زمین سے بلند تھا قریش نے اس سے دوگنا بلند کر دیا۔ یعنی زمین سے اٹھارہ درعہ اور پہلے صرف نو ہی درعہ تھا۔ جب دیواریں بن چکیں تو باقوم۔ پوچھا کہ اس کی چھت کیسی بناؤں۔ بنگلہ نما یا چورس۔

سب نے کہا کہ ہمارے خدا کی چھت چورد بناؤ۔ تب باقوم نے اس کے عوض میں چھ ستون کھڑے کیے اور چورس چھت بنادی غالباً اس قدر لمبی لکڑی نہ تھی کہ پورا شہتیر پڑ جاتا اسی سبب سے بیچ میں ستون بنانے کی ضرورت ہوئی اور شاید اسی وجہ سے باقوم نے بنگلہ نما بنانی چاہی ہوگی تاکہ قینچی پڑ جاوے اور بیچ میں ستون بنانے نہ پڑیں۔ اس کی چھت کا پرنالہ اس جگہ میں ڈالا جو چھوڑ دی گئی تھی اور کعبہ کے اندر ایک کاٹ کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشن دان رکھا جس سے کعبہ کے اندر بھی اجالا رہے اور اس میں سے جب ضرورت ہو کعبہ کی چھت پر چڑھ جاویں''۔

(٦) تعمیر عبداللہ بن زبیر

معاویہ بن ابی سفیان کے بعد جب یزید نے اپنے تئیں اپنے باپ کا جانشین کیا تو عبداللہ بن زبیر نے اس سے بیعت میں یعنی اس کو خلیفہ تسلیم کرنے میں تامل کیا اس پر حصین بن نمیر کی طرف سے فوج لے کر مکہ پر چڑھ گیا اور کئی دن تک عبداللہ بن زبیر سے لڑائی ہوتی رہی۔ عبداللہ بن زبیر کے سب لوگ کعبہ ک گرد خیموں میں پڑے ہوئے تھے اور حصین بن نمیر ابوقیس پہاڑ پر سے گوپن میں پتھر مارتا تاھ اور غلاف کعبہ اس کے صدمہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا۔ اتفاق سے ایک خیمہ میں آگ لگ گئی۔ ہوا تیز چل رہی تھی کعبہ میں بھی جا لگی اور تمام کعبہ جل گیا۔ اس کی دیواروں میں کاٹ لگا ہوا تھا اس کے جلنے سے تمام دیواروں کے پتھر ایسے ہوگئے کہ کبوتر کے بیٹھنے سے بھی گر پڑتے تھے اور کئی جگہ سے دیواریں

شق ہوگئیں۔ یہ واقعہ تیسری ربیع الاول ٦٤ ہجری کو ہوا اس کے دس گیارہ دن بعد یزید مر گیا۔ جب یہ خبر مکہ پہنچی تو ابن زبیر نے حصین بن نمیر سے کہا کہ دیکھو کعبہ بھی جل گیا ہے امیر بھی مر گیا پھر ہم سے کیوں لڑتے ہو کیا معلوم کہ نیا خلیفہ کیا کرے گا اس پر حصین بن نمیر مع اپنے لشکر کے پانچویں ربیع الثانی ٦٤ ہجری کو مکہ سے شام کو چلا گیا۔

فلما ابدبر جيش حصين بن نمير و كان خروجه من مكة لخمس لياس خلون من ربيع الا خرسنة اربع و وتين دعا ابن زبير وجوه الناس و اشرافهم و شاو رهم فى هعم الكعبة . (كتاب اخبار مكه صفحه ١٤٠).

فار ابن الزبير بهدمها فما اجتراء احد على ذلك فلمارای ذلک علاها هو بنفسه ياخذ المعول وجعل يهدمها و برمى بحجارتها رواه انه لم يصبه شئى اجترائوافصعدو ايهدموها (كتاب اخبار مكه صفحه ١٤١)

وكان هدمها يوم السبت نصف من جمادى الاخرسنة اربع و ستين و لم يقرب ابن عباس مكة حين هدمت الكعبة حتى فرغ منها وارسل الى ابن الزبير لا تدع الناس بغير قبلة انب لهم حول الكعبة الخشب واجعل عليها الستور حتى يطوف الناس من ورائها ويصلون اليها ففعل ذلک ابن الزبير . (كتاب اخبار مكه صفحه ١٤٢).

فلما هدم ابن الزبير الكعبة و سواها الارض كشف عن اساس ابراهيم فوجده داخلا فى الحجر نحوا من سنة اذرع و شبر (كتاب اخبار مكه صفحه ١٤٢)

ثم وضع البناء على ذلک الا ساس ووضع حدات الباب باب الكعبة على مد ماک على الشاذروان اللاصق بالارض وجعل الباب

الاخر بازارء فی ظهر الکعبة مقابلته (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۴۳)

قالوا و کانت الکعبة یوم هدمها ابن الزبیر ثمانینة عشر ذراعا فی الساء فلما ان بللغ ابن الزبیر بالبناء ثمانیة عشر ذراعا قصرت بحال الزیادة التی زاده من الحجر فیها و استسمج ذل اذصارت عریضة لا طول لها فقال قد کانت قبل قریش تسعة اذرع حتی ذادت قریش فیها تسعة اذرع طولا فی السماء فانا ازید تسعة اذرع اخری فبنا ها سبعة و عشرین ذراعا فی السماء وهی سبعة و عشرین ذراعا فی السماء وهی سبعة وعشرون مدما کا و عرض جدار ها ذراعان و جعل فیها ثلث دعایم و کانت قریش فی الجاهلیة جعلت فیهاست دعایم . (کتا ب اخبار مکه صفحه ۱۴۴)

امر بن الزبیر ابنه عباد بن عبدالله و جبیر بن شیبة بن عثمان ان یجلعوا الرکن فی ثوب و قال لهم این الزبیر اذا دخلت فی الصلوة صلوة الظهر فاحملوه واجلعلوه فی موضعه فانا اطول الصلوة فاذا فرغتم فکبروا حتی اخفف صلوتی و کان ذلک فی حرشدید فلما اقیمت الصلوة کبر ابن الزبیر و صل بهم رکعته خرج عباد بالرکمن من دار الندوة وهو یحمله و معه جبهیر بن شیبة بن عثمان و دار الندوة یومئذ قریبٹ من الکعبة فخر قابه الصفوف حتی ادخلاه فی الستر الذی دون البناء و کان الذی وضعه فی موضعه هذا عباد بن عبدالله بن الزبیر و اعانه علیه جبیر بن شیبة فلما اقروه فی موضعه و طرق علیه الحجر ان کبروا فخفف ابن الزبیر صلوته وتسامع الناس بذلک.(کتاب اخبار مکه ۱۴۳ و ۱۴۴).

’’تب ابن زبیر نے مکہ کے ذی وجاہت اور شریف لوگوں کو بلایا اور کعبہ کے ڈھانے میں مشورہ کیا۔ بہت وہمی اور وسواسی باتیں جو ایسے موقع پر ہوتی ہیں ہوئیں آخر کار ابن زبیر نے کعبہ کے ڈھانے کا حکم دیا مگر کسی کو ڈھانا شروع کرنے کی بوجہ توہم وسواس و خوف کے جرات نہ ہوئی تو خود ابن زبیر کدال لے کر اوپر چڑھ گئے اور ڈھانا شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابن زبیر پر کچھ آفت نہیں پڑی تو اوروں کو بھی جرات ہوئی اور سب چڑھ گئے اور ڈھانے لگے جمادل الاول ۶۴ ہجری تک سب کعبہ ڈھا دیا گیا مگر ابن عباس اپنے خوف یا وہم یا کعبہ کا منہدم کرنا خلاف طبع ہونے کے سبب مکہ میں نہ آئے ابن زبیر نے بموجب فہمائش ابن عباس کے کعبہ کے چاروں طرف تختہ بطور دیوار کے کھڑا کر دیا اور کپڑے سے منڈھ دیا اور اندر اندر کام ہوا کیا لوگ اس تختہ کی دیوار کی گرد طواف کیا کیے اور نماز پڑھا کیے۔ جب کہ کعبہ بالکل ڈھے کر زمین کے برابر ہو گیا اور حضرت ابراہیم کے ہاتھ کی بنیاد رکھی ہوئی نکل آئی تو ضرور بالطبع ابن زبیر کو رغبت ہوئی ہو گی کہ کل تعمیر ابراہیم پر تعمیر کی جاوے اور جس قدر کہ قریش نے یہ سبب نہ میسر نہ ہونے سامان کے چھوڑ دیا تھا وہ بھی تعمیر میں شامل کیا جاوے چنانچہ ابن زبیر نے ایسا ہی کیا اور کل بناء ابراہیم پر تعمیر کعبہ شروع ہوئی۔ ایک نہایت عمدہ تجویز جو ابن زبیر نے کی تھی وہ یہ تھی کہ کعبہ کے دو دروازے رکھے جاویں ایک جانب شرق جو قدیم سے تھا دوسرا جانب غرب تا کہ جو لوگ

شرقی دروازہ سے کعبہ میں داخل ہوں وہ غربی دروازہ سے نکل جاویں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو کرسی قریش نے با قوم کی صلاح سے دی تھی وہ بھی موقوف کر دی اور زمین پر دروازوں کو قائم کیا مگر بلندی اس کی قریش کی بلندی سے بھی نو ذرعہ بڑھا دی یعنی ستائیس ذرعہ کر دی اور بلا شبہ جب کہ کعبہ لمبا ہو گیا تھا تو اس کا اس قدر اونچا کرنا بھی نہایت ضرور تھا کہ قریش نے کعبہ کے اندر چھ ستون قائم کیے تھے چھت پاٹنے کو ابن زبیر نے صرف تین ستون بنائے غالبًا ان کو بہ نسبت قریش کے لکڑی لمبی مل گئی تھی۔

حجر اسود رکھے جانے کا ایک عجیب حال کتابوں میں لکھا ہے جس کی کچھ وجہ خیال ہمارے سمجھ میں نہیں آتی۔ ابن زبیر نے ان لوگوں کو ایک دھوکا میں رکھا اور اپنے بیٹے عباد اور جبیر ابن شیبہ کو سمجھا دیا کہ جب میں نماز پڑھانے کھڑا ہوں گا۔ تو بڑی نماز پڑھاؤں گا اس وقت تم حجر اسود کو جو دارلندوہ میں قریب کعبہ کے رکھا ہوا ہے ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے آنا اور جو جگہ اس کے کھڑا کرنے کی ہے وہاں کھڑا کر دینا جب کھڑا کر چکو تو پکار کر اللہ اکبر کہنا پس میں نماز کو ختم کر دوں گا چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ جب ابن زبیر نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے اور ایک رکعت پڑھا چکے تو عباد اور جبیر حجر اسود کو کپڑے میں لپیٹ کر دارلندوہ میں سے لے آئے جماعتوں کو چیر کو تختوں کی دیوار کے اندر لے گئے اور ان دونوں نے حجر اسود کو اس کی معین جگہ میں کھڑا کر دیا اور پھر پکار کر اللہ اکبر کہا تب ابن زبیر نے

اپنی نماز ختم کی۔اس بات پر لوگوں نے بہت کانا پھوسی کی اور بعض
لوگ علانیہ ناراض ہوئے۔مگر ہم نہیں سمجھتے کہ ابن زبیر کو ایسا کرنے
سے کیا فائدہ تھا اور کیوں ایسا دھوکا دینے کی ضرورت ہوئی تھی۔
حقیقت میں کوئی اور بات ہوئی ہوگی لوگوں نے اپنے قیاسات اس پر
لگائے اور انہیں قیاسات کو بطور واقعہ کے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اپنی
روایتوں میں بیان کیا بہرحال کچھ ہی ہوا خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ حجر
اسود کھڑا ہوگیا۔

(۷) تعمیر حجاج بن یوسف

**حتی قتل ابن الزبیر رحمة الله و دخل الحجاج مکة فکتب الی عبد
الملک ابن مروان ان ابن الزبیر زاد فی البتی مال لیس منه واحدث فیه
بابا اخر فکتب الیه عبدالملک ابن مروان ان سدبابها الغربی الذی کان
فتح ابن الزبیر واهدم ما کان زاد فیه من الحجر واکبسها به علی ما کانت
علیه فهدم الحجاج منها سبعة اذرع و شبرا ممیلی الحجر و بناها علی
اساس قریش الذری کانت استقصرت علیه و کبسها بما هدم منها و سد
الباب الذی فی ظهرها و ترک سایرها لم بحرک منه شیئا فکل شئی**

فيها اليوم بناء ابن الزبير الا الجدر الذى فى الحجر فانه بناء الحجاج وسد الباب الذى فى ظهرها وماتحت عتبة الباب

''عبداللہ ابن زبیر کی حکومت مکہ میں بہت جلد ختم ہونے والی تھی اور تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اس بنا کو بہت زیادہ قیام نہ ہوگا چنانچہ عبدالملک ابن مروان جب خلیفہ ہوا تو اس نے حجاج کو مع فوج کے عبداللہ ابن زبیر کے مقابلہ کے لیے بھیجا اس لڑائی میں عبداللہ ابن زبیر مارے گئے اور حجاج مکہ میں چلا آیا تب اس نے عبدالملک کو لکھا کہ کعبہ میں ابن زبیر نے ایسی چیزیں بنا دی ہیں جو پہلے نہ تھیں اور ایک نیا دروازہ بھی بنایا ہے عبدالملک نے لکھا ہے کہ اس دروازہ کو بند کردو اور جس قدر ابن زبیر نے زیادہ بنا دیا ہے وہ سب توڑ دو چنانچہ حجاج نے چھ ذرعہ اور ایک بالشت کعبہ کو توڑ دیا اور قریش کی بنیاد پر وہاں دیوار بنا دی اور وہ نیا دوازہ بھی بند کر دیا اور باقی سب چیز بدستور بنی رکھی اب کعبہ کی جو عمارت ہے وہ ابن زبیر کی بنائی ہوئی ہے صرف وہ دیوار جو حجر کی جانب ہے اور غربی دروازہ کا تیغہ اور شرقی دروازہ کی چار ذرعہ ایک بالشت اونچا اور کعبہ کے اندر کی سیڑھی اور اس کے دونوں روشندان حجاج کے بنائے ہوئے ہیں''۔

☆☆☆

الشرقى الذى يدخل منه اليوم الى الارض اربعة اذرع وشبر و كل هذا بناء الحجاج والدرجة الستى فى بطنها اليوم والبيابان الذان عليها اليوم هما ايضاً من عمل الحجاج.

کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۴۵۔۱۴۶۔

مورخ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر نے کعبہ کی تعمیر میں جو کچھ نیا بنایا تھا۔وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق تھا۔جس کا ذکر آنخضرت نے حضرت عائشہ سے کیا تھا۔

فلما فرغ الحجاج من هذا كله وفد بعد ذالک الحارث بن عبد الله ابن ربيعة المخزومی علی عبد الملک ابن مروان فقال له عبد الملک ما اظن ابا خبيب يعنی ابن الزبير سمع عن عائشةؓ ما كان يزعم انه سمع سنها فی امر الكعبة فقال الحارث انا سمعته من عايشةؓ قال سمعتها تقول ما ذا قال سمعتها تقول قال لی رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم ان قومک استقصروا فی بنا ء البيت و لولا حداثة عهد قومک بالكفرا عدت فيه ما تركوا منه.... و قال رسول اللهصلى الله عليه وآله وسلم جعلت لهايا بين موضوعين على الارض بابا شرقيا يدخلا لناس منه وال عبد الملک بن مروان انت سمعتها تقول هذا قال نعم يا امير المومنين انا سمعت هذا منها قال فجعلب ينكت منكسا بقضيب فی يده ساعة طويلة ثم قال وددت والله انی تركت ايبن الزبير و ما تحمل من ذلک.(كتاب اخبارات مكه صفحه ۱۴۶ .)

چناں چہ حجاج جب کعبہ کو توڑ تڑا کر قریش کی تعمیر کے برابر کر چکے،تو حارث ابن عبداللہ عبدالملک کے پاس گئے۔ان سے عبدالملک نے پوچھا کہ ابن زبیر نے کوئی بات کعبہ کی نسبت حضرت عائشہؓ سے سنی تھی۔حارث ابن عبداللہ نے کہا کہ میں نے خود حضرت عائشہؓ سے سنا کہ ان سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تیری قوم

نے کعبہ کی تعمیر میں کمی کر دی۔ اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے زمانہ سے نیا بدلا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ میں پھر کعبہ میں ملا دیتا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اس میں دو دروازے بنا دیتا۔ ایک شرقی دروازہ کہ جس میں سے لوگ اندر جاتے۔ اور ایک غربی دروازہ کہ جس سے لوگ باہر نکل جاتے۔ عبد الملک نے پوچھا کہ تم نے خود یہ بات سنی ہے۔ انھوں نے کہا ہاں اے امیر المومنین میں نے خود یہ بات سنی ہے۔ عبد الملک یہ سن کر ہاتھ کی لکڑی پر سر ٹیک کر بڑی دیر تک سوچ میں گئے اور پھر کہا کہ با خدا میں پسند کرتا ہوں کہ میں نے ابن زبیر کے برخلاف کیا۔

یہ زمانہ جب کہ اس حدیث کا چرچا ہوا۔ ایسے فتنہ وفساد کا زمانہ تھا۔ کہ روایت کی صحت پر بہت کم یقین ہوتا تھا۔ خلافت میں سخت سے سخت واقعات گزر چکے تھے۔ حضرت امام حسینؑ کی نسبت واقعہ کربلا ہو چکا تھا۔ مدینہ منورہ میں قتل عام ہو چکا تھا۔ مکہ معظّمہ میں محاربات ہو چکے تھے۔ اور عبد اللہ ابن زبیر قتل ہو چکے تھے۔ اور ہر ایک کا واقعہ کے ساتھ جدا فرقہ قائم ہو گیا تھا۔ جو ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف تھا۔

بے شک ہمارا دل اور غالبا ہر ایک کا دل یہ بات زیادہ پسند کرتا ہوگا کہ کعبہ بنائے ابراہیم پر بنایا جاتا۔ اور دو دروازے بھی اس میں بنانے بھی نہایت عمدہ اور مفید کام تھا۔ مگر یہ بات کہ آنحضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا اس کی صحت پر یقین نہیں ہوسکتا۔ اول تو اس معاملہ میں حضرت عائشہ کو مخاطب کرنے اور اس فعل کو جو ایام جاہلیت میں ہوا تھا۔ خاص حضرت عائشہ کی قوم کا فعل قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ کیونکہ وہ فعل تمام قریش نے بہ مجبوری کیا تھا۔ جس میں خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل تھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فتح مکہ تمام قریش اسلام لے آئے تھے۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو تیار تھے۔ اور موجود تھے۔ خانہ کعبہ کے تمام بتوں کو جن کی

پرستش ان کے باپ دادا نے صدہا سال کی تھی۔ توڑ ڈالا تھا اور ان کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ پس کعبہ کو بڑا کر دینے اور حضرت ابراہیم کی بنیاد پر پورا بنا دینے میں کون سی مشکل تھی۔ جو آنحضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے

" لو لا حداثة عهد قومک بالکفر اعدت فيه ما ترکوا منه

پس یہ حدیث کسی طرح صحیح اور قابل وثوق نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس بات سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بناء سے جس قدر زمین خانہ کعبہ کی تعمیر سے خارج رہ گئی تھی۔ اس کی کچھ پرواہ نہیں فرمائی ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی کوئی خاص وضع یا اس کے لئے کوئی خاص مقصود اور مدار علیہ نہ تھی۔ بلکہ صرف وہ ایک مسجد تھی جو حضرت ابراہیم نے بنائی تھی۔ جب وہ ڈھ گئی اور دوبارہ بنائی گئی، تو جس طرح سے بن گئی، بن گئی۔ یہ کچھ ضرور نہ تھا کہ بعد بن جانے کے خواہ مخواہ پھر توڑ کر اسی قدر بنائی جاتی جس قدر کہ حضرت ابراہیم نے بنائی تھی۔ جیسے کہ عبدالملک بن مروان نے اپنی نادانی یا حضرت عبداللہ ابن زبیر کی عداوت سے اس بنی ہوئی عمارت کو پھر توڑ کر ویسا ہی کر دیا۔ جیسا کہ قریش نے ایام جاھلیت میں بنایا تھا۔

غلاف کعبہ

حضرت ابراہیم کے وقت میں اوراس کے بعد کعبہ کی دیواریں ویسی ہی دکھائی دیتی تھیں۔جیسی کہ بنی تھیں مگر سنہ عیسوی سے چھ سو برس پیشتر اسعد حمیری نے کعبہ کی دیواروں پر غلاف چڑھایا۔اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو کپڑا پہنا رہا ہے۔جب جاگا تو اس نے انطاع کا غلاف چڑھایا،مگر پھراس نے وہی خواب دیکھا تب اس نے یمن کے کپڑے کا جو عمدہ ہوتا ہے۔غلاف چڑھایا

اس کی عربی یہ ہے۔

و کان ھو (ای اسعد الجمیری وھو تبع) اول من کسا الکعبة.... اری فی النوم انه یکسو ھا فکساھا الوصا یل یشاب جبرة من عصب الیمن و جعل لھا یابا یغلق (کتاب اخبار مکه،صفحه ۱۷۳ ،۱۷۴ .)

تب سے کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہوگئی۔اور جس کے قبضہ اقتدار میں کعبہ رہتا آیا۔وہ ہر سال پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھاتا رہا۔اوراس سبب سے بہت سا کپڑا کعبہ کی دیواروں پر چڑھ گیا تھا۔اوراس توبرتو کپڑے کے سبب کئی دفعہ آگ لگ گئی تھی اور خانہ کعبہ جل گیا تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر کے وقت تک پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کا دستور تھا۔اوراسی سبب سے ان کے عہد میں بھی آگ لگ گئی تھی۔اس کے بعد سے پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کی رسم جاتی رہی۔بلکہ ہر سال پرانا غلاف اتار کر نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔اور کعبہ کے خادم پرانے غلاف کے ٹکڑے ٹکڑے کر کر

بطور تبرک تقسیم کرتے ہیں۔ اور حاجی ان ٹکڑوں کو نہایت شوق سے لاتے ہیں۔ اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے دوستوں کو دیتے ہیں۔ اکثر مسلمان جن کے پاس یہ ٹکڑے ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ کفن میں رکھ کر اپنی قبر میں لے جاتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ اس کی برکت کے سبب عذاب سے بچیں گے۔ مگر مسلمانوں کے یہ سب اوہام اور خیالات ہیں، مذہب اسلام ایسی باتوں سے جو کچے سوت سے بھی زیادہ ناپائیدار ہیں، پاک صاف ہے۔ مذہب اسلام سے نہ یہ بات پائی جاتی ہے کہ غلاف کعبہ کچھ متبرک ہو جاتا ہے اور نہ یہ کہ اس کے قبر میں ساتھ لے جانے کے بجز اس کے کہ وہ بھی مثل جسم و کفن کے خاک ہو جائے گا۔ اور کچھ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف اعتقاد توحید سے ہو سکتا ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا کہ زمانہ اسلام میں کعبہ پر غلاف چڑھائے گئے۔

كما البيت فى الجاهلية الانطاع ثم كساء النبى صلعم الثياب عمر وعثمان القباطى ثم كساء الحجاج الديباج يزيد بن معاويه ويقال ابن الزبير ويقال عبد الملك بن مروان (كتاب اخبار مكه صفحه ١٧٦).....

اگرچہ کتابوں میں روایتیں ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ان کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ و عثمانؓ نے بھی کعبہ پر غلاف چڑھایا۔ مگر ہم کو جہاں تک شبہ ہے۔ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فعل کی نسبت شبہ ہے۔ کیونکہ جو روایتیں اس باب میں ہیں وہ درجہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں۔ با ایں ہمہ ان کو تسلیم کر لینے میں کچھ زیادہ بحث نہیں ہے۔ غرض کہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ابوبکر صدیقؓ نے یمن کے کپڑے کا جو نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ کعبہ کو غلاف چڑھایا۔ اور عمرؓ و عثمانؓ نے قباطی کپڑے کا غلاف چڑھایا۔ اور پھر دیباج کے کپڑے کا غلاف چڑھایا

گیا۔ بعضے کہتے ہیں کہ حجاج نے اور بعض کہتے ہیں کہ عبد الملک بن مروان نے چڑھایا۔ غرض کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام خلفائے بنوامیہ اور خلفائے بنی عباسیہ و دیگر خلفاء کے عہد میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کا بڑا اہتمام رہا۔ اور سب چڑھاتے رہے۔ زمانہ حال میں سلطان روم کی جانب سے نہایت عظیم الشان بہت عمدہ غلاف سیاہ رنگ جس میں بعض آیات قرآنی نہایت خوش خط اور سونے کے پانی سے لکھی ہوتی ہیں۔ چڑھایا جاتا ہے۔

اسلام کی رو سے جو کچھ بحث اس پر ہو سکتی ہے۔ وہ اسی قدر ہو سکتی ہے کہ

" ما التبعد الکعبة اولتحسینها فالاول کفر علی مذهب الاسلام والثانی امر لا باس به"

یعنی یہ کام کس ارادہ سے کیا جاتا ہے، کعبہ کی پرستش کے لئے یا اس کی خوب صورتی کے لئے اور آرائش کے لئے اگر پہلی نیت سے کیا جاتا ہے۔ تو اسلام کی رو سے کفر ہے۔ اور اگر دوسرے ارادے سے کیا جاتا ہے۔ تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

آرائش کعبہ کی ایسی ہی ہے، جیسے کہ ہم اور تمام مسجدوں کی آرائش کرتے ہیں۔ مگر جو کہ کعبہ ایک نہایت قدیم مسجد ہے۔ اور ایسے بانی اسلام کے ہاتھ سے بنی ہے۔ جس نے سب سے اول کہا تھا۔

لا احب الافلین. انی وجهت وجهی للذی فطر السموات و الارض حنیفاً و ما انا من المشرکین".

اس لئے ہم کو اس کی قدر بہ نسبت اور مسجدوں کے زیادہ کرنی ضرور ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے خدا کی پرستش کی نشانی ہے۔

اصنام کعبہ

اساف ونایلہ

بنی جرھم کے زمانے میں صفاومروہ کے پہاڑوں پر دوبت رکھے گئے۔صفا پر جو بت تھا۔وہ مرد کی شکل کا تھااوراساف اسے کہتے تھے۔دوسرا بت جومروہ پرتھا،وہ عورت کی شکل تھا۔اورنایلہ اس کو کہتے تھے۔جوروایتیں حقارت آمیزان کی نسبت پائی جاتی ہیں۔وہ قدیم نہیں،غالباً اسلام کے زمانہ کی بنائی ہوئیہیں۔ظاہرامعلوم ہوتا ہے کہ وہ دوانسان تھے،اور بنی جرھم ان کو دیوتا سمجھتے تھے۔اوران کے مرنے کے بعدان کے دوبت بنائے گئے اور پرستش ہونے لگی۔فتح مکہ کے روز رسول خداصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کواور بتوں کے ساتھ توڑڈالا۔

نہلیک ومطعم

یہ بھی دوبت تھےنہلیک کوصفاپرنصب کیا گیا تھااور مطعم کومروہ پر۔

ھبل

یہ ایک بہت بڑا بت خانہ کعبہ کے اندر دائیں طرف جو خزانہ کا کنواں تین ذرع گہرا حضرت ابراہیم کا کھودا ہوا تھا۔ اس پر یہ بت کھڑا کیا گیا تھا۔ عمرو بن لحی اس کو ارض جزیرہ سے لایا تھا۔ احد کی لڑائی میں ابوسفیان نے فتح ہونے کے لئے اسی بت سی مدد چاہی تھی۔

مناۃ

یہ بھی بڑا بت تھا اور سمندر کے کنارہ پر قدید کے پاس عمرو بن لحی نے نصب کیا تھا۔ اور یہ دونوں بت قبیلہ ازد وعسان کے کہلاتے تھے۔ اور بعضوں کا قول ہے کہ یہ اوس وخزرج وغسان کے کہلاتے تھے۔ جواز دکی شاخوں میں بعضوں کا قول ہے کہ وہ صرف قبیلہ ھذیل کا ایک پتھر تھا۔ اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بن گھڑا ایک لمبا پتھر ہو۔

لات وعزی۔ لات ایک بن گھڑا پتھر تھا۔ جس میں لوگ خیال کرتے تھے کہ شان باری کے کرشمہ نے حلول کیا ہے۔ اور عزیٰ تین درخت تھے۔ جس میں ذات باری کا حلول سمجھ کر پوجتے تھے۔ جیسے کہ ہمارے زمانے میں بھی بہت سے مسلمان اسی طرح پر درختوں کی جو درگاہوں میں ہوتے ہیں۔ پرستش کرتے ہیں۔ ہمارے شہر دھلی میں بھی کبھی شاہ بولا کے بڑ پر بھی منتوں کے ناڑے باندھے جاتے تھے، لات تہامہ میں تھا۔ اور عزیٰ طائف میں۔

ذات انواط۔ یہ بھی ایک بہت بڑا سرسبز وشاداب درخت حنین میں تھا۔ جس کو لوگ

پوجتے تھے۔

ذوالکفین ۔ یہ بھی ایک بت تھا۔جس کوعمر بن حممہ نے بعد فتح مکہ جلایا تھا۔

سواع: یہ ایک مشہور بت قبیلہ ھذیل کا تھا۔جس کوعمر بن العاص نے بعد فتح مکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے توڑا تھا۔

ود: ایک بت بنی کلب دومۃ الجندل میں تھا۔

یغوث: پہلے اس کو بنی مراد پوجتے تھے۔پھر بنی عطیف پوجنے لگے۔

یعوق: بنی ھمدان میں تھا،جس کو وہ پوجتے تھے۔

نسر: بنی حمیر آل ذی الکلاع کے پوجنے کا بت تھا۔

علاوہ ان بتوں کے مشہور روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت بنے ہوئے تھے۔اور نہایت استحکام کے ساتھ سیسہ سے جڑ کر کھڑے تھے۔جو فتح مکہ کے دن سب توڑ ڈالے گئے۔

تصاویر خانہ کعبہ

ادرک (ای عطا ابن ابی رباح) فیھا (ای فی البیت) تمثال مریم مزدقا فی حجر ھا عیسیٰ ابنھا قاعدا مزوقا. (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۱۲۰.)

حضرت مریم کی حضرت عیسیٰ کو گود میں لیے ہوئے تصویریں تھیں۔غالبا حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویر یا قوم نے بنائی ہوگی۔جب کہ اس نے قریش کے زمانے میں کعبہ بنایا تھا۔جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ نے حضرت

ابراہیم کی تصویر کو دیکھ کر فرمایا کہ خدا ان کو مارے ابراہیم کو تیروں سے شگون لیتا اور فال دیکھتا بنایا ہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت مریم کی تصویر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ سب تصویروں کو مٹا دو، مگر مریم کی تصویر کو چھوڑ دو، اگر یہ واقعات صحت کو پہنچے تو اس کی وجہ صاف بتائی جاتی ہے۔ فرشتوں کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پس ان کی تصویریں بنانا محض جھوٹ اور خلاف واقع تھا۔ حضرت ابراہیم کی تصویر ایسے فعل کی حالت بنائی تھی کہ جو شرک میں داخل ہے۔ اور بلا شبہ حضرت ابراہیم اس سے پاک تھے۔ صرف مریم اور حضرت عیسیٰ کی تصویر ایسی تھی جس میں کوئی اشارہ کفر یا شرک یا کذب کا نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ پرستش کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس کے چھوڑ دینے میں کچھ ہرج نہ تھا۔

زمزم

جب سے کعبہ کا نام ہے۔ اسی کے ساتھ اس چشمہ کا نام بھی چلا آتا ہے۔ بلکہ یہی چشمہ مکہ کی آبادی اور کعبہ کے اس جگہ بننے کا سبب ہے۔ اگرچہ یہ چشمہ مدت سے خشک ہو گیا ہے۔ مگر اس کی جگہ ایک کنواں کھود دیا گیا ہے۔ جو چاہ زمزم کے نام سے مشہور ہے۔

عرب کی سرزمین نہایت خشک ہے یا پہاڑ ہیں۔ یا ریگستان ہے۔ برسات وہاں بہت کم ہوتی ہے۔ کوئی دریا اس میں نہیں بہتا۔ اس سبب سے پانی کی بہت قلت ہے۔ کہیں کہیں جنگلوں میں جا کر پہاڑوں کی نلیوں میں یا پہاڑ کے اونچے غار میں پانی جمع ہو جاتا ہے۔ اور لوگ پانی کی تلاش میں پھرتے ہیں۔ جہاں پانی مل گیا۔ وہاں تنبو تان دیے۔ اور آباد ہو گئے۔ جب وہاں کا پانی خشک ہو گیا تو وہاں سے چل دیے۔ دوسری جگہ جہاں پانی مل گیا۔ ڈیرے ڈال دیے۔ یہی طریقہ قدیم سے عرب کے صحرانشین بدوؤں کا تھا۔

اونچے مقاموں میں جو پانی جمع ہو جاتا تھا، اور زمین یا پہاڑوں کے نیچے نیچے سوتوں کی راہ سے پانی کے نکلنے کا کوئی رستہ مل جاتا تھا۔ تو اپنے مخزن سے دور جا کر بطور چشموں کے نکل آتا تھا۔ مگر ایسی ایسی سوتیں ایسی ضعیف ہوتی تھیں کہ سطح زمین سے اگر تھوڑے نیچے بھی ہوں تو معلوم نہیں ہوتی تھیں، اور اگر کہیں کھل بھی جاتی تھیں تو تھوڑی سی چیز کے پڑنے سے ڈھک جاتی تھیں۔ حال کے زمانہ میں بھی بدو اس طرح کے پانی کے سوتوں کو تھوڑے سے کنکر پتھر، کانٹوں کے ڈالنے سے اس طرح پر چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا نشان نہیں ملتا۔

زمزم کی نسبت ایسی ایسی دور از کار روایتیں مشہور ہیں۔ جن میں سے ایک بھی معتبر اور مذہب اسلام کے موجب صحیح نہیں ہے۔ جتنا کہ یہ چشمہ پرانا ہے۔ اسی قدر تقدس آمیز اور تعجب انگیز مبالغہ سے وہ روایتیں بنائی گئی ہیں۔ اصلیت اس چشمے کی صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت حاجرہ زوجہ حضرت ابراہیمؑ مع اپنے بیٹے اسماعیلؑ کے بہ سبب اس نزاع اور حسد کے جو قدرتی ایک شوہر کی دو جوروؤں میں ہوتی ہے۔ سربصحرا نکال دی گئیں اور یہاں پہنچیں تو پانی جو ان کے پاس تھا، ختم ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت ہوئی بہ سبب نہ ملنے پانی کے مایوسی طاری ہوئی۔ اس گھبراہٹ میں ہر چہار طرف پانی کی تلاش کرتی تھیں۔ اسی جستجو میں اتفاقاً کنکروں اور پتھروں کے نیچے پانی کا نشان معلوم ہوا اور پتھر ہٹانے سے پانی نکل آیا۔ انھوں نے اس تائید غیبی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور وہ اور ان کے بیٹے پانی پی کر سیراب ہوئے۔

جس طرح کہ عرب کے چشمے چند مدت تک جاری رہتے ہیں۔ اور پھر خشک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ چشمہ بھی کسی مدت کے بعد خشک ہو گیا۔ اور کسی کو اس کی طرف خیال بھی نہ رہا۔ اور سینکڑوں برس اس پر گزر گئے۔ مگر عام الفیل کے بعد حضرت عبدالمطلب جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا۔ وہاں کنواں کھود کر پانی نکالا

جائے۔ چنانچہ انھوں نے کھودنا شروع کیا۔اس پر بعض لوگ مانع ہوئے اور فساد پر آمادہ ہوئے۔مگر کسی نہ کسی طرح وہ فساد رفع ہوا اور حضرت عبدالمطلب اپنے مقصد میں کام یاب ہوئے۔ جو قصے کتابوں میں اس کنویں کی نسبت اور حضرت عبدالمطلب کو اس خاص مقام کے دریافت ہونے کی نسبت لکھے ہیں۔ان میں سے کسی کی کچھ صحت نہیں ہے۔ کچھ عجیب نہیں کہ انھوں نے خواب میں دیکھا ہو کہ میں ایک کنواں کھودتا ہوں۔اور اس سبب سے کنواں کھودنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ یہ کنواں پہاڑ میں کھودا گیا۔ جہاں سوتیں مشکل سے نکلتی ہیں۔ چنانچہ اس میں سے صرف تین سوتیں نکلیں تھی۔ سنہ ۲۲۳ ھجری اور سنہ ۲۲۴ ھجری میں اس کا پانی خشک ہو گیا تھا۔اس لیے دو ذرع اور کھودا گیا تھا۔مگر سنہ ۲۲۵ ھجری میں کثرت سے بارش ہوئی اور اس سبب سے کنویں میں بہت سا پانی جمع ہو گیا۔

خلافت ہارون رشید میں بھی یہ کنواں بہ سبب کمی پانی کے قریب دو ذرع گہرا کیا گیا تھا۔اور مہدی اور محمد بن الرشید کی خلافت میں بھی گہرا ہوا تھا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسا کہ تمام کنوؤں کا حال ہے۔ ویسا ہی اس کا بھی حال ہے۔اور تمام عجائب وغرائب روایتیں جو اس کے پانی کے قبل قیامت نہ سوکھنے کی ہیں۔ وہ سب موضوع ہیں۔جن کی کچھ بھی اصلیت اسلام میں نہیں ہے۔

زمزم کا کنواں اس وجہ سے ہے کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت کا ہے۔جس میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پانی پینا تھا۔ بلا شبہ قابل ادب اور عزت کے ہے۔لیکن اس کے پانی کے فضائل میں جو روایتیں ہیں۔ وہ سب بے سند اور ضعیف ہیں۔ حاجی جو زمزم کا پانی چھوٹی چھوٹی زمزمیوں میں بھر کر بطور تبرک کے ہندوؤں کی مانند دور دور لے جاتے ہیں۔اور سب لوگ بطور تبرک کے اس کو رکھتے ہیں۔اور اس پانی کی بہت تعظیم کرتے ہیں۔اور بہ اظہار ادب کھڑے ہو کر پانی پیتے ہیں۔اس کی کچھ اصل

مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جیسے اور کنوؤں کا پانی۔ وہ بھی ویسا ہی کنویں کا پانی ہے۔ مزہ میں میٹھا نہیں ہے۔ بلکہ مل ملاتا ہے۔ جس وقت کھینچیں اگر اسی وقت پی لیں تو شاید پینے کے قابل ہو الا رکھا رہنے سے زیادہ مل ملا ہو جاتا ہے۔

اسماء کعبہ

کعبہ کا اصلی نام بیت اللہ ہے۔ یعنی خانہ خدا۔ یہ ایک قدیم طریقہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے جاری تھا کہ جہاں وہ کوئی نشان عبادت کے لیے قائم کرتے تھے اس کو ''بیت ایل'' یعنی خانہ خدا کہتے تھے۔ مگر جو کہ وہ عمارت جو حضرت اسماعیل نے بنائی تھی بہ شکل مکعب تعمیر ہوئی تھی اس لیے کعبہ کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔

کعبہ کا نام بیت عتیق اور مکہ و بکہ اور ام القری میں بھی آیا ہے۔ پچھلے تینوں نام تغلیبا کعبہ پر اطلاق ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ تمام حرم یا شہر پر صادق آتے ہیں۔

کتابوں میں کعبہ کے اور نام بھی لکھے ہیں جو ''ام رحم'' ''الباسہ'' ''الحاطمہ'' مگر یہ سب وہ نام ہیں جو لوگوں نے بعض صفات کے خیال سے گھڑ لیے ہیں۔

عمال کعبہ

جس وقت کعبہ بنایا گیا۔ اس وقت وہ حضرت اسماعیلؑ کے قبضہ میں بطور تولیت کے رہا۔ اوران کی وفات کے بعدان کی اولاداس مقدس مسجد کی سب سے بڑی محافظ تھی۔ مگر بنی اسماعیل اور بنی جرہم میں نہایت قریب قرابت تھی۔ اور حضرت اسماعیل کی اولاد بجز قیدار کے عرب کے مختلف مقامات میں جا بسی تھی۔ اس وجہ سے خدا کے گھر کی حفاظت اسماعیل کی اولاد سے نکل کر بنی جرھم کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ ایک مدت دراز کے بعد بنی عمالیق جوحمیر کے خاندان سے تھے۔ اس پر غالب آ گئے تھے۔ اور خانہ خدا کے مالک مطلق ہو گئے تھے۔ اس موقع پر بنی اسماعیل اور بنی جرھم آپس میں متفق ہوئے۔ اور عمالیق کو خانہ خدا سے بے دخل کر دیا۔ اور پھر دوسری مرتبہ بنی جرھم اس مقدس معبد کے مالک ہو گئے۔

پھر بنی بکر اور بنی حزہ بنی جرھم کے مقابلے کو کھڑے ہوئے۔ اور دونوں نے اپنی فوجوں کو جمع کر کے دفعتاً بنی جرھم پر حملہ کیا۔ اور بہت سخت لڑائی کے بعد بنی جرھم بالکل مغلوب ہو گئے اور بھاگ گئے۔ اور حفاظتا س معبد کی بنی حزہ کے ہاتھ آ گئی۔ پہلا شخص جس نے کہ مکہ کی حکومت اور کعبہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ عمر بن اللحی تھا۔ یہ وہ شخص ہے۔ جس نے سب سے اول کعبہ کے اندر حبل بت کو کھڑا کیا تھا۔

چند مدت بعد قصیٰ بن کنانہ نے جو اجداد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہیں۔ بنو بکر اور بنی حزہ پر چڑھائی کی خوب مقابلہ ہوا۔ مگر ان قوموں کو شکست ہوئی اور قصیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پانچ پشت اوپر تھا۔ حکومت مکہ اور تولیت کعبہ ان سے چھین لی۔ اور خود حاکم اعلی ہو گیا اور اب قریش کعبہ کی ہر ایک بات کے مالک ہو گئے۔

قصیٰ کے بعد ان کا بیٹا عبدالداران کی جگہ سردار ہو گیا۔ اور جو خاص خاص عہدے عبدالدار سے متعلق تھے۔ ان کے بھائی عبد مناف کو مل گئے۔

کعبہ کے متعلق پانچ بڑی خدمتیں تھیں:

اول: سقیاء ورفادہ۔ یعنی حاجیوں کو پانی اور کھانا دینے کا عہدہ۔

دوم: قیادہ۔ یعنی لڑائی کے وقت فوج کی سپہ سالاری کرنا۔

سوم: لوا۔ یعنی علم بردار ہونے کا عہدہ۔

چہارم: حجاب، یعنی کعبہ کی حفاظت کا عہدہ۔

پنجم: دول الندوہ۔ یعنی دارالندوہ میں پریزیڈنٹ یا صدر انجمن ہونے کا استحقاق۔

عبد مناف کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں ایک خاندانی نزاع پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے ان عہدوں کی تقسیم اس طرح پر ہوگئی۔

ھاشم کو سقیا ورفادہ کا عہدہ ملا۔

عبدالدار کے بیٹے شیبہ نے کعبہ کی حفاظت اور دارالندوہ کی صدر انجمنی اور علم بردار ہونے کا عہدہ اپنے قبضہ میں رکھا۔

ھاشم نے بڑی فیاضی، سیر چشمی اور دریا دلی کے ساتھ حاجیوں کی خبر گیری کی خدمت ادا کی۔ چنانچہ سر ولیم مور تسلیم کرتے ہیں کہ ھاشم نے جو اس طرح پر حاجیوں کی خدمت کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ شاھانہ عظمت کے ساتھ اس کو ادا کیا۔ خود ان کے پاس بڑی دولت تھی۔ اور قوم قریش کے بہت سے آدمیوں نے تجارت کے ذریعے سے بہت سی دولت جمع کی تھی۔ ھاشم نے مثل قصیٰ اپنے دادا کے قوم قریش سے التجا کی کہ تم خدا کے ہمسایہ اور اس کے گھر کے محافظ ہو، جو حاجی اس کے مکان کی تقدس کی تعظیم کو آتے ہیں۔ وہ اس کے مہمان ہیں۔ اور یہ مناسب ہے کہ سب سے پہلے ان مہمانوں کی خاطر تواضع تم کرو۔ تم کو خاص خدا نے منتخب کیا ہے۔ اور اس بڑے رتبے کے ساتھ تم معزز ہو۔ پس خدا کے مہمانوں کی تعظیم کرو۔ اور ان کو تر و تازہ کر دو۔ کیونکہ وہ نہایت دور دراز شہروں سے اپنے لاغر وخراب وخستہ اونٹوں پر بیٹھ کر تمہارے پاس نہایت تھکے ہوئے اور پریشان آتے ہیں۔ ان کے بال

بکھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا جسم دوردراز کے رستہ سے گرد وغبار میں آلودہ ہوتا ہے۔ پس تم مہمان نوازی کے ساتھ ان کی دعوت کرو۔ اوران کو بہت سا پانی دو۔

ھاشم نے اپنے پاس سے بہت سا روپیہ کرچ کر کے ایک عمدہ نظیر قائم کی۔ اور تمام قوم قریش نے بھی نہایت مستعدی کے ساتھ مدد کی، اور ہر ایک شخص نے اپنے مقدور کے موافق چندہ دیا اور تمام قوم قریش پر ایک معین محصول لگایا گیا۔ اور حاجیوں کے جم غفیر کے لیے حوضوں میں کافی پانی کعبہ کے نزدیک بھروایا گیا۔ اور عرفات کے رستہ میں چمڑے کے عرضی حوض بنوائے۔ جب کہ حاجی عرفات اور منیٰ کو روانہ ہوتے تھے۔ اس روز کھانا تقسیم ہونا شروع ہوتا تھا۔ اور جب تک وہ ہجوم منتشر نہ ہوتا تھا۔ اس وقت تک برابر کھانا تقسیم ہوتا رہتا تھا۔ غرض کہ پانچ چھ روز تک گوشت اور روٹی اور مکھن اور جو سے جو مختلف طور پر پکائے جاتے تھے۔ اور چھوہاروں سے جو عرب کا نہایت عمدہ اور پسندیدہ کھانا تھا۔ ان کی تواضع ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح پر ھاشم نے مکہ کی نام آوری کو بخوبی قائم رکھا تھا۔ مگر خود ھاشم کا نام ایک بہت اعلیٰ درجہ کی خیرات سے اور بھی زیادہ مشہور ہو گیا۔ اور جس نام وری سے اھل وطن کی بہت سی ضرورتوں کو رفع کیا۔ جو مدت دراز سے قحط کے سبب سے نہایت تنگ ؤ گئے تھے۔ یعنی ھاشم نے ملک شام کا سفر اختیار کیا۔ اور وہاں روٹیوں کا بہت بڑا ذخیرہ خرید کیا۔ اوران کو ٹوکروں میں بھر کر اور اونٹوں پر لاد کر مکہ لائے۔ اور وھاں اونٹ ذبح کیے گئے اور بھونے گئے اور تمام لوگوں کو کھانا تقسیم کیا گیا۔ فاقہ زدگی اور گریہ وزاری اچانک خوشی اور افراط طعام سے بدل گئی۔ اور گویا قحط کے بعد ان کو نئے سرے سے زندگی مل گئی۔

ھاشم کے بعد مطلب کو سقیا ورفادہ کی خدمت ملی۔ اوران کے بعد عبد المطلب بن ھاشم کے پاس وہ خدمت آئی اوران ہی کے عہد میں ابرھۃ الاشرم نے جو اصحاب الفیل کہلاتا ہے۔ کعبہ کے ڈھانے کے قصد سے فوج کشی کی تھی۔ عبد المطلب کے بعد یہ خدمت

زبیر بن عبد المطلب کو پہنچی۔ مگر ان سے بخوبی کام نہ چلا تو انھوں یہ خدمت اپنے بھائی ابو طالب کو دے دی۔ انھوں نے بھی خیال کیا کہ یہ کام نہایت مشکل ہے۔ اس لئے انھوں نے اپنے بھائی عباس کے سپرد کر دی۔ لیکن حضرت عباس کو اس قدر مقدور نہ تھا۔ کہ وہ عہدہ سقیاء و رفادہ کا کام خوبی اور شہرت سے انجام دے سکتے۔ اس لیے یہ عہدے ان کے خاندان سے منتقل ہو کر عبد مناف کی دوسری شاخ میں چلے گئے۔

واقعہ اصحاب الفیل

مکہ کے واقعات میں یہ واقعہ بھی ایک بہت بڑے واقعات میں سے گنا جاتا ہے۔ اس واقعہ کا عظیم متصور ہونا نہ اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اور نہ اس وجہ سے کہ در حقیقت ایک ایسا عظیم واقعہ ہے۔ کہ مثل اس کے کبھی نہ ہوا۔ بلکہ اس کی عظمت صرف ہمارے مفسروں اور جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کی بدولت ہے۔ جنھوں نے ایک سیدھے سادے واقعہ کو ایک عجیب من گھڑت اور الف لیلہ کے قصوں سے عجیب تر قصہ کر کر بیان کیا۔

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود درسیستاں

میں اپنے اس خطبہ میں ان لغو اور بیہودہ روایتوں پر اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اس قصہ کی بابت بیان کیے ہیں۔ بحث کرنا نہیں چاہتا۔ جس میں ایک لمبا جدا گانہ مباحثہ ہے۔ مگر جو واقعہ کہ گذرا۔ اس کو صاف صاف بیان کر دیتا ہوں۔

کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب فیل سے پہلے تبع نے تین دفعہ کعبہ کے ڈھانے کا

ارادہ کیا۔ مگر ظلمت و آفت میں گرفتار ہوئے۔ وہ قصے چنداں مشہور نہیں ہیں۔ مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے۔ ابرھۃ الاشرم جو کہ ایک عیسائی حاکم یمن کا تھا۔ اس نے صنعا یمن میں قریب غمدان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا۔ اور قلیس اس کا نام رکھا تھا۔ اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑ دیں۔ اور اس کنیسہ کا حج کیا کریں۔ اور اس لیے اس نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا۔ اور مع فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا۔ اور مغمس میں اترا۔ اس وقت قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ھذیل سب لڑنے کو تیار ہوئے۔ مگر انھوں نے ابرھۃ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پائی۔ ابرھۃ الاشرم نے کہلا بھیجا کہ مجھے تم سے جدال و قتال منظور نہیں ہے۔ بلکہ صرف کعبہ کو ڈھانا مقصود ہے۔ اس گفتگو میں چند روز گزرے اور اسی درمیان میں ابرھہ کے لشکر میں چیچک کی وبا پھیلی جو اس سے پہلے عرب میں نہیں ہوئی تھی۔ تمام لشکر برباد ہو گیا۔ اور بہت سے مر گئے۔ اور بہت سے اسی حالت میں پھر گئے۔ خدا تعالیٰ نے ایسی آفت ان پر نازل کی کہ جو بد ارادہ انھوں نے کیا تھا، اس پر کامیاب نہ ہوئے۔

مفسرین نے اس قصہ کو عجیب طرح سے رنگا ہے۔ قرآن مجید میں دو لفظ آئے ہیں طیرا اور بحجارۃ ان دونوں لفظوں کی مناسبت سے جو مفسرین وضاعین نے جو قصہ چاہا ہے۔ بنا لیا ہے۔ جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔

اسی سال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہو چکے تھے۔ جو اس بے نظیر اصلاح کا ذریعہ ہونے والے تھے۔ جو قیامت تک بے نظیر رہے گی۔ عبد المطلب اور ابو طالب ان کی پرورش میں مصروف تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سن شریف اس حد کو پہنچا جس میں اس منصب کے ادا کرنے کا وقت منحصر تھا۔ جس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ تب آپ نے اپنے فطرتی منصب نبوت کو اختیار

کیا۔اورخدائے واحد کی پرستش کا واعظ فرمانا شروع کیا۔اور بوجہ ان مصائب کے جواس کام میں آپ کو پیش آئے۔وطن چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا پڑا۔مکہ اب اپنے تئیں محفوظ سمجھتا تھا۔اورخوشی اور اطمینان کے ساتھ اپنے بتوں کی پرستش میں مصروف تھا۔کہ دفعتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا محاصرہ کرلیا۔اور بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے اس کو فتح کرلیا۔اس کے بتوں کوتوڑا اور پھر خدائے واحد کی پرستش کو قائم کیا۔جو قیامت تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام نامی کے ساتھ قائم رہے گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسب ونسب کی تحقیق

ان اللہ اصطفیٰ آدم ونوحا وآل ابراھیم وآل عمران علی العالمین

.

علم الانساب میں عربوں کی کامل مہارت

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں نہایت اکھڑ گنوار جاہل بن لکھے اور بن پڑھے تھے۔علم ادب بھی جس کو ٹھیک ٹھیک علم ادب کہتے ہیں۔ان میں نہ تھا۔اور نہ کسی اور فن کو اچھی طرح جانتے تھے۔ہاں دو باتیں ان میں بے مثل تھیں۔(۱) ایک نہایت موثر اور پر مطلب گنواری فصاحت جو بالتخصیص دھقائیوں میں پائی جاتی تھی۔اور اس سبب سے اس کے مضامین طبعی جوشوں پر مبنی ہوتے تھے۔اور دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے۔(۲) دوسرے بے مثل اور بے نظیر حافظہ۔اگرچہ ہمیشہ بن لکھے پڑھوں کا حافظہ ہمیشہ قوی ہوتا ہے۔مگر عرب والوں کا حافظہ بہت قوی تھا۔اسی قوت حافظہ کے سبب وہ اپنی قوموں کی تمام نسلوں کو یاد رکھتے تھے۔اور نسلوں کے یاد رکھنے کو نہایت فخر سمجھتے تھے۔جو رفتہ رفتہ ایک علم ہو گیا۔اور ”علم الانساب“ اس کا نام پڑ گیا۔اھل عرب کی عادت تھی کہ وہ اپنے نسب پر بہت فخر کرتے

تھے۔اورھر موقع پر اس کا ذکر کرتے اور شیخیاں بگھارنے سے نہ چوکتے تھے۔اور اس سبب سے ان کو نہ صرف اپنا ہی نسب نامہ یاد رکھنا کافی نہ تھا۔ بلکہ اپنے مخالفوں،رقیبوں اور ہمسایوں کا نسب نامہ بھی یاد رکھنا ضروری ہوتا تھا۔تاکہ اپنی شیخی کے سامنے دوسروں کی شیخی نہ چلنے دیں۔لکھنا ان کو آتا نہ تھا۔اس لیے ان کے نسب نامے لکھے ہوئے نہ تھے۔ جہاں تک یاد تھی۔اور جو باتیں یاد رکھنے کے قابل تھیں۔وہ سب برزبان یاد تھیں۔ان کا حافظہ ہی ان کے لئے لوح محفوظ تھا۔حافظہ کیسا ہی قوی ہو۔مگر تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا ایک غیر ممکن بات تھی۔اس سبب سے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور و معروف اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے۔باقی لوگوں کے نام جس قدر یاد رہ سکتے تھے۔اسی قدر یاد رہتے تھے۔ان مشہور آدمیوں کے نام یاد رہنے کا یہ بھی بڑا اسبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے حالات سب شعروں میں ہوتے تھے۔جو بڑے بڑے معرکوں،میلوں اور لڑائیوں میں بڑے فخر کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ان سب رسموں اور عادتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اپنے ہمسایوں ،اپنے مخالفوں اور رقیبوں کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کس قوم اور کس نسل کا ہے۔اور کسی کو ایسی جرات اور طاقت نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے۔یا جھوٹ موٹ اپنے آپ کو کسی ایسی نسل کا جس کا درحقیقت وہ نہیں ہے۔کہنے لگے۔مگر باایں ہمہ سلسلہ وار تمام پشتوں کو بتلا دینا ہر ایک کو نام بنام مورث اعلیٰ تک گن دینا ایک غیر ممکن امر تھا۔اس لیے ہر شخص اپنے باپ دادا کے نام وھاں تک بیان کرسکتا تھا۔ جہاں تک یاد ہوتے تھے۔پھر بیچ کی پشتوں کو چھوڑکر ان کے نام لے دیتا تھا۔جن کے نام اشعار میں مذکور ہوتے تھے۔پس جس مورخ نے ایسے لوگوں کا پورا سلسلہ وار نسب نامہ بیان کرنا چاہا۔اس کو یہ سب دقتیں پیش آئیں۔اور یہ ایسی مشکلیں تھیں،جن کا حل ہونا کچھ آسان نہ تھا۔

ایک اور مشکل عرب کے نسب ناموں میں یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب

ناموں میں ہوتے تھے۔اوراس لئے مورخ دھوکے میں پڑ جاتے تھے۔اور پچھلے شخص کو وہ شخص سمجھ لیتے تھے۔ جو اگلوں میں اسی نام کا کوئی گزرا ہے۔اور جو پشتیں ان دونوں شخصوں کے درمیان میں فی الحقیقت گزری ہیں۔ان کا نام چھوٹ جاتا تھا۔اور جب کہ ایک شخص کے کئی نام ہوتے تھے۔تو دوسری قسم کا دھوکا پڑتا تھا۔تجنیس خطی کے سبب سے ایک ہی نام کو بعضوں نے کچھ پڑھا اور بعضوں نے کچھ۔شام اورعرب میں یہ بھی دستور تھا کہ بجائے باپ کے نام کے اس شخص کا نام لے دیتے تھے، جو نسب نامے میں مشہور ومعروف ہوتا تھا۔ یا جس سے نسل گنی جاتی تھی۔ چنانچہ سینٹ متی حواری نے اپنی انجیل میں حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ میں لکھا ہے کہ ''کتاب نسب نامہ عیسیٰ مسیح ابن داود ابن ابراہیم'' حالانکہ مسیح سے داود تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں ہیں۔مگر داؤد جو ایک مشہور نام تھا۔ان ہی کا بیٹا داؤد کو کہہ دیا ہے۔جس سے نسل چلی تھی۔اور بیچ کے سب نام چھوڑ دیے۔

عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنے باپ داداؤں کے ناموں کو جہاں تک ان کو یاد ہوتے تھے، بیان کرتے جاتے،اور جب ان کی یاد کے نام ختم ہو جاتے تھے تو اخیر یاد میں رہے ہوئے شخص کو اس کا بیٹا کہہ دیتے تھے۔جس سے وہ نسل چلی ہے۔یا جب وہ ایسے شخص پر پہنچتے تھے۔جس سے وہ نسل چلی ہے تو اس شخص کو اس کا بیٹا کہہ دیتے تھے۔اور اس سبب سے مورخوں کو ایسے لوگوں کا سلسلہ وار نسب نامہ لکھنے میں اور بھی مشکل پڑی ہے۔

آنحضرت کا نسب نامہ اوراس کے متعلق غیرمعتبر روایات

جب کہ ہم اپنے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی یہ سب مشکلات آتی ہیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

نسب نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اوراسی سبب سے کوئی صحیح حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب نامہ کی موجودنہیں ہے۔ یہ بات بے شک انھوں نے فرمائی ہے کہ ''ابرہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں۔'' جیسا کہ ترمذی نے عبداللہ ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے۔مگر کرسی نامہ کے طور پر نہ کبھی اپنا نسب نامہ بیان فرمایا اور نہ اس کے بیان کی ضرورت تھی۔ کیونکہ تمام عرب لے لوگ بلا کسی شک وتردد کے جانتے تھے کہ محمد رسول اللہؐ قبیلہ قریش سے ہیں۔اوراس بات پر بھی سب کو یقین تھا کہ قبیلہ قریش معد ابن عدنان کی اولاد میں سے ہے۔ عدنان اولاد ہے قیدار ابن اسماعیل ابن ابراہیم کی۔اوراتنی ہی بات اس امر کے ثبوت کے لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اولاد اسماعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں۔کافی تھی۔گوکہ ان کے درمیان کتنی ہی پشتیں گزری ہوں،جن کی تعداد میں اختلاف ہو۔

ھاں اس بات میں کچھ شک نہیں۔کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو اس میں اختلاف ہوا۔اسی بنا پر کاتب الواقدی نے ایک قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ۔''کذب النسابون'' یعنی نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔اور مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذھب میں ایک روایت بیان کی ہے۔کہ اسی اختلاف کے سبب جو نسب نامہ میں لوگ کرتے ہیں۔آپ نے فرمایا ہے۔

و لذالک (ای لتنازع الناس فی النسب) نھی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن تجاوزمعد لعلمه من تباعد الانساب و کچرت الا راء فی طول ھذا الا عصا. (مروج الذھب مسعودی)

کہ معد بن عدنان سے آگے مت بڑھو۔کیونکہ آن حضرت نسب نامہ کے بڑے دور

تک ہونے سے اور اس کے زمانہ دراز میں متعدد درائیں ہونے سے بخوبی واقف تھے۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ (انا ابن الذبحین) یعنی میں دو قربانی کیے گئے شخصوں کا بیٹا ہوں۔ اور اس قربانی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان دو شخصوں سے اسماعیل ابن ابراہیم اور عبداللہ اب محمد رسول اللہ مراد ہیں۔

وروی عن ام سملة زوجة النبی صلی الله علیه وسلم انها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عدنان ابن ادو بن زید بن برا بنعراق الثری فقالت ام سلمة زید همیسع وبرا بنت و اسماعیل عراق الثری.

ابو الفدا نے حضرت ام سلمہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عدنان بیٹا ادو کا اور وہ بیٹا زید کا اور وہ بیٹا برا کا اور وہ بیٹا عراق الثریٰ کا ہے۔ اور ام سلمہ نے یہ بھی کہا ہے کہ زید اور ھمیسع ایک ہی شخص کا نام ہے اور برا بنت اور اسماعیل اور عراق الثریٰ ایک ہی ہیں۔

یہ تمام روایتیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں محض غلط اور ذرا بھی اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ آنحضرت کے روبرو کبھی بھی آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت ذکر نہیں ہوا۔ صرف ان کے نسب کا یقین کہ قریش میں تمام عرب کے دلوں پر جما ہوا تھا۔ اور اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب نامہ پر کچھ بحث ہوتی۔ کئی صدی بعد جب کتابوں کی تحریر کا رواج شروع ہوا اور مورخین کو نسب نامہ کی تخلیق میں مجبوری ہوئی تو انھوں نے اپنی کتابوں کو رونق دینے کے لیے جھوٹی روایتیں خود گھڑ لیں یا افواہا سنی سنائی اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر بلاتحقیق مندرج کر دیں۔ انا ابن الذبیحین کی روایت غلط ہے۔ اسماعیل کبھی قربانی نہیں ہوئے۔ جیسا کہ ہم نے اپنے خطبہ میں ثابت کیا ہے جو عرب کے تواریخی جغرافیہ پر لکھا ہے۔ اور عبداللہ کی قربانی کا بیان محض غلط ہے۔ ہاں بلاشبہ ترمذی

نے جوروایت عبداللہ ابن مسعود سے بیان کی ہے۔وہ کسی قدر اعتبار کے لائق ہے۔

عن عبد الله ابن مسعود قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان لكل بنى ولاة من النبين وان وليى ابى و خليل ربى ثم قرا ''ان اولى الناس با براهيم للذين اتبعو و هذا النبى والذين امنو والله ولى المومنين رواة الترمذى.''

عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہرایک نبی کے لیے ایک مربی نبیوں میں سے ہوتا ہے۔اور میرا مربی میرا باپ میرے پروردگار کا دوست (یعنی ابراہیم ہے) پھر قران کی یہ آیت پڑھی کہ سب سے زیادہ دوست ابراہیم کے وہ ہیں۔جنھوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی یعنی محمد رسول اللہ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔اور اللہ سب ایمان والوں کا دوست ہے۔

آنخضرت کا نسب بیان کرنے والے

پانچ شخص ہیں۔جن کے تحقیق کیے ہوئے نسب ناموں میں معدابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔ایک بہیقی اور دوسرے ابن ھشام، تیسرے ابن الاعرابی، چوتھے برخیا، کاتب الوحی ارمیا نبی علیہ السلام، پانچویں الجرا۔

ا۔ بہیقی

ان میں سے پہلے یعنی بہیقی نے عدنان سے ابراہیم تک دس پشتیں اس طرح پر

لکھی ہیں ''عدنان ابن عدد ابن المقوم بن یا حور بن یارح بن یعرب بن یشحب بن ثابت بن اسماعیل بن ابراہیم ۔''

۲۔ ابن ھشام

اور دوسرے شخص ابن ھشام نے اپنی کتاب المغازی و سیر میں نو پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں ''عدنان ابن عدد ابن ناحور ابن اسود ابن یعرب ابن یشحب ابن ثابت ابن اسماعیل ابن ابراہیم ۔'' اور اسی کتاب کے دوسرے نسخہ میں گیارہ پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں ''عدنان ابن ادد ابن سام ابن یشحب ابن یعرب ابن الہمیسع ابن ساتو ابن یامد ابن قیدار ابن اسماعیل ابن ابراہیم ۔''

۳۔ ابن الاعرابی

اور تیسرے شخص یعنی ابن الاعرابی نے اس طرح پر نو پشتیں نسب نامہ میں مندرج کی ہیں ''عدنان ابن ادا بن ادد ابن الہمیسع ابن نابت ابن سلامان ابن قیدار ابن اسماعیل ابن ابراہیم ۔''

اول تو ان نسب ناموں کو اسماعیل تک سمجھنا غلطی ہے ۔ کیوں کہ اس کے لکھنے والوں نے جہاں تک ان کو یاد تھے ۔ وہاں تک لکھ کر اس کے مشہور اشخاص قیدار و اسماعیل کا نام لے دیا ہے ۔ اور بیچ کے نام جو یاد نہ رہے تھے ۔ چھوڑ دیے ہیں ۔ جن لوگوں نے ان کو پورا سمجھا ہے ۔ بڑی غلطی کی ہے ۔ اور خود اس زمانہ سے جو عدنان اور ابراہیم کے درمیان میں گزرا

ہے۔ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔دوسرے یہ کہ نسب نامے خود بھی غلط ہیں۔ابن ھشام کے دونوں نسخے آپس میں مختلف ہیں۔اور ثابت کے ذریعے اسماعیل تک قریش کا نسب نامہ پہنچانا ایک ایسی غلطی ہے جو خود عرب جاہلیت کی روایتوں سے جو تاریخی وقعت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں۔غلط ثابت ہوتی ہیں۔ابن الاعرابی کے نسب نامے کا بھی کچھ ثبوت روایتا یا درایتا نہیں ہے۔

۴۔ برخیا

پس دو نسب نامے باقی رہ گئے ہیں ایک باروخ یا برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا اور دوسرا الجرا کا۔

واما الذی ذکرہ الجرا فی النسابۃ فی شجرۃ النسب ھو المختار (ابو الفدا)

ابو الفدا نے بھی لکھا ہے کہ جو نسب نامہ الجرا نے لکھا ہے۔وھی درست ہے اور وہی اختیار کرنے کے لائق ہے۔کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جو سلسلہ برخیا کاتب الوحی حضرت برمیا نبی نے اپنے زمانہ تک کا لکھا ہے۔اس پر ہم اعتبار نہ کریں۔خصوصا اس وجہ سے کہ معد ابن عدنان حضرت برمیا نبی کے وقت میں تھے۔اور بخت نصر کے ھنگامہ میں حضرت برمیا نبی نے ان کو بچایا تھا۔اور ساتھ لے گئے تھے۔اور یہ ایک قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ برخیا کاتب الوحی برمیا نبی کو معد کا نسب نامہ لکھنے کی اسماعیل ابن ابراہیم تک ضرورت پڑی ہوگی۔یہ شجرہ حضرت اسماعیل کی اولاد کا یا یوں کہو کہ معد ابن عدنان کا ابراہیم تک نسب نامہ جو برخیا کاتب الوحی نے لکھا ہے۔ہمارے

ہاں کی کتابوں میں بھی مندرج ہے۔ چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذھب میں اس کو بعینہ نقل کیا ہے۔ ھشام کلبی کی روایت جو واقدی میں ہے۔ اس میں اسی شجرہ کو بیان کیا ہے۔ مگر ناموں کے تلفظ میں بہ سبب مجانست الفاظ کے اور نقل کے فرق ہو گیا ہے۔ مثلا ایک نے ایک نام لکھا ہے۔ اقناد کاف اور نون سے دوسرے نے لکھا ہے افتاد فے اور تے سے یا مثلا ایک نے لکھا ہے عیسیٰ بالیا اور دوسرے نے لکھا عیسر بالراء اور گالبا کاتب نے کشش دار حرف یا کو حرف الرا سمجھ لیا ہے۔ اس طرح ناموں کے تلفظ اور نقل میں اختلاف ہے۔ ورنہ وہ دونوں واحد ہیں۔ اور وھی شجرے ھیں ھو برخیا کاتب الوحی نے اپنے زمانہ میں لکھے ہیں۔

۵۔ الجرا

الجرا کا نسب نامہ درحقیقت اسماعیل ابن ابراہیم تک نہیں ہے۔ بلکہ حمل ابن معد ابن عدنان اول تک ہے۔ یعنی وھاں تک کہ برخیا کاتب الوحی نے شجرہ لکھا تھا۔ مگر جو کہ الجرا نے بھی ان ناموں کو جو برخیا کاتب الوحی نے لکھے تھے۔ چھوڑ کر حسب دستور عرب وشام اس کے اخیر میں قیدار ابن اسماعیل اور ابراہیم کا نام لکھ دیا تھا۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ یہ مستقل جداگانہ نسب نامہ ہے۔ حالانکہ درحقیقت وہ برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ ہے۔ ایک اور وجہ غلطی میں پڑنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ برخیا کاتب الوحی نے شجرہ لکھا تھا۔ مگر جو کہ الجرا نے بھی ان ناموں کو جو برخیا کاتب الوحی نے لکھے تھے۔ ان کے لکھے گئے نسب ناموں میں مکرر نام آتے ہیں۔ خصوصا معد اور عدنان کے۔ اور اس سبب سے لوگوں نے اس کو جداگانہ نسب نامہ خیال کیا ہے۔ حالاں کہ مکرر ناموں کا آنا کوئی امر قابل اشتباہ کے نہیں ہے۔ پس اب ہم برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کے نیچے الجرا کا نسب نامہ جو اس کا تتمہ

ہے۔لگا دیتے ہیں۔جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ اسماعیل ابن ابراہیم تک پورا ہو جاتا ہے۔جن وجوہات سے کہ ہم نے الجرا کے نسب نامہ کو برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ بیان کیا اور دونوں کی صحت کو تسلیم کیا، اس کی وجوہات یہ ہیں۔

اول یہ کہ اسماعیل ۲۰۹۴ دنیاوی مطابق ۱۹۱۰ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے۔اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۴۵۷۰ دنیاوی مطابق ۵۷۰ بعد مسیح کے پیدا ہوئے تھے۔پس دونوں ولادتوں میں چوبیس سو چھہتر برس کا فاصلہ ہے اور اسماعیل سے آن حضرت تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گزرتی ہیں، جو از روئے حساب اس سلسلہ نسب کے جو علی العموم علوم طبعی کی تحقیقات سے اختیار کیا جاتا ہے۔ بالکل صحیح ہے۔یعنی قریب تین پشت کے ایک صدی میں۔

دوسرے یہ کہ معد وارمیا نبی دونوں ایک وقت میں تھے۔چنانچہ مروج الذہب مسعودی جلد چار صفحہ ۱۹۹ میں لکھا ہے۔

وقد کان لا رمیا معہ معد ابن عدنان اخبار یطول ذکر ھا.(مسعودی)

کہ معد ابن عدنان کے ارمیا نبی کے ساتھ جو حالات گزرے ہیں۔وہ بہت طولانی ہیں۔وہ حالات یہ ہیں کہ جب بخت نصر نے عرب پر حملہ کیا اور عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور مکہ کو لوٹ لیا۔اور صدہا آدمیوں کو پکڑ کر بابل لے گیا۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے معد ابن عدنان کو اس سے بچایا اور ارمیا نبی اور برخیا خدا کے حکم سے معد کو اپنے ساتھ لے گئے۔اور حیران میں ان کو بحفاظت رکھا۔ارمیا نبی کا زمانہ سال دینوی کے حساب سے پینتالیسویں صدی میں یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں تھا۔اور جو نسب نامہ ہم نے صحیح قائم کیا ہے۔اس میں بھی نسلوں کا عام سلسلہ بموجب معد بھی اسی زمانہ میں ہوتا ہے۔جو ایک نہایت قوی دلیل اس سلسلہ کی صحت کی ہے۔اور برخیا کاتب الوحی کی تاریخانہ تحریر اور عام عرب کی

مشہور روایت سے عجب طرح پر مطابقت پائی جاتی ہے۔

نسب نبوی پر یورپین اعتراضات اور ان کے جوابات

سر ولیم مور نے اپنی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلد ا صفحہ ۱۹۴ میں لکھا ہے کہ یہ روایت معد اور ارمیا نبی کی صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عدنان میں آٹھارہ پشتیں ہیں۔اور نسلوں کے صحیح حساب سے عدنان کی پیدائش ۱۳۰ قبل مسیح سے پہلے کی نہیں ہو سکتی۔حالانکہ بخت نصر کے حملوں کا زمانہ ۵۷۷ قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔

مگر سر ولیم مور کو ناموں کے متحد ہونے سے یہ شبہ پڑا ہے کہ معد بھی دو ہیں۔اور عدنان بھی دو ہیں۔ایک وہ ہیں جو برخیا نبی کاتب وحی کے شجرہ میں ہیں۔اور دوسرے وہ ہیں، جو الجراوالے نسب نامہ میں ہیں۔پس وہ روایت نسبت پہلے معد ابن عدنان کے ہے۔ سر ولیم مور نے دوسرے معد ابن عدنان کی نسبت وہ روایت تصور کی ہے۔عک بلا شبہ معد کا بھائی تھا۔مگر اس سے پہلے معد کا نہ کہ دوسرے معد کا۔جیسا کہ سر ولیم مور نے تصور کیا ہے۔ عرب نے قلعہ حضرت موت میں جو قلعہ قوم عاد کا از نام حض الغراب تھا۔اور جس میں سے ایک کتبہ نکلا۔جس میں ھود پیغمبر کا ذکر ہے۔اور اس میں عک کا بھی نام ہے۔یہ عک اسی پہلے معد کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے اس مضمون کے پڑھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک جو ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہیں۔پشتوں کا سلسلہ عموماً تسلیم کیا گیا ہے۔اور کسی مورخ کو اس میں اختلاف نہیں ہے۔مگر عدنان سے آگے بلحاظ ان

وجوھات کے جواوپر مذکور ہوئی ہیں۔مورخوں میں اختلاف ہے۔

قال البیھقی المذکور و کان شیخنا ابو عبد اللہ الحافظ بقول نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیحۃ الی عدنان و ماورا ء عدنان فلیس فیہ شی نعتمد علیہ (ابو الفدا).

بیہقی کا قول ہے کہ ’’اس کے استاد حافظ ابوعبداللہ‘‘ کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب عدنان تک صحیح ہے۔اوراس سے اوپر کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔جس پر بھروسہ کیا جائے۔مگر یادرکھنا چاہیئے کہ اگر یہ قول بیہقی کا صحیح ہو۔تواس کے استاد کی ایک رائے وسمجھ ہے۔کوئی مذہبی حدیث نہیں ہے۔جس پر یہ استدلال ہوسکے۔کہ مذہبی روایت کے موجب اس کی صحت نہیں ہے۔

بلا شبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبیہ رکھتے تھے۔وہ اسماعیل کی اولاد تھے۔اور اس کے بھائی اسحاق کی۔وہ ان پڑھ جاہل تھے۔اور یہ پڑھے لکھے قابل۔پس یہ ایک قدرتی وطبعی بات تھی کہ جس بات سے ناواقف ہوں۔اپنے اسرائیلی بھائیوں سے وہ دریافت کریں۔یا جس بات کی تفصیل محمد رسول اللہ نے نہیں فرمائی۔اس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں۔خصوصا اس وجہ سے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ حالات وتاریخی واقعات کی نسبت بنی اسرائیل سے روایت کرنے کو منع نہیں فرمایا۔ بلکہ اجازت دی تھی۔اور جو کسی بات میں کوئی خاص حکم نہ تھا تو یہود کے تتبع کو جو اہل کتاب تھے۔مناسب سمجھا تھا۔پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کا نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا۔جس کا کبھی مذکور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نہ ہوا تھا۔تو بلاشبہ انھوں نے یہودیوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے۔اور جن کے ھاں تاریخ نویسی اورنسب ناموں کی تحریر کا بھی سلسلہ جاری تھا۔مدد لی۔اوران کی کتابوں کی بھی تحقیق کی۔اور

نسب نامہ مرتب کیا۔اور یہی وجہ ہوئی کہ بہ سبب مشابہ ہونے حروف تہجی عبری کے پھراوراس کے دوسرے خط کوفی میں نقل ہونے پھر خط ثلث میں نقل ہونے اور پھر موجودہ خط عربی میں نقل ہونے سے الفاظ کا الٹ پھیر اور تلفظ کا ادل بدل ہوا۔اور کاتبین کی غلطی سے کوئی نام رہ گیا۔کوئی بڑھ گیا جو منشاء اختلاف ہے۔مگر جب کمال غور وفکر سے اس پر لحاظ کیا جاوئے تو اس کی صحت بخوبی ہوسکتی ہے۔جیسے کہ بقدر اپنے فہم کے ہم نے کی ہے۔چنانچہ انھیں واقعات کا ذکر واقعدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔کہ میں نے اس بات میں کہ معد اولاد قیدار بن اسماعیل میں ہے۔کسی کا اختلاف نہیں دیکھا۔جو آپ کے نسب میں ہے۔

ولم اربینھم اختلافا ان معد من اولاد قیدار بن اسماعیل وھذا الاختلاف فی نسبہ انہ لم یحفظ و انما اخذ ذلک من اھل الکتاب وترجموہ لھم فاختلفو فیہ و لو صع ذلک کان رسول اللہ اعلم الناس بہ فالامر عندنا علی الانتھا ء الی معد ابن عدنان ثم الاساک عما ورا ء ذلک الی اسماعیل بن ابراھیم . (کاتب لواقدی)

اس بات کی دلیل ہے کہ اہل عرب کو یا مسلمانوں کا نسب نامہ یاد نہیں تھا۔انھوں نے یہ نسب نامہ اھل کتاب سے لیا ہے۔انھوں نے اس کو ترجمہ کر دیا۔اور پھر ان کو اس میں اختلاف ہو گیا۔اور اگر یہ نسب نامہ صحیح ہوتا تو رسول خدا صلہ اللہ علیہ وسلم لوگوں سے زیادہ جاننے والے تھے۔پس ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ معد ابن عدنان تک ٹھہر جانا چاہیئے۔اوراس سے آگے اسماعیل تک کچھ نہ کہنا چاہیئے۔

واقدی کے اس واقعہ کو سر ولیم مور نے بھی اپنی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نقل کیا ہے۔مگر اس میں کوئی ایسی بات جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولاد اسماعیل ہونے میں شبہ پڑے۔نہیں ہے۔یہ بات سچ ہے کہ ہم نے یہودیوں سے جو

ہمارے اسرائیلی بھائی ہیں۔ یا ان کی کتابوں سے اس کی تحقیق کرنے پر مدد لی ہے۔ جو وجہ اختلاف ہم نے بیان کی ہے۔ اس کی طرف واقدی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعلم الناس تھے۔ اگر ان کے سامنے اس کا تذکرہ ہوتا یا اس کے بیان کی ضرورت ہوتی یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا جاتا تو خدا کی ہدایت سے بالکل صحیح ودرست بتلا دیتے۔ مگر نہ اس کی ضرورت ہوئی نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ اوراسی وجہ سے ہم کو اور ذریعوں سے بھی تحقیق کرنے کی ضرورت پڑی۔ باقی جو کچھ واقدی نے کہا ہے۔ وہ خاص واقدی کی رائے ہے۔ اس کے نزدیک معد بن عدنان تک نسب نامہ کی تحقیقات میں کچھ شبہ نہیں رہا۔ اس سے زیادہ اس کو تحقیق نہیں ہوا۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ معد بن عدنان سے زیادہ بیان کرنا کچھ ضرور نہیں۔ مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا لکھا ہوا شجرہ صحیح ہے۔ اور وہ اسماعیل ابن ابراہیم تک پہنچا ہوا ہے۔

سر ولیم مور کا یہ کہنا ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ یہ بات صاف صاف تسلیم کی جاتی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم" کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے۔ اور عدنان سے آگے یہودیوں سے۔ مگر ہماری تحقیق اور سر ولیم مور کی تحریر میں اتنا فرق ہے کہ وہ اس عدنان تک عرب کی ملکی روایتوں کا نسب نامہ بتلاتے ہیں۔ جو ہمارے مرتبہ کرسی نامہ پر پچاس نمبر پر ہے۔ اور ہم اس عدنان تک ملکی روایتوں کا نسب نامہ قبول کرتے ہیں جو اکتالیس نمبر پر ہے۔ اور باقی کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کی تاریخ سے لیا ہوا ہے۔

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے بہت تعجب ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتاب اور تحریر میں کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے۔ اور اپنا وقت ضائع کیا

ہے۔اور قوئے عقلیہ ودماغیہ کو صرف کیا ہے۔جس سے ہم مسلمان کبھی منکر نہیں ہوئے۔یعنی یہ امر کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے۔اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے۔اور جب وہ اس امر کو نہایت سعی بے حاصل سے ثابت کر چکتے ہیں۔تو از راہ طعن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں بات یہودیوں کے مذہب سے لی ہے۔گویا مذہب اسلام میں ایسی بات نہیں ہے۔جو خود وہ اپنے اصول پر قائم ہو۔بلکہ یہودیوں کے ھاں سے چرایا ہوا ہے۔اور جیسے کہ مذہب عیسائی بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے۔ویسا ہی مذہب اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے۔اگر چہ یہ امر کہ کون سا مذہب مسلمانی یا عیسائی زیادہ تر مذہب یہود کا محتاج ہے۔ہر ایک پر روشن ہے۔مگر ہم خوشی سے اس امر مذکور کو تسلیم کریں گے۔کیونکہ جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذھبوں میں پائی جاتی ہے۔اس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو اپنا بہت بڑا فخر سمجھیں گے۔کہ ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم ونوح ،اور ابراہیم ویعقوب اور اسحاق واسماعیل وموسیٰ وعیسیٰ اور محمد صلواۃ اللہ علیھم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا۔ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سوا ء بیننا وبینکم ان لا تعبد الا اللہ. قرآن

کہہ دے کہ ایک بات کو مان لو۔جو تمھارے ہاں بھی وہی ہے۔اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو مت پوجو"۔ہم مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسی کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں۔جنھوں نے عیسیٰ وموسیٰ اور محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی۔اور ان کی پیروی کی ہدایت کی تھی۔مگر یہودیوں نے ان تینوں کو۔اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ ہوا تھا۔نہ مانا۔مگر سچے

پیروی موسیٰ وعیسیٰ کی ہم مسلمانوں نے ہی کی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب نامہ کی نسبت کیا بےھودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے۔ خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا تھا۔ ''کہ میں تمھارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا''۔ کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا۔ کہ بنی اسماعیل کی نسلیں محمد سے لے کر اسماعیل تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں۔ اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کی تحریروں سے وہ تو اسماعیل کی اولاد میں سے ایک کے لیے ہونا تھا۔ سو محمد رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مورخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے۔ بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ بنی ھاشم قریش اسماعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں۔ محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ''ابیکم ابراہیم'' جس کو سب نے تسلیم کیا۔ اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرات ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ ہم اس موقع پر چند رائیں عالم مورخوں کی نقل کرتے ہیں۔ ابو الفداء لکھتا ہے۔

ونسبه صعلم الی عدنان متفق علیه من غیر خلاف و عدنان من اسماعیل بن ابراهیم الخلیل علیه السلام من غیر خلاف لکن الخلاف فی هذا الا با ء الذین بین عدنان و اسماعیل فعد بعضهم رجلا وعد نحو اربعین رجلا وعد بعضهم سبعة. (ابو الفداء)

کہ نسب نامہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عدنان تک متفق علیہ ہے۔ بغیر اختلاف

ہے۔ کچھ اختلاف نہیں کہ عدنان اولاد اسماعیل ابن ابراہیم میں ہے اور اس میں بھی کہ کے درمیان میں ہے۔ لیکن ان پشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ جو عدنان اور اسماعیل کے درمیان میں ہے۔ بعضوں نے تو چالیس پشتوں کے قریب گنی ہیں۔ اور بعضوں نے سات۔ جن لوگوں نے جس شبہ سے سات گنی تھیں۔ اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ پس اصل میں وہ بھی کچھ اختلاف نہ تھا۔ بلکہ صرف سمجھ کی غلطی تھی۔

مشہور مورخ مسٹر گبن جو تمام عالم میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقیر اور متبذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک گھناونا اور احمقانہ افترا ہے۔ (ایسا افترا کہ جس سے کفر لازم آتا ہے۔ کیونکہ تمام دین محمدی کی بنیاد زبان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے۔) ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے وہ اپنے مخالف کی خوبیوں کو گھٹاویں۔ اس کی خوبیوں کو اور زیادہ کرتے ہیں۔ اسماعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک تسلیم کی ہوئی بات ہے۔ اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں۔ اور ابہام میں ہوں تو اور بہت سی پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں وہ قریش اور بنی ھاشم ہیں۔ جو اھل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثہ محافظ تھے۔

رونڈ مسٹر فارسٹر صاحب بھی یہی گواہی دیتے ہیں۔ اور ان کی گواہی ایسی ہے۔ جو غالباً انھوں نے خوشی سے نہ دی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیمی جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عرب کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو۔ گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہوں۔ مگر روایت کی جانچ اور پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں۔ ان کے مطابق ان

پر غور کرنے اس بات کا انکار کرنا ناممکن ہے۔ کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح پر تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ خاص قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اس کیا ولاد ابتدا میں حجاز میں آباد ہوئی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصا مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اور خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی بنیاد پر کہ اسماعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں، اپنی قوم کی دینی اور دینوی عظمتوں کے استحقاق پر تائید کی ہے''۔

صرف سر ولیم مور نے اپنی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں علما کی متفق رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ہم اس اختلاف کے جانچنے پر مستعد اور آمادہ ہیں۔ انھوں نے صرف اپنی قیاسی باتوں سے ان حقیقتوں پر اعتراض کیا ہے۔ جو آفتاب کی طرح روشن ہیں اور مذہبی اور دینوی دونوں طرح سے بلا کسی شبہ کے ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ سر ولیم مور کہتے ہیں کہ ''جو کوششیں'' ہمیشہ مذہب اسلام کی روایتوں اور عرب کے قصوں کو توریت اور یہودیوں کی روایتوں سے مطابق کرنے کے واسطے لی گئی ہیں۔ اس کو بھی ہم اسی سبب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کلیہ کو خاص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات سے بہت کم تعلق ہے۔ لیکن وہ ان کے بزرگوں اور عرب کی قدیمی رویتوں سے ایک وسیع اور موثر تعلق رکھتا ہے۔ یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسماعیل کی اولاد سے خیال کیا جاوئے۔ اور غالبا یہ کوشش کہ وہ اسماعیل کی اولاد میں سے ثابت کیے جایں۔ ان کی حین حیات میں پیدا ہوئی تھی۔ اور اس طرح پر محمد کے ابراہیم ی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے۔ اور اسماعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے''۔

مگر سر ولیم مور کی اس خیال کی غلطی کیسی علانیہ ظاہر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی زندگی میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہ ہوا کہ کوئی نسب نامہ ابراہیم تک درست کیا جاوئے۔ اور نہ کبھی اس بات کا دھیان ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اولاد ابراہیم ثابت کرنے میں کوشش ہو۔ یہ ایک ایسی بات ثابت شدہ و محقق تھی کہ جس میں کسی کو کسی جدید ثبوت تلاش کرنے کی حاجت نہ تھی۔ کیا آفتاب نصف النہار کے اثبات کا دن دھاڑے کسی کو خیال آسکتا ہے۔ تمام قرآب مجید میں کہیں اس بات پر زور نہیں ڈالا گیا۔ تمام معتبر کتابیں حدیثوں کی اس مباحثہ سے خالی ہیں۔ چند نا معتبر روایتیں جو کئی صدی بعد وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہوئیں۔ اور اس وقت پیدا ہوئیں جب کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور مصنفوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاھا۔ ان کا بھی سلسلہ سند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچایا گیا۔ پس یہ قیاس کرنا کیسا غلط قیاس ہے کہ یہ خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے علماء نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اس کی تحقیقات کی اور اس کی نسبت جو ان کی رائے اور تحقیقات ہوئی بلا کسی تامل کے، بلا کسی خیال کے، بلا کسی تر دد کے، بلا کسی پکڑ دھکڑ کے نہایت بے پروائی اور سادگی اور صفائی سے لکھ دی۔ جس سے خود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں نہ کبھی اس امر میں شبہ تھا، نہ ان کو تر دد تھا۔ نہ کبھی ان کو اس بات کے ثابت کرنے کی فکر تھی اور نہ کبھی وہ چوری و فریب ان کے دل میں تھا۔ اور نہ کبھی اس کے ثبوت کے درپے تھے۔ جس کا قیاس سر ولیم مور نے اپنی رائے میں کیا ہے۔ پس ان کا وہ قیاس محض غلط ہے۔ اور مطلق اعتبار کے لائق نہیں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ

اب ہم اس مضمون کے خاتمے میں اپنے پیغمبرؐ کا نسب نامہ جس طرح پر کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں۔اور جو کہ مجھ کو بھی اس بات پر فخر ہے کہ میں بھی اس آفتاب عالم تاب کے ذروں میں سے ہوں۔اس لیے اپنے نسب نامہ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں۔تا کہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور دو جہان سے ہے اور جس کے سبب ''لحمک لحمی ، دمک دمی'' کا ہمارا موروثی خطاب ہے۔ اس ظاہری ارتباط سے اور بھی معزز ہو جاوئے۔

گر	چہ	خوردیم	نسبتے بزرگ
ذرہ	آفتاب	تا	با نیم

نسب نامہ محمد رسول اللہ تا حضرت ابراہیمؑ مع
نسب نامہء سرسید نا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ابینا ابراہیم ۱۹۶۶قبل مسیح

۲۔اسماعیل۱۹۱۰قبل مسیح

۳۔قیدار

۴۔ عوام

۵۔ عوض اول

۶۔ مر

۷۔ سمائے

۸۔ رزاخ

۹۔ ناجب

۱۰۔ معصر

۱۱۔ ابہام

۱۲۔ افتاد

۱۳۔ عیسیٰ

۱۴۔ حسان

۱۵۔ عنقا

۱۶۔ ارعوا

۱۷۔ بلخی

۱۸۔ بحرے

۱۹۔ ھری

۲۰۔ پسن

۲۱۔ حمران

۲۲۔ الرعا

۲۳۔ عبید

۲۴۔ عنف

۲۵۔ عسقی

۲۶۔ ماحی

۲۷۔ ناحور

۲۸۔ فاجم

۲۹۔ کالح

۳۰۔ بدلان

۳۱۔ بلدارم

۳۲۔ حرا

۳۳۔ ناسل

۳۴۔ ابی العوام

۳۵۔ متساویل

۳۶۔ برو

۳۷۔ عوص دوم

۳۸۔ سلامان اول

۳۹۔ الہمیسع اول

۴۰۔ ادواول

۴۱۔عدنان اول ۶۰۰ قبل مسیح

۴۲۔معداول ۵۸۸ قبل مسیح ہم عصر ارمیا نبی

۴۳۔ حمل

۴۴۔ ثابت

۴۵۔ سلامان دوم

۴۶۔ الہمیسع دوم

۴۷۔ الیمسع

۴۸۔ اددووم

۴۹۔ اد

۵۰۔ عدنان دوم

۵۱۔ معد ثانی

۵۲۔ نزار

۵۳۔ مضر

۵۴۔ الیاس

۵۵۔ مدرکہ

۵۶۔ خزیمہ

۵۷۔ کنانہ

۵۸۔ النضر

۵۹۔ مالک

۶۰۔ فہر

۶۱۔ غالب

۶۲۔ لوے

۶۳۔ کعب

۶۴۔ مرہ

۶۵۔ کلاب

۶۶۔ قصی عبد مناف

۶۷۔ ھاشم

۶۸۔ عبدالمطلب

۶۹۔ عبداللہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ فاطمہ زھرؑا

امیر المومنین علی ابن ابی طالب ابن عبدالمطلب

۳۔ امام حسین

۴۔ امام زین العابدین

۵۔ امام محمد باقر

۶۔ امام جعفر صادق

۷۔ امام موسیٰ کاظم

۸۔ امام علی رضا

۹۔ امام محمد تقی

۱۰۔ سید موسیٰ مرفع

۱۱۔ سید ابی عبداللہ احمد

۱۲۔ سید محمد اعرج

۱۳۔ سید محمد احمد

۱۴۔ سید احمد

۱۵۔ سید موسیٰ

۱۶۔ سید احمد

۱۷۔ سید محمد

۱۸۔ سید علی

۱۹۔ سید جعفر

۲۰۔ سید محمد

۲۱۔ سید عیسیٰ

۲۲۔ سید ابوالفتح

۲۳۔ سید علی

۲۴۔ سید یار حسین

۲۵۔ سید کاظم الدین حسین

۲۶۔ سید جعفر

۲۷۔ سید باقر

۲۸۔ سید موسیٰ

۲۹۔ سید شرف الدین حسین

۳۰۔ سید ابراہیم

۳۱۔ سید حافظ احمد

۳۲۔ سید عزیز

۳۳۔ سید محمد دوست

۳۴۔ سید برھان

۳۵۔ سید محمد عماد

۳۶۔ سید محمد ھادی (تقی)

۳۷۔ سید محمد مہدی

۳۸۔ سید محمد متقی

۳۹۔ سید محمد سید احمد

سید محمد احمد سر سید ولادت

ولادت ۸ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ مطابق ۹ مئی ۱۸۴۳ء (۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷، اکتوبر ۱۸۱۷ء

۴۰۔ سید حامد

ولادت ۲۴ صفر ۱۲۶۵ ہجری مطابق ۲۰ جنوری ۱۸۴۹ء

سید محمود۔

ولادت ۱۱ رجب ۱۲۶۶ ھجری مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۰ء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات توریت و انجیل میں

یجدونہ مکتوبا عند ھم فی التوراۃ والا نجیل

توریت	ز	وصف	تست	معمور
انجیل	زنام		تست	مشہور

قرآن مجید کے موجب ہم مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ توریت اورانجیل دونوں میں محمد رسول اللہ صلہ اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کی ایسی صاف صاف بشارتیں مذکور ہیں۔جن میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا۔

خداتعالیٰ سورہ اعراف میں فرماتا ہے کہ

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عند ھم فی التوراۃ والا نجیل یا مرھم بالمعروف وینھا ھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الحبائث. ویضع عنھم اصرھم والا غلال التی کانت علیھم فالذین امثوبۃ وعزروہ ونصروہ واتبعو معہ اولئک ھم المفلحون.(سورہ اعراف ایت ۱۵۶)

کہ ’’جولوگ کہنا مانتے ہیں رسول بن پڑھے نبی کا جس کا ذکر اپنے پاس لکھا پاتے ہیں توریت اورانجیل میں۔وہ ان کو اچھی باتوں کے کرنے کو کہتا ہے۔اور بری باتوں کے

کرنے سے منع کرتا ہے۔اور ستھری چیزوں کوان کے لیے حلال کرتا ہے۔اور ناپاک چیزوں کوان کے لیے حرام کرتا ہے۔اوران کا بوجھ ان پر سے اتارتا ہے۔اور جو مشقتیں ان کے گلے کا طوق ہورہی تھیں۔ان کو دور کرتا ہے۔پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے اوران کا ادب کیا۔اوراس کی مدد کی۔اوراس نور کی تابع داری کی جواس کے ساتھ اترا۔وہی لوگ ہیں نجات پانے والے۔

پھر دوسری جگہ خدا نے سورہ صف میں فرمایا ہے۔

واذ قال عیسیٰ ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول الله الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراة ومبشرا برسول یاتی من بعدے اسمه احمد فلما جا ء هم با لبینات قالوا هذا سحر مبین.(سوره صف آیت ٦)

کہ جب کہا عیسی مریم کے بیٹے نے کہ اے بنی اسرائیل بے شک مجھ کو خدا نے رسول کر کے تمھارے پاس بھیجا ہے۔تصدیق کرتا ہوا توریت کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوا ایک پیغمبر کی جو میرے بعد ہوگا۔اوراس کا نام احمد ہے۔پھر جب وہ پیغمبر (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس آیا۔کھلی ہوئی دلیلیں لے کر تو انھوں نے کہا یہ تو علانیہ جادو ہے۔

مسلمان کل عہد عتیق کو جس میں حضرت موسیٰ کی پانچوں کتابیں اور زبور وصحف انبیا داخل ہیں۔توریت کہتے ہیں۔

کیونکہ ان سب کے سرے پر جو کتاب تھی۔اس کا نام توریت تھا۔اور عہد جدید کی کتابوں کو سوائے عمال وحواریوں کے ناموں کے انجیل کہتے ہیں۔کیونکہ وہ سب کتابیں انجیل کے نام سے موسوم ہیں۔قرآن وحدیث میں بھی انھی معنوں میں لفظ توریت وانجیل کا وارد ہوا ہے۔پس قرآن مجید میں یہ تو پایا گیا ہے کہ توریت وانجیل میں ہمارے پیغمبر صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے اور لقب بھی مذکور ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ کس جگہ توریت وانجیل میں یہ ذکر مذکور ہے۔ اس سبب سے مسلمان عالموں نے توریت وانجیل میں اس کی تلاش شروع کی۔ مگر انھوں نے عہد جدید وعہد عتیق کی کتابوں کو نہایت ابتر و پریشان حالت میں پایا۔ کیونکہ کوئی اصلی قلمی نسخہ توریت وانجیل کا دنیا میں موجود نہ تھا۔ اور جس قدر نقلیں موجود تھیں۔ وہ آپس میں نہایت مختلف تھیں۔ یہودیوں کے جو دو بڑے نامی مدرسے تھے۔ تو جو کتابیں مشرقی مدرسہ میں مروج تھیں۔ ان میں اور مغربی مدرسہ کی کتابوں میں نہایت اختلاف تھا۔ اور سامری یونانی زبان میں توریت کے جو ترجمے تھے۔ وہ بھی آپس میں مختلف تھے۔ اور جو ترجمے مشرقی زبانوں میں ہوئے تھے۔ وہ بھی آپس میں مختلف تھے۔ اور ہرگز یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ سب ایک ہی اصلی کتاب کے ترجمے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمان عالم مذہبی روایتوں اور کلام الہیٰ کی تصدیق کے لیے سند مسلسل کے عادی تھے۔ اور ھر مسلمان اپنی مذہبی کتاب اور مذہبی روایت کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد (اور علی ھذا القیاس) کی زبانی گواہی یا سند سے اصل تک اس کا ثبوت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قرآن مجید کے بھی مکتوبی نسخوں کے بھروسے پر نہ تھے۔ بلکہ اس کے ہر ہر لفظ کی اور زیر وزبر تک مسلسل سند بھی کوئی موجود نہ تھی۔ بلکہ ان موجودہ نقلوں کی صداقت کے لیے بھی کوئی ایسا سلسلہ ثبوت کا جس سے کوئی شبہ نہ رہے۔ موجود نہ تھا۔ علاوہ اس کے جب مسلمان عالموں نے توریت میں بعض مقام پر ایسی باتیں لکھی ہوئی پائیں، جو نہایت اخلاق کے برخلاف تھیں۔ اور بعض ناپاک افعال اور مقدس بزرگوں اور نبیوں کی طرف منسوب تھے۔ جن کا واقع ہونا ان بزرگوں سے مسلمان کسی طرح یقین نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ خود مذہب اسلام نے ان کو تعلیم کی تھی کہ تمام انبیاء معصوم تھے۔ اور افعال قبیحہ ایسے معصوم بزرگوں سے سرزد ہونے غیر ممکن ہے۔ تو وہ ان مقاموں کو دیکھ کر نہایت حیران اور متعجب ہو گئے۔ اور ان

کے دل میں اس بات کا شبہ پیدا ہوا کہ توریت اور انجیل میں تحریف ہوئی ہے۔

اور جب ان کو قرآن مجید کی یہ آیت یاد آئی کہ۔

یحرفون الکلم عن مواضعہ (سورہ نساء آیت ۴۸ وسورہ مائدہ آیت ۱۶)

''یہودی بدل ڈالتے ہیں لفظوں کو ان کی جگہ سے'' تو ان کا وہ شبہ درجہ یقین کو پہنچ گیا۔ اور انھوں نے توریت وانجیل میں زیادہ تفتیش کرنے کی ہمت نہ کی۔ اور یہ خیال کر کے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت وانجیل میں تحریف کر دی ہے۔ اور خصوصا وہ مقامات جہاں جہاں ہمارے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارتیں تھیں بدل دی ہیں۔ تلاش کرنی چھوڑ دی اور اپنی کم محنتی اور کاہلی اور ہمت چھوڑ دینے کے الزام سے بچنے کے لیے تحریف کے الزام کو بطور سپر کے بنا لیا۔

مگر یہ خیال انہی لوگوں کو تھا جو علم اور تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچے تھے۔ اور استقلال کے ساتھ تحقیقات بھی نہیں کی تھی۔ بلکہ اوپری اوپری باتوں میں پھنس رہے تھے۔

برخلاف اس کے بڑے بڑے عالم اور فاضل اور دین دار لوگ جن کا نام دنیا میں بھی مشہور تھا۔ اور آخرت میں بھی مشہور ہوگا۔ نہایت استقلال اور تحمل سے اس کی تحقیقات میں مصروف ہو گئے۔ اور اس کی جڑ تک پہنچ گئے، ان کا یہ قول تھا کہ قرآن مجید میں جو تحریف کا الزام یہودیوں اور عیسائیوں پر خدا نے لگایا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے جان بوجھ کر قصدا توریت وانجیل کے لفظوں کو بدل دیا۔ بلکہ یہ مطلب تھا کہ لفظوں کے معنی پھیر دیے ہیں۔ چنانچہ یہ بات امام محمد اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''یحرفون الکلم عن مواضعہ'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''ای یاولونہ علی غیر تاویلہ'' پس وہ لوگ تحریف لفظی کے قائل نہ تھے البتہ یہ بات تسلیم کے قابل تھی کہ قلمی نسخوں میں کاتبوں کی سہو اور غلطی سے بہت

سی غلطیاں پڑ گئی تھیں۔اس لیے ان بزرگوں نے پہلی قسم کے عالموں کی مانند ہمت نہ ہاری اور تلاش وتفتیش سے باز نہ رہے۔اور خدا تعالیٰ نے ان کی سعی کو مشکور کیا۔اور نہایت کامیابی سے انھوں نے توریت اور انجیل میں اور یہودیوں کی روایتوں میں وہ مقام ڈھونڈ نکالے۔جہاں پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔چنانچہ وہ سب روایتیں ہم مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اور قرآن مجید کی تفسیر میں اور کتب سیر وتواریخ میں مندرج ہوتی چلی آتی ہیں۔

اگر چہ میں ان بزرگ عالموں کی کوشش اور محنت کی نہایت قدر کرتا ہوں اور ان بزرگوں کا مسلمانوں پر نہایت احسان مانتا ہوں۔اور ان کو ہر طرح قابل ادب سمجھتا ہوں۔مگر میں اپنے خطبے میں ان سب کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔کیونکہ جو کچھ ان عالموں نے اپنی ان تھک محنت سے نکالا ہے۔گو وہ کیسا ہی مفید ہو۔الا نقص سے خالی نہیں۔

اول۔تو یہ نقص ہے کہ وہ بزرگ ایک عام طور پر لکھ دیتے ہیں۔کہ یہ بشارت توریت میں ہے۔اور وہ بشارت انجیل میں ہے۔اور اس خاص مقام کا جہاں سے وہ مطلب اخذ کیا ہے۔کچھ پتا ونشان نہیں بتلاتے۔

دوم:

ان بشارات کے بیان کرنے میں اس خاص کتاب کا بھی نام نہیں بیان کرتے۔ جہاں سے وہ بشارت نکالی ہے۔یعنی یہ نہیں بتلاتے کہ وہ بشارت حضرت موسیٰ کی کتابوں میں ہے۔یا زبور میں یا صحف انبیاء میں اور جو پرانے قدیم نسخے چلے آتے تھے۔اور جن میں اختلاف عبارت بھی تھا۔اور ان کے جدا جدا نام تھے۔ان میں سے بھی کسی نسخے کا نام نہیں

بتلاتے تھے۔ کہ کون سے نسخے میں یہ بشارت تھی۔ اور نہ جس کتاب سے وہ بشارت لکھی ہے۔ اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔ جو مذکورہ بالا نسخوں میں سے کسی کے ساتھ مطابق نہیں ہوتا۔

سوم۔ ان کتابوں کے سوا جو اسوقت مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں داخل ہیں، اور کتابیں بھی تھیں۔ جو اب دست یاب نہیں ہوتیں یا غیر معتبر اور مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔ اور اس سبب سے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ بشارتیں جو ان بزرگوں نے لکھی ہیں۔ اور موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ کن نسخوں سے لی گئی ہیں۔ یعنی ان کتابوں سے جو اب دست یاب نہیں ہوتیں۔ یا ان سے جو غیر معتبر یا مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔

چہارم: اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ بعض بشارتیں کتابوں میں لکھی موجود نہ تھیں۔ بلکہ سینہ بسینہ بطور روایت کے چلی آتی ہیں۔ جیسے کہ انجیل متی میں حضرت مسیح کے ناصری کہلانے کی بشارت کا اسی طرح پر ذکر ہے۔ کہ ''وہ آیا اور اس شہر میں رہا جس کو ناصرہ کہتے تھے۔ تا کہ وہ بشارت پوری ہو جس کو انبیاء کہتے آئے تھے کہ وہ ناصری کہلاوئے گا۔''

(متی۔ باب۔۲۔۲۳)

حلاں کہ یہ بشارت کسی نبی کی کتاب میں مندرج نہیں ہے۔ پس وہ بشارتیں جن کو مسلمان عالموں نے زبانی روایتوں سے لیا ہے۔ ان کی بھی کوئی معتبر سند نہیں بتائی گئی، تو وہ بھی نقص سے خالی نہیں، اور اس لیے ان کا بھی اس خطبے میں ذکر کرنا کچھ مناسب نہیں۔

پنجم۔ بعض بشارتیں اب بھی ان کتابوں میں مندرج ہیں۔ جن کو عیسائی نامعتبر سمجھتے ہیں۔ اور گو ہمارے پاس اس بات کا کافی ثبوت ہو کہ وہ صحیح ہیں۔ لیکن ہم اپنے خطبے میں اس کا ذکر نہیں کرنے کے۔ بلکہ صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کریں گے جو موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں موجود ہیں۔ جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں۔ تا کہ کسی کو اس میں دم

مارنے کا مقام نہ رہے۔

ششم:

علاوہ اس کے موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں دو قسم کی بشارتیں موجود ہیں۔ ایک ایسی ہیں کہ اگر بغیر کسی تعصب وطرف داری وضد کے ان پر غور ہو۔ اوران کے معنوں میں تحریف نہ کی جائے۔ تو وہ صاف صاف ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صادق آتی ہے۔ اور دوسری قسم کی ایسی ہیں کہ ان سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کے ہونے کی بشارت ہے۔ مگر یہ بات صاف معلوم نہیں ہوتی کہ کس پیغمبر کی بشارت ہے۔ اور اس لیے ہر ایک قوم یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ بشارت ہمارے پیغمبر سے متعلق ہے۔ اس قسم کی بشارتیں بھی جھگڑے سے خالی نہیں۔ اس لیے میں ان کا بھی اس خطبہ میں ذکر نہیں کرنے کا۔ پس ہمارے اس خطبے کے پڑھنے والے خیال کریں گے کہ بوجوہات مذکورہ بالا جس قدر بشارتوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی تعداد بمقابل ان بشارتوں کے جن کا اس خطبہ میں ذکر کیا ہے، بہت زیادہ ہے۔

توریت وانجیل میں آنے والے پیغمبر کی بشارتیں ایسی مہمل اور مجمل طور سے بیان ہوئی ہیں کہ پہیلی اور معمے کی مانند ہوگئی ہیں۔ اور جب تک ان کی تشریح نہ کی جائے اوران کا حل نہ بتایا جائے، تو ان کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ پس اگر ہم یکا یک جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارتوں کو بیان کرنا شروع کردیں تو ضرور بعض لوگوں کے دل میں خیال جاوئے گا کہ یہ کیسی مجمل اور مشکل بشارت ہے۔ اس لیے ہم ان بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو حواریوں کے کہنے کے مطابق عہد عتیق میں حضرت عیسیٰؑ کی نسبت آئی

تھی۔اوراس کے بعدان بشارتوں کولکھیں گے جوتوریت اورانجیل میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت آئی ہیں۔اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے۔ایک تو یہ کہ ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے اب اس بات سے واقف ہوجائیں گے کہ بشارتوں کے بیان کرنے کا کیا طریقہ ہے۔اور کس طرح کنایہ اوراشارہ سے بطور پہیلی یا چیستان کے بیان ہوتی ہے۔دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو بشارتیں ہیں۔اور جو بشارتیں کہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت ہیں۔ان کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پیغمبر صاحب کی بشارتیں حضرت عیسیٰ کی بشارتوں کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن اور صاف صاف ہیں۔جن کی صحت کو مخالف کا دل بھی قبول کر لیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ سلام کی نسبت یہ بشارتیں ہیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

ا۔جب احاز یہود کے بادشاہ پر رصین بادشاہ ارم اور فقح بادشاہ رملیہ بادشاہ اسرائیل نے چڑھائی کی تو احاز بادشاہ یہودا بہت گھبرایا۔اس زمانہ میں حضرت اشعیاء پیغمبر تھے،ان سے التجا کی انھوں نے احاز کو تسلی دی اور فرمایا کہ تو خوف نہ کر تیرے دشمن تجھ پر غالب نہ ہو ں گے۔اوراس خوف کے رفع ہونے کی مدت اوراپنے قول کی صداقت کا یہ نشان بتایا کہ ایک کواری کو حمل رہے گا اور وہ بیٹا جنے گی اوراس کا نام عمانوئیل رکھا جاوئے گا۔اور جب وہ ذرا ہوشیار ہوگا تو جو خوف تجھ کو دشمنوں سے ہے جاتا رہے گا۔اور تیرے لیے بہت اچھے دن آویں گے۔(یہ مضمون اشعیاء نبی کی کتاب کے ساتویں باب میں مندرج ہے) پھر اسی کتاب کے آٹھویں اور نویں باب میں مذکور ہے۔کہ وہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ماھیر شالال ھاشنیر ،رکھا گیا اور جب وہ ہوشیار ہوا تو احاز کو دشمنوں کا جو خوف تھا جاتا رہا۔

بایں ہمہ انجیل متی میں لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی ہے۔جو کواری مریم سے پیدا ہوئے ہیں۔چنانچہ سینٹ متی فرماتے ہیں کہ ’’جب حضرت مسیح کی ماں مریم کی منگنی

یوسف کے ساتھ ہوئی، تو اس سے پہلے کہ وہ ہم بستر ہوں۔'' روح قدس سے حاملہ پائی گئی۔تب اس کے شوہر یوسف نے جو راستباز تھا نہ چاہا کہ اس کی تشہیر کرے۔ ارادہ کیا کہ اسے چپکے سے چھوڑ دے۔ وہ ان باتوں کی سوچ میں تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اس پر خواب میں ظاہر ہوکر کہا، اے یوسف داود کے بیٹے اپنی جورو مریم کو اپنے ھاں لانے سے مت ڈر کیوں کہ جو اس کے پیٹ میں ہے۔ سو روح قدس سے ہے۔ اور وہ بیٹا جنے گی تو اس کا نام یسوع رکھنا۔ کیونکہ وہ اپنے لوگوں کو ان گناہوں سے بچائے گا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا، پورا ہوا کہ دیکھو ایک کواری پیٹ سے ہو گی اور بیٹا جنے گی۔ اور اس کا نام عمانوئیل رکھیں گے، جس کا ترجمہ یہ ہے،'' خدا ہمارے ساتھ'' (انجیل متی ا۔۱۸، لغایت ۲۲)

پس اب غور کرنا چاہیئے کہ یہ کیسی مہمل اور مشتبہ پشین گوئی ہے۔ اور کس وقت اور کس کے مطلب کے لیے کی گئی ہے۔ مگر حضرت متی نے اس کو اشارۃ وکنایۃ حضرت عیسیٰ علیہ سلام کے پیدا ہونے کی بشارت قرار دی ہے۔

۲۔ حضرت میکا نبی نے بہت سی باتیں آئندہ کی اشارات وکنایات میں کہی ہیں کہ یہ ہوگا۔ اور وہ ہوگا۔ اس میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ '' اے بیت لحم افراتاہ۔'' اگرچہ تو یہودا ہزاروں میں چھوٹا ہے۔ لیکن میرے لیے ایک شخص جو بنی اسرائیل میں سلطنت کرے گا۔ اور اس کا ہونا بہت قدیم زمانہ سے مقرر ہو چکا ہے۔ تجھ میں سے نکلے گا۔ (کتاب میکا، باب ۵،۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ پشین گوئی بھی حضرت عیسیٰ مسیح کی ہے۔ کیونکہ جب ہیرودو بادشاہ نے سردار کاہنوں اور یہودیوں کے فقیہوں کو جمع کرکے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہو گا تو انھوں نے میکا نبی کی اس کتاب پر استدلال کر کے کہا کہ بیت لحم میں پیدا ہو

گا۔(انجیل متی باب ۲، ۳، لغایت ۶)

اور جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ سلام بیت لحم میں پیدا ہوئے۔اور گو دنیاوی سلطنت ان کو بنی اسرائیل پر نہیں ہوئی۔مگر سینٹ متی نے سلطنت کو روحانی سلطنت قرار دیا اور اس پشین گوئی کو حضرت عیسیٰ کی پشین گوئی ٹھہرایا۔

حضرت ہوشیع نبی نے لغز وکنایہ میں کچھ فرماتے فرماتے یہ فرمایا کہ جب اسرائیل بچہ تھا تو اس کو میں پیار کرتا تھا۔اور اپنے بیٹے کو میں نے مصر سے بلایا''۔(کتاب ہوشیع نبی باب ۱۱، ۱)

۳۔حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی حضرت عیسی کے متعلق بشارت ہے کیونکہ جب ہیرود نے حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کے بعد ان کو مار ڈالنے کے لیے ان کی تلاش کی تو خداوند کے فرشتے نے یوسف کو خواب میں کہا کہ ''اٹھ اس لڑکے کو اور اس کی ماں کو لے کر مصر کو بھاگ جا۔''(متی باب ۲۔۱۲)لغایت ۲۱۔

۴۔حضرت برمیا نبی نے بنی اسرائیل کی مصیبتوں کو بیان کرتے کرتے یہ فرمایا کہ خداوند فرماتا ہے کہ راماء میں دھاڑیں مار کر رونے اور نالہ کرنیکی آواز سنائی دیتی ہے۔کہ راحیل اپنے بیٹوں کے لیے روتی ہے۔اور تسلی نہیں پاتی۔کیونکہ وہ نہیں ہیں (کتاب برمیا باب ۲۱۔ ۱۵)۔

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک بشارت حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔کیونکہ جب حضرت عیسی پیدا ہوئے تو ھیرود بادشاہ نے اس شبہ میں کہ کون سا بچہ ہے جو عیسیٰ ہوگا۔

۱۔لغز۔بہ ضم اول وسکون غین معجمہ وبعدہ زائے معجمہ کلام بہم۔چیستان۔

بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے سب لڑکوں کو جو دو برس کے اور اس سے چھوٹے تھے قتل کروایا''(انجیل، متی، باب ۲، ۱۷)۔

اب سینٹ متی نے صرف اس قدر لگاؤ سے کہ ان بچوں کے مارے جانے سے راماہ میں رونا اور پیٹنا ہوا فرمایا کہ یہ پشین گوئی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔ (انجیل متی، باب ۲، ۱۷، ۱۸)۔

۵۔ حضرت اشعیا پیغمبر نے یہ بیان کرتے کرتے کہ اب بیت المقدس (اور شلیم) میں تکلیف باقی نہ رہے گی"۔ یہ بھی فرمایا کہ تنگی کی ظلمت جس میں یہ زمین مبتلا ہوتی ہے۔ باقی نہ رہے گی۔ جس طرح کہ اگلے زمانے میں زبولوں کی زمین اور نفتالی کی زمین کو حقیر کر کے آخر کار اسی طرح دریائے اردن (فرات) کے کنارے جلیل میں بڑے قبیلے ہوں گے۔ جو قوم کہ اندھیرے میں چلتی ہے۔ نور عظیم دیکھے گی۔ اور موت کے سایہ کی زمین کے رہنے والوں پر ایک نور چمکے گا" (کتاب اشعیا باب، ۹، ۱، ۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بشارت بھی حضرت عیسی علیہ سلام کی ہے۔ کیونکہ جب حضرت عیسی نے سنا کہ یحیٰ پیغمبر گرفتار ہو گئے تو وہ جلیل کو چلے گئے۔ اور ناصرہ کو چھوڑ کر کفر ناحوم میں جو دریا کے کنارے زبولوں اور تفتالیوں کی حدوں میں ہے جا رہے۔ (متی، باب، ۴، ۱۲، ۱۳)۔

سینٹ متی نے صرف اتنی بات پر کہ حضرت عیسیٰ دریا کے کنارے جا رہے تھے۔ حضرت اشعیا نبی کے اس قول کو حضرت عیسیٰ کی بشارت قرار دیا۔ (انجیل متی، باب ۴، ۱۴، لغایت ۱۶)

۶۔ حضرت ملاکی نبی نے بنی اسرائیل کو خدا کی عدول حکمی پر ملامت کرتے کرتے یہ فرمایا کہ "اب میں اپنے رسولوں کو بھیجوں گا۔ اور وہ میری برابر راہ کو تیار کرے گا۔ اور جس خداوند کی تفحص میں یعنی رسول کے عہد اور اس سے خوش ہو۔ یکا یک اپنی ہیکل میں آ جاوئے گا۔ لشکروں کا خداوند فرماتا ہے کہ وہ اب آتا ہے۔ (کتاب ملاکی، باب ۴)

اور جس وقت اشعیا نبی نے بنی اسرائیل اور بیت المقدس کو تسلی دی تو اس وقت یہ فرمایا کہ پکارنے والا پکارتا ہے کہ بیابان میں خداوند کے لیے ایک راہ تیار کرو۔ اور جنگل میں ایک شاہ راہ میرے خدا کے لیے درست کرو (کتاب اشعیا باب۔۴۰۔۳)۔

حضرت متی اور مارک اور لوک تینوں حواری اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دونوں بشارتیں حضرت عیسی علیہ سلام کی ہیں۔ اس لیے کہ یحیی پیغمبر نے جب لوگوں کو اصطباغ دیا۔ تو انھوں نے گویا حضرت عیسیٰ کے لیے راہ بنائی۔ اور حضرت یحیی یہ کہا کرتے تھے کہ" میرے بعد ایک اور آتا ہے۔" "جو مجھ سے بھی زیادہ قوی ہے۔" پس حضرت یحییٰ کا اصطباغ دینا تو راہ بنانا ہوگیا۔ اور حضرت یحیٰ کا یہ کہنا کہ "میرے بعد ایک اور آتا ہے۔" پکارنے والے کی آواز ہوگی۔ اور وہ دونوں بشارتیں حضرت عیسیٰ پر صادق آگئیں۔ (متی، باب،۱،۳،۲،۳،۱۱) انجیل مارک (۱،۲،۳،۴،۷،۱۸) (انجیل لوک باب،۲،۳،لغایت ۴)

ھر مسلمان حضرت یحیٰ پیغمبر کو برحق جانتے ہیں۔ مگر یہودی ان کو پیغمبر نہیں مانتے ،اور عہد عتیق میں ان کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ اور نہ کوئی صحیفہ حضرت یحیٰ کا مذکور ہے۔ پس جو اقوال حضرت عیسی کے انجیلوں میں مذکور ہیں۔ وہ زبانی روایتوں سے لکھے گئے ہیں۔ جن لوگوں سے انجیلوں کے لکھنے والوں نے وہ اقوال سنے، ان کا نام نہیں بتایا۔ عیسائی یقین کرتے ہیں کہ وہ سب روح القدس کی تائید سے لکھا گیا ہے۔ جس کی صحت یقینی ہے۔ مگر ہم مسلمان جس طرح کہ اپنے پیغمبر کے حوارین یعنی صحابہ وتابعین کے کلام کی سند چاہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسی علیہ سلام کو سند کا محتاج جانتے ہیں۔

لا نفرق بین احد من رسله

ان چند بشارتوں کے ذکر کرنے سے جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کی بشارتیں قرار دیا ہے۔ ہمارے اس خطبہ کو پڑھنے والے سمجھ جائیں گے کہ انبیا سابق نبی لاحق کی

بشارت کیسے دھندلے لفظوں میں اور کیسے اشارے کنایہ سے مگھم مگھم میں دیتے تھے۔ جس کا سمجھنا پہیلی معمہ اور چیستان سے بھی زیادہ مشکل ہوتا تھا۔ اور اب ہم اپنے پیغمبر خدا رسول اللہ کی بشارتیں بیان کرتے ہیں۔ جن کو لوگ دیکھیں گے کہ وہ ان کی نسبت کیسی صاف اور روشن ہیں۔

بشارات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بشارت اول

حضرت موسیٰ کی پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسماعیل کی نسبت یہ وعدہ کیا ہے۔(اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔)

ول یشمعیل شمعتیخا ھنہ بیرکتی اوتو وھفربتی اوتو وھربیتی اوتو بمد ودمشو د شنیم عاسار نسیشیم بولید ولشیولغوی گادول

ویومر الوھیم الا براھام ال برع بعینیخا علی ھنعر وعلی اماشخنا۔کل اشرتومرالیخا سارہ شمع مقولیہ کی بیصحق بقارالیخازارع وعم اثبن ھا آمہ لغوی آسیمنو کی زرعخا ھو۔

عربی ترجمہ

قدسمعت دعاک لا اسماعیل وھانا بارکتہ وفضلتہ کثیرا کثیرا یولد اثنی عشر خلیفۃ واجعلہ جیلا کبیرا۔

وقال اللہ لا براھیم لا یضیق صدرک علی الولد وعلی امتک کلما تقول لک سارہ فقسمع

بقولھا فانہ باسحاق یدعی نسلک واجعل ابن لاستہ ایضا امہ لانہ نسلک۔

اردو ترجمہ

میں نے تیری دعا اسماعیل کے حق میں قبول کی۔ ہاں میں نے اسے برکت دی اور اسے بارآور کیا۔ اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اس سے بارہ امام پیدا ہوں گے۔ اور اس کو بڑی قوم کروں گا (توریت کتاب اول، باب ۱۷، ۲۰)

کہا اللہ نے ابراہیم سے تیری نظروں میں برا معلوم نہ ہو۔ اس لڑکے اور اپنی لونڈی کی وجہ سے۔ جو کچھ تجھ سے سارہ کہے۔ اس کی بات مان لے۔ کیونکہ اسحاق سے تیری نسل کہلائے گی۔ اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی ایک قوم کروں گا کیونکہ وہ تیری نسل ہے۔ (توریت کتاب اول، باب ۲۱، ۱۲، ۱۳،)

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ کی صریح بشارت ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے حضرت اسماعیل کو برکت دینے کا جو وعدہ کیا تھا۔ وہ اس طرح پر پورا ہوا کہ محمد رسول اللہ کو جو اسماعیل کی اولاد سے تھے۔ تمام دنیا کے لیے دنیا کے ختم ہونے تک نبی مقبول مقرر کیا۔

جو ہمارے مخالف ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اسماعیل سے یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ اس کی اولاد میں بارہ سردار ہوں گے۔ چنانچہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا بارہ سرادروں کے تھے پیدا ہوئے۔ اور جس برکت دینے کا اسماعیل سے وعدہ ہوا تھا۔ وہ دنیاوی برکت تھی نہ روحانی۔

مگر یہ تاویل کسی طرح صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ ہر ایک منصف مزاج ان آیتوں کو پڑھ کر معلوم کرے گا کہ ان آیتوں میں جدا جدا تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ میں نے

اس کو برکت دی۔ دوم یہ کہ اسے بارآور کیا، اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔ سوم یہ کہ "اس کو بڑی قوم کروں گا" بس اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان تینوں جدا جدا لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ یعنی اولاد کا زیادہ ہونا۔

جب کہ حضرت اسحاق بیرشبع میں پہنچے تو خدا تعالیٰ نے خواب میں ان سے یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ تیرے باپ ابراہیم کا خدا ہوں تو ڈرمت۔ میں تیرے ساتھ ہوں، تجھ کو برکت دوں گا۔ اور اپنے بندے ابراہیم کے سبب تیری نسل کو بہت کروں گا۔ (توریت کتاب اول، باب ۲۷، ۲۴۔)

جس مضمون کا وعدہ حضرت اسماعیل سے کیا گیا اور جو لفظ برکت کا اسماعیل کے وعدہ میں استعمال ہوا۔ اسی مضمون کا وعدہ اسحاق سے کیا گیا۔ اور وہی لفظ برکت کا اسحاق کے وعدہ میں بھی بولا گیا۔ پس یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اسماعیل سے جو وعدہ تھا وہ دنیاوی تھا۔ اور اسحاق سے جو وعدہ تھا۔ وہ روحانی تھا۔

ہم کو اس بات پر بھی غور کرنی چاہیئے کہ خدا نے حضرت ابراہیم سے کیا وعدہ تھا۔ توریت میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کنعان میں پہنچے تو خدا نے ان سے کہا تھا کہ یہ زمین تیری اولاد کو دوں گا۔ (توریت کتاب اول، باب ۱۲، ۷،)

اور جب کہ حضرت لوط حجرت ابراہیم سے جدا ہو گئے تو پھر خدا نے ابراہیم سے کہا کہ آنکھیں کھول اور چاروں طرف دیکھ۔ کہ یہ تمام زمین جو تو دیکھتا ہے۔ تیری اولاد کو دوں گا۔ اور تیری اولاد کو زمین کی ریت کی مانند کروں گا۔ جو کوئی ریت کے ذروں کو گن سکے گا تو تیری اولاد کو بھی گن سکے گا۔ (توریت کتاب اول، باب ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶،)

پھر ایک دفعہ خدا نے ابراہیم سے وعدہ کیا کہ تیری اولاد اتنی ہو گی جتنے آسمان کے ستارے جن کو گن نہیں سکتا۔ (توریت کتاب اول، باب ۵، ۱۵۔)

پھر خدا نے ابراہیم سے ایک اور پختہ وعدہ کیا کہ یہ زمین مصر کے دریا سے فرات کے دریا تک تیری اولاد کو دوں گا (توریت باب ۱۵، ۱۸۔)

اور جب کہ حضرت ابراہیم ضعیف ننا وے برس کے ہو گئے تب پھر خدا نے ابرا ھیم سے وعدہ کیا کہ تجھ میں اور مجھ میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ تجھ کو زیادہ سے زیادہ کروں گا۔ تو بہت سی قوموں کا باپ ہوگا۔ تجھ سے قومیں پیدا ہوں گی۔ تجھ سے بادشاہ نکلیں گے۔ اور تیری اولاد سے بھی یہ ہمیشہ کا عہد ہوگا اور کنعان کی زمین بوراثت دائمی تجھ کو دوں گا۔ (توریت کتاب اول، باب ۱۷، ۱، ۳، ۴، ۵، ۷، ۱۸۔)

یہ تو وعدے تھے جو خدا نے حضرت ابراہیم سے کیے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اسحاق و یعقوب سے کیا وعدہ کیا تھا۔

توریت میں لکھا ہے کہ جب یعقوب بیر شبع سے حاران کی جانب روانہ ہوئے تو ایک مقام پر پتھر سرہانے رکھ کر سو رہے۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی آسمان تک لگی ہوئی ہے۔ اور خدا کے فرشتے اس پر اترتے چڑھتے ہیں۔ اس پر خدا نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں تیرے باپ ابراہیم اور اسحاق کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو سوتا ہے۔ تجھ کو اور تیری اولاد کو دیتا ہوں۔ تیری اولاد زمین کی ریت کی برابر ہو گی اور چاروں طرف پھیل جاوئے گی (توریت کتاب اول، باب ۲۸، ۱۲، ۱۳، ۱۴،)۔

یہ بات بھی زبور سے ثابت ہے کہ خدا نے جو ابراہیمؑ سے عہد کیا تھا۔ وہی بعد کو بھی قائم رکھا۔ اور وہ صرف کنعان کی زمین دینے کا عہد تھا۔ چناں چہ زبور داود میں خدا کا کلام اس طرح لکھا ہے کہ "وہ عہد جو میں نے ابراہیم سے کیا اور اسحاق سے اس کی قسم کھائی اور یعقوب کے ساتھ بمنزلہ قانون کے مقرر کیا اور اسرائیل سے عہد دائمی کیا اور کہا کہ زمین کنعان تجھ کو دیتا ہوں تا کہ تیری میراث کا حصہ ہو۔" (زبور ۱۰۵۔ ۹ و ۱۱)

اب دیکھو کہ اسی وعدہ کو پورا کرنا خدا نے بتلایا۔ چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ مواب کے جنگل میں بنو پہاڑ پر چڑھے۔ جو ریحو کے سامنے ہے۔ تو خدا نے موسیٰ سے کہا کہ یہ وہ زمین ہے جس کو میں نے بقسمیہ ابراہیم واسحاق اور یعقوب سے وعدہ کیا تھا کہ تمھاری اولاد کو دوں گا۔ پس یہ زمین میں تجھ کو آنکھوں سے دکھلا دیتا ہوں۔ مگر تو وھاں نہیں جانے کا" (توریت کتاب پنجم، باب ۳۴، ۴)۔

اب یہ تمام وعدے جو خدا نے ابراہیم، اسحاق اور یعقوب سے کیے تھے۔ ہم نے منتخب کر کے ہر منصف مزاج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم دو سوال کرتے ہیں۔ اول یہ کہ جو وعدے جو خدا نے ابراہیم کے لیے کیے تھے۔ وہ وعدے اسماعیل اور اسحاق دونوں کے حق میں کیوں نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ حلانکہ خود خدا نے بھی کہا ہے کہ اسماعیل بھی ابراہیم کی اولاد ہے۔ جیسا کہ باب ۲۱ آیت ۱۲ میں مذکور ہے۔

دوسرا سوال ہمارا یہ ہے کہ جو وعدہ خدا نے اسحاق ویعقوب کی نسبت کیا تھا۔ یعنی ملک کنعان دینے کا اور اولاد زیادہ کرنے کا۔ اس میں کیا ایسی چیز ہے؟۔ جس سے وہ روحانی قسم کا سمجھا جاتا ہے۔ اور جو وعدہ اسماعیل کی نسبت کیا تھا۔ اس میں کس چیز کی کمی ہے جس سے وہ دنیاوی سمجھا جاتا ہے۔

جو لوگ کہ انصاف سے ان باتوں پر نظر کرتے ہیں۔ وہ بہ یقین جانتے ہیں کہ خدا نے بھی اسحاق سے بھی برکت کا وعدہ کیا۔ اس کی اولاد میں سب سے آخر ایک پیغمبر آخر الزمان پیدا کیا۔ تمام دنیا کو اس سے برکت دی۔ اسماعیل کی اولاد نے بھی ملک فتح کیے۔ کنعان کو جو غیر خدا پرستوں کے ھاتھ چلا گیا تھا۔ پھر فتح کیا۔ اور ابراہیم ہی کی نسل میں پھر اس ورثہ کو لے آئے۔ اور جب تک کہ خدا کی مرضی ہے۔ وہ ورثہ ان کے حصہ میں رہے گا۔ اگرچہ بقائے اصلی صرف خدا کی ذات کو ہے۔ الا کل شیء ماخذ اللہ زائل

بشارت دوم

خداتعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بہت سے احکام بتلائے، اس میں یہ بھی فرمایا:۔

اس عبارنی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

نابی مقریخا ماحیخا کاموني باء تیم لخا یہواہ الوھخا الاؤ تشماعون؛ نابی اقیم لاھم مقرب اجیھم کاموخا دیثنی دیبارای بفیو ودبرالیھم اث کل اشراصوتو۔

عربی ترجمہ

الهک الموجود یقیم لک نبیا من بینک من اخوتک مثلی له تسلمون: نبی من بین اخوتهم اقیم لهم مثلج والقی کلامی بقیة و کل ما آمره یقول لهم.

اردو ترجمہ

قائم کرے گا تیرا معبود تیرے لیے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے مجھ سا۔اس کو مانیو۔ان کے بھائیو سے نبی تیرا سا قائم کروں گا۔اور اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا۔اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا۔وہ ان سے کہہ دے گا (توریت کتاب پنجم، باب ۱۸،۱۵،۱۸)۔

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ایسی صاف اور مستحکم بشارت ہے۔ جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ خدا نے حضرت موسی سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی مثل موسی کے مبعوث کرے گا۔ اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسماعیل ہیں۔ بنی اسماعیل میں بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نبی نہیں ہوا۔ اور اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ بشارت ہمارے ہی پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی۔

علاوہ اس کے ان آیتوں میں دو لفظ ہیں جن پر غور کرنا چاہیئے۔۔ اول یہ کہ اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا۔ دوم یہ کہ ''مثل تیرے'' یعنی موسیٰ کے ان دونوں لفظوں کا مصداق سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔

یہودی اور عیسائی دونوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل پر سوائے احکام عشرہ موسی کے جو وحی آئی تھی۔ اس کے لفظ وہی نہیں ہیں۔ جو توریت و زبور و صحف انبیا میں لکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ انبیا کو صرف مطلب القا ہوتا تھا۔ اور پھر وہ اس کو اپنی زبان و محاورہ میں لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اناجیل اربعۃ جواب معتمد اور قابل سند عیسائیوں میں تسلیم ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ تو وہ ہیں ہی نہیں جو حضرت عیسیٰ کی زبان مبارک سے نکلے تھے۔ کیونکہ حضرت عیسی کی زبان عبرانی تھی۔ اور وہ انجیلیں یونانی میں تحریر ہوئی تھیں۔ ھاں البتہ قرآن مجید ایسا ہے کہ اس کے لفظ پیغمبر کے منہ میں رکھے گئے۔ اور وہی لفظ پیغمبر نے لوگوں کو پڑھ کر سنائے۔ پس یہ الفاظ اس بشارت کے ہیں کہ اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا۔ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی پر صادق ہی نہیں آتے۔

اب دوسری بات پر غور کرو کہ حضرت موسیٰ کی مانند کون سا پیغمبر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل میں تو کوئی پیغمبر مثل حضرت موسیٰ کے نہیں ہوا۔ کیونکہ حضرت عزیر پیغمبر نے جب توریت کو

بعد قید بابل کے تحریر فرمایا تو اس میں یہ لکھا ہے کہ:

اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

ولوقام نابی عود بیسرائیل کموشہ اسر سداعو یھوا پانیم آل بانیم۔

عربی ترجمہ

و ما قام نبی و ما بعد با سرائیل کموسی الذی عرف الله بالمشافهة...

اردو ترجمہ

اور پھر قائم نہ ہوا کوئی نبی بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند جس نے پہچانا اللہ کو دو بدو۔(توریت کتاب پنجم باب،۳۴،۱۰)۔

پس اب بنی اسرائیل کے بھائیوں میں دیکھنا چاہیئے۔کہ کون پیغمبر ہوا، وہ بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔ھاں اب یہ دیکھنا باقی رہا کہ وہ مثل حضرت موسیٰ کے ہیں یا نہیں،سو مفصلہ ذیل باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ھی ایسے پیغمبر ہیں جو مثل موسی کے ہوئے ہیں۔

ا۔حضرت موسی نے اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ھجرت کی۔اسی طرح حضرت محمدؐ کو بھی اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے ہجرت کرنا پڑی۔

۲۔ا۔حضرت موسی نے اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے ہجرت کر کے شہر یثرب

میں جس کو اب مدینہ کہتے ہیں اور جو یثرون بانی شہر کے نام پر کہلاتا تھا۔ پناہ لی۔ اسی طرح ا۔ حضرت محمد نے بھی اپنے وطن مکہ سے ھجرت کر کے اسی شہر مدینہ میں پناہ لی۔

۳۔ا۔ حضرت موسیٰ پر کلام خدا بہ لفظہ نازل ہوا جو دس احکام ہیں۔ حضرت موسیٰ پر کلام خدا بہ لفظہ نازل ہوا بھی کلام خدا بہ لفظہ نازل ہوا۔ جو موجود ہے۔ اور کلام اللہ کہلاتا ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ کو بھی کافروں سے جہاد کرنے کا حکم ھوا۔ حضرت محمدؐ کو بھی وحدانیت خدا کے وعظ کرنے سے جو کافر مانع ہوں۔ ان سے جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ البتہ جہاد حضرت موسیٰ کا نہایت سخت اور خون ریز تھا۔ اور حضرت محمد کا جہاد نہایت ملائم اور امن چاہنے والا اور امن دینے والا اور جانوں کو بچانے والا تھا۔

۵۔ حضرت موسیٰ نے اپنی متفرق اور پامال قوم کو مصر سے نکال کے یکجا جمع کیا۔ حضرت محمدؐ نے بھی تمام متفرق اور مختلف عرب کی قوموں کو جو آپس میں نہایت دشمن اور کینہ ورتھیں۔ جن کے باھم ھر سال خون کے نالے بہتے تھے۔ اکٹھا کر دیا۔ بلکہ یک دل و یک جان کر دیا۔ اور اس پر عمدہ بات یہ ہے کہ سب کو ایک خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کرنے والا کر دیا تھا۔ اور ایسا قوی کر دیا کہ کوئی اس کے مقابل نہ تھا۔

۶۔ حضرت موسیٰ نے ملک فتح کیے اور بنی اسرائیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کی۔ حضرت محمد نے بھی ملک فتح کیے۔ اور بنی اسماعیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کر دی۔ اگر چہ اتنا فرق ہے۔ کہ شاید حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد بادشاہت قائم کرنی اور ملک کنعان پر قبضہ کرنے کا تھا۔ اور حضرت محمد کا مقصد دنیاوی بادشاہت کا نہ تھا۔ اصلی مقصد کے ساتھ وہ بھی اتفاق سے قائم ہو گئی۔ تاکہ توریت کی بشارت مثل موسیٰ کے پوری ہو جاوئے۔

۷۔حضرت موسیٰ کو خدا تعالیٰ کی جانب سے شریعت عطا ہوئی۔اور ایک کتاب دی گئی یعنی توریت۔جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں۔حضرت محمدؐ کو بھی شریعت عطا ہوئی اور کتاب دی گئی۔(یعنی قرآن) جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں۔اور کوئی اور پیغمبر غالبا

حضرت موسیٰ اور حضرت محمدؐ کے ایسا نہیں ہوا۔جس کو ایسا قانون شریعت عطا ہوا ہو۔کیونکہ تمام انبیائے بنی اسرائیل اور خود حضرت عیسیٰ سب کے سب حضرت موسیٰ کی شریعت کے تابع تھے۔کسی کو خاص شریعت عطا نہیں ہوئی تھی۔

۸۔عیسائی مصنفوں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ حضرت محمدؐ مثل حضرت موسیٰ کے تھے۔مسٹر رینان نے حضرت عیسیٰ کے حالات زندگی کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت محمدؐ صرف غور ہی کرنے والے اور سوچنے والے نہ تھے۔بلکہ وہ دونوں کام کرنے والے بھی تھے۔اور اپنے ہم وطنوں اور ہم عصروں کے لیے کام تجویز کرتے تھے۔اور اسی کے ذریعہ سے ان دونوں پر حکومت کی۔

۹۔کوارٹر لی ریویو نمبر ۲۵۴ میں جو آرٹیکل اسلام پر چھپا۔اس آرٹیکل کے لکھنے والا لکھتا ہے کہ حضرت محمدؐ کو اپنے وطن میں رہنا مشکل ہوا۔اور اس لیے انھوں نے ہجرت کی۔تا کہ کسی دوسرے مقام پر جا کر وعظ کریں۔جیسے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم اور اور نبیوں نے ہجرت کی تھی۔

۱۰۔آنحضرت کے پیروؤں نے اطاعت اور وفاداری کا وعدہ کیا اور جب یہ ہو چکا تو انھوں نے ان میں سے بارہ آدمی منتخب کیے۔حضرت عیسیٰ نے بھی بارہ حواری چنے۔حضرت موسیٰ نے بھی بنی اسرائیل کی قوم سے اپنی بہ نسبت زیادہ عمر کے لوگ منتخب کیے تھے۔

۱۱۔۱۰ سنہ ھجری میں آخیر مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس ہزار مسلمانوں

کے ساتھ مکہ میں آنے اور کوہ عرفات پر مثل حضرت موسیٰ کے آخیر مرتبہ مسلمانوں سے پوچھا کہ میں نے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں کیا اور کسی کا کچھ فرض تو مجھ پر نہیں ہے؟۔انتہیٰ۔

یہ سب تمثیلیں وہ تھیں۔ جو کوارٹرلی ریویو میں لکھی ہیں۔پس اب سوائے اس کے جو براہ تعصب اس صاف اور روشن بشارت سے آنکھ بند کر لے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہیں ہے۔

جو آیتیں توریت کی ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ان میں سے ایک کے یہ الفاظ ہیں کہ ''قائم کرے گا تیرا معبود موجود''

ا۔ یہاں سرسید کو غلطی لگی ہے، اصل تعداد دس ہزار تھی نہ کہ چالیس ہزار۔(صحیح بخاری۔کتاب المغازی)

توریت میں بھی جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فتح مکہ کی پشین گوئی ہے، صاف لکھا ہے ''وہ دس ہزار قدسیوں (نیک لوگوں) کے ساتھ آیا'' (کتاب استثناء باب ۳۳، آیت ۲) توریت کے قدیم نسخوں میں دس ہزار ہی کا لفظ ہے۔مگر اب عیسائیوں نے اعتراض سے بچنے کے لئے دس ہزار کی بجائے ''لاکھوں'' بنادیا ہے۔(محمد اسماعیل)

تیرے لیے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے ''اس لفظ تجھ میں سے'' پر ہم نے خطبات احمدیہ میں جو انگریزی زبان میں چھپی ہے۔کچھ بحث نہیں کی تھی۔سبب اس کا یہ تھا کہ دوسری آیت میں یہ لفظ نہیں تھا۔اور اس میں نہایت صفائی سے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسماعیل میں سے نبی مبعوث ہونا ظاہر تھا۔اور جب کہ حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب کے چونتیسویں باب کی دسویں آیت سے جو اوپر لکھی گئی ہے۔صاف ثابت تھا کہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی مثل حضرت موسیٰ کے نہیں ہوا تھا۔تو صاف صاف متیقین ہوگیا تھا کہ بنی اسماعیل میں سے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔نبی موعود ہونے والا

تھا۔مگر مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ ''بشارت مثل حضرت موسیٰ'' میں اس پر بحث کی ہے۔وہ ارقام فرماتے ہیں کہ لفظ'' تجھ میں سے'' اصلی صحیح نسخہ توریت میں نہ تھا۔ بلکہ کاتبوں کی غلطی سے یہ لفظ بڑھ گیا ہے۔اوراس کے ثبوت پر تین نہایت مضبوط دلیلں پیش کی ہیں۔

اول: یہ کہ اسی آیت کو پطرس حواری نے اعمال حواریین میں نقل کیا ہے۔اوراس میں سے یہ فقرہ'' تجھ میں سے''نہیں ہے۔

دوسرے۔ یہ کہ استیغان حواری نے بھی اس آیت کو نقل کیا ہے۔اوراس میں بھی وہ فقرہ نہیں ہے۔

تیسرے:۔ یہ کہ توریت کے یونانی ترجمہ میں جو سیٹوا یجنٹ کہلاتا ہے۔اورنہایت قدیم اور بہت معتبر ترجمہ ہے۔اس میں بھی یہ فقرہ نہیں ہے۔اوراس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم صحیح نسخوں میں یہ الفاظ نہ تھے۔

وہ یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو ضمیر واحد کی ہے۔وھاں اصل میں جمع کی تھی۔جیسے کہ ان حواریوں کی تحریروں اور یونانی ترجمہ سے پایا جاتا ہے۔

میں نے اس بحث کو جناب مولانا مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی کے سامنے پیش کیا۔جو عبرانی زبان اورتوریت مقدس کے بہت بڑے عالم ہیں۔اورغالباً ہم مسلمانوں میں آج تک عبرانی اور کالڈی زبان کا اورتوریت وزبور وصحف انبیاء کا ایسا کوئی عالم نہیں گزرا۔جناب ممدوح نے فرمایا ہے کہ ترجموں کی طرف ہم کوالتجا لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں۔اورجب کہ یونانی ترجمہ توریت کا حضرت عیسیٰ سے پیش تر ہو چکا تھا۔تو حواریوں نے بھی غالباً اسی ترجمہ سے نقل کیا ہوگا۔توپس گویا دلیل صرف ایک یونانی ترجمہ پرعود کرتی ہے۔اورہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ترجمہ کے استدلال سے اصل متن پر کچھ الزام

لگا دیں۔مگر جن لفظوں پر بحث ہے۔ وہ ہمارے مطلب کے بہت زیادہ مفید اور موید ہیں۔

آیت جس کے لفظوں پر بحث ہے یہ ہے کہ ''قائم کرے گا تیرا معبود موجود تیرے لیے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں مجھ سا اس کو مانیو۔'' یہ قول حضرت موسیٰ کا ہے۔اور مخاطب اس کا کوئی خاص شخص نہیں ہے۔ بلکہ کل قوم بنی اسرائیل ہے۔اور تمام قوم جو جنس واحد ہے۔اس کی طرف ضمیر خطاب واحد کا استعمال کیا ہے۔

اب اس مقام پر حضرت موسیٰ کو یہ بتانا تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہونے کا ، بلکہ برادران بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔پس اگر اس مقام صرف یہی کہا جاتا کہ تیرے بھائیوں میں سے ہوگا۔تو یہ بات بخوبی روشن نہ ہوتی کہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا۔ کیونکہ اگر قوم کو صرف یہ کہا جاوئے کہ تمھارے بھائیوں میں سے ہوگا تو اس وقت یہ احتمال ہے کہ اس قوم میں سے کوئی ہو زائل نہیں ہوتا۔اس لیے اولا حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ''تجھ میں سے''۔ پھر اس کا بدل واقع ہوا۔تو اس سے صاف یقین ہوگیا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا، نہ بنی اسرائیل میں سے۔پس اسی طرز کلام سے بنی اسرائیل میں سے اس نبی موعود کے مبعوث ہونے کا احتمال بالکل زائل ہو جاتا ہے۔اور الفاظ کہ ''تیرے بھائیوں میں سے۔'' الفاظ ''تجھ میں سے کا'' بیان تصور نہیں ہو سکتے۔کیونکہ اگر مقصود یہ ہوتا کہ وہ نبی موعود بنی اسرائیل میں سے ہوگا تو خود الفاظ ''تجھ میں سے'' ہی زیادہ تر اس مطلب کا بیان کرنے تھے۔ بہ نسبت الفاظ تیرے بھائیوں میں سے۔پس کسی طرح یہ پچھلے الفاظ پہلے الفاظ کی تفسیر اور بیان نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ پہلے الفاظ کے بدل واقع ہوئے ہیں۔جن سے اس نبی موعود کا بنی اسماعیل سے ہونا معین ہو جاتا ہے۔

انقلس نے جو نہایت قدیم ترجمہ کالڈی زبان کا ہے۔اس مقام پر ترجمہ بصیغہ واحد کیا ہے۔یعنی بجائے اس کے کہ ''تیرے بھائیو میں سے'' اس نے ترجمہ کیا ہے۔ ''تیرے

بھائی میں سے‘‘اس کا سبب یہ ہے کہ عبرانی میں جو لفظ ماحیخا ہے۔اس کے ھرف یا کو اگر علامت اضافت سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ واحد ہونا چاہیئے ۔اور اگر علامت بصیغہ جمع سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ جمع ہونا چاہیئے ۔بہرحال ایک بڑے یہودی عالم کی یہ رائے ہے کہ وہ حرف علت یا اضافت ہے۔اور جب ترجمہ بصیغہ واحد ہو تو صاف قوم بنی اسرائیل کے بھائی کوئی دوسری قوم ہونی چاہیئے ۔اور اس صورت میں بنی اسماعیل میں سے نبی موعود کا ہونا متعین ہو جاتا ہے۔اور ماحیخا‘‘ کا بجز بدل ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ ’’بشارت مثل موسیٰ‘‘ میں بھی یہ بیان کیا ہے کہ یہ کہنا کہ بموجب محاورہ توریت کے بھائیوں کے لفظ سے ہمیشہ بنی اسرائیل ہی مراد ہوتے ہیں۔محض غلط ہے۔ بلکہ کتاب استثناء باب ۲۳۔ ۸ ۔ میں بنی قطورہ پر اور کتاب استثناء باب ۴۔۴۔وصحیفہ اشعیاء باب ۲۰۔۱۲ و باب ۱۸۔۲۵ میں بنی اسرائیل پر لفظ بھائیوں کا بولا گیا ہے۔اور جو کہ ان میں سے بجز اسماعیل کے اور کسی کو برکت نہیں دی گئی تھی۔اس لیے بنی اسماعیل میں سے نبی موعود کا مبعوث ہونا متعین اور منحصر ہو گیا تھا۔

بشارت سوم

حضرت موسیٰ پیغمبر اور حضرت حبوق نبی نے نبی عربی حجازی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصلعم کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دی ہے۔

(اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔)

و یومر بھوا مسینائی باذر ارح مسعیر لا مو ھو فیع مھر باران وانا مر بیوت فودش میمینوایش داث لا سر.الووۃ ستیمان یابو و قادوش مھر

باران سنه كسه مما مابم هود ونهلا نو مالئا ها ارص.

عربی ترجمہ

و قال ان الله طلع من سينا. و اشرق لهم من السعير و من جبل فاران تجلے. بيمينه شريعة بيضا بجند الملائكة آتى. ياتى الله من جنوب والقدوس من جبل فاران. زين السموات الارض بحمده ملئان.

اردو ترجمہ

اور کہا خدا سینا سے نکلا اور سیعر سے چمکا اور فاران کے پہاڑ
سے ظاہر ہوا۔ اس کے ھاتھ میں شریعت روشن ساتھ لشکر ملائکہ کے آیا
(توریت کتاب پنجم باب، ۲۳-۳)

آئے گا اللہ جنوب سے اور قدوس فاران کے پہاڑوں سے آسمانوں کو جمال سے چھپا دیا۔ اس کی ستائش سے زمین بھر گئی (کتاب حبقوق، باب، ۳-۳)

ان آیتوں میں جو کوہ فاران سے خدا کا ظاہر ہونا اور شریعت کا اس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا ہے۔ وہ علانیہ محمد رسول اللہ کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی کہ وہی شریعت ہے۔ بشارت ہے۔

یہ بات عرب کے قدیم جغرافیہ سے اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق اور تسلیم سے اور توریت کے محاورات سے بخوبی ثابت ہوگئی ہے کہ مکہ معظّمہ کے پہاڑوں کا نام فاران

ہے۔ چنانچہ امر مذکورہ کے ثبوت کی کافی دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۸۶۹ء کے کوارٹرلی ریویو میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ جو ایک بہت بڑے عالم یہودی زبان جاننے والے کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۲۹۹ میں لکھا ہے کہ شیفر نے ان خاص آیتوں کی جن میں سینا اور سعیر اور فاران کی بشارت مذکور ہے۔ اس طرح پر تشریح کی ہے کہ خدا سینا سے نکلا'' یعنی عبرانی زبان میں شرح دی گئی ہے۔ (جس سے مراد توریت ہے۔) اور ''سعیر سے چمکا'' یعنی یونانی زبان میں بھی شریعت دی گئی ہے۔ جس سے مراد انجیل ہے۔ اور مسلمان کل عیسائیوں کو رومی کہتے ہیں اور '' فاران کے پہاڑ سے'' ظاہر ہوا اور اس کے ھاتھ میں شریعت روشن یعنی عربی زبان میں شریعت دی گئی (جس سے مراد قرآن مجید ہے) پس اس عالم کے قول سے ثابت ہوا کہ فاران وہی جگہ ہے جہاں سے مذہب اسلام ظاہر ہوا۔ یعنی حجاز یا مکہ معظّمہ۔

چند سطروں کے بعد اسی آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور عیسیٰ کے مستعمل ہوتے ہیں۔ اور ادوم بجائے روم کے اور فاران تو صاف عرب کے لیے مستعمل ہے۔ صرف اس میں شبہ ہے کہ مکہ کے گرد پہاڑوں کا یہ نام ہے یا نہیں۔'' مگر ہم اس شبہ کو بھی مٹا دیں گے۔ اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت کر دیں گے کہ مکہ کے گرد پہاڑ ہی فاران ہیں۔

توریت کتاب اول باب ۲۱۔ آیت ۲۰ میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے حضرت حاجرہ اور اسماعیل کو اپنے پاس سے نکال دیا تو وہ دونوں بیر شبع کے بیابان میں پھرا کیے اور اسی باب کی اکتسویں آیت میں لکھا ہے کہ بیابان فاران میں ساکن ہوئے۔

قرآن مجید سے بھی حضرت اسماعیل کی سکونت بیابان ہی میں معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں حضرت اسماعیل کے اس زمانہ کی سکونت کا ذکر ہے۔ جب کہ حضرت

ابراہیم ان کے پاس آئے تھے۔اور خانہ کعبہ کی تعمیر کر کے اسی کے پاس حضرت اسماعیل کی سکونت مستقل طور پر کر دی تھی۔اور یہ بات توریت سے بھی پائی جاتی ہے۔کہ پہلے حضرت اسماعیل بیابان میں خانہ بدوش تھے۔پھر بیابان فاران میں سکونت اختیار کی۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم   کی دعا اس طرح پر مذکور ہے۔

اللھم انی اسکنت ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم

(قرآن).

کہ اے خدا میں نے اپنی اولاد میں سے تیرے بزرگ گھر کے پاس بن کھیتی کے میدان میں آباد کیا ہے۔لفظ ’’مدبر‘‘ جو توریت میں عبرانی زبان کا آیا ہے۔اور ’’واد غیر ذی زرع‘‘ جو قرآن مجید میں آیا ہے۔ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔پس توریت مقدس اور قرآن مجید میں یہ بات تو متفق ہے کہ حضرت اسماعیل وادی میں آباد ہوئے۔مگر اس وادی کے نام اور مقام میں بحث باقی رہی۔توریت مقدس سے تو اس کا نام فاران معلوم ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید سے اس کا نام اور مقام وہ معلوم ہوا ہے۔جہاں کہ اب کعبہ ہے۔اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مکہ معظّمہ جہاں کعبہ بنا ہوا ہے۔وادی فاران میں واقع ہے تو یہ امر بھی متفق علیہ ہو جاوئے گا۔

اب ہم اس بات سے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔یعنی کعبہ کے پاس حضرت اسماعیل کا آباد ہونا اس سے قطع نظر کرتے ہیں۔اور جو بات توریت میں ہے۔اور جس کو یہودی اور عیسائی دونوں تسلیم کرتے ہیں۔اسی کو مدار اپنے استدلال کا دیتے ہیں۔اور وہ یہ ہے کہ حضرت اسماعیل وادی فاران میں ساکن ہوئے۔

اب ہم کو قدیم جغرافیہ سے اس بات کی تلاش باقی رہی کہ حضرت اسماعیل کس جگہ آباد ہوئے تھے۔کیونکہ جو مقام ان کی سکونت کا ثابت ہو جاوئے گا۔وہی وادی فاران ہو

گا۔

اس مطلب کے حل کرنے کے لیے تین سوال قابل غور ہیں۔

اول: یہ کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل اوران کی ماں کو گھر سے نکال کر کس مقام پر چھوڑا؟۔

دوم:۔ یہ کہ حضرت اسماعیل اوران کی ماں بیابان پھرنے کے بعد کس مقام پر آباد ہوئیں۔

سوم:۔ یہ کہ وہ اسی جگہ رہتی ہیں۔ جہاں انھوں نے سکونت اختیار کی تھی۔ یا کسی اور مقام پر جا کر رہیں۔

قران مجید میں ان باتوں کا کچھ تذکرہ نہیں ہے۔لیکن چند روایتیں اور کچھ حدیثیں اس کے متعلق ہیں۔حدیثوں کا جواس معاملہ سے متعلق ہیں یہ حال ہے کہ وہ کافی اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔اور نہ وہ مرفوع ہیں یعنی ان کی سند پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ والہ وسلم تک نہیں ہے۔پس وہ بھی مثل روایتوں کے نامعتبر ہیں۔اور روایتیں تو کسی طرح اعتبار کے قابل ہے ہی نہیں۔کیونکہ ان میں نہایت اختلاف ہے۔اور مختلف اوقات کے واقعات سب ایک جگہ گڈ مڈ کر دیئے ہیں۔پس پہلے سوال کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے۔اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اوران کے بیٹے حضرت اسماعیل کو دو روٹیاں اورا یک پانی کی چھاگل دے کر نکال دیا۔اور وہ بیر شبع کے بیابان میں پھرا کیں''۔(توریت کتاب اول، باب ۲۱ آیت ۱۶۔)

دوسرے سوال کا جواب اس مقام کی تحقیق کرنے پر منحصر ہے۔جہاں حضرت اسماعیل آباد ہوئے۔اوراس مقام کی تحقیقات کا اس سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمئنان کے کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ہم پرانے جغرافیہ پر متوجہ ہوں۔اور حضرت اسماعیل کی اولاد کے

رہنے کے مکانات کے کھنڈروں کی تحقیقات کریں ،اور جہاں وہ ملیں وہی مقام سکونت حضرت اسماعیل کا ہوگا۔اوروہی مقام وادی فاران بھی ضرور ہوگا۔اس لیے کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ وادی فاران میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے تھے۔؛ا۔نبایوث ۲۔قیدار،۳۔ادبیل ۔۴۔مبسام ۔ ۵۔مشماع ۶۔دوما۔۷۔مسا۔۸۔حدر ۹۔تیما۔۱۰۔بطور۔۱۱۔نافیش ۔۱۲۔قیدماہ۔

پہلا۔بیٹا حضرت اسماعیل کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصے میں آباد ہوا۔ریورنڈ کارٹری پی،کاری،ایم،اے نے اپنے نقشہ میں اس کا نشان ۳۸ ،۳۰ درجہ عرض شمالی اور ۳۶ و ۳۰ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ نبایوث کی اولاد عربیا پیٹرا سے مشرق کی طرف عربیا ڈزرٹا تک اور جنوب کی طرف خلیج الامتک وحجاز تک پھیل گئی تھی۔

اسٹر یبو کے بیابان سے پایا جاتا ہے۔کہ نبایوث کی اولاد نے اس سے بھی زیادہ ملک گھیر لیا تھا۔اور مدینہ تک اور بندر حور اور بندر ینبوع تک جو بحیرہ قلزم کے کنارے پر ہے۔اور مدینہ سے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ان کی عمل داری ہوگئی تھی۔

ریورنڈ مسٹر فاسٹر لکھتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبایوث کی اولاد صرف پتھریلے میدانوں میں نہیں پڑی رہی۔ بلکہ حجاز اور نجد کے بڑے بڑے ضلعوں میں پھیل گئی۔

ممکن ہے کہ نبایوث کی اولاد عرب کے بہت بڑے حصے میں پھیل گئی ہو۔الا یہ بات کہ نبایوث کی سکونت اوراس کی اولاد کی سکونت عرب میں تھی۔بخوبی ثابت ہے۔

دوسرا بیٹا حضرت اسماعیل کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا۔ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیا نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن

حجاز ثابت ہوتا ہے۔جس میں مکہ ومدینہ بھی شامل ہیں۔اورزیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ میں شہرالحدراورنبت سے پایا جاتا ہے۔جواصل میں القیدارادرنبایوث ہیں۔اہل عرب کی یہ روایت کہ قیداراوراس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی۔اس کی تائیداس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے۔دوسرے یہ کہ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ یورینیس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں۔کیڈری یعنی قیدری دری یعنی مخفف قیدری اورکڈور نائٹ یعنی قیداری کریتی یعنی قیدری چنانچہ اس کا ذکرھسٹری جغرافیہ جلداول،صفحہ ۲۴۸ میں مندرج ہے۔پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدارحجاز میں آباد تھا۔

ریورنڈ کارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶،۲۸، درجہ طول شرقی کے درمیان میں لگایا ہے۔

تیسرا بیٹا :۔حضرت اسماعیل کا ادبیل ہے۔بموجب سند جوزیفس کے ادبیل بھی اپنے دونوں بھائیوں کے ھمسایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا بیٹا حضرت اسماعیل کا مبسام ہے۔مگراس کی سکونت کے مقام کا پتانہیں ملتا ہے۔

پانچواں بیٹا حضرت اسماعیل کا مشماع ہے۔ریورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مشماع لکھا ہے۔اس کو یونانی ترجمہ سبٹو ایجنٹ میں مسما اور جوزیفس نے مسماس وبطلیموس نے مسمیز لکھا ہے۔اورعرب میں اس کی اولاد بنی مسما کہلاتی ہے۔پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا قریب نجد کے اولا آباد ہوا تھا۔

چھٹا بیٹا حضرت اسماعیل کا دوماہ تھا۔مشرقی اورمغربی جغرافیہ دان قبول کرتے ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔

دومة الجندل...... قد جاء فی حدیث الواقدی دوماه الجندل وعد ها ابن السقفیة من اعمال المدینة سمیت بدوم ابن اسماعیل و قیل کان لا سماعیل ولد اسمه دما و لعله مغیر منه و قال ابن الکلبی دوما ابن اسماعیل قال و لما کثر ولد اسماعیل عم بالتهامة خرج دوماه بن اسماعیل حتی نزل موضع دومه و بنی له حصنا فقیل دوما و نصب الحصن الیه.....قال ابو عبید السکونی دومة جندل حصن وقری بین الشام و المدینة قرب جبل طے..... دومة من القربات من وادی القریٰ. (معجم البلدان)....

معجم البلدان میں لکھا ہے کہ دومۃ الجندل کا نام واقدی کی حدیث میں دومۃ الجندل آیا ہے۔اور ابن سقیفہ نے اس کوعمال مدینہ میں لکھا ہے۔اس کا نام دوم ابن حضرت اسماعیل ابن حضرت ابراہیم کے نام پر موسوم ہوا ہے۔اور زجاجی کا قول ہے کہ حضرت اسماعیل کے بیٹے کا نام دومان ہے۔اور بعضوں نے کہا ہے کہ حضرت اسماعیل کا ایک بیٹا تھا۔اس کا نام دما تھا۔اور شاید اس کے اصلی نام کو بگاڑ دیا اور ابن کلبی کا قول ہے کہ دوماہ حضرت اسماعیل کا بیٹا تھا۔اور اسی کا قول ہے کہ جب تھامہ میں حضرت اسماعیل کی بہت سی اولاد ہوگئی تو دوماہ وھاں سے نکلا اور بمقام دومہ قیام کیا۔اور وہیں قلعہ بنایا۔اور اس کا نام دوماہ اپنے نام پر رکھا۔اور ابوعبید سکونی کا قول ہے کہ دوماہ جندل قلعہ اور گالوں شام اور مدینہ کے درمیان میں ہے۔قریب جبل طے کے اور دوماہ وادی قری کے گانوں میں سے ہے۔ریورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔اور اب تک یہ مشہور جگہ عرب میں موجود ہے۔

ساتواں بیٹا حضرت اسماعیل کا مسا تھا۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ بیٹا میسو پوٹیما میں آباد ہوا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ جب یہ بیٹا حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا۔ اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا قائم مقام ہے۔ ریورنڈ کارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ طول شرقی میں قائم کیا ہے۔

حضرت اسماعیل اور ان کی تمام اولاد اولا حجاز میں تھی۔ بلا شبہ جب اولاد جوان ہوئی اور کثرت ہوگئی تو مختلف مقاموں میں جا کر سکونت اختیار کی۔ مگر عمدہ بات قابل غور یہ ہے کہ سب کا پتہ عرب میں یا حجاز کے آس پاس پایا جاتا ہے۔

آٹھواں بیٹا حضرت اسماعیل کا حدد تھا۔ اور عہد عتیق میں حداد بھی اس کا نام تھا۔ یمن میں شہر حدیدہ اب تک اس مقام کا پتا بتلا رہا ہے۔ اور قوم حدیدہ جو یمن میں ایک قوم ہے۔ اس کے نام کو یاد دلاتی ہے۔ زہیری مورخ کا بھی یہی قول ہے کہ ریونڈ مسٹر فارسٹر بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں بیٹا حضرت اسماعیل کا تیما تھا۔ ان کی سکونت کا مقام نجد ہے۔ اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے۔

دسواں بیٹا:۔ حضرت اسماعیل کا بطور ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ اس کا مسکن جدور میں تھا۔ جو جبل کسیرنی کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں بیٹا :۔ حضرت اسماعیل کا نافیش تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربیا دزرٹا میں ان کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں بیٹا؛۔ حضرت اسماعیل کا قید ماہ تھا۔ انھوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے خیال کیا ہے کہ قید ماہ کاظمہ میں آباد ہوا تھا۔ جو خلیج فارس پر ہے۔ اور جس کا تذکرہ ابوالفدا ءنے کیا ہے۔ مگر یہ خیال ان کا غلط ہے۔

مسعودی نے صاف لکھا ہے کہ اصحاب الرس حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھے۔

اصحاب الرس کانوا من علد اسماعیل وھم قبیلتان یقال لا حد ھما قدمان والاخریٰ یامین و قیلی رعویل و ذلک بالیمن .(مروج الذھب مسعودی)

مسعودی نے لکھا ہے کہ اصحاب الرس اسماعیل کی اولاد میں سے تھے۔اور وہ دو قبیلے تھے۔ایک کو قدمان کہتے تھے۔اور دوسرے کو یامین اور بعضوں کے نزدیک رعویل اور یہ یمن میں رہتے تھے۔

اب اس تحقیقات کے جو جغرافیہ کی رو سے نہایت قابل اطمینان کے ہے۔دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ایک یہ کہ حضرت اسماعیل اور ان کی تمام اولاد عرب میں آباد ہوئی۔دوسرے یہ کہ مرکز اس خاندان کی آبادی کا حجاز تھا۔جہاں حضرت اسماعیل کی مقدم اولاد کا مسکن ہوا تھا۔اور پھر اس مرکز سے اور طرف عرب میں پھیلی۔پس ثابت ہوا کہ حضرت اسماعیل نے حجاز میں سکونت کی تھی۔اور اسی کا قدیم نام فاران ہے۔جو حضرت موسیٰ اور حبقوق نے اپنی اپنی بشارتوں میں بتایا ہے۔

توریت سامری کا عربی ترجمہ جس کو آرکیونن نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گلدونی نیاورم چھاپا۔فاران کو حجاز بتلایا ہے۔چنانچہ اس ترجمہ کی بعینہ یہ عبارت ہے:۔

و سکن بربہ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ امرۃ من ارض مصر" (عربی ترجمہ توریت سامری

لفظ حجاز جو دو ہلالی خطوں میں ہے۔مترجم نے اسی طرح لکھا ہے۔

اگرچہ یہ بات نہایت صفائی سے ظاہر ہے کہ وادی حجاز اور وادی فاران دونوں ایک

ہیں۔اورحضرت اسماعیل کے خاندان کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈراس کی گواہی دے رہے ہیں۔مگر بایں ہمہ عیسائی اس کوتسلیم نہیں کرتے۔اورموقع فاران کی نسبت مفصلہ ذیل تین رائیں قرار دیتے ہیں:۔

اول: یہ کہ اس وسیع میدان کو جو بیرشبع کی شمال حد سے کوہ سینا تک پھیلا ہوا ہے۔ فاران کہتے ہیں۔اوراس کی حدیں عموماً اس طرح پرقرار دیتے ہیں۔

حدشمالی،کنعان ۔حدجنوبی،کوہ سینا

حدغربی،ملک مصر۔حدشرقی کوہ سعیر

اور کہتے ہیں کہ اس حد میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی وادیاں علیحدہ علیحدہ نام سے شامل ہیں۔مثلاًشور،بیرشبع ،انہان،سینا،سن،زن،وایدم وغیرہ۔

دوسرے یہ کہ قادیش جہاں حضرت ابراہیم نے کنواں کھدوایا،جس کا نام بیرشبع تھا۔اورفاران دونوں ایک ہیں۔

تیسرے یہ کہ فاران اس وادی کو کہتے ہیں جو کوہ سینا کے مغربی نشیب پر واقع ہے۔اور جہاں بہت سی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اور پرانی قبریں اور میناریں وغیرہ اب تک موجود ہیں۔مسٹرروپر کا بیان ہے کہ اس مقام پرایک ٹوٹا ہوا گرجا ملا جوحضرت عیسیٰ کے بعد پانچویں صدی کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ چوتھی صدی میں اس مقام پرعیسائی رہتے تھے۔اورایک بشپ بھی وہاں رہتا تھا۔

ہماری رائے میں یہ تینوں توجہیں محض غلط ہیں۔اورکسی طرح توریت مقدس کے بیان کے مطابق نہیں ہیں۔چنانچہ ہم ان تینوں توجہوں کی تردید کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ توجہیں نہایت مختصر تقریر سے رفع ہوسکتی ہیں۔کہ جب ان مقاموں میں

حضرت اسماعیل یا ان کی اولاد کے رہنے کا کوئی نشان تک نہیں ہے۔تو پھر کیوں کر وہاں مقام فاران تصور ہو سکتے ہیں۔مگر ہم اس سے قطع نظر کر کے ہر ایک توجیہ کی جدا جدا تردید بیان کریں گے۔

توجیہ اول کی تردید

پہلی توجیہ کا منشا یہ ہے کہ فاران ایک بہت بڑی وادی ہے۔اور اس میں شور وسینا وغیرہ سب داخل ہیں۔اس توجیہ کی تردید کے لیے توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دینی کافی ہیں۔جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فاران ایک مستقل اور جداگانہ وادی ہے۔اور وادیوں سے مل کر نہیں بنی ہے۔

۱۔توریت کتاب چہارم باب ۱۰ آیت ۱۲ میں لکھا ہے "بنی اسرائیل نے بیان بیابان سینی سے کوچ کیا اور بادل بیابان پاران میں ٹھہر گیا۔" پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بیابان سینی ایک جدا بیابان اور پاران جدا بیابان ہے۔

۲۔توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶ میں لکھا ہے کہ "کدر الاعومر" نے حوریوں کو پہاڑ سعیر میں ایل فاران تک جو سحارا کے نزدیک ہے مارا" پس اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ سعیر جدا ہے۔اور وادی پاران علیحدہ ہے۔

۳۔توریت کتاب چہارم باب ۱۳ آیت ۱۶ باب ۱۳ آیت ۳۔ میں لکھا ہے کہ "بنی

اسرائیل حصیروت سے چلے اور بیابان فاران میں ٹھیرے‘‘ اور وہاں سے زمین کنعان کی تلاش کو سرداران قوم روانہ کیے۔اس سے صاف ثابت ہے کہ حصیروت سے آگے فاران اور ان سب وادیوں سے علیحدہ وادی ہے۔

۴۔پھر اسی کتاب کے باب ۱۳ آیت ۲۵، ۲۶ میں لکھا ہے کہ وہ سرداران کنعان کو دیکھ کر پھرے۔تو بیابان فاران میں سے قادیش میں پہنچے‘‘۔پس کنعان سے مراجعت کرتے وقت پہلے بیابان فاران پڑتا ہے۔اور پھر قادیش اور یہ بالکل ٹھیک ہے۔کیونکہ قادیش جہاں ابراہیم نے بیر شبع بنایا اور بیابان فاران باھم پیوستہ ہیں۔قادیش شمالی سرحد فاران پر واقع ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ بیر شبع ابراہیم والا اور قادیش ایک ہیں۔اس لیے کہ وہ قادیش میں بنایا گیا تھا۔اور اسحاق نے جو بیر شبع بنایا وہ۔علیحدہ اور قریب فلسطین کے واقع ہے۔ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ خیال میں رکھنا ضرور ہے۔

یہ دونوں آیتیں توریت اور کتاب حبقوق نبی کی جن میں ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارتیں مندرج ہیں۔اور جن پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ان سے بھی ظاہر ہے کہ فاران وسعیر سب علیحدہ علیحدہ مقام ہیں۔

۵۔کتاب اول سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۸ میں حدد اور اس کے ہمراھیوں کے مصر جانے کے حال میں لکھا ہے کہ وہ مدیان سے نکلے اور فاران میں آئے۔اور وہاں سے آدمی ساتھ لے کر مصر کو گئے۔مدیان وہ شہر ہے جس کو عرب میں مدین کہتے تھے۔اور ساحل بحر قلزم پر جو حجاز کی جانب ہے۔تبوک سے تخمینا چھ منزل جانب جنوب واقع ہے۔اور یہ شہر عین وادی فاران میں واقع ہے۔جو ٹھیک حجاز ہے۔اس سے دو مطلب ایک حجاز اور وادی فاران کا ایک ہونا، دوسرے وادی فاران کا ایک مستقل جدا وادی ہونا ثابت ہوتے ہیں۔

توجیہ دوم کی تردید

توجیہہ دوم کی تردید یہ تھی کہ وادی فاران اور قادیش دونوں ایک ہیں۔اس توجیہہ دوم کی تردید میں توریت کی چند آیتیں لکھی جاتی ہیں۔جن سے معلوم ہوگا کہ وہ الگ الگ مقام ہیں۔

ا۔توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶۔ ۷ میں لکھا ہے کہ ''کدرلاعومر'' نے حوریوں کو پہاڑ سعیر میں اہل فاران تک جو صحرا کے نزدیک ہے۔مارا۔اور وہاں سے پھر کر عین مشپاط میں جو قادیش ہے آئے''۔اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ پاران اور قادیش دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔متحد نہیں۔

۲۔توریت کتاب چہارم باب ۱۳ آیت ۲۶ میں لکھا ہے کہ ''وہ سردار جو حضرت موسیٰ نے بھیجے تھے۔ازطرف فاران قادیش میں پہنچے۔''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادیش اور فاران جدا جدا دو مقام ہیں۔

آیت جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔اس کے ترجمے میں لوگوں نے کس قدر غلطی کی ہے۔اس لیے ہم اس آیت کو معہ ترجمہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

وبیلخو ویا یشوال موشه وال اهارون وال کل عدت بنی اسرائیل

آل مدير پاران قاديشه.

عربی ترجمہ

ورحلوا وجاوا الی موسیٰ و الیٰ هارون والی کل جماعة بنی اسرائیل الی برية فاران بالقادس.

اردو ترجمہ

اور کوچ کیا اور آئے موسیٰ اور ھارون اور تمام جماعت بنی اسرائیل کے پاس ظرف میدان فاران کے قادیش میں۔

انقلس نے اس مقام پر قادیش کو مقام نہیں خیال کیا۔ بلکہ اس کے معنی نائل کے لیے ہیں۔ یعنی فاران میں واپس آئے بےنیل ومرام پس اگر یہ معنی لیے جاویں تو اس آیت سے قادیش اور فاران کے ایک ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔

توجیہہ سوم کی تردید

توجیہ سوم کی تردید یہ ہے کہ پاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے۔ جہاں کھنڈرات بھی پائے گئے تھے۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ ہم اس بیابان کے وجود سے جوکوہ سینا کے نشیب میں واقع ہے۔ انکار نہیں کر سکتے۔ مشرقی جغرافیہ دانوں کی تحریروں سے ثابت ہے کہ تین مقام فاران کے نام سے مشہور ہیں۔

ایک کوہستان حجاز یعنی مکہ معظّمہ اور ابو نصر بن قاسم بن قضاعۃ القضاعی الفاالاسکندری جو حجاز کا رہنے والا تھا۔ وہ حجاز ہی کے رہنے کے سبب فارانہ کہلاتا ہے۔ دوسرا فاران کوہ طور پر یا سینا کے پاس تھا۔ اور تیسرا فاران نواح سمرقند میں واقع تھا۔ چنانچہ یہ تفصیل کتاب مشترک یاقوت حمودی میں لکھی ہے۔

جو فاراں کہ نواح سمرقند میں تھا۔ وہ تو بحث سے خارج ہے۔ جو کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے۔ مگر اس کی نسبت اس قدر اور تحقیقات کرنی باقی ہے۔ کہ آیا اس مقام پر فاران حضرت ابراہیم کے بلکہ حضرت موسیٰ کے وقت میں تھا۔ یا نہیں اور یہ وہی وادی ہے۔ جس کا ذکر توریت میں ہے۔ اور جہاں بیر شبع کے بیابان میں پھرنے کے بعد حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ نے قیام کیا تھا۔ اور یہ وہی مقام ہے۔ جہاں اسماعیل کی اولاد آباد تھی۔ ان باتوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف ثابت ہے۔ جیسا کہ اگلی بحثوں میں بیان ہو چکا ہے۔ مگر باایں ہمہ جو دلیلیں عیسائیوں نے اس فاران کی نسبت لکھی ہیں۔ اور جس کو ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے ایک نہایت عمدگی اور غور سے جمع کر دیا۔ ان سب کی ہم تردید بیان کرتے ہیں۔ تاکہ بحث بخوبی پوری ہو جاوے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ ''توریت کتاب اول باب ۲۵ و آیت ۱۷ میں لکھا ہے۔'' کہ اسماعیل کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو اشور کو جاتے ہوئے مصر کے برابر پڑتا ہے۔ آباد ہوئی، اس آیت کو لکھ کر وہ کہتے ہیں کہ ''اقرار خدا کا پورا ہو گیا'' کہ بنی اسماعیل شور

سے حویلاہ تک یعنی عرب میں مصر کے کنارہ سے دریائے فرات کے موھانہ تک پھیل گئی۔‘‘

پہلی غلطی مصنف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دریائے فرات کے موھانہ پر قرار دیتے ہیں۔حالانکہ وہ مقام جس کا پانی حویلاہ ہے۔اور جس کا نام توریت کتاب اول باب ۱۰ آیت ۲۹ میں آیا ہے۔یمن کے قریب واقع ہے۔چانچہ ریورنڈ کارٹری پی کاری ایم۔اے کے نقشہ میں اس کا نشان ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۲ درجہ ۳۰ دقیقہ طول شرقی پر لگایا ہے۔اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسری غلطی اس مصنف کی یہ ہے کہ وہ شور کو عربیا پیٹریا کے مغرب میں بتاتے ہیں۔اور یہ صریح غلطی ہے۔کیونکہ شور کے بیابان سے وہ وسیع میدان بنایا جاتا ہے۔جو سریا کے جنوب سے مصر تک پھیلا ہوا ہے۔

توریت کی جس آیت کا ریورنڈ کارٹری پی کاری ایم۔اے نے ذکر کیا۔یعنی کتاب اول باب ۲۵ آیت ۱۸ اس میں دو لفظ ہیں۔اشورہ اور کسی نام کے ساتھ لفظ بیابان کا نہیں ہے۔شور کا نام ھال میں سریا ہے۔اور کچھ شک کا مقام نہیں ہوسکتا کہ حال کا نام اشورہ کا سریا ہے۔پس صاف ظاہر ہے کہ اسماعیل کی اولاد اس قطعہ زمین میں آباد ہوئی جو یمن کی شمالی سرحد سے سریا کی جنوبی سرحد تک ہے۔اور یہی امر مطابق واقعہ کے بھی ہے۔اور توریت مقدس کے بیان کے مطابق بھی ہے۔اور اسی مقام پر اسماعیل کی اولاد کی آبادیوں کے نشان ملتے ہیں۔اور یہی ٹکڑا زمین کا حجاز کہلاتا ہے۔اور اسی کا قدیم نام فاران ہے۔اور یہ ہمارا بیان اس بات سے اور زیادہ صحیح ہو جاتا ہے کہ جو مسافر وھاں سے اس سریا کو جاتا ہے۔تو ٹھیک مصر سامنے ہوتا ہے۔جیسا کہ توریت مقدس میں لکھا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال کے خط سے جو گلیشین کے نام لکھا تھا۔ایک نیا نتیجہ نکالتے ہیں۔کہ کوہ سینا اور ھاجر متحد ہیں۔مگر یہ بھی سرتاسر غلطی ہے۔ہم ریورنڈ مسٹر فارسٹر

سینٹ پال کے خط کی وہ عبارت لکھتے ہیں۔اور پھراس کا مطلب بیان کر کے ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال کی غلطی بتاتے ہیں۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال کے خط کی یہ عبارت ہے"تم جو شریعت کے تابع ہوا چاہتے ہو۔" کیا تم نہیں سنتے کہ شریعت کیا کہتی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ایک لونڈی سے دوسرا بیوی سے۔ جو لونڈی سے پیدا ہوا تھا۔جسمانی طور پر پیدا ہوا تھا۔اور جو بیوی سے تھا۔سو وعدہ کے طور پر پیدا ہوا۔ یہ باتیں تمثیلیں ہیں۔اس لیے کہ یہ دو عہد ہیں۔ایک تو سینا پہاڑ سے جس سے نرے غلام پیدا ہوتے ہیں۔اور یہ حاجرہ ہے۔ کیونکہ حاجرہ عرب کا کوہ سینا اور یہاں کے یروشلم کا جواب ہے۔ جو اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے۔سو یہی ہم سب کی ماں ہے۔(نامہ ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال بنام گلیشین آیت ۲،لغایت ۲۶۔)

اس مقام پر جو لفظ آیا ہے کہ" یہ ہاجرہ ہے" اس سے اس بات پر کہ کوہ سینا اور حاجر ایک ہے۔استدلال نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس مقام پر امر مذکور بیان نہیں ہوا۔ بلکہ سارا بیان بطور تمثیل کے ہے۔

سینٹ پال ان لوگوں کو جنھوں نے صاف ظاہری احکام شریعت کی پابندی اختیار کی تھی۔اور اس کے نتیجہ یعنی روحانی نیکی کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔ان کو نصیحت کرتے تھے۔یہ بات یہودیوں میں مشہور تھی کہ حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ایک حضرت اسماعیل لونڈی سے(گو کہ یہ امر غلط ہے مگر یہ مقام اس بحث کا نہیں ہے۔) دوسرے حضرت اسحاق جو بیوی سے تھے۔اور یہ بھی مشہور تھا کہ حضرت اسماعیل تو جسمانی ہیں اور حضرت اسحاق روحانی تھے۔ جو بموجب وعدہ کے پیدا ہوئے تھے۔اب سینٹ پال حضرت اسحاق کی اولاد یعنی بنی اسرائیل کا بھی جسمانی ہونا اور صرف عیسائیوں کا روحانی بیٹا ہونا بیان کرنا چاہتے

ہیں۔اوراس لیے کہتے ہیں کہ جسمانی اورروحانی ہونا یہ توتمثیلیں ہیں۔حقیقت میں یہ دوعہد ہیں۔اب وہ کہتے ہیں کہ ایک تو کوہ سینا سے ہے۔جس سے بنی اسرائیل اسحاق کی اولاد مراد ہے۔مگراس عہد سے بھی غلام پیدا ہوتے ہیں۔یعنی صرف ظاہری شریعت میں پڑے ہوئے ہیں۔اب وہ کہتے ہیں کہ ''یہی ہاجرہ ہے'' یعنی بمعنی لونڈی کی اولاد ہونا ہے۔اوراس کی دلیل بیان کرتے ہیں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے۔اوریروشلم کا جواب ہے۔جو یعنی یروشلم اپنے لڑکوں یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ غلامی میں ہے۔آگے وہ کہتے ہیں کہ روحانی یروشلم کا ہم کو بیٹا ہونا چاہیئے۔اورمثل لونڈی کی اولاد کے غلامی کی حالت کو چھوڑ دینا چاہیئے۔پس اس مقام سے ھاجرہ اورکوہ سینا کا ایک ہونا ثابت نہیں ہوتا۔بلکہ صاف پایا جاتا ہے۔کہ حضرت ہاجرہ کوہ سینا سے علیحدہ عرب میں (حجاز) میں تھیں۔جن کو تمثیلاعرب کا سینا بیان کیا ہے۔یروشلم کا مقابل۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر کتاب اول تواریخ ایام کی آیت ۹،۱۰ کی سند پر بیان کرتے ہیں کہ ھگری یعنی بنی ھاجرہ کنارہ دریائے فرات زمین گلعاد میں ساکن تھے۔اور وہاں چند آبادیوں کے ایسے نام بھی تلاش کیے ہیں جو بنی اسماعیل کے ناموں کے مشابہ یا مطابق ہیں۔

مگراس کہنے سے کیا فائدہ ہے۔بلاشبہ زمانہ کے دور میں بنی اسماعیل حجاز سے نکلے اورتمام عرب میں خلیج فارس تک پھیل گئے۔فاران کی تحقیقات میں اس مقام کو تلاش کرنا چاہیئے۔جہاں حضرت اسماعیل آباد ہوئے۔سو وہ ثابت ہو گیا کہ حجاز میں اور گرد مکہ آباد ہوئے۔پس وہی مقام فاران ہے۔بعد میں وہ کتنی دور تک ملکوں میں پھیل گئے ہوں۔اس سے کچھ بحث نہیں ہے۔

جو فاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں ہے،اور جس کے کھنڈرات ملے ہیں۔وہ

توریت کا فاران نہیں ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے زمانہ تک اس کا وجود نہ تھا۔ حضرت موسیٰ جب مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے۔ اور انھوں نے بحر احمر کی غربی شاخ کی نوک کو پار کیا۔ جس کے پانی کو بہ سبب سمندر کے جذر کے خدا نے ھٹا دیا تھا۔ شور کے جنگل میں پہنچے اور جب سن کے جنگل کو طے کیا اور افیدم میں مقام ہوا تو وھاں عمالیق آئے اور موسیٰ سے لڑے۔ چناں چہ یہ سب حال توریت کتاب دوم، باب ۱۷، آیت ۱، لغایت ۸ میں مندرج ہے۔ کہ ''عمالیق آن کر لڑے'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمالیق افیدیم کے باشندے نہ تھے۔ اور کیوں کو ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ مقام محض بے آب و گیاہ تھا۔ مگر اس مقام پر اتنی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افیدیم کوہ سینا کے مغرب میں یعنی شرقی مصر میں واقع ہے۔

اب یہاں سے حضرت موسی مشرق کی طرف یعنی کوہ سینا کی طرف چلے اور بیابان کوہ سینا میں پہنچ گئے۔ اور اس سفر میں وہ مقام فاران جس کا غربی کوہ سینا میں واقع ہونا بیان کیا جاتا ہے گزر گیا۔ اور حضرت موسیٰ نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

اب اسرائیل کوہ سینا سے آگے بڑھے اور شمال مشرق کو چلے۔ اس راہ میں حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ''بنی اسرائیل بیابان'' سے نکلے اور بادل بیابان فاران میں ٹھہر گیا (توریت کتاب چہارم باب ۱۰ آیت ۱۲۔)

پس اب بخوبی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں بیابان فاران جانب شمال و شرق کوہ سینا کے تھا۔ جو قریب قادیش کے واقع ہے۔ اور وہی بیابان حجاز کا ہے۔ نہ غربی نشیب کوہ سینا کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب العاریہ کی ایک قوم جو اولاد میں فاران ابن عوف بن حمیر کی تھی اور جو بنی فاران کے نام سے کہلاتی تھی۔ کسی زمانہ میں وھاں جا کر بسی ہوگی۔ اور اس سبب سے وہ مقام فاران مشہور ہو گیا ہوگا۔ مگر وہ فاران ہرگز وہ فاران نہیں ہے۔ جس کا ذکر توریت میں ہے۔

تمام مشرقی مورخ اور جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں۔کہ جو کوھستان حجاز میں واقع ہیں۔وہی فاران ہیں۔ان کے اس قول کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حمیر جو عرب کا بادشاہ تھا۔اس کا بیٹا عوف تھا جو نجد میں تھا۔اور جس کے نام سے کوہ ستان نجد معروف ہے۔جیسا کہ کتاب مراصد الاطلاع علی اسماء الامکنہ والبقاع میں لکھا ہے۔اور تاریخ ابوالفدا سے ثابت ہے کہ

عوف بفتح اوله وسكون ثانية و آخره فاء جبل بنجد..... وعوق بالفتح ارض فی دیار غطفان بین نجد و خیبر (مرا صد الاطلاع).

تاریخ ابوالفدا ء سے ثابت ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا۔اور نہایت قیاس غالب ہے کہ متصل نجد کے جو زمین وکوھستان حجاز کے واقع ہیں۔وہ اس فاران کے نام ست موسوم ہوئے۔مگر جو کہ اس مقام پر ایک اور نامی اور متبرک چیز یعنی کعبہ معظّمہ قائم ہو گیا۔اور اس سبب سے بجائے پہلے نام فاران کے مکہ یا کعبہ کا نام مشہور ہو گیا۔

فاران سنہ ۱۹۷۸ دینوی میں تھا۔یعنی حضرت موسیٰ سے ۴۵۳ برس پیش تر۔پس اسی فاران کا نام حضرت موسیٰ کی کتاب میں آیا ہے۔جہاں سے شریعت کے ظاہر ہونے اور خدا کے چمکنے کی بشارت دی گئی تھی۔جو خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہوئے۔اور قرآن مجید کے نازل ہونے سے پوری ہوئی۔

اب باقی رہ گیا۔تیسرا سوال اور وہ یہ تھ کہ حضرت اسماعیل جہاں رہتے تھے۔وہاں سے کسی دوسری جگہ تو نہیں جا رہے۔اس بات کو کوئی بھی مورخ کیا عیسائی کیا یہودی اور کیا مسلمان نہیں بیان کرتا کہ حضرت اسماعیل نے مقام سکونت کو تبدیل کیا تھا۔پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہی ملک حجاز جہاں حضرت اسماعیل سے اول سے آخیر تک سکونت اختیار کی تھی۔فاران ہے۔جس کا ذکر حضرت موسیٰ کی کتاب میں آیا ہے۔

بشارت چہارم

حضرت سلیمان اپنے محبوب سے ملنا چاہتے ہیں۔اور جب نہیں مل سکتے تو خدا تعالیٰ کی مناجات اور اپنے محبوب کی تعریف اس طرح پر کرتے ہیں۔

(اس عبرانی عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔)

دودی صخ وادوم وغول مر بابه روشو کثم پاز قصو ثاؤ تلتليم شحووث کعو ديب عناؤ کيو نيم على افيقی مايم رحصوث بحالاب يو شبوث عل مليث: لحا باؤ کعر وغث هبمومم معد لوث مر قا خيم سفثوثاؤ شو شنيم نطا فوث مورعو بير يا داو گليلی زاهاب مملائيم بتر سيش معاؤ عشث شين معلفث سپيريم شوقا ؤ عمودی شيش ميسا ديم عل ادنی باز مئيهو کلبا نون با حور کار از يم : حکو ممنقيم و خنبر محمد يم زه دودی و زه رعی بوت يرو شلايم .

عربی ترجمہ

جيبی ضح ادمان سيد بين الا لاف قصة متلتله حالک کالغراب راسه لامعة الا لماس عيونه کحما مة على عين الماء مغسوله با لحليب قائمة الخيتام عذا ء صلاية الطيب کمعرج البشام شفتاه ورد تقطر مرابطنه صحيفة العاج مر صص بالدور ويداه مصو غتان من الذهب

ملوتان بالجوهر سيقانه اعمدة الرخام موسة على قواعد اللئالى صورة تمراء شاب كا الصنوبر حنكة حلو وكله محمديم هذا خيلى وذاحببى بنات اور شليم.

اردو ترجمہ

میرا دوست گندم گون ھزاروں میں سردار ہے۔اس کا سرا ھیرے کا سا چمک دار ہے۔اس کی زلفیں مسلسل مثل کوے کے کالی ہیں۔اس کی آنکھیں ہیں جیسے پانی کے کنڈل پر کبوتر دودھ میں ڈھلی ہوئی نگینہ کی مانند جڑی ہیں۔اس کے رخسارے ایسے ہیں جیسے ٹٹی پر خوشبودار بیل چھائی ہو۔اور چکلے پر خوشبو رگڑی ہو۔اس کے ھونٹ پھول کی پنکھڑیاں، جن سے خوشبو ٹپکتی ہے۔ اس کے ھاتھ سونے میں ڈھلے ہوئے اور جواھر سے جڑے ہوئے۔اس کا پیٹ جیسے ہاتھی دانت کی تختی جواھر سے لپی ہوئی۔اس کی پنڈلیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کے ستون سونے کی بیٹھکی پر جڑے ہوئے۔اس کا چہرہ مانند مہتاب کے جوان مانند صنوبر کے،اس کا گلا نہایت شیریں۔اور وہ بالکل محمد ﷺ یعنی تعریف کیا گیا ہے۔یہ ہے میرا پیارا اور میرا محبوب اے بیٹیوں یروشیم کی (کتاب تشبیجات سلیمان باب ۵ آیت ۱۰ الغایت ۱۶)۔

اگر چہ اس مقام پر حضرت سلیمان نے خدا کی تسبیح میں گیت گایا ہے۔اور اس کی مناجات کی ہے۔مگر ضرور وہ ایک کسی

ا۔تشبیجات سلیمان سے سرسید کی مراد توریت کی کتاب غزل الغزلات سے ہے۔موجودہ توریت میں جو آج کل شائع ہو رہی ہے۔عبارت کچھ مختلف ہے۔مگر مطلب وہی

ہے جو سر سید نے لکھا ہے۔(محمد اسماعیل)

بڑے شخص قابل تعظیم و ادب کے آنے کے متوقع ہیں، اور اس کی بشارت دیتے ہیں۔ اور اسی کو اپنا محبوب بتاتے ہیں۔ اور اپنے محبوب کی شاعرانہ تعریف کرتے ہیں۔ اور پھر صاف بتاتے ہیں کہ وہ میرا محبوب ہے (محمدؐ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(محمدؐ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معنی تعریف کیے گئے ہیں۔ پس حضرت سلیمان نے اپنی مناجات میں اپنے محبوب کی تعریف کرتے کرتے اس کا نام ہی لے دیا کہ اگر اس کے معنی لو تو وہ بھی ایک لفظ تعریف ہے۔ ورنہ وہ صاف صاف نام تو ہے ہی۔

یہ مقام ایسا ہے جس میں صاف نام (محمدؐ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتا دیا گیا ہے۔ مگر ہمارے خطبہ پڑھنے والوں کے دل میں شبہ رہ جائے گا کہ اگر یہ نام بتانا تھا تو (محمدؐ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا ہوتا۔ محمدیم کیوں کہا؟ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عبرانی زبان میں، لیے، اور، میم، علامت جمع کی ہیں۔ اور جب کوئی بڑی قدر کا شخص اور عظیم الشان ہوتا ہے۔ تو اس کے اسم کو بھی جمع بنا لیتے ہیں۔ جیسا کہ خدا کا نام الوہ ہے۔ اور اس کی جمع الوھیم بنا لی ہے۔ اور اسی طرح بعل جو ایک بت کا نام ہے۔ جس کو نہایت عظیم الشان سمجھتے تھے۔ اس کی جمع بعلیم بنا لی تھی۔ اور یہی قاعدہ اسم استروث میں لگایا گیا ہے۔ جو دوسرے بت کا نام ہے۔ پس اسی طرح حضرت سلیمان نے بہ سبب ذی قدر اور عظیم الشان ہونے کے اپنے محبوب کے اس نام کو بھی صیغہ جمع کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اور سچ ہے (محمدؐ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کون شخص محمدیم کہلانے کا مستحق ہے۔ پس یہ ایسی بشارت ہے جس میں صاف صاف نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔

بشارت پنجم

تحجیٰ نبی ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دیتے ہیں۔

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

و ھـر عشتی اث کـل ھکویم و باؤ حمدث کل ھکوئیم وملئی اث ھبا یث ھزہ کایود امریھو اصبا ؤ ث.

عربی ترجمہ

و از لـزل الا مـم کـلھـا و حمد جمیع الا مم تجئی و املا ھذا البیت مجد ا قال رب الخلایق .

اردو ترجمہ

سب قوموں کو ہلا دوں گا۔اور حمد سب قوموں کا آوئے
گا۔اوراس گھر کو بزرگی سے بھروں گا کہا خداوند خلائق نے (کتاب
حجی نبی باب ۱۱ آیت ۷)

اس آیت میں لفظ (حمدث) جو آیا ہے۔اس سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت بشارت نکلتی ہے۔ریورنڈ مسٹر پارک ھرسٹ حمد کے مادہ کی نسبت کہتے ہیں کہ ''ہر قسم کی پاک چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے۔'' اسی مادہ سے محمد اور احمد اور حامد اور محمود ہمارے پیغمبر خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک نکلے ہیں۔اور اس بشارت میں لفظ حمدث کے کہنے

سے صاف اشارہ ہے کہ جس شخص کے مبعوث ہونے کی اس میں بشارت ہے۔ وہ ایسا شخص ہے کہ اس کا نام حمد کے مادہ سے مشتق ہے۔ اور وہ کوئی نہیں سوائے محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے۔

عیسائی مذہب کے پادری خیال کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کے مبعوث ہونے کی ہے۔ مگر یہ خیال دو وجہ سے صحیح نہیں: اول اس لئے کہ حضرت متی نے جس قدر بشارتیں عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ کی کی ہیں۔ ان سب کو بالتفصیل اپنی انجیل میں لکھا ہے۔ کیونکہ وہ انجیل عبرانی زبان میں یہودیوں کی ہدایت کے لیے لکھی گئی تھی۔ اور اسی سبب سے تمام بشارتیں جو توریت و زبور و صحف انبیاء میں حضرت عیسیٰ کے متعلق تھیں۔ ان سب کو حضرت متی نے لکھا تھا۔ مگر اس بشارت کا ذکر حضرت متی نے نہیں کیا۔ اگر یہ بشارت حضرت عیسیٰ کے متعلق ہوتی تو حضرت متی اس کا ذکر ضرور کرتے۔

دوسرے یہ کہ حمد کے مادہ سے حضرت عیسیٰ کے نام پر کسی طرح کا اشارہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یہ اشارہ خاص اسی شخص کے نام کا ہوسکتا ہے۔ جس کا نام اسی مادہ کے نام سے مشتق ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی ہے۔ جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی کہ ''یاتی من بعدی اسمہ احمد۔''

گاڈ فری ھیگنس نے بھی اپنی کاتب میں باستدلال قول ریورنڈ پارک ہرسٹ صاحب کے لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس شخص کی ہے۔ جس کے آنے کی بشارت خود حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔

بشارت ششم

حضرت اشعیا نبی وحی کی رو سے ان لوگوں کا ذکر جو خدا کی سچی پرستش از سرنو قائم کریں گے۔اوراس طرح پر کرتے ہیں۔

اس عبارت کوعربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔

ورائا رخب صمد بارشیم رخب حمور رخب گا مال وھقشیب قشب رب قاشب

عربی ترجمہ

و رائی مرکب الفارسین راکب حمار راکب جمل والفت التفا تاجیدار

اردو ترجمہ

اورایک جوڑی سواروں کی دیکھی۔اورایک سوار گدھے کا۔

اوراونٹ کا اورخوب متوجہ ہوا(کتاب اشعیا نبی باب ۲۱ وآیت ۷)۔

اس آیت میں حضرت اشعیا نبی نے دوشخصوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔جوخدا کی سچی پرستش از سرنو قائم کریں گے۔ان میں سے ایک کو گدھے کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے۔اوراس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ ہے۔کیونکہ جناب ممدوح گدھے پرسوار ہوکر یروشلیم (بیت المقدس) میں داخل ہوئے تھے۔اور بلاشبہ حضرت عیسیٰ نے خدا کی سچی پرستش قائم کی۔اور یہودیوں نے جو مکاری اور دغا بازی سے

شریعت کے صرف ظاہری احکام کی ریا کاری سے پابندی اختیار کی تھی۔اور دلی نیکی وروحانی پاکیزگی کو بالکل چھوڑ دیا تھا۔اس کو بتایا اور خدا کی سچی پرستش قائم کی۔

دوسرے شخص کو اونٹ کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے۔اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس سے حضرت محمد رسول اللہ کی طرف اشارہ ہے۔جو عرب کی خاص سواری ہے۔بچے سے بوڑھے تک اور عالم سے جاہل تک جس سے چاہو پوچھو اونٹ کا نام لیتے ہی عرب کا اشارہ سمجھ جاوئے گا۔اور جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں داخل ہوئے تو اونٹ پر سوار تھے۔اور بلاشبہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدائے واحد کی پرستش قائم کی۔حضرت عیسیٰ کے بعد جو لوگوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنایا تھا۔اور تین خدا قائم کرکر پھر تین میں سے ایک خدا بنایا تھا۔اور خدائے واحد کی پرستش میں خلل آ گیا تھا،اس کو مٹایا اور پھر سے خدا کی سچی پرستش قائم کی۔اور یوں فرمایا ''یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان الا نعبد الا اللہ۔''

بشارات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انجیل میں سے بشارت اول

عید فسح سے تھوڑی مدت پہلے جب حضرت عیسیٰ کو معلوم ہوا کہ اب ان کا وقت بہت قریب آ گیا ہے۔ اوراب وہ گرفتار ہونے والے ہیں تو انھوں نے اپنے حوایوں کو بہت سی نصیحتیں کیں۔ ان ہی نصیحتوں میں یہ بھی فرمایا کہ ''یہ امور میں نے تم میں سے کہے۔ جب کہ تمہارے ساتھ ہوں، لیکن پیریکلیطاس پاک روح جس کو باپ بھیجے گا۔'' میرے نام سے ہر بات تم کو سکھاوئے گا۔ اور یاد دلائے گا تم کو تمام وہ باتیں جو نہ میں نے تم سے کہی ہیں (انجیل یوحنا، باب ۱۴، ۲۵، ۲۶۔)

تاہم میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ یہ بھلا ہے تمہارے لیے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو پیریکلیطاس تمھارے پاس نہ آوے گا۔ (انجیل یوحنا، باب ۱۶، ۷)

بالفعل جو انجیل کے نسخے موجود ہیں۔ ان میں لفظ پیریکلیطاس اسی املا سے لکھا ہے۔ جس طرح کہ ہم نے لکھا ہے۔ مگر ہم مسلمان یہ یقین نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ نے یہ یونانی لفظ بولا تھا۔ کیونکہ ان کی زبان عبرانی تھی جس میں کالڈی یعنی خالدیہ کے زبان کے لفظ بھی ملے ہوئے تھے۔ عبرانی وخالدی دونوں زبانیں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مقام پر فارقلیط کا لفظ فرمایا تھا، جیسا کہ بشپ مارش

صاحب کی بھی رائے ہے۔ مگر جب انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئیں، تب اس میں اس کی جگہ یونانی لفظ لکھا با ایں ہمہ ابتدا میں اس لفظ کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں کیا گیا۔ جس کے معنے تسلی دینے والے بیان کیے جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا ترجمہ پیریکلیو طاس کیا گیا جو ٹھیک فارقلیط کے لفظ کا ترجمہ ہے۔ اور جس کا ترجمہ ٹھیک ٹھیک عربی زبان میں احمدؐ ہے۔ بلا شبہ اس بات کا ثبوت کہ یہ لفظ پیریکلیو طاس ترجمہ ہوا تھا۔ اور پیریکلیطاس نہیں تھا۔ ہمارے ذمہ ہے۔ چناں چہ ہم اس کو بہ تائید روح القدس بخوبی ثابت کریں گے۔ اس لفظ پر بہت بڑے بڑے عالموں نے بحث کی ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہیں کے اقوال کا ذکر کرنا شاید کافی ہوگا۔

سر ولیم مور صاحب لائف آف محمد جلد اول صفحہ ۱۷ میں ارقام فرماتے ہیں کہ ''یوحنا'' کی انجیل کا ترجمہ جو ابتدا میں عربی زبان میں ہوا۔ اس میں اس لفظ کا ترجمہ غلطی سے احمد کر دیا ہوگا یا کسی خود غرض جاہل راہب نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جعل سازی سے اس کا استعمال کیا ہوگا جس کو مسلمان اپنے پیغمبر کی بشارت قرار دیتے ہیں۔

اول تو مسلمانوں کو یوحنا کی انجیل کے کسی ایسے عربی ترجمہ کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے پہلے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں موجود ہو مطلق اطلاع نہیں دیتے۔ اور نہ ہی ہمارے اگلے بزرگوں نے اس کا کچھ ذکر کیا ہے۔ اور نہ ایسے ترجمہ کے موجود ہونے کا کچھ ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ عرب میں حضرت متی کی اصلی انجیل جو عبرانی زبان میں تھی اور اب معدوم ہے۔ البتہ پائی جاتی ہے۔ اور اس کا ذکر ہمارے ہاں کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر یوحنا کی انجیل کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کسی خود غرض راہب نے یہ جعل سازی کی ہو تو ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر کسی خود غرض راہب کے اس لفظ میں جعل کرنے کا ہم یقین کریں گے جیسا کہ سر ولیم مور

صاحب نے فرمایا ہے تو ہم کو بہ مجبوری اس بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ کہ بعض دین دار رھبوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بشارتیں چھپانے کی غرض سے بھی انجیل مقدس میں تحریفیں کی ہیں۔ جیسا کہ عموماً مسلمان یقین کرتے ہیں۔ مگر ہم کو ایسی بدگمانیوں پر تحقیق سے باز رہنا چاہیئے۔ بلکہ استقلال سے تفتیش کرنی چاہیئے۔ کہ اگلے عالموں نے اس پر کیا بحث کی ہے۔ اور فیلالجی یعنی علم مطابقت لسان جو اس زمانہ میں نہایت ترقی پر ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

گاڈ فری ھینگنس (رحمۃ اللہ علیہ) جو ایک بہت بڑے عالم حال کے زمانہ میں گزرے ہیں۔ اور انگریز تو تھے ہی اور انگریزی زبان تو ان کی زبان تھی ہی۔ مگر عبرانی اور کالڈی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ اور علم مطابقت السنہ سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اس کی کیا تحقیق کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مسلمان بیان کرتے آئے ہیں۔ اور اب بھی یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دی ہے۔ جس طرح کہ حضرت اشعیا نبی نے کیخسرو کی پشین گوئی کی تھی۔ اور دونوں پشین گوئیوں میں دونوں کا نام بتا دیا گیا تھا۔''

گاڈفری ھیگنس صاحب تو اس مقام پر مسلمانوں کی طرف سے ایک مجادلانہ تقریر کی ہے۔ جو یہ ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیا تھا۔ وہ اس لفظ سے نہیں لیا تھا۔ جو لفظ کہ اب نجیلوں میں موجود ہے۔ بلکہ وہ لفظ پیر یکلیو طاس تھا۔ جس کے معنی بزبان عربی احمد کے ہیں۔ اور ابتدا میں انجیل میں یہی لفظ تھا۔ مگر سچ بات چھپانے کے لیے اس کو تحریف کر دیا ہے۔ اور عیسائی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی کتب موجودہ میں بہت سی تحریفیں یا اختلاف قرآت ہیں۔ اور مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عبارت کے چھپانے کے لیے تمام قلمی نسخے غارت کر دیے گئے۔ قلمی

نسخوں کے غارت ہو جانے کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بات وہ بات ہے جس کی نسبت جواب باصواب دینا مشکل ہے۔ اور قدیمی نسخوں کی نسبت تو یہ ہے کہ چھٹی صدی کے قبل کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔

اگر اس کا جواب نہ دیا جاوئے کہ ترترلین اور قدیم مصنفوں کی عبارت سے ثابت ہو سکتا ہے۔ کہ انجیلوں کی صحیح قرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے پیش ترایسی ہی تھی۔ جیسے کہ اب ہے۔ اور اس لیے ان میں تحریف نہیں ہوئی ،تو اس صورت میں ان قدیمی نسخوں میں بھی تحریف کا ہونا ثابت کرنا چاہیئے گا اور کیا عجب ہے کہ ان میں بھی ہوئی ھو ،جن لوگوں نے انجیل مقدس کے قدیم قلمی نسخوں کو غارت کر دیا۔ انھوں نے ایک وصلی کو جس پر قدیمی مصنف کی تصنیف لکھی گئی ہو ،از سر نو لکھنے میں کیا دریغ کیا ہوگا۔ اس بات کو اول درجہ کے دین دار عالموں نے تسلیم کیا ہے۔ کہ انجیل میں اور اور مقصدوں کے لیے تحریف ہوئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک مطلب کے لیے تحریف کریں گے۔ وہ دوسرے مطلب کے لیے کیوں نہ کریں گے۔ اور جو کہ تسلیم کیا گیا۔ کہ یہ لفظ عبرانی ہے۔ بس اگر غلط لکھا گیا ہو۔ تو گمان غالب یہ ہے کہ ابتدا کے عیسائی مورخوں نے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والے ہیں۔ اپنے خاص مطلب کے لیے جھوٹ بولا ہو۔ اور یہ گمان نہایت ضعیف ہے کہ یوحنا حواری نے جو عبرانی زبان کا شخص تھا۔ کوئی غلطی کی ہو۔ وہ عبرانی اور یونانی دونوں زبانوں کو سمجھتے تھے۔ اور اگر وہ بالفرض وہ عبرانی زبان کے بڑے عالم نہ ہوں۔ اور اسی وجہ سے انھوں نے لفظ کلیطاس کو بجائے کلیوطاس غلطی سے لکھ دیا ہو۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا۔ کہ یوحنا کی انجیل کے اصل متن میں تحریف ہوتی ہے۔

اس کے بعد میں گاڈ فری ھیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے ایک اور مجادلانہ تقریر لکھتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا بیان ہے کہ یہ بخوبی ظاہر ہے۔ کہ عیسائی

اگر مناسب سمجھتے تو نہایت عمدہ قلمی نسخوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ جس طرح کہ انھوں نے بہت سے ولیوں کی لاشوں کو نہایت آسانی سے محفوظ رکھا ہے۔ چناں چہ یوحنا اور مریم اور پطرس اور پولس وغیرہ کی لاشیں ہر روز اٹلی میں نظر آتی ہیں۔

پس مسلمان ضرور باصرار عیسائیوں سے کہیں گے کہ اس غلط ترجمہ کے چھپانے کے لیے کل قلمی نسخے غارت کر دیے یا ان میں جھوٹ ملا دیا گیا۔ اور اگر ایسا نہ تھا۔ تو وہ غارت کیوں کر دیے گئے۔ اور عیسائیوں کو ان کا جواب باصواب دینے میں بہت کچھ دقت ہو گی۔ کیونکہ قلمی نسخوں کے غارت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔

اس لیے گاڈفری ھیگنس صاحب نے محققانہ طور پر گفتگو شروع کی ہے۔ اول وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو بشارتیں ان آیتوں میں مندرج ہیں۔ ان سے بہت سے قدیم عیسائی کسی شخص کے مبعوث ہونے کی پشین گوئی سمجھتے تھے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹ نے جو اس لفظ کے معنوں میں تحریف کی ہے۔ اور اس سے صرف روح القدس کا حواریوں پر آنا مراد لیا ہے۔ ابتدا میں یہ رائے عام نہ تھی۔ چنانچہ دوسری صدی میں ترترلین کے زمانہ سے پہلے مانٹینی آس ایک شخص پیدا ہوا تھا۔ جس کو بہت لوگ سمجھتے تھے۔ کہ وہی پیریکلیو طاس جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ نے وعدہ کیا تھا۔ اس کے دشمنوں نے اس کی نسبت بے اصل بات مشہور کر تھی۔ کہ وہ روح القدس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے مانٹینی آس کے سبب انجیلوں میں تحریف کی اور یہ ماجرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے بہت پیش ترمیس کو بھی اس کے پیرووٗں نے جو بہت بڑے عالم اور طاقت ور تھے۔ وہی شخص سمجھا تھا۔ جس کے مبعوث ہونے کی حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی۔ لیکن اس کے انجام سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ مینس شخص موعود نہ تھا، اور اس

کے پیرو غلطی پر تھے۔

بعد اس کے گاڈ فری ھیگنس صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے لکھتے ہیں کہ اس لفظ سے جو عیسائی روح القدس کا حواریوں پر اترنا مراد لیتے ہیں۔ وہ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ اگر اس کے معنی تشفی دھندہ کے ہوں تو وعدہ تو ایک تشفی دھندہ کے آنے کا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ ظہور بارہ زبانہ آتشین کا وہی شخص موعود ہے۔ محض فضول ہے۔ علاوہ اس کے حواریوں کے قوانین اور خود عیسائیوں کی کتاب سے کسی طرح پایا نہیں جاتا کہ روح القدس کا حواریوں میں آجانا تشفی دھندہ موعود کا آنا ہوا اور صرف زبان سے کہہ دینے سے ایسے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوسکتی ہے۔

علاوہ اس کے پینٹی کامٹ کی ضیافت میں حواریوں پر روح القدس نازل ہوچکی تھی۔ کیونکہ بموجب عیسائیوں کے ایک بریدہ زبان آتش نے ہر ایک حواری پر طاری ہوکر اسی لمحہ ان کو سب زبانیں بولنے کی طاقت بخشی تھی۔ اور یوحنا کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ نے اپنے جانے سے تھوڑے عرصہ پیش تر یہ فیض ان کو عطا کر دیا تھا۔ یعنی پینٹی کامٹ کی جیافت کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ فیض مذکور عنایت کیا گیا تھا۔ عیسائی مذہب کی تمام مذہبی کتابوں میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ کہ یہ زمانہ ھائے آتشین جن سے کہ سب جانیں، بولنے کی طاقت عطا ہوئی تھی۔ تشفی دھندہ موعود تھیں۔ جو ایسا ہوتا تو ضرور کتاب مذکور میں ہوتا۔

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ وہ عطایا جن کا بیان متی کی انجیل میں ہے۔ اور فیض روح القدس کا جس کا بیان یوحنا کی انجیل کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت میں ہے۔ صرف چند روز کے لیے تھا۔ اور پھر لے لیا گیا تھا۔ اور بعد کو ہمیشہ کے لئے آیا۔ تو مسلمان کہیں گے کہ یہ صرف حیلہ ہے۔ جس کی تصدیق انجیل کے کسی لفظ سے نہیں ہوتی۔

اسی بحث میں گاڈفری ھیگنس صاحب نے ایک نہایت عمدہ قول فیصل لکھاہے کہ یعنی اگر تسلیم کیا جاوئے کہ یہ لفظ وہی ہے جو اس زمانے کے عیسائی کہتے ہیں۔ اور اس کے معنے بھی روح القدس ہی کے ہوں تو مسلمان عیسائیوں سے کہیں گے کہ تم کہتے ہو کہ انجیل میں بشارت ہے۔ کہ روح القدس آوئے گا۔ یہ درست ہے کہ روح القدس آئی۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آئی، جن کو روح القدس سے الہام ہوتا تھا۔ پس تمہاری پیچیدہ عبارت کے یہی معنے ہیں۔ اور یہی معنے درستی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

یہ لفظ تو گاڈفری ھیگنس صاحب کے تھے۔ اور میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ جو عام ہدایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی اور تمام جزیرہ عرب بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرنے لگا۔ اور تمام دنیا میں وحدانیت کا ڈنکا بج گیا۔ اور حضرت عیسیٰ پر جو اتہام خدا کے بیٹے ہونے کا کیا تھا۔ وہ مٹ گیا۔ اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ضرور وہ روح القدس اور روح الصدق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔

اشهد ان لا الـه الا الـلـه و اشهـد ان محمد رسول الله و اشهد ان محمد عبده و رسوله ،

اس کے بعد گاڈفری ھیگنس صاحب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ لفظ پیر یکلیطاس نہیں ہے۔ جس کے معنی تشفی یا تسلی دھندہ کے بیان کیے جاتے ہیں۔ بلکہ یہ لفظ پیر یکلیو طاس ہے۔ جس کے معنی احمد کے ہیں۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دلیل بابت ترجمہ لفظ پیر یکلیو طاس کے بجائیلفظ پیر یکلیطاس کے اس طرز تحریر سے بہت مدد ملتی ہے۔ جو سینٹ جیروم نے انجیل کے لیٹن ترجمہ میں اختیار کی ہے۔ یعنی اس ترجمہ میں لیٹن زبان میں یہ لفظ پیر یکلیو طاس لکھا تھا۔ نہ پیر یکلیطاس۔

اس لفظ پیر یکلیطاس کے معنی پر پادریوں میں بہت اختلاف ہے۔ چناں چہ مشہور

عالم مائی کیلس کہتا ہے کہ ارسٹائی نے بہت مناسب کہا ہے کہ اس کے معنی نہ حامی کے ہیں اور نہ تشفی دھندہ کے۔اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں تحقیق خیال کرتا ہوں کہ یہ لفظ پیریکلیطاس یا تو روح القدس کو کہتے ہیں یا معلم یا مالک کو یعنی بتانے والا خدا تعالیٰ کی سچائی کا۔اور میں اس کی رائے سے درباب ترجمہ صحیح نہ ہونے کے مطابقت کرتا ہوں۔گو میں اس کو ڈاکٹر یعنی عالم متبحر کا لقب نہیں دیتا۔بلکہ مانیٹر یعنی معلم کا لقب دیتا ہوں۔اس لیے کہ جو معنی اس نے لفظ مذکورہ کے لکھے ہیں۔بہتیروں نے اختیار کیے ہیں۔البتہ اس کے اثبات کا جو طرز اس نے اختیار کیا ہے۔وہ عجیب ہے۔اس کو چاہیئے تھا کہ لفظ مذکور کو کسی محقق کی تصنیف میں تلاش کرتا۔اور اس کے معنوں کی تشریح اس لفظ کے استعمال سے ثابت کرتا۔اس نے ان سب باتوں کو چھوڑ کر جس زبان کے لفظ سے یہ نکلا ہے۔(یعنی کالڈی زبان سے) اس کے محاورہ اور استعمال سے اپنا بیان ثابت کرنے پر استدلال رکھا ہے۔بہت بڑے عالم اور معزز بشپ مارش نے کہا ہے کہ لفظ پیریکلیطاس کے تین ترجمے ہیں۔اور ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے جون سا چاہیئں پسند کر لیں۔اول معنی حامی کے ہیں جو معتبر ہیں اور یونانی اکابر کے نزدیک مسلم ہیں۔دوسرے معنی مبین کے ہیں۔اور یہ وہ معنی ہیں کہ ارنستائی نے بحوالہ لفظ فارقلیط کے جو کالڈی زبان کا لفظ ہے کہے ہیں۔تیسرے معنی واعظ کے ہیں جس کو خود بشپ مارش نے بحوالہ ایک عبارت مصنفہ فائلو کے تسلیم کیا ہے۔پس یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مشہور لفظوں کے معنوں میں اور اس پیغمبر کی قسم میں جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ نے وعدہ کیا تھا۔ بہت اشتباہ وشک تھا۔

یہ لفظ گاڈفری ھیگنس صاحب کے ہیں۔مگر میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ اگر بشپ مارش کے ہی معنے تسلیم کیے جاویں اور اس لفظ کو پیریکلیطاس ھی مانا جائے۔اور اس کے معنے واعظ ہی کے قرار دیے جاویں تو بھی بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی

کے حق میں یہ بشارت نہیں ہوسکتی ہے۔ کیونکہ حوارین جنھوں نے کہ انجیل کا وعظ کیا۔ وہ اس سے پہلے روح القدس سے معمور ہو چکے تھے۔ اور وہ سب اس وقت موجود تھے۔

قل انما انا بشر مثلکم یو حی الی انما الھکم اله واحد (سورہ مریم آیت ۱۲۰)

ان کی نسبت تو یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ میں بھیجوں گا۔ کیونکہ وہ موجود تھے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب آئے تو انھوں نے بتایا کہ میں بھی تم سا ایک آدمی ہوں صرف مجھ پر وحی کی گئی ہے۔ کہ بے شک تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ صاف فرمایا کہ۔

قل لا املک لنفسی نفعا لا ضرا الا ماشاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یومنون۔ (سورہ اعراف آیت ۱۸۸۔)

فرمایا کہ میں اپنی جان کے لئے بھی کچھ فائدہ یا نقصان پہنچانے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی برائی چھوتی بھی نہیں، میں تو ان قوموں کو جو ایمان لائی ہیں۔ ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔

قل انما اعظکم بواحد ان تقومو الله مثنی وفرادی ثم تتفکرو ا ما بصا حبکم من جنة ان هو الا نذیر لکم بین یدی عذاب شدید (سورہ سبا آیت ۴۵).

اور پھر اور بھی صاف صاف فرمایا کہ میں تو تم کو صرف ایک
بات کا یعنی لا الہ الا اللہ کا وعظ کرتا ہوں پھر تم خالصتاً للہ دو دو ایک ایک
کھڑے ہو اور سونچو کہ جو شخص تمہارے ساتھ ہے۔ اس کو کچھ جنون

نہیں ہے۔وہ صرف تم کو عذاب میں پڑھنے سے پہلے ڈرانے والا ہے۔''

اس کے سوا اور بہت سی جگہ رسول خداؐ نے خدا کی طرف سے فرمایا کہ ''خدا تم کو اس بات کا وعظ کرتا ہے'' اور خدا کا وعظ کرنا اور پیغمبر کا وعظ کرنا برابر ہے۔پس محمد رسول اللہ کے سوا کسی پیغمبر نے ایسا صاف صاف نہیں کہا ہے۔کہ میں تو صرف وعظ کرنے والا ہوں۔پس اگر اس لفظ کے معنی واعظ ہی کے ہوں تو جیسا کہ بشپ مارش نے کہا ہے تو بھی سچا واعظ محمد رسول اللہ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

بعد اس کے گاڈفری ھیگنس صاحب کہتے ہیں کہ ''یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ کہ لفظ مذکور'' (یعنی فارقلیط) جیسا کہ بشپ مارش نے کہا ہے کہ یقیناً عیسی مسیح نے استعمال کیا تھا۔ مسلمانوں کے دعویٰ کو بہت کچھ سہارا دیتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میری رائے میں اھل اسلام لفظ فارقلیط کو یونانی میں پیریکلیو طاس بنا لینے کا اسی قدر اختیار رکھتے ہیں،جس قدر کہ عیسائی پیریکلیو طاس کر لینے کا بلکہ ان کی رائے میں غلبہ کا پلہ مسلمانوں کی طرف ہے۔

کیونکہ عیسائی مجاز نہیں ہیں کہ پچھلے جزو میں لفظ زبان خالدی کے حرف یہ یعنی یائے تحتانی کو جو مثل حرکت کسرہ کے ہے یا حرف ایتا کو جو یائے تحتانی ممدودہ معروف کے برابر ہے۔حرف ایونا کے عوض میں بدلیں۔

حرف یہ حروف تہجی زبان خالدیہ کا دسواں حرف ہے۔اور شمار میں اس کے عدد بھی دس ہیں۔پس اگر لفظ مذکور کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بدلا جائے تو اس یونانی حرف سے بدلنا چاہیئے۔جو دس کے معنی میں آیا ہے۔اور جو ابتدا میں حروف تہجی میں دسواں تھا۔قبل اس کے یونانیوں کا حرف ڈگامہ جاتا رہے۔کثرت سے اپنے اس جواب مضمون میں ثابت کیا ہے کہ جو در باب جیسا کہ میں نے اس کو جنوب مغربی فرنگستان کے قدیمی پادریوں کے

لکھا ہے۔

مگر میں علاوہ اس کے یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا لفظ فارقلیط تھا۔ اور یہ کہ اس لفظ کے معنی مستودہ کے ہیں۔ جیسا کہ سیل صاحب کا بھی قول ہے۔ تو اس کا ترجمہ اس لفظ یونانی میں پیریکلیطاس میں غلط ہے۔ یعنی اختلاف قرات کی جہت سے اور یہ کہ بشپ مارش اور انسٹائی دونوں کے ترجمے غلط ہیں۔ اور لفظ مذکور اسی لفظ سے مبدل کرنا چاہیئے۔ جو ستودہ کے معنی رکھتا ہو۔ اور واقع میں یہ لفظ پیریکلیوطاس ہونا چاہیئے۔

مگر اس کا ترجمہ فاقلیط علم کے معنی لے کر نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اسم صفت کے طور پر کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اہل اسلام بمعنی احمد کے لیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ حضرت عیسیٰ کا استعمال کیا ہوا زبان خالدیہ یا عبرانی یا عربی کا ہو تو اس سے وہی مراد پائی جانی چاہیئے۔ جو اس کے معنی ان زبانوں میں تھے۔ اگر وہ خالدیہ کا لفظ عربی مصدر سے مشتق ہو تو اس کے وہی معنی چاہیئں جو عربی مصدر کے ہیں۔ اور تب اس کے معنی ستودہ یا شخص ممتاز کے ہوں گے۔

اگر ناظرین خوض کریں گے تو معلوم کر لیں گے کہ لفظ پیریکلیطاس کو ھومر اور ھسیڈ دونوں نے بجائے ستودہ آدمی کے استعمال کیا ہے۔ اس طرح سے میری دانست میں اہل اسلام کی دلیل اس سلیقہ کے ساتھ ہے۔ کو اگر ان کی غلطی پر معقول کیا جائے تو عجب نہیں کہ بہت بڑی مشکل آ پڑے۔ یہ ادنیٰ بات ہے۔ مگر ان کی دلیل کی تردید میری نظر سے نہیں گزری۔

مگر مجھ کو اس مشہور لفظ فارقلیط کی نسبت اور بھی کچھ کہنا ہے۔ اس کو بشپ مارش نے جس کے قول کو عیسائی صادق جانتے ہیں۔ ایک مسلمان کی دی ہوئی دلیل میں تسلیم کر لیا ہے۔ کہ وہ سریانی یا خالدیہ یا عربی ہے۔ مگر یونانی نہیں۔ ان زبانوں میں سے ایک کو یا دو کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور بولتے ہوں گے یا ادنیٰ درجہ یہ کہ سمجھتے ہوں گے۔ اور

یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لفظ مذکور کے یونانی ترجمہ کی نسبت آپ کو کچھ بحث ہوئی ہو۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کے یونانی ترجمہ سے عرب کے لوگوں کو کیا غرض تھی۔۔ عرب میں ان ترجموں کا کیا کام تھا۔ ان لوگوں کو وہ کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے۔ جو ان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ بجز ایسے لوگوں کے جو اصل زبان کو سمجھتے تھے۔ جس کو حضرت عیسیٰ بولتے تھے۔ آپ نے لفظ مذکور کو اسی طرح پر لیا ہوگا۔ جیسا کہ منقول چلا آتا ہے۔ اور جیسا کہ سیل صاحب نے اس کو لکھا ہے۔ جس کے معنی سودہ کے ہیں۔ اور اس سے زیادہ غالباً آپ نے کبھی دریافت نہیں کیا ہے۔ یہ خیال کرنا کیسا بے ہودہ ہے کہ اپنی زبان کے ایک لفظ کے معنی کی تشریح غیر زبان میں ڈھونڈتے۔

آپ نے لفظ مذکور کو مثل اس زمانہ کے دوسرے فرقوں کے شخص انسانی پر محمول کیا۔ اور یہ اجازت نہیں دی کہ اس کو ثالث ثلاثہ کہیں۔ جیسا کہ اس زمانے کے موحد بھی کہتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اس کو احمد کے معنی میں لیا ہو۔ اور اس کی نسبت کبھی جھگڑا یا شک نہ کیا ہو۔

یہ تمام تقریر گاڈفری ھیگنس صاحب کی ہے۔ جو انھوں نے مسلمانوں کی طرف سے کی ہے۔ مختصر یہ کہ ہم مسلمانوں کی بحث لفظ پیریکلیطاس پر جو اب یونانی انجیل میں ہے۔ یا لفظ پیریکلیطاس پر جو اصلی نسخوں پر تھا۔ منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ کی زبان نہیں تھی۔ پس انھوں نے جو لفظ فرمایا تھا۔ وہ عبرانی یا خالدی زبان کا تھا۔ جو دونوں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمان کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ یونانی زبان میں پیریکلیوطاس کیا گیا تھا۔ جو درحقیقت صحیح ترجمہ ہے۔ اور اس کا ثبوت بھی جہاں تک ہوسکا دیا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں پیریکلیطاس ہی اس کا ہمیشہ سے ترجمہ چلا آتا ہے تو ہم مسلمان یہ کہیں گے کہ یہ ترجمہ غلط ہے۔ کیونکہ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں

ہے۔ بلکہ پیریکلیو طاس ہے۔اوراس کا فیصلہ عبری وخالدی زبان کے لغت کی تحقیق پر ہر وقت ہوسکتا ہے۔اور جو کہ مشہور ہے کہ انجیل یوحنا دراصل حضرت یوحنا حواری کی لکھی ہوئی ہے۔اس لئے ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت یوحنا نے فارقلیط کے ترجمہ میں غلطی کی ہو۔ اور جو دلیلیں مذکور ہوئی ہیں۔ان سے بھی یہ پایا جاتا ہے کہ انھوں نے غلطی نہیں کی۔اس لیے وہ لفظ اصل میں پیریکلیو طاس ہے۔بمعنی احمد نہ پیریکلیطاس بمعنی تسلی دھندہ۔

اکثر عیسائی یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس بشارت کو انجیل پر بناس سے اخذ کیا ہے۔اور جارج سیل صاحب نے بھی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ بلکہ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی ''یاتی من بعدی اسمہ احمد'' اسی انجیل میں سے اخذ کی گئی ہے۔اور یہ اخیر زمانہ کے ایک آدھ کچے مسلمان اور جاھل مولوی نے کہیں سے سن سنا کر کہہ دیا کہ پر بناس کی انجیل میں بھی یہ مطلب آیا ہے۔شاید اس کا حوالہ دے دیا ہو۔مگر قدیم عالموں اور بڑے بڑے محققوں نے اس بشارت کی بابت پر بناس کی انجیل کا خواہ وہ صحیح ہو غلط نام تک نہیں لیا۔جارج سیل صاحب کی غلطی ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں۔

بشارت دوم

جب بعد مصلوب ہونے اور قبر میں دفن کیے جانے کے حضرت عیسیٰ زندہ ہو کر اٹھے اور حواریوں سے ملے۔اوران کے سامنے شہد اور مچھلی کا ٹکڑا کھایا۔تو بیت عنیا میں جانے اور آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے انھوں نے اپنے حواریوں سے یہ فرمایا کہ ''اور دیکھو'' میں بھیجتا ہوں، وعدہ اپنے باپ کا تم پر۔لیکن تم ٹھہرو شہر یروشلم پر جب تک کہ تم پر عطا

ہو۔قوت اوپر سے (انجیل لوقا، باب ۲۴ آیت ۴۹۔)

چند سطروں کے بعد لوقا اپنی انجیل ختم کرتے ہیں۔اور کچھ ذکر اس وعدہ پورا ہونے کا نہیں کرتے۔ بلکہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ یہ کہہ کر آسمان پر چلے گئے تو تمام حواری سجدہ کرکر بڑی خوشی سے یروشیلم کو پھرے۔اور ہمیشہ ھیکل میں خدا کی تعریف اور شکر کرتے رہے۔ اور انھی لفظوں پر لوقا کی انجیل ختم ہوتی ہے۔اور اس وعدہ کے وفا ہونے کا کچھ ذکر نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ لوقا کی زندگی تک یا کم سے کم اس انجیل کے لکھے جانے کے وقت تک وہ وعدہ جس کو لوقا سمجھتے تھے۔ پورا نہیں ہوا تھا۔

لوقا کے نزدیک روح القدس کا زبانہ ھائے آتشیں میں حواریوں پر نازل ہونا (اگر وہ اس کے بعد نازل بھی ہوئے ہوں) اس وعدہ کا پورا ہونا نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ہوتا تو اس وعدہ کے پورا ہونے کا ذکر ضرور لکھتے۔پس ضرور ہے کہ یہ وعدہ کسی اور شخص کے مبعوث ہونے کا تھا۔

اب ہم کو اس شخص کی تلاش کرنی مناسب ہے۔جس کے آنے کی حضرت عیسیٰ نے بشارت دی ہے۔ جب ہم اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے حواریوں سے فرمایا کہ ''اس وعدے کے آنے تک تم یروشلم میں ٹھیرے رہو۔'' تو ہم کو تعجب ہوتا کہ اس وعدہ کے آنے اور یروشلم کے ٹھہرے رہنے سے کیا تعلق ہے؟۔اگر بالفرض اس وعدہ سے حواریوں پر روح القدس کا نازل ہونا ہی مراد تھا۔تو بھی یروشلیم میں رہنے اور روح القدس کے آنے سے کوئی ضروری مناسبت نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ اگر حوارین شہر کے باہر چلے جاتے تو بھی ان کے پاس روح القدس اسی طرح آ سکتی تھی۔ جیسے کہ شہر میں رہنے سے یہ مظلب نہیں ہے۔ جو اس کے لفظی معنوں سے نکلتا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب تک وہ وعدہ پورا ہو۔ تم شہر یروشلم سے وابستہ رہو۔ اور اسی کی عزت و تعظیم جیسی کہ پیش تر سے کرتے آئے ہو

۔کرتے رہو۔اسی کی طرف اپنا سر جھکاؤ۔اپنا منہ اسی کی طرف رکھو۔جب تک کہ وہ وعدہ پورا ہو۔چناں چہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور وہ وعدہ پورا ہوا۔اور یروشلم میں رہنے کا زمانہ منقطع ہوگیا۔اور بیت اللہ میں رہنے کا زمانہ آیا۔باپ کا وعدہ پورا ہوا اوراوپر سے عطا ہوگئی۔بیت المقدس کی طرف جو مدت دراز سے قبلہ تھا،موقوف ہوا۔اور مکہ میں ابراہیم کے بنائے ہوئے خانہ خدا اور کعبہ معظم کی طرف قبلہ اہل ایمان قرار پایا۔پس یہ بشارت صاف ہمارے پیغمبر کے مبعوث ہونے اور بیت المقدس کے قبلہ رہنے کے زمانہ کے اختتام اور بیت الحرام کے قبلہ ہونے کی بشارت ہے۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ قد نری تقلب وجهک فی السماء فلنولینک قبلة ترضها فول وجهک شطر المسجد الحرام.

بشارت سوم

جب حضرت یحییٰ پیغمبر ہوئے تو یروشلیم سے یہودیوں نے کاھنوں اور لیویوں کو ان کے پاس بھیجا۔تا کہ ان سے پوچھیں کہ وہ کون ہیں۔چناں چہ وہ لوگ گئے اور ان سے یہ گفتگو ہوئی کہ اس نے یعنی حضرت یحییٰ نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا اور اقرار کیا کہ میں کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح نہیں ہوں۔اور انھوں نے پوچھا اس سے پھر کون کیا تو الیاس ہے۔اور اس نے کہا کہ میں نہیں ہوں۔پھر انھوں نے پوچھا کہ کیا تو وہ نبی ہے؟۔اور انھوں نے جواب دیا نہیں۔تب انھوں نے اس سے کہا کہ کون تو ہے؟۔تا کہ ہم جواب دے سکیں ان کو جنھوں نے کہ ہم کو بھیجا ہے۔اپنے تیئں تو کیا کہتا ہے۔اس نے کہا میں ہوں آواز اس

کی جو جنگل میں چلاتا ہے۔سیدھا کرو راستہ خداوند کا جیسا کہ نبی اشعیا نے کہا اور وہ جو بھیجے گئے تھے،فردوسی تھے۔اورانھوں نے اس سے پوچھا اور اس نے کہا کہ تو کیوں اصطباغ کرتا ہے۔جب کہ تو نہ کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح ہے اور نہ الیاس اور نہ وہ نبی (یوحنا، باب ا آیت ۱۰ لغایت ۲۵)۔

ان اوپر کی آیتوں میں تین پیغمبروں کا ذکر ہے۔

(ا) حضرت الیاس کا۔

(۲)۔دوسرے حضرت عیسیٰ کا

(۳)۔تیسرے اس پیغمبر کا جو علاوہ حضرت عیسیٰ کے ہونے والا تھا۔

یہودی یقین کرتے تھے کہ پیغمبر الیاس جن کو مسلمان خضر کہتے ہیں۔مرے نہیں۔ بلکہ صرف انسانوں کی نظروں سے غائب ہو گئے ہیں۔اور یہودیوں کو حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت یہ یقین تھا کہ اور اب بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن آویں گے۔لیکن ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ حضرت عیسیٰ کے ایک اور پیغمبر کے آنے کی بھی وہ امید رکھتے تھے۔اور وہ پیغمبر ایسا مشہور تھا کہ بجائے نام کے صرف اشارہ ہی کر دینا کافی تھا۔جب کہ ہم مسلمان بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ صرف آنحضرت اشارہ لکھتے ہیں۔اور بولتے ہیں۔اور یہ مشہور پیغمبر کون ہوسکتا ہے۔بجز اس کے جس کے سبب خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کو برکت دی۔اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا ''تیرے بھائیوں میں تجھ سا پیغمبر پیدا کروں گا۔''اور جس کی نسبت حضرت سلیمان نے کہا کہ ''میرا محبوب سرخ وسفید سب میں تعریف کیا گیا محمدؐ ہے۔''یہی میرا محبوب ہے اور یہی میرا مطلوب''۔اور جس کی نسبت حجی نبی نے فرمایا کہ ''حمد تمام قوموں کا آوئے گا۔''اور جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ ''میرا جانا ضرور ہے تا کہ فارقلیط آوے۔''

اب میں نہایت مضبوطی سے کہتا ہوں کہ یہ نامی اور مشہور پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ واللہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

شق صدر کی حقیقت اور واقعہ معراج کی ماھیت

وما جعلنا الرویا التی ارینٰک الا فتنة للناس

اس مضمون میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک شق کرنے کی حقیقت اور معراج کی اصلیت کا بیان ہے۔

جو واقعات کہ ہم اس خطبہ میں بیان کرتے ہیں۔ان کی اصلیت کی نسبت اور جن الفاظ میں وہ بیان ہوئے ہیں۔ان کے صحیح معنوں کی نسبت اکثر علمائے دین نے بحث کی ہے۔اور اس کی تحقیقات کو انتہا درجہ تک پہنچایا ہے۔مگر افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اور شارحین نے اپنی پیچ در پیچ تاویلات اور لاطائل براھین سے بجائے اس کے کہ شکوک کو رفع کریں یا غلطی کی تصحیح کریں۔ان الفاظ کے معنی کو اور بھی تاریکی میں ڈال دیا ہے۔

شق صدر

قرآن مجید کی رو سے ہم کو شرح صدر پر جس کو آخر کار لوگ شق صدر کہنے لگے۔اور نفس معراج کی صحت وصداقت پر بغیر کسی شبہ کے ایمان لانا چاہیئے۔پس جو امر کہ بحث طلب ہے۔اور جس پر ایک مدت تک علمائے اسلام کی توجہ مبذول رہی ہے۔اس بات سے علاقہ رکھتا ہے۔کہ شرح صدر یا شق صدر کی اصل حقیقت اور معراج کی ماھیت کیا تھی۔ان دونوں کی حقیقت بیان کرنے کے لیے اولاً ہم قران مجید کی ان باتوں کو نقل کرتے ہیں۔جو

ان باتوں سے متعلق ہیں۔

کیا ہم نے تیرے لیے سینہ کو نہیں کھول دیا ہے۔

آیت اول : الم نشرح لک صدرک

آیت دوم :

سبحن الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الا قصیٰ الذی بارکنا حوله لنریه من ایتینا، انه هو السمیع البصیر .

آیت سوم :

وما جعلنا الروء یا التی ارینٰک الا فتنة للناس .

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔ جس کے دور کو ہم نے برکت دی ہے۔ تا کہ ہم اس کو اپنی نشانیوں میں سے دکھلا دیں۔ بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

ترجمہ آیت سوم:

اور نہیں کیا ہم نے اس رویا کو جو تجھ کو دکھلایا مگر آزمائش واسطے لوگوں کے۔

جو آیتیں کہ اوپر لکھی گئی ہیں ان میں سے صرف پہلی آیت شق صدر سے علاقہ رکھتی ہے۔ اور باقی آیتیں معراج سے متعلق تصور کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں سینہ کے چیر پھاڑ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اور اس کے اصلی و اصطلاحی معنی جیسے کہ اکثر مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس کشادگی کے ہیں جو دل اور سینہ میں وسعت اور عرفان الہٰی اور وحی کے منبع ہونے کے لیے کی گئی تھی۔

باقی رہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جو شق صدر اور معراج سے علاقہ رکھتی ہیں۔ لیکن وہ باہم اس قدر مختلف، متعارض اور متناقض ہیں کہ کوئی بھی قابل اعتبار کے نہیں ہے۔ اور ان کی

صحت کی کافی سندیں بھی نہیں ہیں۔ ھشامی ذیل کا قصہ حلیمہ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے بیان کیا ہے کہ ''ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ گھر کے قریب مویشی میں کھیل رہے تھے۔ وہ دونوں دفعتہً دوڑتے ہوئے آئے اور رو کر کہنے لگے کہ دو سفید پوش آدمی ہمارے قریشی بھائی کو پکڑ لے گئے۔ اور ان کا سینہ چاک کر ڈالا۔ میں اور میرا خاوند اس مقام پر گئے۔ دیکھا کہ آنحضرت کا مارے خوف کے رنگ زرد تھا۔ ہم نے ان کو چھاتی سے لگایا اور ان کے اضطرار کا باعث پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دو سفید پوش آدمی میرے قریب آئے اور مجھ کو چت لٹا کر میرا دل چیرا اور اس میں سے کوئی چیز نکال لی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز تھی۔''

اسی طرح کی ایک اور کہانی ھشامی نے بغیر کسی سند کے صرف یہ بیان کر کے کہ بعض علماء نے بیان کیا ہے۔ اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت سے کہا کہ آپ کچھ اپنی تعریف میں بیان فرمائیے۔ اس پر پیغمبر صاحب نے فرمایا کہ میں ان برکتوں کا مشتاق ہوں۔ جن کے عطا کرنے کا وعدہ حضرت ابراہیم سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا۔ اور میں وہ شخص ہوں کہ جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ جب کہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا۔ میری ماں کو معلوم ہوا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے۔ جس سے شام کے محل منور ہو گئے۔ ایک روز میں اپنے دودھ بھائیوں کے ساتھ مویشی چرا رہا تھا۔ کہ دفعتہً دو آدمی جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور اپنے ہاتھ میں ایک سونے کا طشت برف اور پانی سے بھرا ہوا لے کر آئے۔ اور مجھ کو زمین پر لٹا کر میرے سینہ کو چاک کیا۔ اور میرے دل کو نکال کر چیرا۔ اس میں سے ایک سیاہ قطرہ دبا کر نکال ڈالا۔ اس کے بعد انھوں نے دل کو اور سینہ کو برف سے دھو دھلا کر پاک صاف کر دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اس کو ایک طرف رکھ کر اور دس آدمیوں کو دوسری طرف رکھ کر تولو۔ مگر میں وزن میں زیادہ ہوا۔ تب اس

نے سو آدمیوں سے مجھے تولا۔اس پر بھی میں وزن میں بڑھتی رہا۔اس پر ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ اگر تم اس کو تمام جہانوں کے مقابلہ میں تولو گے تب بھی یہ کم نہ نکلے گا۔

واقدی نے بھی ان دونوں روایتوں کو نقل کیا ہے۔اور کتاب شرح السنۃ میں عریاض ابن ساریہ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مذکورہ بالا فضائل کا بیان ہوا ہے۔اور دارمی میں ابوذرغفاری سے آنحضرت کے تولے جانے کی روایت بھی بیان ہوئی ہے۔مگر ان روایتوں میں جو اختلاف ہے وہ غور کے قابل ہے۔حلیمہ سے جو روایت ہے۔اس میں برف کے پانی اور طشت کا اور دل کے دھونے کا کچھ ذکر نہیں ہے۔اور ھشامی کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کا تولا جانا شق صدر کے بعد حلیمہ کے گھر پر ہوا تھا۔مگر دارمی میں جو ابوذرغفاری سے روایت ہے۔اس میں شق صدر کا کچھ ذکر نہیں ہے۔اور اس سے پایا جاتا ہے کہ آنحضرت کا تولا جانا بطحائے مکہ میں ہوا تھا۔ باایں ہمہ یہ تمام روایتیں نہایت ناقابل معتبر ہیں۔اور قصہ اور کہانی ہونے سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں۔

عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔وہ اپنے ہاں کی مقدس کتابوں کو جس میں کتب تواریخ اور ملوک وقضاۃ وغیرہ داخل ہیں۔اور توریت وانجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔بمنزلہ وحی کے یعنی کلام الٰہی کے سمجھتے ہیں۔اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں۔حالاں کہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔اسی طرح انھوں نے خیال کر لیا ہے۔کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے۔ورنہ اس خیال خام سے انھوں نے مسلمان بھی اپنی تمام حدیثوں اور روایتوں کو ناقابل خطا تصور کر کے اسلام پر سخت طعن وتشنیع کی ہے۔لیکن وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔کیونکہ مسلمان اپنے ہاں کی حدیثوں

اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں۔ جب کہ ان کے لیے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں۔ ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یہ روایتیں جو ھشامی اور واقدی میں بیان ہوئی ہیں۔ یا وہ روایتیں جو ھشامی اور واقدی میں بیان ہوئی ہیں۔ یا وہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں۔ صحت سے بہت دور ہیں۔ محققین علمائے اسلام ان کو محض نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ اور بے ہودہ افسانے جو محض جہلا کے خوش کرنے کے قابل ہیں، خیال کرتے ہیں، پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے۔ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔

البتہ شق صدر کے معاملہ میں ایک روایت ہے۔ جو ایک معتبر کتاب میں لکھی ہے۔ یعنی مسلم میں اور وہ اس لائق ہے کہ علمائے اسلام اس پر توجہ دیں۔ اور اس بات کی تحقیق و تدقیق کریں۔ کہ وہ روایت صحیح ہے یا بے اصل۔ کیونکہ مسلم میں اس روایت کے مندرج ہونے کے بعد یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس کی صحت میں کچھ شک نہیں۔ بلکہ صرف علما کی توجہ کا استحقاق رکھتی ہے۔ اور اگر بعد تحقیق کے معلوم ہو کہ وہ صحیح نہیں تو گو کہ وہ مسلم نے بیان کی ہے۔ ویسی ہی نامعتبر تصور ہوگی جیسے کہ کسی اور نے بیان کی ہو۔

مسلم میں ہے کہ انس بن مالک نے کہا کہ ''ایک روز جب کہ پیغمبر صاحب اور لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔'' حضرت جبرائیل ان کے پاس آئے۔ اور ان کا دل چیرا اور اس میں سے ایک قطرہ نکال کر کہا کہ تجھ میں یہ شیطان کا حصہ تھا۔ تب اس کو ایک سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا۔ اور اس کو بجنسہ جہاں رکھا ہوا تھا۔ وہیں رکھ دیا۔ اور لڑکے بھاگ کر زھیرہ آنحضرت کی دودھ پلائی کے پاس گئے۔ اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مار ڈالا۔ وہ فوراً محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس دوڑی آئی، اور ان کا رنگ فق پایا۔ (انس کا بیان ہے کہ) سیون کا نشان جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ پر محسوس ہوتا تھا۔ میں نے

خود دیکھا تھا‘‘۔

قطع نظر اس روایت سے وہ تمام روایتیں جن میں حلیمہ کے گھر میں شق صدر ہونے کا بیان ہوا ہے، غلط اور باطل قرار پاتی ہیں۔ یہ روایت بھی چار مستحکم دلیلوں سے نا قابل اعتبار ہیں۔

قطع نظر اس کے اس روایت سے وہ تمام روایتیں جن میں حلیمہ کے گھر میں شق صدر ہونے کا بیان ہوا ہے۔ غلط اور باطل قرار پاتی ہیں۔ یہ روایت بھی چار مستحکم دلیلوں سے قابل اعتبار کے نہیں ہے۔: اول یہ کہ انھی انس نے ایک دوسری روایت میں اس واقعہ کا ہونا شب معراج میں بیان کیا ہے۔ اور وہ زمانہ اس زمانہ سے جو اس روایت میں مذکور ہے۔ بالکل مختلف ہے۔ ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد کے راوی۔ اس کی اس لمبی روایت میں سے جو معراج سے متعلق ہے۔ اور جس کا بیان آگے ہوگا۔ ایک ٹکڑا توڑ کر اور اس میں کمی بیشی کر کے بیان کیا ہے۔ جس سے اس روایت کی بے اعتباری، اور اس مضمون کا کہ سیون کا نشان انس نے دیکھے تھے۔ لغو اور بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس روایت میں انس کا یہ قول کہ میں نے آنحضرت کے سینہ پر سیون کے نشان بچشم خود دیکھے تھے۔ بیان کیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بات غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اگر مانا جائے کہ آنحضرت کا سینہ دراصل چیرا گیا تھا۔ جیسا کہ اس روایت میں مذکور ہے تو اس کے سیون کے نشان کا محسوس ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ یہ سیوں جراح کی سیون اور ٹانکوں کی مانند نہ تھی۔ کسی روایت کی اصلیت کے امتحان کرنے کا یہ بھی طریقہ ہے کہ اگر وہ کسی ایسے امر کو بیان کرے۔ جو خود اس معجزہ کی جو روایت میں بیان ہوا ہے، برخلاف ہو تو ایسی روایت محض بے اصل ہو گی۔ پس اس دلیل سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت محض بے اصل و نا معتبر ہے۔ اور اس کے بعد راوی نے اس میں بالکل غلطی کی ہے۔ تیسرے یہ کہ آنحضرت کے صحابہ نے آنحضرت کا مفصل حلیہ

بیان کیا ہے۔مگر کسی نے اس سیون کے نشان کا جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا، بیان نہیں کیا۔اگر ایسا ہوتا تو بہت سے صحابہ اس کو بیان کرتے۔چوتھے یہ کہ انس بر وقت وقوع اس واقعہ کے موجود نہ تھے۔اور نہ ہی انھوں نے ان اشخاص کے نام بیان کیے ہیں۔جن کی وساطت سے ان کو یہ روایت پہنچی۔روایت کے نامعتبر قرار دینے کو ایک مستحکم اصول یہ قرار پایا ہے کہ اگر راوی کسی ایسے واقعہ کو بیان کرے، جس میں وہ خود موجود نہیں تھا۔تو وہ روایت اعتبار کے قابل نہیں ہے۔گو کہ وہ راوی صحابہ میں سے کیوں نہ ہو۔

شق صدر کے متعلق روایتیں ایسی مختلف ہیں کہ ان کی باہم تطبیق نہیں ہوسکتی، اس لئے وہ سب کی سب نامعتبر ہیں۔مصنف مواہب لدنیہ نے سب سے زیادہ نادانی کی ہے۔کہ ان مختلف روایتیوں کو دیکھ کر بعوض اس کے ان کو نامعتبر ٹھہراتا، یہ تسلیم کیا ہے کہ واقعہ شق صدر پانچ مرتبہ واقع ہوا ہے۔: اول اس وقت جب آنحضرت اپنی دائی حلیمہ کے پاس رہتے تھے۔دوم مکہ میں جب آنحضرت کی عمر مبارک دس برس کی تھی۔سوم غار حرا میں، چہارم شب معراج میں۔پنجم ایک دفعہ اور جس کے وقت کی تعین مصنف خود نہ کر سکا۔یہ تمام روایتیں ایسی ہیں جن پر تمام ذی علم اور تعلیم یافتہ مسلمان ذرا بھی اعتبار نہیں کرتے۔اور یہ روایتیں محققین اسلام کے نزدیک طفلانہ افسانوں سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں۔

شق صدر کی نسبت ایک روایت جس میں شب معراج میں شق صدر کا ہونا بیان کیا گیا ہے۔اعتبار کے لائق ہوسکتی ہے۔اور اس واقعہ کو ہم معراج کے ساتھ بیان کریں گے۔مگر معراج کے تمام واقعات جو کچھ کے ہوں بطور رویا کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منکشف ہوئے تھے۔پس جو بیان شق صدر کا اس روایت میں ہے، وہ بھی رویا سے متعلق ہے۔

۶۔ واقعہ معراج

اب ہم معراج کے حالات بیان کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں۔معراج کے مقدم واقعات جن پر توجہ کی جاسکتی ہے۔ یہ ہیں۔

ا۔ آنخضرت کا سینہ مبارک کا شق کیا جانا۔آپ کا براق پر سوار ہو کر مکہ سے بیت المقدس کو جانا اور وہاں سے آسمان پر تشریف لے جانا۔ وہ واقعات اور مکالمات جو آسمانوں پر پیش آئے ،مگر مطلق ثابت نہیں ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی ان باتوں کے درحقیقت واقع ہونے کا کبھی دعوٰی کیا ہو۔قرآن مجید سے اور نیز ان روایتوں سے جو روایوں نے معراج کی نسبت بیان کی ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں۔اور اگر اس روایت کو جس میں شق صدر کا بھی ذکر ہے۔صحیح مانا جاوئے تو یہ بھی آنخضرت نے خواب میں دیکھا تھا کہ ان کا سینہ چاک کر کے پانی سے دھویا گیا ہے۔اور اسی خواب میں آنخضرت نے اور بھی کچھ خدا کی نشانیاں دیکھیں۔جس کی تفصیل قرآن مجید میں مذکور نہیں۔

اول ہم اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ معراج صرف ایک رویا تھا۔ بخاری میں لکھا ہے کہ:

عن ابن عباس فی قوله تعالیٰ وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنة قال هی رویا عین ایها رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لیلة اسری به الی بیت المقدس (بخاری):۔

بخاری میں لکھا ہے کہ ''ابن عباس نے قرآن مجید کی تفسیر میں وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ للناس'' کہا کہ یہ آنکھ کا رویا ہے۔ جو رسول خدا کو اس رات دکھایا گیا تھا۔ جب وہ بیت المقدس کو لے جائے گئے تھے۔

قتادہ کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات آنحضرت چت لیٹے ہوئے تھے۔

حسن کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ معراج کی رات کو میں مقام حجر میں سوتا تھا۔

انس کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد حرام میں سوئے تھے۔ جب تمام قصہ معراج کا انس بیان کر چکے تو اس کے اخیر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ لفظ بیان کیے ہیں۔ کہ ''پھر میں جاگ اٹھا اور میں مسجد حرام میں تھا۔''

ام ھانی کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عشا کی نماز پڑھ کر سو رہے تھے۔ اور فجر کے پہلے ہم نے انہیں جگایا۔

عبد ابن حمید کی روایت میں ہے کہ معراج کا حال بیان کرنے میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں سوتا تھا۔'' یا یہ کہا کہ ''چت لیٹا ہوا تھا۔'' یا یہ کہا ہے کہ ''سونے اور جاگنے کے بیچ میں تھا۔''

یہ روایتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ آئندہ لکھی جاویں گی۔ یہ سب روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ معراج کے جو واقعات کے بیان ہوئے ہیں۔ وہ خواب کے واقعات ہیں۔ اور اگر ان روایتوں کی معتبری پر شبہ کیا جائے۔ تو اتنی بات تو ضرور اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے لوگ جب کہ یہ روایات لکھی گئی ہیں معراج کے واقعات کو رویا کے واقعات سمجھتے تھے۔ علاوہ اس کے بہت سے محققین نے جن میں امیہ اور حذیفہ بھی داخل ہیں جو معتبر اصحاب میں سے ہیں، بالاتفاق معراج کو ایک رویا قرار دیا

ہے۔جیسا کہ مندرجہ ذیل سندوں سے ثابت ہوتا ہے۔

نذهب طايقة الى انه اسرى بالروح و انه رويا متام مع اتفا قهم ان رويا الا نبيا ء حق وحى والى هذا ذهب معاوية حكى عن الحسن والمشهور عنه خلافة واليه انثار محمد بن اسحاق . (شفا ء)

شفائے قاضی عیاض میں لکھا ہے کہ ایک گروہ عالموں کا اس طرف گیا کہ معراج روحانی تھی اور وہ سوتے میں ایک رویا تھا۔اس کے ساتھ ہی ان سب نے اتفاق کیا ہے کہ انبیاء کا رویا حق اور وحی ہے۔اور اسی بات کی طرف معاویہ بھی گئے ہیں۔لیکن اس کی مشہور روایت اس کے برخلاف ہے۔اور اس کی طرف محمد ابن اسحاق نے اشارہ کیا ہے۔

وحكى عن محمد بن جرير الطيرى فى تفسيره عن حذيفه انه قال ذلك رويا وانه ما فقد جسد رسول الله صلعم وانما اسرے بروحه وحكى هذا القول ايضاً عن عائشةؓ و عن معاويه .(تفسير كبير.)

مگر علمائے متاخرین نے مذہبی گرم جوشی سے یہ بات قرار دی ہے کہ معراج جسمانی تھی۔اور تمام واقعات جو واقع ہوئے فی الحقیقت واقع ہوئے تھے۔لیکن اس ادعا کی نسبت کوئی سند ان کے پاس قرآن مجید کی موجود نہیں ہے۔ بلکہ بعض الفاظ کے معنوں پر جوش خروش کے ساتھ بحث کر کے اس امر کو قائم کرتے ہیں کہ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ لفظ ''اسریٰ'' کا اطلاق رویا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے معنی رات کے سفر کے ہیں۔اور اسی وجہ سے وہ اس لفظ سے واقعی رات کا سفر مراد لیتے ہیں۔اسی طرح وہ یہ دلیل کرتے ہیں کہ لفظ ''بعبدہ'' کا اطلاق جس کے معنی اپنے بندہ کے ہیں۔روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان دونوں چیزوں سے مرکب ہے۔۔اس لئے ضرور ہے کہ وہ سفر یعنی معراج جسمانی ہوئی ہو۔وہ بیان کرتے ہیں کہ لفظ رویا کے معنی دیکھنے کے ہیں۔اگر

چہ اس سے بالعموم خواب میں دیکھنے کے معنی لیے جاتے ہیں۔لیکن اس کا اطلاق فی الواقع آنکھ کے دیکھنے پر بھی ہوسکتا ہے۔اوراس لیے ممکن ہے کہ ''رویا'' کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے۔اس سے پچھلے معنی مراد ہوں۔اوراس پر وہ یہ دلیل اور اضافہ کرتے ہیں کہ ابن عباس کی روایت میں جو لفظ ''رویا عین'' استعمال ہوا ہے تو ''عین'' کی قید لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ رویا کے لفظ سے فی الواقع آنکھ کا دیکھنا مراد ہے۔

باقی حدیثوں کا جن میں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوتا ہوا ہونا مذکور ہے۔یوں فیصلہ کرتے ہیں کہ یا تو کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج کے شروع ہونے کے وقت لیٹے ہوئے ہوں گے،جیسا کہ لوگ عموماً سونے کے واسطے لیٹتے ہیں۔یا معراج سونے میں شروع ہوئی ہوگی۔اور پھر جاگ گئے ہوں گے۔اور جاگنے کی حالت میں ختم ہوئی ہوگی۔

مگر ہر شخص پر جس میں ذرا بھی سمجھ ہے اور ذرا بھی استدلال کا مادہ رکھتا ہے۔واضح ہوگا کہ مذکورہ بالا دلیلیں کیسی پوچ اور ضعیف ہیں۔ان دلیلیوں کے پیش کرنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو مذہبی جوش میں اندھے ہوکر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں پر جو ذرا بھی مذہب سے علاقہ رکھتی ہیں۔گو وہ کیسی ہی بیھودہ اور محال اور قابل تضھیک ہی کیوں نہ ہوں،آمنا وصدقنا کہنا چاہیئے۔بلا شبہ ان مسلمانوں کا یہ اعتقاد ان کے مذہبی جوش وجذبے پر دلالت کرتا ہے۔لیکن عیسائیوں کا یہ بیان کہ مسلمانوں کو ان سب بے ہودہ باتوں کو امور دینی سمجھ کر بلا وسواس ان پر اعتقاد رکھنا واجب ہے اور بھی زیادہ بیہودہ پن ہے۔دیدہ دانستہ نا انصافی اور حامیانہ جہالت کے کس قدر گہرے اور تاریک گڑھے میں پر پڑو دھنسا ہوا ہے۔جس وقت کہ اس نے یہ کہا کہ جملہ مسلمان اس کو ایک امر دینی سمجھتے ہیں اور اس مذہب کے تمام لوگوں کا اس قصے پر ایسا مستحکم اعتقاد ہے۔جیسے کہ عیسائی انجیل کے کسی امر پر عقیدہ

رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کی عادت ہے کہ جب ہو کوئی کتاب مذہب اسلام یا اس کے بانی کے حالات میں لکھتے ہیں۔تو ان کا ارادہ انصاف یا تحقیق حق کا نہیں ہوتا۔ بلکہ قلم اٹھانے سے پہلے وہ قصد کر لیتے ہیں کہ جس قدر ہو سکے اس کو لغو اور بیہودہ ظاہر کیا جائے۔ پس وہ ان تمام لغو اور مہمل روایتوں کو کہ جن کو خود مسلمان تسلیم نہیں کرتے (جیسا کہ شق صدر وغیرہ) ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر مسلمانوں کے خاص امور دینی بغیر کسی دلیل کے قرار دیتے ہیں۔اور اس پر زبان طعن و تشنیع دراز کرتے ہیں۔عیسائیوں باستشناء معدودے چند کے اس مقدس شخص کے احکام وطریقہ کو جس کے پیرو وہ اپنے تئیں بتاتے ہیں اور جس کے حلم اور نیک خصلت سے وہ محض بے بہرہ ہیں بالائے طاق رکھ کر ان لوگوں پر جو خدائے واحد برحق پر ایمان رکھتے ہیں۔ایسے الفاظ سے طعن و تشنیع کی ہے۔جن کا ملحد اور لا مذہب لوگوں پر بھی استعمال کرنا زیبا نہیں دیتا ہے۔اسی قسم کی نا انصافانہ سخت کلامیاں ہیں۔جو عیسائیوں نے معراج اور شق صدر کے باب میں لغو اور نا معتبر روایتیوں کی بنیاد پر مسلمانوں پر کی ہیں۔

مگر ہم ان عیسائی مصنفوں کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جنھوں نے انصافانہ تسلیم کیا ہے کہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اس واقعہ کو خواب کا واقعہ بیان کرتے تھے۔اور انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ راویوں نے جو زیادتیاں اس میں کر دی ہیں۔ان سے بانی مذہب اسلام پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا ہے۔چناں چہ اکتوبر کے کوارٹرلے ریویو نمبر ۲۵۴ میں ایک عیسائی مصنف نے یہ رائے لکھی ہے کہ جو کچھ ہم کو اس مقام پر بیان کرنا ہے۔ وہ یہ کہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے بعض سرگرم پیرووں کا ذمہ دار قرار نہیں دینا چاہیئے۔ جب کہ انھوں نے اس خواب کو (جس کے ہم پلہ تمام ڈواین کامڈی میں شاید ہی کوئی خواب ہو۔) اور جس نے البتہ کسی قدر رنگ اس سے نا دانستہ اڑایا ہے۔

لیکن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اس کو خواب کہتے کہتے تھک گئے) ایک مہمل اور لایعنی چیز کے ساتھ بدل دیا۔"

اگرچہ ہم نے ان روایتیوں کی جو معراج سے متعلق ہیں، بخوبی قدرومنزلت جیسی کہ ان کی ہے بیان کی ہے۔ لیکن اب ہم ان تمام نامعتبر روایتیوں کو اوران تمام بے بنیاد قصوں کو جو ان میں مذکور ہیں۔ بغرض اتمام حجت واقعی تسلیم کرلیتے ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کرلیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے ھاں ایک خاص امر دینی ہے۔ اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنیاد پر مذہب اسلام پر طعن وتشنیع کرتے ہیں، پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر رند مچاتے ہیں۔ جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے۔ اور وہ اس امر کو دینی خیال نہیں کرتے کہ حضرت الیاس آسمان پر انسانی جسم وشکل کے ساتھ بدوں چکھے ذائقہ موت کے ایک آتشیں گاڑی میں بذریعہ ایک آندھی کے اٹھا لیے گئے ہیں۔؟ اور کیا عیسائی اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے۔ اور خدا کے دست راست کی طرف بیٹھے ہیں۔ یعنی خود اپنے ہی دست راست کی طرف، کیونکہ وہ خود خدا تھے۔؟۔ (متی باب، ۲۸ ورس ۷ مرقس باب ۱۶ ورس ۱۹)۔

اس واسطے ہم تمام عیسائیوں کو جو ایسی خراب اور ایذا رساں تقلید کی جانب مائل ہیں۔ ان کے احکام مرقومة الزیل کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ کہ "تو اس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے۔" اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے۔ اس کو نہیں دیکھتا۔ تو اپنے بھائی کو کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے۔ جب کہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں کا شہتیر تو نکال لے۔ تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں کا ذرہ نکالنے کے لیے صاف نظر آنے لگے گا۔" لوقا باب ۶ ورس ۴۱،

۴۴)''۔

گرم جوش پیرو جب ہمیشہ اس قسم کے واقعات کو جب نظم یا نثر میں بیان کرتے ہیں، تو اس میں شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔اسی طرح معراج کے حالات لوگ نظم و نثر میں بیان کرتے ہیں۔تو اس میں شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔یہ امر مسلمانان گرم جوش پیروؤں پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ عیسائی گرم جوش پیروؤں کا بھی یہی حال ہے۔ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر چلے جانے کے واقعات کو نہایت شاعرانہ رنگینی سے نظم کیا ہے۔جس کا ترجمہ ہم لکھتے ہیں۔

اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی۔اور اس کے پیچھے صدائے مرحبا اور دس ہزار چنگوں کی سریلی آوازیں تھیں۔ جو رمزمہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں۔زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی۔تمام افلاک و بروج سے صدائے بازگشت آ رہی تھی۔سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ جب کہ یہ نورانی جلوس طنطنہائے شاد کامی کے ساتھ عالم بالا کا عازم ہوا۔انھوں نے یہ نغمہ گایا اے لازوال دروازہ کھل جاؤ۔اے آسمانوں اپنے دروازوں کو وا کرو۔اور اس بڑے نجات دھندہ کو جو اپنے کام کو اختتام تک پہنچا کر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے۔اندر لے لو۔اب خدا تعالیٰ نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ کرے گا۔اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولے الاجنحۃ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔

پس کیا کسی مسلمان کو زیبا ہے کہ ان شاعرانہ خیالات کو مذہب عیسوی میں داخل قرار دے کر ان پر بے ہودہ طعن و تشنیع شروع کرے۔

اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی کیا کچھ نشانیاں دیکھیں اور کچھ مذکور نہیں ہے۔مگر قرآن مجید کے طرز کلام پر اگر ہم غور

کریں، تو اس سے ان نشانیوں کا استنباط کریں تو کہہ سکتے ہیں۔ کہ قرآن مجید میں آیت اور آیات کا لفظ احکام پر اطلاق ہوا ہے۔ اور دکھلانے کا لفظ کسی بات پر کامل یقین کرا دینے کی نسبت بولا جاتا ہے۔ پس آیت معراج کے ان الفاظ کے" لنریہ من ایاتنا" کے یہ معنی ہوئے۔ تاکہ یقین کرا دیں، ہم اس کو بعض حکموں سے"۔ پس وہ نشانیاں وہی احکام تھے۔ جو عالم رویا میں ان کو وحی کیے گئے۔ اب ہم کو تلاش کرنا چاہیئے کہ وہ احکام کیا تھے۔ جب ہم اس مقدس سورت کو بغور پڑھتے ہیں۔ اور بخوبی چھان بین کرتے ہیں۔ تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام جو آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منکشف ہوئے اور جو اسی سورت میں مذکور ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

لا تجعل مع الله الها اخر فقد مذمو ما مخذو لا (آیت ۲۳)

و قضی ربک الا تعبد و الا ایاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک اللکبر احد هما او قال هما فلا تقل لهما اف و لا تنهر هما، و قل لهما قولا کریما. (آیت ۲۴)

مت مقرر کر ساتھ اللہ کے معبود اور پس بیٹھ رہے گا۔ تو مذمت کیا گیا ھلاکت میں سونپا ہوا۔

اور حکم کیا تیرے پروردگار نے کہ نہ پوجو مگر اسی کو۔ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر پہنچیں تیرے نزدیک بڑھاپے کو دونوں میں سے ایک یا دونوں۔ پس مت کہو ان کو اف اور مت ڈانٹ ان کو، اور کہہ ان کو معزز کہنا۔

و اخفض لهما جناح الذل من الرحمة و قل رب ارحمها کما ربیانی صغیرا. (آیت ۲۵.)

اور نیچا کر ان دونوں کے لئے ذات کا بازو، مہربانی سے، اور

کہہ اے پروردگار رحم کر ان پر جس طرح پالا تھا انھوں نے مجھ کو چھٹ پن میں۔

وات ذا القربیٰ حقه والمسكين وابن السبيل ولا تبذر تبذيرا. (آیت ۲۸).

ولا تجعل يدک مغلو لة الیٰ عنقک ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا. (آیت ۳۱.)

ولا تقتلو اولادكم خشيته املا ق، نحن ترزقهم وايا كم ان قتلهم كان خطاءً كبيرا. آیت ۳۳.

ولا تقربو الزنا انه كان فاحشة و سا ء سبيلا. (آیت ۳۴.)

ولا تقتلو النفس التى حرم الله الا با لحق . (آیت ۳۵.)

ولا تقربو مال اليتيم الا بالتى هى احسن حتیٰ يبلغ اشده و اوفوا بالعهد ان العهد كان مسئو لا. (آیت ۳۶.)

اور دے رشتہ داروں کو اس کا حق اور مسکین کو اور مسافروں کو۔

اور مت کر اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف اور مت کھول دے اس کو بالکل کھول دینا۔ کی بیٹھ رہے تو ملامت کیا ہوا درماندہ۔

اور مت مار ڈالو اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے، ہم ان کو اور تم کو روزی دیتے ہیں۔ بے شک ان کا مار ڈالنا بڑا گناہ ہے۔

اور زنا کے پاس مت جاؤ۔ بے شک وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

اور مت مار ڈالنا اس جان کو جس کو خدا نے حرام کیا ہے۔ مگر حق کے ساتھ۔

اور مت چھوؤ یتیم کے مال کو مگر پسندیدہ طریقے سے یہاں تک کہ وہ پہنچے اپنی جوانی

کو اور پورا کرو عہد کو بے شک عہد پوچھا جاوے گا۔

وافوا الکیلاذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم.(آیت ۳۷)

ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولئک کان عنہ مسئولا.(آیت ۳۸.)

ولا تمش فی الارض مرحاً انک لن تخرق الارض و لن تبلغ الجبال طولا.(آیت ۳۹.)

کل ذالک کان سیئہ عند ربک مکروھا .(آیت ۴۰)

ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمة ولا تجعل مع اللہ الٰھا آخر فتلقی فی جھنم ملوما مدحورا.(آیت ۴۱.)

اور پورا کرو پیمانہ کو جب ناپو۔اور وزن کرو سدھ ترازو سے۔

اور اس بات کے پیچھے مت پڑ۔جس کا تجھ کو علم نہیں ہے۔بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہوگا۔

اور زمین میں اکڑتا ہوا مت چل۔یقیناً تو زمین کو پھاڑ نہ ڈالے گا۔اور لمبان میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا۔

ان سب باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تیرے پروردگار نے وحی بھیجی، تیری طرف حکمت سے اور مت قرار دے خدا کے ساتھ دوسرا خدا کہ ڈالا جائے تو دوزخ میں ملامت کیا ہوا۔راندہ ہوا۔

پچھلی آیت سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان احکام کی وحی خدا تعالیٰ نے دی تھی۔اور جو کہ یہ تمام احکام اسی سورہ معراج میں بہ لفظ وحی بیان ہوئے ہیں۔اس سے یقین ہوتا ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شب معراج میں احکام کا انکشاف ہوا تھا۔

بعض روایتیں اس خواب میں بہت سی اور چیزوں کے ظاہر ہونے کو بیان کرتی ہیں۔ مگر ان کی صحت کے واسطے کوئی بھی قابل یقین معتبر سند نہیں ہے۔ اور ایسی بہت کم روایتیں ہیں، جن کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک پہنچتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان راویوں نے کوئی بات قران مجید سے اور کوئی بات حدیثوں سے بلا تنقیح ان کی صحت کے اور کوئی بات کسی راوی کی زبانی روایت سے، اور کوئی دوسری بات کسی اور راوی کی زبانی روایت سے چن کر اور ان سب پر اپنے سے دلیل اور وہمی خیالات کا اضافہ کر کے ایک قصہ گھڑ لیا۔ علاوہ اس کے یہ سب روایتیں کچھ عقل ہی کے بر خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ خود دین اسلام کے عقائد اصولی کے اس قدر خلاف ہیں کہ ان پر ذرہ برابر بھی اعتقاد رکھنا محال ہے۔

علاوہ اس کے یہ روایتیں ایک دوسری سے ایسی مخالف اور متناقض ہیں کہ ہم کو کوئی شخص ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ایک کی دوسری سے تطبیق کر سکے۔ اس مقصد سے کہ جو کچھ ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہماری اس کتاب کے پڑھنے والوں کے ذہن میں بخوبی آ جاوے گا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سب روایتوں کو اس مقام پر نقل کریں، اور ان کے اختلافات دکھانے کو ان کو علیحدہ علیحدہ اٹھارہ حصوں میں تقسیم کریں۔

اول۔ ان اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے، جو مقام وقوع معراج سے متعلق ہیں

عن قتادہ عن انس ابن مالک عن مالک بن صعصعة ان النبی صلی اللہ علیه و آله وسلم حدثهم عن لیلة اسری به بینما انا نی الحطیم وربما قال فی الحجر. (قتادہ)

عن ابن شهاب عن انس قال کان ابو ذر یحدث ان رسول الله صلی اللہ علیه و آله وسلم قال فرج عنی سقف بیتی وانا بمکة (ابن شهاب)....

عن ام هانی انها قالت ما اسری بر سول الله صلی اللہ علیه و آله وسلم الا هو فی بیتی تلک اللیلة .....(ام هانی).......

وقد روی عن عمر بن الخطاب فی حدیث الاسر ا ء عنه علیه السلام انه قال ثم رجعت الی خدیجة وما تحولت عن جانبها... (شفا ء)

مالک بن صعصہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں سے شب معراج کا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اس درمیان میں کہ ''میں حطیم میں تھا۔'' اور کبھی فرمایا کہ حجر میں۔

انس سے روایت ہے کہ ابوذر حدیث بیان کیا کرتے تھے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت شق ہوگئی۔ اور میں مکہ میں تھا۔

ام ھانی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ وہ اس رات کو میرے گھر میں تھے۔

حضرت عمر بن الخطاب نے معراج کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پھر واپس آیا میں خدیجہؓ کی طرف اور انھوں نے کروٹ نہیں بدلی تھی۔

دوم۔ان اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے جو بروقت شروع معراج آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت سے متعلق ہیں

مضطجا (قتادہ)

وعن الحسن بینما انا نائم فی الحجر جا ء نی جبرئیل فھمزنی بعقبہ لقمت فجلست فلم ارا حد افعلات الی مضجی ذکر ذالک ثلثا فقال فی الثالثۃ فا خذ بعضدی فجرنی الی باب المسجد (حسن)......

عن انس وھو نائم المسجد الحرام وذکر القصۃ ثم قال فی آخرھا فا ستیقضت و انا با المسجد الحرام . ...(شفا قاضی عیاض)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی العشا ء الاخرۃ و نام بیننا فلما کان قبل الفجر اھبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلما صلی الصبح قال یا ام ھانی لقد صلیت معکم العشا ء الاخرۃ کما رایت بھذا الوادی ثم جئت بیت المقدس فصلیت فیہ ثم صلیت الغداۃ معکم الان کما ترون (ام ھانی).....

فی روایتہ عبد بن حمید عن ھمام بیننا انا نائم و ربما قال مضطجع و فی الروایۃ الا خری بین النایم والیقطان ... (شفاعیاض)

لیٹے ہوئے قتادہ۔

اس درمیان کہ میں حجر میں سویا تھا جبرئیل میرے پاس آئے اور پھر ٹھوکا دیا ایڑی سے، پس میں اٹھ بیٹھا، سو مجھ کو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر میں اپنی خواب گاہ کی طرف پھرا۔ آپ نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کو نے تین بار ذکر کیا۔ اور تیسری بار فرمایا کہ میرے بازو کو پکڑا اور مسجد کے دروازے تک کھینچ لائے (حسن)

انس سے روایت ہے کہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ مسجد حرام میں قصہ کو بیان کیا۔ پھر اخیر میں کہا کہ جاگا میں اور میں مسجد حرام میں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخیر عشاء پڑھی اور ہم لوگوں میں سوئے، فجر سے پہلے آنحضرت نے ہم لوگوں کو جگایا۔ پھر جب آپ نے صبح کی نماز پڑھ لی اور ہم لوگوں نے بھی پڑھ لی۔ آپ نے فرمایا، اے ام ھانی میں نے تم لوگوں کے ساتھ اخیر عشاء پڑھی، جیسا کہ تو نے اس میدان میں دیکھا۔ پھر میں بیت المقدس پہنچا اور وہاں نماز پڑھی۔ اور پھر صبح کی نماز اس وقت تم لوگوں کے ساتھ پڑھی۔ جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔

ھمام سے روایت ہے کہ اس درمیان میں کہ میں سویا ہوا تھا، اور کبھی فرمایا کہ لیٹا ہوا تھا۔ اور دوسری روایت ہے کہ سونے اور جاگنے کے درمیان میں۔

عایشہؓ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم کو گم نہیں کیا۔

سوم۔ متعلق شق صدر

اذا تانی آت فشق ما بین هذا الی هذا یعنی من ثعرة تحره. الی شعرته . قتاده ......

کہ میرے پاس ایک آنے والا آیا اور یہاں سے یہاں تک چاک کر دیا یعنی سینہ کی ہڈی سے بالوں تک۔

فنزل جبرئیل ففرج صدری۔ (ابن شہاب)

پس اترے جبرئیل اور چاک کیا میرا سینہ۔

چہارم واقعات بعد شق صدر

فاستخرج قلبی ثم آتیت بطست من ذهب مملو ایمانا فغسل قلبی ثم حشی ثما اعید. (قتاده...)

پس میرا دل نکالا پھر ایک طشت سونے کا لائے، جو ایمان سے بھرا ہوا تھا۔ پھر میرے دل کو دھویا گیا۔ پھر بھر دیا گیا اور ویسا ہی کر دیا گیا۔

....

و فی روایته ثم غسل البطن بماه زمزم ملا ایمانا و حکمة ...(قتاده)

ایک روایت میں ہے کہ پھر پیٹ کو زمزم کے پانی سے دھویا، جو ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا تھا۔۔۔۔

ثـم غسـل بـمـا ء زمـزم ثـم جـا ء بطست من ذهب ممتلیء حکمته وایمانا فا فرغه فی صدری ثم اطبقه .... (ابن الشهاب).......

پھراس کو دھویا زمزم کے پانی سے، پھرایک طشت سونے کے پانی کا لایا گیا، جو حکمت وایمان سے بھرا ہوا تھا۔ پس اس کو میرے سینہ میں انڈیلا اور پھر برابر کردیا۔

پنجم متعلق براق

ثـم اتیـت یـدایته دون البغل وفوق ا لحمار ابیض یقال له براق یضع خطوه عند اقمی طرفه...قتاده.....

پھرایک چوپایہ میرے پاس لایا گیا۔ خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا، سفید رنگ کا جس کا نام براق تھا۔ جس حدتک اس کی نظر جاتی تھی۔ اس کا قدم وہیں پڑتا تھا۔

....

عـن ثـابـت البسـنـانـی عـن انـس ان رسول الله صلی الله علیه وآله وسـلـم قال اتیت با براق و هو دابته ابض طویل فوق الحمار و دون البغل یقع حافره عنه منتهی طرفه ...... (ثابت).............

ثما اخذ بیدی فعرج بی الی السما ء.... (ابن شهاب)....

انس سے روایت ہے کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج ہوئی۔ براق لایا گیا۔ زین کسا ہوا اور لگام چڑھایا ہوا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھ کو آسمان تک چڑھا لے گیا۔

ششم۔ متعلق سواری براق

فحملت عليه. .. (قتاده)

فركبته .... (ثابت)

فا ستصعسب عليه فقال له جبرئيل ايمحمد تفعل هذا فما ركبك احمد اكرم الله منه فار فض عرقاو قال الترمذى هذا حديث غريب . ..... (انس).......

پس میں اس پر سوار کرایا گیا۔

پس میں اس پر سوار ہوا۔

پس اس کو دشوار گزرا۔

جبرئیل نے اس سے کہا ارے تو محمدؐ کے ساتھ ایسا کرتا ہے۔کوئی شخص ان سے زیادہ بزرگ تجھ پر سوار نہیں ہوا۔پس وہ پسینے سے تر ہو گیا۔ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

ہفتم واقعات بیت المقدس پہنچنے کے

حتى اتيت بيت المقدس فربتطة با لحلقة

التی بر ربط بها الا نبیا ء. . .(ثابت)......

یہاں تک کہ میں بیت المقدس آیا۔ پس میں نے اس کو اسی حلقہ میں باندھ دیا۔ جس میں اور انبیاء باندھا کرتے ہیں۔

عن بریدہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم لما انتھینا الی بیت المقدس قال جبرئیل یا صبعہ فخرق بھا الحجر فشد بہ البراق... (رواہ الترمذی)

بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جب ہم بیت المقدس پہنچے جبرئیل نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ پس پتھر پھٹ گیا۔ اس سے براق کو اٹکا دیا گیا۔

قتادہ اور اس کے سوا اور راویوں نے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیت المقدس جانے اور وہاں چند رسوم کے ادا کرنے کا جن کو اب ہم بیان کریں گے۔ کچھ ذکر نہیں کیا ہے۔

ہشتم رسوم جو بیت المقدس میں ادا کی گئیں

قال ثم دخلت المسجد فصلیت فیه رکعتین. (ثابت)......

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر داخل ہوا میں مسجد میں اور دو رکعت نماز اس میں پڑھی۔

عن ابی هریره قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم لقد رایتنی فی الحجر و قریش تسالنی عن مسرای فسالتنی عن اشیا ء بیت المقدس لم اثبتها فکربت کربا ما کربت مثله فرفعه لی انظر الیه ما یسالونی عن شے الا ابناتهم و قد رایتنی فی جماعته من الانبیا ء فاذا موسیٰ قایم یصلی فاذا رجل ضرب جعد کانه من رجالشنئو ة واذا عیسیٰ قایم یصلی اقرب انناس به شبها عروة بن مسعود الشقفی فاذا ابراهیم قایم یصلی اشبه الناس به صاحبکم یعنی نفسه فحانت الصلواة (صلواة العصر) فا ممتهم فلما فرغت من الصلواة قال لی قایل یا محمد هذا مالک خازن النار فسلم علیه فالشفت الیه فبدانی بالسلام .... (رواه مسلم)......

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میں حجر میں تھا۔ قریش میری معراج کا حال پوچھ رہے تھے۔ پس انھوں نے مجھ سے بیت المقدس کے متعلق چند باتیں پوچھیں۔ جو مجھے یاد نہیں رہیں تھیں۔ اس پر مجھ کو ایسا صدمہ ہوا۔ کہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا کہ میں اس کو دیکھنے لگا۔ پھر جو بات انھوں نے پوچھی میں نے سب بتائی۔ اور میں نے اپنے کو

جماعت انبیاء میں دیکھا، یکا یک موسیٰ نظر آئے کہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ ایک پیچیدہ مو آدمی تھے۔ گویا شنوۃ کے لوگوں میں سے ہیں۔ پھر عیسیٰ نظر آئے کہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ عروۃ بن مسعود ثقفی ان سے صورت میں بہت ملتے تھے۔ پھر براھیم نظر آئے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ ان سے بہت ملتا ہوا تمہارا ساتھی ہے۔ (حضرت نے اس سے اپنے کو مراد لیا۔) پھر نماز عصر کا وقت ہوا۔ میں ان سب کا امام بنا۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوا تو کسی کہنے والے نے مجھ سے کہا اے محمد یہ مالک دوزخ کا داروغہ ہے۔ اس کو سلام کرو۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو انھوں نے خود سلام میں پیش دستی کی۔ (اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔)

عن جابرؓ انه سمع رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم یقول لما کذبنی قریش قمت فی الحجر فجلی الله لی بیت المقدس نطفقت اخبر هم عن ایانه و انا انظر الیه... (متفق علیه)...

جابر سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہتے سنا کہ جب قریش نے مجھ کو جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا تھا۔ پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور بیت المقدس کی علامتیں بتاتا جاتا تھا۔

وفی حدیث ابی هریرة ثم سار حتی اتی بیت المقدس فنزل فربط فرسه الی صخرة فصلی مع الملئکة قالو ا یا جبرئیل ما هذا معک قال هذا محمد رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم (خاتم النبیین) قالوا او قد

ارسل الیه قال نعم قالوا حیاه الله من اخ و خلیفة ثم لقوا ارواح الانبیا ء فاثنوا علی ربهم وذکر کلام کل واهد منهم و هم ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ و داؤد و سلیمان ثم ذکر کلام النبی صلی الله علیه وآله وسلم فقال ان محمد صلی الله علیه وآله وسلم اثنی علی ربه فقال کلکم اثنی علی ربه وانا اثنی علی ربی الحمد لله الذی اوسلنی رحمة اللعالمین کافة للناس اجمعین بشیرا نذیرا و انزل علی القران فیه تبیان کل شئی وجعل امتی وسط وجعل امتی هم الاولون و هم الا خرون و شرح لی صدری ووضع عنی وزری ورفع لی ذکری وجعلنی فاتحا و خاتما فقال ابراهیم بهذا فضلکم یا محمد. (شفا ء قاضی عیاض)

ابوھریرہ کی حدیث میں ہے کہ پھر چلے آنحضرت یہاں تک کہ بیت المقدس میں آئے اور پھر اتر کر اپنے گھوڑے کو ایک پتھر سے باندھ دیا۔ پھر فرشتوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب نماز ہوئی تو لوگوں نے پوچھا، اے جبرئیل تمہارے ساتھ یہ کون ہیں۔ جبرئیل نے کہا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء لوگوں نے کہا کیا ان کے پاس پیغام بھیجا گیا۔ انھوں نے کہا ھاں۔ سب نے کہا خدا ان کو زندہ رکھے۔ بڑے اچھے بھائی اور خلیفہ ہیں۔ پھر انبیا ء کی روحوں سے ملاقات ہوئی۔ سب نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی۔ اور ھر ایک کا کلام بیان کیا۔ (ابوھریرہ نے) اور وہ ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ و داود وسلیمان تھے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام بیان کیا (ابو ھریرہ نے)، پس کہا کہ محمدؐ نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی، تو کہا کہ

تم سب نے اپنے خدا کی تعریف کی۔ اور اب میں اپنے خدا کی تعریف کرتا ہوں۔ حمد ہے اس خدا کو جس نے مجھ کو تمام عالم کے لیے رحمت کر کے بھیجا۔ اور تمام لوگوں کے لئے خوش خبری اور ڈرانے والا کر کے بھیجا۔ اور مجھ پر قران اتارا کہ جس میں ہر شے کی توضیع ہے۔ اور میری امت کو اور امتوں سے افضل کیا۔ اور میری امت کو وسط کیا اور میری امت کو قرار دیا۔ کہ وہی پہلے ہیں اور وہی پچھلے ہوں گے۔ اور میرا سینہ کھول دیا اور بوجھ مجھ سے اتار دیا۔ اور میرا چرچا بلند کیا۔ اور مجھ کو فاتح کیا اور خاتم کیا۔ پس ابراہیم نے کہا اسی سے محمد تم سب سے بڑھ گئے۔

وانکر ذلک (ای الصلواۃ فی بیت المقدس) خذیفه بن الیمان و قال واللہ مازال عن ظهر البراق حتی وجع.... (شفاء)

اور انکار کیا اس کا (یعنی بیت المقدس میں نماز کا) خذیفہ بن یمان نے اور کہا بخدا رسول اللہ براق کی پیٹھ سے الگ نہیں ہوئے واپس آنے تک۔

نہم واقعات بروقت خروج از بیت المقدس

ثم خرجت فجاء نی جبرئیل باناء من خمر واناء من لبن فاخترت اللبن فقال جبرئیل اخترت الفطرة . .. (ثابت)

پھر میں نکلا، پس جبرئیل میرے پاس شراب کا ایک ظرف اور

دودھ کا ایک ظرف، پس میں نے دودھ کا اختیار کیا۔ جبرئیل نے کہا
تم نے فطرت کو اختیار کیا۔

دھم۔۔۔۔واقعات فلک اول

فـانـطـلـق جبـرئيل حتى اتى السما ء لدنيا فاستفتح قيل من هذا قال جبـرئيـل قيـل و من معک قال محمد قيل و قد ارسل اليه قال نعم قيل مر حبـا فـنـعم المجى جاء ففتح فلما خلصت فاذا فيها آدمم فقال هذا ابوک آدم فسلـم عـليـه فسلمت عليه فرد السلام ثم قال مر حبا بالا بن الصالح والنبى الصالح . (قتاده)

پس چلے جبرئیل یہاں تک کہ آسمان دنیا تک پہنچے اور کھلوایا۔لوگوں نے کہا یہ محمد ہیں۔لوگوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے تھے؟۔ کہا ھاں۔ لوگوں نے کہا مرحبا خوب آئے پھر کھل گیا آسمان۔پھر جب میں پہنچا تو آدم نظر پڑے،جبرئیل نے کہا تمہارے باپ آدم ہیں، ان کو سلام کرو۔ میں نے سلام کیا۔انھوں نے سلام کا جواب دیا۔اور پھر کہا اچھے نبی کو مرحبا۔اچھے بیٹے کو مرحبا۔

پھر مجھ کو آسمان پر لے کر چڑھے اور اسی طرح بیان کیا) فرمایا یکا یک آدم نظر پڑے پس مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔

فـلما جئت الى السماء الدنيا (وساق مثل معناه) اذا رجل قاعد على يـمينه اسورة وعلىٰ يساره اسورة اذا نظر قبل يمينه ضحک واذا نظر قبل شـماله يبكى فقال مرحبا يا لنبى الصالح والا بن الصالح قلت لجبرئيل من

هـذا قال آدم و هذه الا سورة عن يمينه و عن شماله لسم بنيه فاهل اليمين مـنهـم اهـل الـجنة و الا سورة التى عن شماله اهل النار فاذا الظر عن عيينه ضحک و اذا نظر قبل شماله بکی (ابن شهاب)

پس جب میں آسمان دنیا تک پہنچا (اور اس کے مثل بیان کیا) یکا یک ایک شخص نظر پڑے جن کے دائیں بائیں سیاہ شکل ہیں جب دہنی جانب دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا اچھے نبی کو مرحبا، اچھے بیٹے کو مرحبا، میں نے جبرئیل سے کہا یہ کون ہیں کہا یہ آدم ہیں۔ اور ان کے دائیں اور بائیں جانب کی سیاہ صورتیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں سو دہنی جانب والے اہل جنت ہیں اور بائیں طرف والے اہل دوزخ ہیں پس جب وہ دہنی طرف دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں اور بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔

عـن انس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بينا انا قاعد ذات يـوم اذ دخـل جبـرئيل عليه السلام فركز بين كتفى فقمت الى شجرة فيها مثـل و كرى الطائر فقعد فى واحدة وقعدت فى الاخرى فنمت حتى سلت الخافقين ولو شئت لمست السماء وانا اقلب و نظرت جبرئيل كانه حلس لا طـئـى فعرفت فضل علمه بالله على و فتح لى باب السماء و رايت النور الاعـظـم واذا دونـى الـحـجـاب و فـرجة الدر واليا قوت تم اوحى لله الى ماشاء ان يوحى (شفاء قاضى عياض)

انس سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت نے میں بیٹھا ہوا تھا

ایک دن یکا یک جبرئیل آئے اور میرے دونوں شانوں کے درمیان
ذرا دبایا پس میں ایک درخت کی طرف گیا جس میں پرند کے گھونسلے
بھی تھے۔ پس ایک میں جبرئیل بیٹھے اور ایک میں میں پھر میں سو گیا
یہاں تک کہ خافقین سے آگے بڑھ گئے اور اگر میں چاہتا تو آسمان کو
چھو لیتا اور میں پلٹے کھاتا تھا مگر جبرئیل کو دیکھا تو وہ گویا عرق گیر تھے
(یعنی اپنی جگہ جمے رہے) پس میں نے ان کا افضل ہونا علم الٰہی میں
اپنے سے جان لیا اور میرے لیے آسمان کے دروازے کھولے گئے
اور میں نے نور اعظم دیکھا اور یکا یک میرے سامنے حجاب تھا اور
موتی و یاقوت کے دریچے پھر خدا نے میری طرف وحی کی جو وحی
چاہی۔

وذکر البزار عن علی ابن ابیطالبؓ لما اراد الله تعالیٰ ان یعلم رسوله
الاذان جاه جبرئیل بدابة یقال لها البراق فذهب یرکبهافا ستصعب علیه
فقال لها جبرئیل علیه السلام اسکنی ذو الله مارکبک غیر اکرم علی الله
من محمد صلی الله علیه وسلم فرکبتها حتی اتی بها الی حجاب الذی
یلی الرحمن تعالیٰ فبینا هو کذالک اذ خرج ملک من الحجاب فقال
رسول الله صلی الله علیه وسلم یا جبرئیل من هذا قال والذی بعثک
بالحق نبیا انی لا قرب الخلق مکاثا و ان هذا الملک ما رائیته منذ خلقت
قبل ساعتی هذه فقال الملک الله اکبر الله اکبر فقیل له من وراء
الحجاب صدق عبدی انا اکبر انا اکبر ثم قال الملک اشهدان لا اله الا
الله فقیل من وراء الحجاب صدق عبدی انا الله لا اله انا وذکر مثل هذا

فی بقیة الا ذان الا انه لم یذکر جوابا من قوله حی علی الصلوة حی علی الفلاح و قال ثم اخذ الملک ید محمد صلی اللہ علیه وسلم فقدمه فلم اهل السماء فیهم آدم و نوح قال ابو جعفر محمد بن علی الحسن روایه اکمل اللہ لمحمد صلی اللہ علیه وسلم الشرف علی اهل السموات والارض (شفاء)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خدا نے چاہا کہ اپنے رسول کو اذان سکھائے تو جبرئیل ان کے پاس ایک چار پایہ لائے جس کو براق کہتے ہیں پس آپ اس پر چڑھتے گئے سو اس کو دشوار لگا جبرئیل نے اس سے کہا ٹھہر بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اچھا شخص خدا کے نزدیک تجھ پر نہیں سوار ہوا یہاں تک کہ اس پردہ کے پاس آیا جو خدا کے قریب ہے اسی درمیان میں پردہ سے ایک فرشتہ نکلا پس آنحضرت نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہے جبرئیل نے کہا اس کی قسم جس نے تجھے نبی برحق مبعوث کیا میں خلق اللہ میں سب سے زیادہ مقرب بارگاہ ہوں مگر اس فرشتہ کو اس وقت سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جب سے میں پیدا ہوا پس فرشتہ نے کہا اللہ اکبر اللہ اکبر پس پردہ کی اوٹ سے آواز آئی سچ کہا میرے بندہ نے میں بڑا ہوں میں بڑا ہوں، پھر فرشتہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ۔ پردہ سے آواز آئی کہ سچ کہا میرے بندہ نے میں خدا ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اسی طرح ذکر کیا اذان کے بقیہ میں۔ مگر حی علی الصلواۃ، حی علی الفلاح کا جواب نہیں ذکر کیا

اور کہا پھر فرشتہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھایا۔
پس آنحضرت نے آسمان والوں کی امامت کی جس میں آدم ونوح
تھے۔ ابوجعفر محمد بن علی الحسین جوراوی ہیں انہوں نے کہا کہ خدا نے
آنحضرت کو اہل زمین اور آسمان دونوں پر بزرگی بخشی۔

یازدہم واقعات فلک دوم

ثم صعد بی حتی اتی السماء، الثانیه (وساق مثل معناه) اذا یحیٰی و عیسیٰ و هما ابنا خالة (وساق مثله) قالا مرجا بالاخ الصالح والنبی الصالح (فتاده)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ دوسرے آسمان پر آئے
(اور اسی کے ہم مضمون بیان کیا) ناگاہ وہاں یحیٰی وعیسیٰ تھے اور وہ
دونوں بھائی ہیں (اور اسی طرح بیان کیا) ان دونوں نے کہا نیک
بھائی اور نیک نبی کو مرحبا۔

ثم عرج بنا الی السماء لثانیه (وساق مثله) فاذا اثا با بنی الخالة عیسیٰ بن مریم و یحیٰی بن ذکریا صلم فرحبا لی و دعوالی بخیر (ثابت)

پھر مجھ کو دوسرے آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح بیان
کیا) پس ناگاہ میں دو بھائیوں عیسیٰ بن مریم ویحیٰی بن ذکریا کے پاس
تھا۔ انہوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔

حتی عرج بی الی السماء الثانیة (وساق مثله) قال الانس فذکر انه

وجد فی السموات آدم و ادریس و موسیٰ و عیسیٰ و ابراھیم ولم یثبت کیف منازلھم غیرانه ذکرانه وجد آدم فی السماء الدنیا و ابراھیم فی السماء السادسة (ابن شھاب)

یہاں تک کہ مجھ کو دوسرے آسمان تک چڑھا لے گئے (اور اسی طرح بیان کیا) انس نے کہا کہ پس ذکر کیا آنحضرت نے کہ پایا آسمانوں میں آدم و ادریس و موسیٰ وعیسیٰ و ابراہیم کو اور ان کے مقامات نہیں متعین کیے ہاں اس قدر ذکر کیا کہ آدم کو آسمان دنیا میں پایا اور ابراہیم کو چھٹے آسمان میں۔

وفی روایة رای یوسف فی الثانیة و یحییٰ و عیسیٰ فی الثالثة (لمعات)

ایک روایت میں ہے کہ یوسف کو دوسرے آسمان میں دیکھا اور یحییٰ وعیسیٰ کو تیسرے آسمان میں

دوازدہم واقعات فلک سوم

ثم صعد بی الی السماء الثالثه (وساق مثله) قال مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح (قتاده)

پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھے (اور اسی طرح ذکر کیا) ناگاہ یوسف تھے (اور اسی طرح ذکر کیا) انہوں نے کہا نیک بھائی و نیک نبی کو مرحبا۔

ثم عرج بنا الی السماء الثالثة (وساق مثله) فاذا هو یوسف صلعم واذ هو قد عطی شطر الحسن و رحب لی ودعا لی بخیر (ثابت)

پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھا اور اسی طرح ذکر کیا،

پس ناگاہ وہ یوسف صلعم تھے اور ان کو حسن کا ایک حصہ ملا ہے۔ مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔

وفی روایة رای ادریس فی الثالثة (لمعات)

اور ایک روایت میں ہے ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا

وفی روایة رای یحیٰی و عسییٰ فی الثالثة (لمعات)

اور ایک روایت میں ہے یحییٰ اور عیسیٰ کو تیسرے آسمان میں دیکھا۔

سیزدہم واقعات فلک چہارم

ثم صعد بی حتی اتی السماء الرابعة (وساق مثلة) فاذا ادریس (وساق مثله) (قتاده)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ چوتھے آسمان پر آئے (اور اسی طرح بیان کیا) ناگاہ ادریس نظر پڑے (اور اسی طرح بیان کیا)

ثم عرج بنا الی السماء الرابعة و ذکر مثله فاذا انا بادریس فرحب لی ودعا لی بخیر قال الله و رفعناه مکانا علیا (ثابت)

پھر چوتھے آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح ذکر کیا)
ناگاہ وہاں ادریس نظر پڑے سو مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی خدا
نے کہا ہے ہم نے ان کا درجہ اونچا کیا۔

وفی روایة رای ادریس فی الثالثه و هارون فی الرابعة (لمعات)

ایک روایت میں ہے ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا اور
ہاروں کو چوتھے میں

چہاردہم واقعات فلک پنجم

ثم صعد بی حتی اتے السماء الخامسة (تذکر مثله) فاذ اهارون (فذکر مثله) (قتاده)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ پانچویں آسمان پر آئے
(پس اسی طرح ذکر کیا) یکا یک وہاں ہارون تھے (پس اسی طرح
ذکر کیا)

ثم عرج السماء الخامسة (فذکر) فاذا بهارون فرحب لی دعا لی بخیر (ثابت)

پھر پانچویں آسمان کی طرف چڑھے (پس اسی طرح ذکر کیا)
یکا یک وہاں ہارون تھے۔ انہوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر
دی۔

وفی روایة اخریٰ رای ادریس فی الخامسة (لمعات)

دوسری روایت میں ہے کہ ادریس کو پانچویں آسمان میں
دیکھا

پانزدھم واقعات فلک ششم

ثم صعد بی الی السماء السادسة (فذکر مثله) فاذا موسیٰ (فذکر مثله) (قتادہ)

پھر مجھ کو چھٹے آسمان تک لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے (پس اسی طرح بیان کیا)

ثم عرج بنا الی السماء السادسة (فذکر مثله) فاذا انا بموسیٰ فرحب لی ودعا لی (ثابت)

پھر مجھ کو چھٹے آسمان کی طرف لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے سو مرحبا کہا اور دعا دی۔

فلما جاوزت بکی قیل له ما یبکیک قال ابکی لان غلاما بعث بعدی یدخل من امته الجنة اکثر ممن یدخلها من امتی (قتادہ)

پس جب میں آگے بڑھ گیا تو وہ روئے ان سے پوچھا گیا کیوں روئے کہا میں اس لئے روتا ہوں کہ ایک نوعمر میرے بعد مبعوث ہوا اور اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔

انه وجد....... ابراھیم فی السماء السادسة (ابن شھاب)

انہوں نے پایا۔۔۔۔۔۔۔ابراہیم کے چھٹے آسمان میں

وفی حدیث شریک انہ رای موسیٰ فی السابعة (شفاء قاضی عیاض)

اورشریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔

شانزدہم واقعات فلک ہفتم

ثم صعد بی الی السماء السابعة (فذکر مثله) فاذا ابراهيم قال هذا ابوک ابراهيم (فذکر مثله) قال مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح (فتاده)

پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اسی طرح ذکر کیا) ناگاہ وہاں ابراہیم تھے جبرئیل نے کہا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم ہیں (پس اسی طرح ذکر کیا) انہوں نے کہا کہ اچھے بیٹے اور اچھے نبی کو مرحبا۔

ثم صعد بی الی السماء السايعة (قذک مثله) فاذا بابراهيم مسندا لظهره الی البيت المعمور واذا هو يدخله کل يوم سبعون الف ملک لا يعردون اليه (ثابت)

پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اسی طرح ذکر کیا) وہاں ابراہیم تھے۔ بیت معمور کی طرف اپنی پیٹھ ٹیکے تھے اور

وہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور دوہرا کر نہیں آتے۔

وفی حدیث شریک انہ رای موسیٰ فی السابعۃ (شفاء قاضی عیاض)

شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کی ساتویں آسمان میں دیکھا۔

ہفتدہم واقعات سدرۃ المنتہیٰ

ثم رفعت بی الی سدرۃ المنتھی فاذا نبتھا مثل قلال ھجرو اذا ورقھا مثل اذان الفیلۃ و قال ھذا سدرۃ المنتھی (قتادہ)

پھر میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا سو اس کے پھل ہجر (ایک گانوں کا نام ہے) کی پکھال کے برابر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے۔ جبرئیل نے کہا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔

ثم ذھب بی الیٰ سدرۃ المنتھی واذا ورقھا کاذان الفیلۃ واذا ثمرھا کالقلال (ثابت)

پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے سو اس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے اور پھل پکھال کے برابر۔

واذا اربعہ انھار نھران باطنان و نھران ظاھران قلت ماھذان یا جبریل قال اما الباطنان فنھران فی الجنۃ واما الظاھران فالنمیل والفرات (قتادہ)

وہاں چار نہریں تھیں، دو باطن میں دو ظاہر میں، میں نے کہا
اے جبرئیل یہ دونوں کیا ہیں، کہا دونوں باطن کی تو جنت کی دو نہریں
ہیں اور جو ظاہر ہیں وہ نیل وفرات ہیں۔

وفی روایة ابی هریرة من طریق الربیع بن انس فقیل لی هذه السدة المنتهیٰ ینتهی الیها کل واحد من امتک خلی احد علیٰ سبیلک وهی السدرة المنتهیٰ یخرج من اصلها انهار من ماء غیر اسن وانهار من لئن لم یتغیر طعمه وانهار من خمر لذة للشاربین وانهار من عسل مصفیٰ وهی شجرة بسیرا الراکب فی ظلها سبعین عاما وان ورقه منها مطلة الخلق فغشیها نور و غشیها الملائکة قال فهو قوله تعالیٰ از یغشیٰ السدرة ما یغشیٰ فقال الله تبارک و تعالیٰ له سل فقال صلی الله علیه وسلم یا رب انک اتخذت ابراهیم خلیلا واعطیته ملکا عظیما و کلمت موسیٰ تکلیما و اعطیب داؤد ملکا عظیما والنت له الحدید و سخرت له واعطیت سلیمان ملکا عظیما و سخرت له الجن والانس و الریاح والشیا طین واعطیة ملکا لا ینبغی لا حد من بعده و علت موسیٰ النوارة و عیسیٰ الانجیل و جعتله یبری الا کمه والا یرص واعذتة من الشیطان الرجیم فلم یکن علیهما سبیل فقال له ربه تعالیٰ اتخذتک جیباً فهو مکتوب فی التوراة محمد حبیب الرحمن وارسلتک الی الناس کافه وجعلت امتک لا تجوزلهم خطئیة حتی یشهدوا انک عبدے و رسولی و جعلنک اول النبیین خلقا واخرهم بعثا واعطیتک سبعا من المثانی ولم اعطیها نبیا قبلک و جعلتک فاتحا و خاتماً(شفاء قاضی عیاض)

اور ابو ہریرہ کی ایک روایت میں ہے پس مجھ سے کہا گیا یہ سدرۃ المنتہٰی ہے تیری امت میں سے ہر ایک کی پہنچ یہیں تک ہے سوائے ایک کے جو تیرے رستہ پر ہے اور یہی سدرۃ المنتہٰی ہے جس کی جڑ سے پانی کی نہریں نکلی ہیں جو بگڑتا نہیں اور دودھ کی نہریں جس کا مزہ بدلا نہیں اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہیں اور صاف شہید کی نہریں اور وہ ایک درخت ہے کہ سوار اس کے سایہ میں ستر برس چلا جاتا ہے اور اس کا ایک پتہ تمام خلق پر سایہ کرتا ہے پس اوپر نور چھار ہا ہے اور فرشتے چھار ہے ہیں۔ خدا کے اس قول سے اذ یغشی السدرۃ ما یغشی (یعنی جب سدرۃ المنتہٰی کو چھالیا اور اس چیز نے جس نے چھالیا) یہی مراد ہے پس کہا خدائے برتر و پاک نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگ پس کہا صلی اللہ علیہ وسلم نے اے پروردگار تو نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور اس کو ایک بڑا ملک عنایت کیا اور موسیٰ سے کلام کیا اور داؤد کو ایک بڑی سلطنت عطا کی اور ان کے لیے لوہے کو زم کر دیا اور مسخر کر دیا اور سلیمان کو ایک بڑا ملک عطا کیا اور ان کے لیے جن اور آدمی اور ہوائیں اور شیاطین مسخر کر دیے اور ایسا ملک دیا کہ ان کے بعد پھر کسی کو نہیں مل سکتا اور موسیٰ کو توریت سکھائی اور عیسیٰ کو انجیل اور ان کو ایسا کر دیا کہ وہ کوڑھی اور مبروص کو اچھا کر دیتے اور ان کو مردود شیطان سے محفوظ رکھا سو شیطان ان دونوں پر قابو نہیں پا سکتا پس کہا خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے تجھ کو حبیب بنایا سو توراۃ میں لکھا ہے کہ محمد حبیب

الرحمٰن ہیں اور میں نے تجھ کو تمام خلق اللہ پر بھیجا اور میں نے تیری
امت کو ایسا کیا کہ وہ اگلے بھی ہیں اور پچھلے بھی اور تیری امت کی خطا
محسوب نہیں ہوتی جب تک وہ یہ گواہی دیتے رہیں کہ تو میرا بندہ اور
پیغمبر ہے اور میں نے تجھ کو سب نبیوں سے پہلے پیدا کیا اور سب کے
آخیر میں بھیجا اور میں نے تجھ کو دوسرے لفظوں سات آیتوں والی دی
اور تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی اور میں نے تجھ کو فاتح اور خاتم کیا۔

قال فلما غشيها من امر الله ما غشى تغيرت فما احد من خلق الله يستطيع ان ينعتها من حسنها (ثابت)

فرمایا کہ جب چھا گیا اس پر خدا کے حکم سے جو چھا گیا تو وہ
متغیر ہو گیا اور خلق اللہ میں سے کوئی شخص اس کی خوب صورتی کی
تعریف نہیں کر سکتا۔

وقال ابن شهاب حتى اتيت سدرة المنتهىٰ فغيشاه الوان لا درى ما هى و قال ثم ادخلت الجنة فاذا فيها جنابذ اللولو و اذا ترابها السمسک (كما سيجيى)

اور ابن شہاب نے کہا یہاں تک کہ میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا سو
اس کو ایسے رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں نہیں جانتا تھا وہ کیا ہیں اور کہا
پھر داخل کیا گیا میں بہشت میں سو وہاں موتی کے گنبد تھے اور اس کی
مٹی مشک ہے (جیسا کہ آگے آتا ہے)

وعن عبدالله قال لما اسرى برصول الله صلى الله عليه وسلم انتهى به الى سدرة المنتهىٰ و هى فى السماء السادسة اليها ينتهى ما يهيط به من

فوقها فيقبض منها قال اذ يغشى السدرة ما يغشى قال فراش من ذهب (عبدالله ابن مسعود)

اورعبداللہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کومعراج ہوئی سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچائے گئے اور وہ چھٹے آسمان پر ہے۔اسی تک ختم ہوتا ہے جواس پراوپر سے اترتا ہے سووہ اس کو پکڑ لیتا ہے کہااذ یغشی السدرۃ ما یغشی سے مرادسونے کا بچھونا ہے۔

وفی حدیث شریک انه رای موسیٰ فی السابعة قال بتفصیل کلام اللہ تعالیٰ له قال ثم علی به فرق ذلک بما لا یعلمه الا الله تعالیٰ فقال موسیٰ لم اظن ان یرفع علی احد. (شفاء قاضی عیاض)

اورشریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کوساتویں آسمان میں دیکھا۔خدا کی باتوں کی تفصیل ان سے بیان کی کہا کہ پھراتنے اوپر گئے کہ سوائے خدا کے اورکوئی نہیں جانتا پس کہا موسیٰ نے مجھ کوگمان نہیں تھا کہ مجھ سے اوپر بھی کوئی جائے گا۔

ثم رفع لی البیت المعمور (قتادہ)

پھرمیرے سامنے بیت المعمورلایا گیا

ثم ایتیت باناء من خمر وانا من لبن وانا من عسل فاخذت اللبن فقال هی الفطرة انت علیها وامتک (قتادہ)

پھرمیرے سامنے شراب اور دودھ اورشہد کے ظروف لائے گئے پس میں نے دودھ کو لے لیا پس کہا کہ یہی فطرت ہے تو اور تیری امت اس پر ہے۔

قال ابن شهاب فاخبرنی ابن حزم عن ابی عباس و اباحیة الا نصاریٰ کانا یقولان قال النبی صلی الله علیه وسلم ثم عرج بی حتی ظهرت المستویٰ اسمع فیه صریف الا قلام (ابن شهاب)

ابن شہاب نے کہا کہ مجھ کو ابن حزم نے خبر دی کہ ابن عباس اور ابوحیہ انصاریٰ دونوں کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مجھ کو اوپر لے گئے یہاں تک کہ میں ایسی جگہ پر پہنچا جہاں قلم کے لکھنے میں چلنے کی آواز مجھ کو سنائی دیتی تھی۔

ہشتدہم احکام جو عنایت ہوئے

فاوحی الله الیٰ ما اوحی (ثابت)

پس وحی کی خدا نے میری طرف جو کی

ثم فرضت علی الصلواة خمسین صلواة کل یوم (قتادة)

پھر مجھ پر ہر روز پچاس نمازیں فرض ہوئیں

ففرض علی خمسین صلواه فی کل یوم ولیلة (ثابت)

پھر مجھ پر ہر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں۔

قال ابن حزم و انس قال النبی صلی الله علیه وسلم ففرض الله علی امتی خمسین صلواة (ابن شهاب)

ابن حزم وانس نے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پس فرض کیں خدا نے میری امت پر پچاس نمازیں۔

فرجعت فمررت علی موسیٰ فقال بما امرت قلت امرت بخمسین صلواة کل یوم قال ان امتک لا تسطیع خمسین صلواة کل یوم وانی واللہ قد جریت الناس قبلک و عالجت بنی اسرائیل اشد الصعالجة فارجع الی ربک فسئلہ التخفیف لا متک فرجعت فوضع عنی عشرا فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فوضع عشرا فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فوضع عشرا عنی فامرت بعشر صلواة کل یوم فرجعت الی موسیٰ فقال مثلہ فرجعت فامرت بخمس صلواة کل یوم (قتادة)

پھر میں لوٹا اور موسیٰ پر گذرا انہوں نے کہا تم پر کیا فرض ہوا میں نے کہا ہر روز پچاس نمازیں موسیٰ نے کہا تمہاری امت ہر روز پچاس نمازیں نہیں ادا کر سکے گی۔ اور میں بخدا تم سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں اور بنو اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما چکا ہوں تم خدا کی طرف واپس جاؤ اور کم کراؤ اپنی امت کے لیے پس میں واپس گیا سو خدا نے دس نمازیں گھٹا دیں پھر میں واپس آیا موسیٰ کی طرف، موسیٰ نے پھر وہی کہا میں پھر لوٹا خدا نے دس اور بھی کم کر دیں پھر میں موسیٰ کے پاس آیا موسیٰ نے پھر وہی کہا میں پھر لوٹا خدا نے دس اور بھی کم کر دیں پس مجھ کو ہر روز دس نمازوں کا حکم ہوا پس پھر میں موسیٰ کے پاس آیا موسیٰ نے پھر وہی کہا میں پھر لوٹا پس مجھ کو ہر روز پانچ نمازوں کا حکم ہوا۔

فنزلت موسیٰ فقال ما فرض ربک علی امتک فقلت خمسین صلواة فی کل یوم ولیلة قال ارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف فان امتک

لا تطیق ذالک فانی قد بلوچ بنی اسرائیل و خبرتھم قال فرجعت الی ربی فقلت یا رب خفف عن امتی فحط عنی خمساً فرجعت الی موسیٰ فقلت حط عنی خمساً قال ان امتک لا تطیق ذالک فارجع الی ربک فاسئله التخفیف قال فلم ازل ارجع بین یدی ربی تعالیٰ و بین موسیٰ حتیٰ قال یا محمد انهن خمس صلواة کل یوم ولیلة (ثابت)

پس میں اترا موسیٰ کی طرف انہوں نے کہا خدا نے تیری امت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا ہر رات دن میں پچاس نمازیں موسیٰ نے کہا پھر خدا کے پاس جاؤ کہو کہ کم کر دے کیوں کہ تمہاری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی میں نے بنی اسرائیل کو آزما لیا ہے اور دیکھ لیا ہے فرمایا آنحضرت نے پس میں واپس گیا خدا کی طرف اور کہا کہ اے خدا میری امت پر تخفیف کر پس پانچ نمازیں گھٹا دیں پھر میں موسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ پانچ کم ہوئیں موسیٰ نے کہا تمہاری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی تم پھر خدا کے پاس جاؤ اور کمی کی درخواست کرو فرمایا کہ میں برابر خدا اور موسیٰ کے درمیان آیا اور گیا یہاں تک کہ خدا نے کہا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن رات میں۔

فرجعت بذلک حتی مروت علی موسیٰ فقال ما فرض الله لک علی امتک قلت فرض خمسین صلواة قال فارجع الی ربک فان امتک لا تطیق فراجعتی فوضع شطرھا فرجعت الی موسیٰ فقلت وضع شطرھا فقال راجع الی ربک فان امتک لا تطبیق ذلک فراجعت شطرھا

فرجعت الیہ فقال ارجع الی ربک فان امتک لا تطبیق ذلک فرجعته فقال ھی خمس وھی خمسون لا یبدل القول لدی فرجعت الی موسیٰ فقال راجع ربک فقلت استحییت من ربی. (ابن شہاب)

میں اس کے ساتھ لوٹا یہاں تک کہ موسیٰ پر گزرا موسیٰ نے کہا خدا نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا میں نے کہا پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا تم لوٹ جاؤ اپنے خدا کی طرف کیوں کہ تمہاری امت سے یہ نہ ہو سکے گا۔ میں واپس گیا تو ایک حصہ معاف ہوا۔ میں موسیٰ کے پاس پھر آیا اور کہا کہ ایک حصہ معاف ہوا موسیٰ نے کہا پھر خدا سے گفتگو کرو تمہاری امت سے اتنا نہ ہو سکے گا میں واپس گیا اور دوبارہ سوال کیا ایک حصہ اور معاف ہوا میں پھر موسیٰ کی طرف آیا انہوں نے کہا پھر جاؤ تمہاری امت سے اتنا نہ ہو سکے گا میں نے دوبارہ سوال کیا خدا نے کہا کہ یہ پانچ ہیں اور وہ (دراصل) پچاس ہیں میری بات دوسری نہیں ہوتی پھر موسیٰ کے پاس آیا انہوں نے کہا تم پھر خدا کے پاس جاؤ میں نے کہا اب تو میں خدا سے شرما گیا۔

لکل صلواۃ عشرۃ فتلک خمسون صلواۃ (ثابت)

ہر نماز کے لیے دس ہیں، پس وہ پچاس نمازیں ہوئیں

قال فاعطی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثا اعطی الصلواۃ الخمس واعطی خواتیم سورۃ البقرۃ وغفر لمن لا یشرک باللہ من امته شیئاً المقحمات (عبداللہ ابن مسعود)

کہا پس حضرت کو تین چیزیں عطا ہوئیں پانچ نمازیں اور
سورۃ بقر کے خاتمہ کی آیتیں اور بخش دیا گیا اس کو حضرت کی امت
میں سے جو خدا کا کسی کو ساجھی نہیں کرتا۔

ومن هم بحسنة فلم يعملها كتب له حسنة فان عملها كبتت له عشرا ومن هم بيئة فلم يعملها لم تكتب عليه شيئاً فان عملها كتبت له سيئة واحدة (ثابت)

اور جس شخص نے ایک نیکی کا قصد کیا اور کیا نہیں اس کے لیے
ایک نیکی لکھی جاوے گی اور اگر کر لے تو دس لکھی جاویں گی اور جو شخص
کسی برائی کا قصد کرے اور کرے نہیں تو کچھ نہ لکھا جاوے گا اور اگر
کرے تو ایک برائی لکھی جاوے گی۔

فرجعت الى موسىٰ فقال بما امرت قلت بخمس صلواة كل يوم قال امتک لا تستطيع خمس صلواة كل يوم و انى قد جوبت الناس قبلک و عالجت بنى اسرائيل اشد المعالجة فارجع الى ربک فسئله التخفيف لامتک قال سالت ربى حتى استحييت ولكنى ارضى و اسلم (قتادة)

پس میں موسیٰ کی طرف واپس آیا انہوں نے کہا تم کو کیا حکم
ہوا۔ میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا موسیٰ نے کہا تمہاری امت ہر
روز پانچ نمازیں نہ پڑھ سکیں گی اور میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا
ہوں اور بنی اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما لیا ہے۔ تم خدا کی
طرف لوٹ جاؤ اور اپنی امت کے لیے تخفیف کی درخواست کرو۔
فرمایا میں خدا سے سوال کرتے کرتے شرما گیا اب میں اسی پر راضی

ہو جاؤں گا اور تسلیم کر لوں گا۔

قال فنزلت حتی الھیبت الی موسیٰ فاخبرتہ فقال ارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت قدر جعت الی ربی حتی استحییث منہ (ثابت)

کہا پس میں اترا یہاں تک کہ موسیٰ کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی۔ موسیٰ نے کہا اپنے خدا کی طرف واپس جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو۔ پس فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میں نے کہا کہ میں خدا کی طرف پھر پھر کے گیا یہاں تک کہ اب میں اس سے شرما گیا۔

قال فلما جاوزت نادی مناد امضبت فریضتی و خففت عن عبادی (قتادہ)

کہا پس جب میں آگے بڑھا ایک پکارنے والے نے آواز دی۔ میں نے اپنا فرض نافذ کیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کی۔

ثم انطلق بی حتی انتھی بی الی سدرۃ لمنتھی و غشیھا الوان لا ادری ما ھی ثم ادخلت الجنۃ فانا فیھا جنا بذا اللولو و اذا ترابھا المسک (ابن شھاب)

پھر مجھ کو لے کے چلے (جبرئیل) یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور اس کو رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں ان کو نہیں جانتا تھا پھر میں جنت میں داخل کیا گیا۔ ناگاہ وہاں موتی کے گنبد تھے اور اس کی مٹی مشک تھی۔

یہ سب روایتیں ایک دوسری سے اس قدر مختلف و متناقض ہیں کہ ان کے قواعد کے پیش کرنے کی جن سے ان کا باطل اور موضوع ہونا ثابت ہوسکتا ہے غیر ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ خود روایتیں صراحتاً ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں اور اپنی صحت اور اعتبار کو خود کھو دیتی ہیں۔

مصنف لمعات کا بیان ہے کہ یہ روایتیں ایک دوسری سے اس قدر اختلاف رکھتی ہیں کہ ان کا تطبیق کرنا بالکل غیر ممکن ہے تا وقتیکہ تعدد معراج کو تسلیم نہ کر لیا جاوے۔ یا ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دی جاوے یعنی ان میں سے کسی کو مانا جاوے اور باقیوں کو غلط اور بے اصل قرار دیا جاوے۔

وعلی تقدیر صحۃ الروایات یتعذر الجمع الا ان یقال یتعدد المعراج یرحج بعض الروایات علی بعض (لمعات)

وہ عیسائی مصنف جنھوں نے پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھی ہے ایک درجہ اور بھی بڑھ گئے ہیں اور ان تعریفوں اور منظوم نعتوں کو جو مسلمان شاعروں نے اپنی شاعرانہ طرز سے مختلف امور متعلق بہ معراج مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زینت اور شان، اراق کی شکل، فرشتوں کے جلوس وغیرہ پر لکھی ہیں روایات مستند شمار کر لیا ہے مگر انھوں نے اسلام کے حق میں یہ بہت بڑی عمدہ بات کی ہے اور اسلام کو ہمیشہ ان کی محنتوں اور جان فشانیوں کا مشکور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جب کوئی منصف مزاج اور ذی فہم شخص ایسی تصنیفات کے مجموعہ پر نظر ڈالے گا تو ہم کو امید ہے کہ وہ اس نتیجہ کے استنباط سے باز نہ رہ سکے گا کہ یہ تصنیفات امر حق کی تحقیق اور تدقیق کے سوا اور کسی غرض کے لیے کی گئی ہیں اور بے ہودگی اور یاوہ گوئی میں گروشیس کے کبوتر کے قصہ کے ساتھ ہمسری کرتی ہیں۔

شق صدر اور معراج اگر مذہب اسلام سے تعلق رکھتے ہیں تو بہت سیدھا سادھا تعلق

رکھتے ہیں اگر کوئی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں یا اس واقعہ کے خواب میں ہونے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ اس قسم کی کوئی چیز ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی اور یہ تمام روایتیں جو اس واقعہ کے حقیقی یا خیالی وقوع کو بیان کرتی ہیں بلا استثنا بالکل غلط اور سراسر بے اصل موضوع اور جعلی ہیں تو بھی اس کے ایمان میں ذرا برابر بھی خلل واقع نہ ہوگا بلکہ وہ پورا پکا اور سچا مسلمان رہے گا۔

معراج کا خواب اس قبیل سے ہے جیسا کہ حضرت یعقوب نے دیکھا تھا اور جو معراج یعقوب کہا جاتا ہے چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ ''پس بہ خواب دید کہ اینک نردبانے بہ زمین بر پا گشتہ سرش بآسماں می خورد و اینک فرشتگاں خدا ازاں بہ بالا وزیر می رفتند و اینک خداوند براں ایستادہ می گفت من خداوند خدائے پدرت ابراہیم وہم خدائے اسحاق ام ایں زمینے کہ براں می خوابی بتو و بذریعہ تو می دہم و ذریعہ تو مانند خاک زمین گرویدہ بہ مغرب و مشرق و شمال وجنوب منتشر خواہند شد و اینک من باتوام و ہر جائے کہ میروی ترا نگاہ داشتہ بایں زمین باز پس خواہم آورد تا بوقتیکہ آنچہ بتو گفتہ ام بجا آورم ترا وانخواہم گذاشت و یعقوب از خواب خود بیدار شدہ گفت بدرستی کہ خداوند دریں مکان است و من ندانستم پس ترسیدہ گفت کہ ایں مکاں چہ ترسناک است ایں نیست مگر خانہ خدا و این است دروازہ آسمان (سفر تکوین باب 28 ورس 17-12)''

معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے کہ پیغمبر خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انہوں نے درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں خواہ وہ شخص ان نشانیوں کو لا معلوم نشانیاں کہے خواہ ان نشانیوں کے دیکھنے سے عمدہ ترین احکام وحی کا ہونا مراد لے مگر اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ خواب میں دیکھا یا جو

وحی ہوئی یا انکشاف ہوا وہ بالکل سچ اور برحق ہے۔

اگر کوئی مسلمان مذکورہ بالا عقیدہ پر ایمان رکھ کر ان سب روایتوں کو جو معراج کے قصہ میں آئی ہیں نہ مانے اور سب کو موضوع اور نہایت قابل الزام خیال کر کے چھوڑ دے تو اس کے دین و ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور وہ اس شخص کے ہم پایہ ہوگا جو کسی چیز پر بلا تحقیق و تفتیش کے ایمان نہیں لاتا۔

روایات معراج میں اگر کوئی مسلمان کسی حکم کا تلاش کرنا چاہے تو اس کو بعد از تلاش بسیار بجز دو حکموں کے اور کوئی حکم نہ ملے گا ایک نماز پنج گانہ کا اور دوسرا یہ کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کا مثل اور ہمتا گردانے وہ مشرک خیال کیا جاوے گا مگر یہ احکام نہ ان روایتوں پر منحصر ہیں اور نہ ان کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ نے متعدد آیات قرآنی میں ان کی نسبت صاف صاف اور بالتصریح حکم صادر فرمایا ہے پس ان روایات کے نہ ماننے سے کسی حکم شرعی کا انکار لازم نہیں آتا۔

اگر ان روایتوں کی نسبت یہ خیال کیا جاوے کہ ان سے ایک شان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پائی جاتی ہے تو اس کی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ اگر یہ سب باتیں جو ان روایتوں میں مندرج ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاویں تو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کچھ بڑھ نہیں جاوے گی اور نہ اس بے انتہا اعلیٰ درجہ کی شان میں کچھ زیادتی ہوگی اور اگر ان کا عشر عشیر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ منسوب کیا جاوے تو بھی اس جناب کی عظمت و شان میں کچھ فرق نہیں آوے گا۔

ہم مسلمان اپنے نبی کو ''ابن اللہ'' بنانا نہیں چاہتے اور نہ ان کو ''اللہ تعالیٰ کے دست راست'' پر بٹھانے کے مشتاق ہیں ہم ان کی سب سے بڑی عزت اس میں خیال کرتے ہیں

جوخودانہوں نے اپنی نسبت فرمایا ہے کہ

" انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد آمنا باللہ وما جاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم"

☆☆☆☆☆☆☆

12۔۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور طفولیت

(بارہ برس تک کی عمر کا حال)

وانک لعلی خلق عظیم

حضرت عبداللہ

عبداللہ ابن عبدالمطلب والد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چوبیس برس کی عمر تھی جب کہ انہوں نے آمنہ بنت وہب سے شادی کی۔ آمنہ بنت وہب قریش کے قبیلے سے تھیں جو عرب کے قبیلوں میں نہایت معزز اور شریف قبیلہ تھا۔ حضرت آمنہ حمل ہی سے تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ نے بغرض تجارت یثرب یعنی مدینہ کی طرف سفر کیا اور قبل پیدا ہونے آنحضرت کے انہوں نے وفات پائی اور بنی نجار کے دار نبیغہ میں مدفون ہوئے۔

آنحضورؐ کی پیدائش

ان کی وفات کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے جمہور مورخین کی یہ رائے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہویں ربیع الاول کو عام الفیل کے پہلے برس یعنی ابرہہ کی چڑھائی سے پچپن روز بعد پیدا ہوئے، مگر اس بات میں کہ عام الفیل سنہ عیسوی کے کون سے سال میں واقع ہوا تھا۔ مورخوں کی رائے میں اختلاف ہے۔ منقح امر جو قرار پایا ہے وہ یہ ہے کہ عام الفیل 570 ء کے مطابق تھا۔ کیوں کہ سب مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 622ء میں مکہ مدینہ سے منورہ کو ہجرت کی تھی، یعنی نزول وحی سے تیرہویں برس اور وحی چالیس برس کی عمر میں نازل ہوئی تھی ان برسوں کو اگر جمع کیا جاوے تو ترپین قمری سال ہوتے ہیں اور جب کہ ان میں سے ایک برس قمری سال شمسی سال سے مطابقت کرنے کے لیے منہا کیا جاوے تو باون برس باقی رہتے ہیں اور جب ان باون برس کو چھ سو بائیس میں سے نکال ڈالا جائے تو پانسوستر باقی رہتے ہیں اور اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت 570ء میں ہوئی تھی۔

آنحضرت کی پیدائش کے متعلق روایات عجیبہ

آنحضرت کی ولادت کی نسبت بہت سی عجیب روایتیں مشہور ہیں کہ ولادت کی رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگورے گر پڑے۔ فارس کا مقدس آتش کدہ جس میں سالہا سال سے برابر آگ جلتی چلی آتی تھی دفعۃً بجھ گیا وہاں کے موبدوں نے

عجیب عجیب خوابیں دیکھیں اور چشمہ ساوہ دفعتہً خشک ہو گیا، مگر ان روایتوں کی معتبری کی قابل اعتماد سندیں نہیں ہیں اور نہ ہی مذہبی روایتیں سمجھی جاسکتی ہیں آنحضرت کی ذات با برکات کے سبب اسلام نے رونق پائی اور مسلمانوں کو فتوحات نمایاں حاصل ہوتی گئیں اور تمام مملکت فارس مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے قدیم آتش کدے برباد ہوئے اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ ان واقعات کو جو بعد کو وقوع میں آئے شاعرانہ خیالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے منسوب کیا کہ گویا ان کا پیدا ہونا ہی فارس کے آتش کدوں کا بجھنا اور کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑنا تھا رفتہ رفتہ یہ شاعرانہ خیال بطور روایت کے مروج ہونے لگے اور عین روز ولادت ہی سے منسوب کر دیے گئے پس ان روایتوں کو مذہبی روایتیں تصور کرنا ان لوگوں کی غلط فہمی ہے جو مسلمانوں کی مذہبی روایتوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ کا پوتے کے لیے دعا مانگنا

علاوہ ان کے اور بھی روایتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی نسبت کتب سیر میں مذکور ہیں اگرچہ ان کی صحت کے لیے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے، مگر ان کے غلط ہونے کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت آمنہ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی عبدالمطلب فی الفور وہاں آئے اور آنحضرت کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر کعبہ میں لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔

اس دعا پر سر ولیم میور کا اعتراض

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ صریح مسلمانی طرز کا ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ کعبہ میں عبدالمطلب کا دعا مانگنا صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے، مگر ہم اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی وہ مسلمانی طرز کی دعا تھی کچھ تعجب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل معدوم نہیں ہوئی تھی اور اس بات کا بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے۔

ثویبہ

چند روز تک ثویبہ نے جو آنحضرت کے چچا ابولہب کی آزاد کی ہوئی لونڈی تھیں آنحضرت کو دودھ پلایا۔ ثویبہ نے آنحضرت کے چچا حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا اور اس سبب سے حمزہ اور مسروق ابن ثویبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دودھ بھائی تھے۔

عبدالمطلب کا آنحضرت کا نام رکھنا

عبدالمطلب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام محمد رکھا مگر حضرت آمنہ نے خواب

میں ایک فرشتہ کو دیکھا تھا جس نے کہا تھا کہ آپ کا نام احمد رکھنا۔ اس لیے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد رکھا اور اس طرح توریت اور انجیل دونوں کی بشارتوں کی تصدیق ہوگئی۔ جن کا بیان ہم نے خطبہ بشارات میں کیا ہے ولادت کے ساتویں روز عبدالمطلب نے قربانی کی اور تمام اراکین قبیلہ قریش کو دعوت میں بلایا۔

حلیمہ

شرفاء مکہ کا دستور تھا کہ آب و ہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے اپنے بچوں کو جب کہ وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے باہر بھیج دیا کرتے تھے اسی رسم کے موافق آنحضرت کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا اور وہ اپنے گھر لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر ان کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں۔ دو برس بعد آپ کا دودھ چھٹایا گیا اور حضرت حلیمہ آپ کو لے کر حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی آب و ہوا آپ کے موافق نہ ہوگی پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا اور وہ ان کو اپنے ہاں لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر ملا جاتی تھیں جب آنحضرت کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا پس حضرت حلیمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دودھ پلائی ماں اور ان کے خاوند حارث ابن عبدالعزیٰ دودھ کے رشتے کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ اور انیسہ اور خذیمہ عرف شیمان دودھ بھائی اور دودھ بہن ہیں۔

آنحضرت کی محبت حلیمہ کے ساتھ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دودھ کے رشتے کو خون کے رشتہ کے برابر سمجھتے تھے اور حضرت حلیمہ سے نہایت محبت رکھتے تھے اوران کا ادب اوران کی تعظیم ماں کے برابر کرتے تھے ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک جس کو مسلمان سر پر رکھنے اور آنکھوں سے لگانے کے لائق سمجھتے ہیں حضرت حلیمہ کے لیے بچھا دی تا کہ وہ اس پر بیٹھیں۔ دودھ کے رشتہ کا ایسا بڑا پاس ولحاظ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور جو محبت اور الفت کا حضرت حلیمہ اوراس کی اولاد کے ساتھ برتتے تھے اور جس احسان مندی کا اظہار دودھ کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کرتے تھے نہایت اعلیٰ اور عمدہ مثالیں آنحضرت کے اخلاق حمیدہ، نیک خوئی اور نرم دلی کی ہیں جس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں پائی گئی۔

قبیلہ بنی سعد جس میں حضور نے پرورش پائی

بنی قریش اور بالتخصیص اس کی وہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ طفولیت میں پرورش پائی تھی تمام ملک عرب میں زبان کی شائستگی اور فصاحت کے لیے مشہور تھی اوراسی سبب سے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت زبردست اور پراثر فصاحت و بلاغت رکھتے تھے۔ اہل عرب درحقیقت فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے اور جو شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا تھا اس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل سمجھتے تھے گو وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اس سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو جزیرہ نما عرب کی خوش نما زبان کے خالص ترین نمونہ پر بن گئی تھی۔۔۔۔ جب کہ ان کی فصاحت و بلاغت ان کی کام یابی میں بڑا کام دینے لگی تو ایک خالص زبان اور ایک دل فریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا، مگر ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں یقین کیا جاتا ہے کہ خاص لفظ آنحضرت کے محفوظ ہیں جیسے دعائیں وغیرہ تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز کلام اور فصحائے عرب کے طرز کلام سے کچھ غیر مشابہ نہیں ہے، لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے اور دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے اور دوسرا کلام ربانی۔

والدہ محترمہ حضرت آمنہ کی وفات

جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 6 برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیز واقربا سے ملانے کے لیے مدینہ منورہ لے گئیں کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں اور پھر مکہ معظّمہ کو مراجعت کی اور رستہ میں بمقام آہواز[1] وفات پائی جب کہ آنحضرت مکہ میں پہنچے۔

تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی اور ہمیشہ آپ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے۔

1 تمام مورخوں نے اس مقام کا نام ابواء لکھا ہے (محمد اسماعیل)

حضور کی طفولیت پر سر ولیم میور کا اعتراض

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفولیت یعنی بارہ برس کی عمر تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کیے ہیں مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا اور رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اگرچہ ان باتوں کی اور اسی قسم کی اور باتوں کی تصدیق کی جو انہوں نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جاویں تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں جیسی کہ ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہوتی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے انہوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا ہے

" انا بشر مثلکم یوحی الی"

پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔

حضرت عبدالمطلب کی وفات

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آٹھواں برس شروع ہوا تو آپ کے دادا

عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ ’’جب آنخضرت جنازہ کے ہم راہ قبرستان حجر کو گئے تو لوگوں نے ان کو روتے دیکھا‘‘ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے برخلاف منشاء سر ولیم میور صاحب کے کچھ تعجب نہیں ہوتا بلکہ اگر نہ روتے تو نہایت تعجب ہوتا آنخضرت اس وقت کم عمر تھے اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا اور دل کا جوش مارنا خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ رنج کے وقت دل کا ملائم ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم نے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے پس آنخضرت نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی جو خدا تعالیٰ نے انسان میں بنائی ہے۔

حضرت ابو طالب کی کفالت

عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ابو طالب آپ کے چچا نے جو آپ کے والد عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے اپنے ذمہ لی یہ بھی آنخضرت کے ساتھ محبت سے پیش آتے رہے اور مثل پدر مہربان کے ہر طرح سے خبر گیری کی۔

حضرت ابو طالب کے ساتھ سفر شام کی تردید

جب آپ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو ابو طالب کو تجارت کے سبب سے شام کا سفر پیش آیا اور اس کے سرانجام کے بعد پھر مکہ کو واپس آئے سر ولیم میور صاحب نے جو یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابو طالب کے ہم راہ شام کو گئے تھے اور ابو طالب نے اول تو اپنے ہم راہ لے جانے سے انکار کیا تھا مگر آنحضرت روانگی کے دن اتنی لمبی مفارقت کے خیال سے افسردہ دل ہو کر اپنے مربی سے لپٹ گئے اور ابو طالب کو بھی جوش الفت آ گیا اور اپنے ہم راہ لے گئے اس روایت کی کوئی معتبر سند نہیں ہے آنحضرت کا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانا کسی طرح ثابت نہیں۔

زمانہ طفولیت میں حضور کے خصائل

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ برس کی عمر کو پہنچے تو زمانہ طفولیت کا منقضی ہو گیا تھا اور نوجوانی کا آغاز تھا اور جمیع اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان ہر دل عزیز ہو جاتا ہے آراستہ تھے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا اخلاق اور صبر اور مردانگی جن کو اوضاع واطوار کی خوبی اور فصاحت وخوش بیانی سے دوبالا جلا ہو گئی تھی آپ کی ذات بابرکات میں اس طرح پر مجتمع ہوئے تھے کہ عالم شباب ہی میں آپ نے امین عرب کا لقب حاصل کیا تھا۔

آنحضرت کے زمانہ طفولیت پر سر ولیم میور کے بیانات اوران کی تردید

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ طفولیت کے صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں جو ہم نے بیان کیے اوراس کے سوا جو باتیں اس زمانہ کی مشہور ہیں وہ سب بے سند اور نا معتبر ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارہ برس کی عمر تک کے تاریخی واقعات جو ہم نے اوپر بیان کیے ان کے علاوہ سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب مسمیٰ لائف آف محمد میں اور بھی کچھ واقعات بیان کیے ہیں جو نہایت ضعیف اور نا معتبر روایتوں پر مبنی ہیں تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے ''کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے متعلق معجزات حال کے مسلمانوں کے نزدیک بہت دل پسند مضامین ہیں'' مگر اس امر کی کچھ تحقیقات نہیں کی کہ کن معجزات کو حال کے زمانے کے مسلمان بھی معتبر سمجھتے ہیں اور کون سے معجزات کو نا معتبر بطور قصہ اور کہانی کے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ حال کے مسلمانوں کی جو انہوں نے قید لگائی ہے اس سے ان کا کیا مطلب ہے غالباً یہ مطلب ہو گا کہ متقدمین مسلمان ان کو قابل التفافات نہیں سمجھتے تھے اگر یہی مطلب ہو تو صاف اس بات کا اقرار ہے کہ وہ روایتیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے نامعتبر اور غیر صحیح ہیں جس قدر کتب سوانح عمری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علمائے اسلام نے لکھی ہیں اور جو روایتیں ان میں بیان کی ہیں تمام مسلمان ان روایتوں کو ایسی روایتیں خیال کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ وہ صحیح مانی جاویں روایتاً اور درایتاً کامل تحقیق و تدقیق کی محتاج ہیں اس قسم کی روایتوں کو تاوقتیکہ ان کی

تصدیق کی کوئی کافی دلیل نہ ہو مسلمان مطلقاً قابل اعتبار تصور نہیں کرتے بلکہ خود علمائے محققین اسلام اور ذی علم مسلمانوں نے ان روایات پر ذرا بھی اطمینان نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ ان کی کوششیں اس بات کی تحقیق میں کہ کون سی ان میں سے صحیح اور کون سی غیر صحیح ہیں مصروف رہی ہیں۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں روایتوں کے درجہ اعتبار کو بیان کیا ہے ان تمام روایات کی نسبت جن میں صحیح روایتیں اور موضوع اور نا معتبر روایتیں بلا تمیز شامل ہیں صرف اتنی بات کہہ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ سب بے اصل اور راویوں کی محض اختراعات ہیں، مگر ہم باوجود اس کے کہ سر ولیم میور صاحب کے علم اور مرتبہ کا بہت ادب کرتے ہیں اس کہنے پر مجبور ہیں کہ دعویٰ بلا دلیل قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ اگر وہ بالعموم مان لیا جاوے تو اس سے لازم آتا ہے کہ استدلال محض بے کار چیز ہے اور اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کہ یونان کے مشہور کاشت کار مسمی گارڈین کی گاڑی کے جوئے کی گرہ کو ایران کی بادشاہت کی طمع میں ہاتھ سے کھونے کے عوض تلوار سے کاٹ دیا جائے جیسے کہ سکندر نے کیا تھا۔

1 دیکھو کتاب موسوم بہ ''اے والیس فرام دی گنجز''

فرض کرو کہ اگر کوئی یہ کہے [1] (جیسے کہ لوگوں نے کہا ہے) کہ حضرت یحییٰ محض عوام الناس میں سے اور یہود کے فرقہ ایسینین میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ ان کے ایک مرید تھے ان کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے مریدوں نے شان الوہیت اور قدرت اعجاز کو ان پر لگا دیا ورنہ وہ محض ایک عام یہودی تھے اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس کہنے میں اور مسلمانوں کی تمام روایتوں کی نسبت اس بات کے کہہ دینے میں کہ وہ سب بے اصل اور راویوں کی اختراعات ہیں کیا فرق ہے؟

زندگی کے عام معاملات میں بھی کسی شخص پر واجب نہیں ہے کہ کسی شخص کے محض زبانی بیان پر گو وہ کیسا ہی معزز اور ذی فہم کیوں نہ ہو یقین لے آوے۔تو ایسے بڑے معاملات میں کسی مصنف کے بیان یا رائے کو کیوں کر قطعی مان لیا جا سکتا ہے اس لیے ہم قابل معافی ہیں اگر ہم سر ولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ ''ان روایات ہی کو غیر معتبر سمجھ کر خارج کر دینا چاہیے'' قابل تسلیم نہ خیال کریں جب تک کہ دلیل اور واقعات سے اس رائے کی صحت کا ثبوت نہ ملے۔

جاننا چاہیے کہ مسلمانوں کے نزدیک روایتیں تین قسم کی ہیں: اول تو وہ روایتیں ہیں کہ ان کی صحت و اعتبار کی معقول دلیلیں موجود ہیں اور علی العموم مسلم ہیں دوسری قسم میں وہ مشہور روایتیں شامل ہیں جن کا وقوع قوانین فطرت کے برخلاف نہیں ہے اور جن کی بے اصل اور غیر معتبری کی نسبت کوئی دلیل موجود نہیں ہے یہ روایتیں نہ تو بلا تحقیق نا معتبر کرنے کے قابل ہیں اور نہ اس قابل ہیں کہ آنکھ بند کر کے ان پر اعتماد کر لیا جائے۔تیسری قسم میں وہ روایتیں ہیں جو بظاہر بالکل محال معلوم ہوتی ہیں اور ان کے ثبوت کی کوئی معتبر دلیل نہیں ملی ہے اور اس لیے غلط اور نا معتبر قرار دی گئی ہیں پس اس سے زیادہ غلطی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اہل اسلام کی نسبت یہ کہا جاوے کہ وہ ان سب قسم کی روایتوں کو برحق سمجھتے ہیں اور ان سب پر بلا امتیاز ایمان رکھتے ہیں جیسے کہ ہم نے اپنے خطبہ

"الروایات المرویات فی الاسلام"

میں بیان کیا ہے۔

اب ہم ان روایات کی نسبت بحث کرتے ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لغویت مذہب اسلام ثابت کرنے کی منشاء سے بیان کیا ہے اور بتلاتے ہیں کہ وہ روایتیں اقسام روایات متذکرہ بالا میں سے کون سی قسم کی روایتوں میں داخل ہیں سر ولیم

میور صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ولادت میں جو حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز سن کر ڈر جانا یا ایک سفید مرغ کا دفعۃً نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کا پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کے اضطراب کو تسکین کا ہونا یا حضرت آمنہ کے لیے ایک خوش گوار شربت کے پیالہ کا ایک نا معلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا ملائکہ کی آوازیں آنی یا بغیر اس کے کہ کوئی شخص دکھائی دیتا ہو پاؤں سے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آدمیوں کی ں ظر سے چھپا لینے کے لیے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا۔ بہشت کے پرندوں کا چہچہانا۔ بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں جو غالباً سر ولیم میور صاحب نے کسی مولود نامہ سے اخذ کیے ہیں اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہو گا سمجھتا ہے کہ یہ تمام باتیں شاعروں کے گرم جوش شاعرانہ خیالات ہیں جو انہوں نے اپنے مضامین کی تزئین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ کی رونق کے لیے بیان کی ہیں جیسے کہ شاعروں کا اور خصوصاً مشرقی شاعروں کا شاعرانہ مضمون میں اس قسم کے واقعات بیان کرنے کا دستور ہے۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت بھی گرم جوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اسی قسم کے خیالات نظم میں بیان کیے ہیں جن کا نمونہ ہم نے اپنے خطبہ

" فی حقیقۃ شق الصدر و ما ہیۃ المعراج"

میں دکھایا ہے اور ملٹن کی تمام پیریڈ یز لاسٹ انہیں خیلات سے بھری ہوئی ہے پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے ہاں کے اس قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو بطور مذہبی روایتوں کے قرار دے اور اس کا فیصلہ یوں کر دے کہ وہ سب راویوں کی اختراعات ہیں۔

اسی قسم کے وہ مضامین ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے بطور مذہبی روایتوں کے

اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی اور کلمہ پڑھا اور تین نورانی فرشتے آسمان پر سے اترے ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن اور تیسرے کے پاس ایک ریشمی رومال اور آنخضرت کو سات مرتبہ غسل دے کر آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا۔

ہم کو کس قدر تعجب آتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختون پیدا ہونے کو بھی انہی مختراع روایات میں شمار کیا ہے جن کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور خلاف قانون فطرت قرار دیتے ہیں مگر یہ بات نہ معجزہ سے علاقہ رکھتی ہے نہ عجائبات سے بلکہ محض تنوعات فطرت سے متعلق ہے ایسے تنوعات فطرت کی بہت سی نظیریں بتلائی جاسکتی ہیں مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں علامات تذکیر و تانیث دونوں موجود ہوں۔ ایسے واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کا اتفاقیہ انحراف کوئی عجیب بات نہیں ہے اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں جن سے بلا توسل معجزہ یا عجائبات کے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مختون پیدا ہونا یقیناً قرین قیاس ثابت ہوتا ہے اور اس کا ثبوت اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ باوجودیکہ ابراہیم کی اولاد میں ختنہ کی رسم نہایت استحکام سے قرار پا گئی تھی اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا ترک کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے مگر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا ہے۔

مہر نبوت کی نسبت سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ''صفیہ سے نقل ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں مرقوم تھی'' تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود سا تھا اور اس پر بال تھے خود آنخضرت صلی

اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ میری رسالت کی مہر ہے اور نہ کبھی اس کو اپنی رسالت کے برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کیا۔ جس طرح کہ حضرت موسیٰ نے اپنے ید بیضا کو نبوت کے ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی اور اسی خیال سے بعض لوگوں نے آنحضرت کی پشت کے غدود کو عام نام سے بولنا ایک بے ادبی اور گستاخی خیال کر کے استعارۃً اس کو مہر نبوت کے معزز اور گرامی نام سے موسوم کیا ہوگا۔

بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے جمیع علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے پس کیا ایک عیسائی عالم کو یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر ان کے نبی کی رسالت کے ثبوت میں ایسے امر کے

واما رواية كاثر الحجم او كوكبة عنز و كشامة خضراء او سوداء و مكتوب فيها محمد رسول الله او سطر فاثك المنصور لم يثبت منها شئى كما قاله العسقلانى و تصحيح ابن حبان لذلک وهم و قال بعض الحفاظ من روىٰ انه كان علىٰ خاتم النبوة كتابة محمد رسول الله فقد اشتبه عليه خاتم النبوة بخاتم اليه اذ الكتابة المذكوره انما كانت على الثانى دون الاول (حاشية الباجورى على الشمائل)

اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار محض کرتے ہوں۔ شمایل ترمذی کے حاشیہ مسمیٰ باجوری میں لکھا ہے کہ ''یہ جو روایت ہے کہ اس پر چھپنے کے سے نشان تھے یا عنز جانور کے گھٹنے کی مانند یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر محمد رسول اللہ لکھا ہوا تھا یا یہ لکھا ہوا تھا ''ایک منصور'' ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے جیسے

عسقلانی نے کہا ہے اور ابن حبان نے جو اس کی تصحیح کی ہے وہ صرف
اس کا وہم ہے اور بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے
یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر یعنی اس شے پر جو آنحضرت کی پشت پر تھی الفاظ محمد
رسول اللہ لکھے ہوئے تھے اس کو دھوکا ہو گیا ہے ہاتھ کی مہر میں اور اس پشت کے غدود میں
جس کو خاتم نبوت کہتے تھے کیوں کہ وہ عبارت ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی نہ پشت کی چیز پر'' پس
جو محقق امر باجوری اور عسقلانی نے لکھا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اسلام
نے ان روایتوں کو جن کو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے خود رد کیا ہے اور مہر نبوت سے
وہ کیا مراد لیتے تھے۔

شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ ''وہ اپنے باپ

عن ابی رمثه ...... قال دخلت مع ابی علی رسول الله صلی الله علیه وسلم نرای ابی الذی بظهر رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال دعنی اعالج الذی بظهرک فانی طبیب فقال انت رفیق الله الطبیب (رواه فی شرح السنه)

کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے ان کے
باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صل اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی
ان کے باپ نے کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجئے کہ جو چیز آپ کی
پیٹھ پر ہے میں اس کا علاج کر دوں کیوں کہ میں طبیب ہوں۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم رفیق ہو اور اللہ طبیب ہے'' اس روایت
سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے وہ کیا چیز تھی اور صاف صاف معلوم
ہوتا ہے کہ خود اس زمانے کے مسلمان جو آنحضرت کے اصحاب تھے اسی کو کیا سمجھتے تھے پس

سر ولیم میور صاحب نے جو اس کو بطور عجائبات اسلام کے بیان کیا ہے محض بے جا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے اور روایتیں لکھی ہیں جن میں بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے کہ شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی۔ اور ایک روایت لکھی ہے کہ حضرت آمنہ کو ایام حمل میں کچھ بوجھ یا تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی اور دوسری روایت اس کے برخلاف لکھی ہے کہ حضرت آمنہ کہتی تھیں کہ میں نے کسی بچہ کو پیٹ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بھاری نہیں پایا یہ روایتیں اور اسی قسم کی اور سب روایتیں بالکل سند سے معرا ہیں اور خود علمائے اسلام ان کو غیر صحیح اور نا معتبر قرار دیتے ہیں اور یہ سب گرم جوش خیالات کے نتیجے ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب اسلام کی مذہبی روایتوں کی طرز پر بیان کرتے ہیں اس منشاء سے کہ اسلام کی ایک بے وقعتی ظاہر کریں۔

وہ روایت جس میں حضرت آمنہ سے نور کا ظاہر ہونا منقول ہے اور جو کتاب شرح السنہ میں بیان کی گئی ہے اس طرح پر نہیں ہے جس طرح کہ سر ولیم میور صاحب نے بیان کی ہے۔ اس لیے ہم اس روایت کو بلفظہ نقل کرتے ہیں شرح السنہ میں عرباص ابن ساریہ سے منقول ہے کہ "رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم

عن العرباص بن ساریه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال...... ساخبرکم باول امری انا دعوة ابراهیم و بشارة عیسیٰ و رویا امی التی رات حین و ضعتنی وقد خرج لها نور اضاء بها قصور الشام (رواه فی شرح السنه)

نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں میں دعا

ہوں ابراہیم کی اور بشارت ہوں عیسیٰ کی اور خواب ہوں اپنی ماں کا
جس نے میرے پیدا ہونے کے زمانے میں دیکھا تھا کہ اس سے
ایک نور پیدا ہوا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے'' پس جن
روایتوں میں

حضرت آمنہ سے نور کا پیدا ہونا منقول ہے اگر چہ ان کی بھی کوئی کافی سند صحت کی موجود نہیں ہے لیکن اگر ہم ان کو تسلیم کر لیں اور صحیح قرار دیں تو ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ برخلاف فطرت۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ تمام راوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ میں دوشنبہ کو ایک مشہور اور معروف دن خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اسی دن آپ کی زندگی کے سبب سے بڑے واقعات ظہور میں آئے تھے، لیکن اس متبحر عالم نے اس جگہ کسی قدر غلطی کی ہے کیوں کہ مسلمانوں کے ہاں دوشنبہ کے دن کو مذہبی شرف حاصل نہیں ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ جب علماء نے ان مشہور و معروف واقعات پر غور کیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظہور میں آئے تھے تو اکثر کو دوشنبہ کے دن واقع ہونا پایا۔ اس لیے انہوں نے ایک اتفاقی مطابقت کے خیال سے اپنی تصنیف میں دوشنبہ کا ذکر کیا حالاں کہ بعض علماء نے اس اتفاقی مطابقت سے بھی اختلاف کیا ہے۔ پس یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ جس کے سبب اسلام کی طرف کسی منشا سے کوئی اشارہ کیا جائے۔

سر ولیم میور صاحب نے تاریخ واقدی کے چند اختراعات بیان کرنے کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ اس مصنف نے بیان کیا ہے کہ ''حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا'' اس کے بعد صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ ''حمد کے

مادہ سے جو نام مشتق ہوتے ہیں عرب میں معروج تھے مگر احمد عرب میں بہت کم نام ہوتا تھا اور آنحضرت کے سوا پانچ مختلف اشخاص اور بھی گزرے ہیں جن کا نام محمد تھا۔"

واقدی کے حوالہ سے صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنھوں نے یہود اور نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا کہ عرب میں ایک نبی اس نام کا عنقریب ہونے والا ہے اور اکثر اشخاص اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھتے تھے اور ہر شخص یہ امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخرالزمان ہونے کی عزت حاصل کرے۔

مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھان تو سر ولیم میور صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے اگر توریت مقدس کی یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل سے ہے اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہو گا اور اس کا نام اسماعیل رکھنا" (کتاب پیدائش، باب 16 ورس 10) اور نیز یہ آیت کہ "اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارا تیری بی بی کے بے شک ایک لڑکا پیدا ہو گا اور اس کا نام اسحاق رکھنا" (کتاب پیدائش، باب 17 ورس 19) اور انجیل کی یہ آیت "اور اس کے (یعنی مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہو گا اور تجھ کو (یوسف کو) چاہیے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے کیوں کہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا" (متی، باب 1 ورس 30) صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو کس بنا پر وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور جو لڑکا پیدا ہونے والا تھا احمد اس کا نام رکھنے کو کہا تھا۔

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش نبوت وہ ہے جو ہم نے اپنے خطبہ بشارات میں بیان کیا ہے یعنی عہد عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے اور انجیل میں احمد کے نام سے اور اس لیے ان بشارات کے پورا کرنے کے لیے

ضرور تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جاوے، کیوں کہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔

مگر سر ولیم میور صاحب کا یہ بیان نہایت عجیب ہے کہ ''لفظ احمد'' انجیل یوحنا کے کسی قدیم عربی ترجمہ میں بجائے لفظ ''تسلی دہندہ'' کے براہ غلطی واقع ہوا ہو گا یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں کسی جاہل یا متقی راہب کی جعل سازی سے بجائے یونانی لفظ پیر یکلیٹوس کے لفظ پر یکلیوٹوس کر دیا گیا۔ سر ولیم میور صاحب نے یہ بات اس لیے بیان کی ہے کہ پہلے یونانی لفظ پیر یکلیٹوس کا ترجمہ تسلی دہندہ ہے اور دوسرے یونانی لفظ پیر یکلیوٹوس کا ترجمہ احمد ہے، مگر مسلمانوں نے ان یونانی لفظوں کو معرب کر کے فارقلیط بنا لیا ہے اور اس سبب سے کہ مسلمان فارقلیط کا ترجمہ احمد کرتے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یونانی لفظ پیر یکلیوٹوس کو معرب کر کے فارقلیط کیا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے جو یہ بیان کیا ہے کہ عرب میں محمد نام کے اور لوگ بھی گزرے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے انہوں نے اس قسم کی تمام روایتوں کو رد کر دیا اور نہایت تدین و ایمان داری سے اس امر کے دریافت کرنے میں کام یاب کوشش کی اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گزرے تھے اور واقدی کو بھی ہم ان ہی لوگوں میں شمار کرتے ہیں، مگر یہ بات کہ ان ناموں کے اور لوگ بھی آنحضرت سے پہلے درحقیقت گزرے تھے1 یا یہ کہ اس نام کا مادہ حمد ہے اور حمد کے مادہ سے اہل عرب ناموں کو مشتق کیا کرتے تھے یا یہ بیان کہ یہ نام اکثر والدین اپنے لڑکوں کا اس قوی امید پر رکھتے تھے کہ شاید ہمارے ہی لڑکے کی قسمت میں نبی موعود ہونا ہو، کسی طرح عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر موثر نہیں ہوسکتا کیوں کہ کسی لڑکے کے والدین نے اس

کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اس لڑکے کے نبی ہونے کی طمع پر کیوں نہ رکھا ہو مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدا تعالیٰ کو نبی آخر الزمان کرنا منظور تھا۔ ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے جب کہ ہم ان بڑے بڑے کاموں پر غور کرتے ہیں جو آنحضرت سے ظہور میں آئے تھے اور وہ ایسے کام ہیں جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جب کہ ہم اس روحانی سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے جس کو آنحضرت نے اپنی حیات میں شائع کیا تھا اور آئندہ نسلوں کے لیے بطور ورثہ کے چھوڑ گئے اور جب کہ ہم اس صدق اور پاک بازی کی ترویج پر نظر ڈالتے ہیں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رائج کیا اور جو زمانے کی گردشوں کے بعد بھی غیر مبدل اور بے نقص رہی ہیں اور ابدالا آباد تک ایسی ہی رہیں گی۔ تو ہم کو کامل یقین ہوتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

1 حضرت عیسیٰ کے نام کی نسبت بھی ہم یہی حال پاتے ہیں۔ ریفن صاحب کی لیف آف کرایسٹ میں لکھا ہے کہ ''عیسیٰ جوان کا نام ہے رکھا گیا تھا لفظ یوشع کا تبدیل کیا ہوا ہے یہ نہایت مروج نام تھا لیکن بعد کو اس نام میں اسرار اور رامت کی نجات دہندہ کا اشارہ اپنی طرف سے اس میں لگا دیا گیا تھا'' (سید احمد)

حضرت آمنہ کا اگر رویا میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا اور عرب جاہلیت کے دستور کے موافق لوہے کے ٹکڑوں کو گلے میں لٹکانا یا بازوؤں پر بطور عمل اور تعویذ کے باندھنا اگر صحیح بھی تسلیم کیا جاوے تو کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اس امر کی تائید کرنا ہے کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے رویا میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا اں اسپرنگر صاحب کی عقل اور ایمان داری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس واقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے

ہیں کہ حضرت آمنہ کوضعف دماغ اورصرع کی بیماری تھی اور حضرت سارااور حضرت مریم نے جوفرشتوں کودیکھا تھااس کوصرع کی بیماری نہیں قرار دیتے۔

سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں کسی منشاء سے اور بھی چند تعجب انگیز باتیں بیان کی ہیں کہ حضرت آمنہ کوخواب میں اطلاع ہوئی تھی کہ اس لڑکے کوقبیلہ ابوذیب میں سے ایک عورت دودھ پلائے گی اور حلیمہ کو بڑا تعجب ہوا جب بلا دریافت اس کے شوہر کا نام اس کو بتلا دیا اور جب حلیمہ آنحضرت کو لے آئی تو دفعۃً اس کا اوراس کی اونٹنی کا دودھ بہت زیادہ ہوگیا اور جب کہ حلیمہ آنحضرت کو لے کر چلی تو اس کا سفید گدھا سب سے زیادہ تیز رفتار ہوگیا اوراس کے مویشی نہایت فربہ ہوگئے اور کثرت سے دودھ دینے لگے یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے اوراسی لیے یہ روایتیں مستند اور معتبر نہیں ہیں لیکن اتفاقات سے ایسے امور کا واقع ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے مگر عیسائی عالم جوایسی باتوں کوبطور دوراز قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلا شبہ ہم کوتعجب آتا ہے کیوں کہ جب وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ''لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کومیرا خیال ہے تو ٹھہر جا کیوں کہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے'' (کتاب پیدائش، باب 30 ورس 28) اوراس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ ''میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اوراب وہ کثیر التعداد ہوگیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے'' (کتاب پیدائش، باب 30 ورس 30) اوراسی طرح کتاب پیدائش کے باب 30 ورس 36 سے 42 تک کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو حضرت یعقوب کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت ہوئی ہوتو اس کو دوراز قیاس اور تعجب انگیز طرز پر بیان کا ے جائے۔

سر ولیم میور صاحب واقدی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر اور دل کے دھونے کا واقعہ چار برس کی عمر میں واقعہ ہوا تھا اور ہشامی کے حوالہ سے اس بات کا استنباط کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع کا عارضہ تھا۔ ہم نے اپنے خطبہ ''حقیقۃ شق الصدر و ماہیۃ المعراج'' میں اس مضمون پر شرح وبسط سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شق صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شب معراج کے خواب کا ایک جزو تھا نہ یہ کہ در حقیقت وہ جسمانی طور پر واقع ہوا تھا، مگر روایوں نے ان اسباب سے جو اکثر روایات کے بیان کرنے میں واقع ہوتے ہیں مختلف طور پر بیان کیا ہے اور اس کے وقوع کے زمانہ میں بھی انہی اسباب سے اختلاف ہو گیا ہے بعض کا قول ہے کہ عہد طفولیت میں واقع ہوا تھا بعض کا بیان ہے کہ اس کا وقوع ایام شباب میں ہوا تھا اور بعض کے نزدیک شب معراج میں وقوع میں آیا تھا۔ ہم کو اس واقعہ کی حقیقت کا دوبارہ اس مقام پر بیان کرنا ضرور نہیں ہے بلکہ اس مقام پر ہم کو یہ بیان کرنا منظور ہے کہ ہمارے ذی علم اور لائق مصنف سر ولیم میور صاحب نے جو ہشامی کی روایت سے (اگر وہ بالکل صحیح بھی مان لی جاوے) یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرع کا عارضہ ہو گیا تھا وہ کیسا غلط اور بے اصل ہے۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ہشامی اور دیگر متاخرین بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو گمان ہوا کہ اس لڑکے کو ''عارضہ ہو گیا ہے'' جس لفظ کا ہم نے عارضہ ترجمہ کیا ہے وہ انگریزی لفظ ''فٹ'' ہے جو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے ''فٹ'' کے معنی لغت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یک بارگی حملہ کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے اور بعض اوقات غشی طاری ہو جائے جس سے غالباً صاحب ممدوح نے صرع مراد لی ہے، مگر ہشامی میں جو لفظ واقع ہے اس کا ''فٹ'' ترجمہ کرنا بالکل غلط ہے سر ولیم میور صاحب کو اس لفظ کے صحیح پڑھنے میں بالکل غلطی ہوئی ہے جیسا کہ ہم آگے ثابت کریں گے۔

ہمارے پاس سیرت ہشامی موجود ہے جو 1858ء میں بمقام کاٹجن زیر اہتمام و نگرانی ڈاکٹر فرڈیننڈ وسٹن فیلڈ کے چھپی ہے اس کتاب سے ہم وہ عبارت جو اس بحث سے متعلق ہے بلفظہ[1] نقل کرتے ہیں۔

قالت و قال لی ابوہ یا حلیمۃ لقد خشیت ان یکون ھذ الغلام قد اصیب فالحقیہ باھلہ

یعنی حلیمہ نے کہا اس کے باپ (یعنی آنخضرت کے دودھ باپ یعنی شوہر حلیمہ) نے کہا اے حلیمہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے اس لیے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے۔

مگر جب حلیمہ آنخضرت کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ اس وقت حضرت آمنہ نے حلیمہ سے کہا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے یہ کلام بطور استفہام انکاری کے تھا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو یہ گمان ہوا کہ آنخضرت کو کچھ ہو گیا ہے وہ صحیح نہیں تھا۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب لائف آف محمد کے صفحہ 21 کے حاشیہ پر بجائے لفظ اصیب کے امیب لکھا ہے یعنی صاد کی جگہ میم لکھا ہے اور اس کے معنی ''فٹ'' یعنی عارضہ ہونے کے لکھتے ہیں، مگر یہ لفظ تاریخ ہشامی میں ہم کو نہیں ملتا ہے اور نہ اس کے معنی عارضہ ہونے کے پائے جاتے ہیں ہشامی میں اصیب کا لفظ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے ثابت ہوگا اور چوں کہ ان دونوں لفظوں کی شکل میں بہت ہی کم فرق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے کسی غلط قلمی نسخہ سے اس کو نقل کیا ہوگا۔

تمام عیسائی مصنف سوائے ایک دو کے جنھوں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

سوانح عمری لکھی ہے اس بات کو بطور ایک امر واقعی کے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق ہوا تھا۔ اولاً ہم متحیر تھے کہ یہ خیال گروشیس کے کبوتر کے قصہ کی طرح عیسائیوں کے دماغوں میں کیوں کر سمایا کسی تاریخ سے نہیں پایا جاتا کہ کوئی ڈاکٹر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی حالت کا امتحان کرنے کو عرب میں گیا ہو اور نہ ایشیائی مصنفوں نے اس امر کی نسبت کچھ تذکرہ کیا ہے پھر اس خیال کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور کس نے اس کو پھیلایا۔ آخرکار بہت سی تلاش کے بعد ہم کو متحقق ہوا کہ یہ خیال خام عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوا اول عیسائیوں کے توہمات مذہبی کے سبب سے اور دوسرے عربی عبارت کے زبان لیٹن میں غلط ترجمہ ہونے سے۔

کتاب لائف آف محمد مصنفہ پریڈو مطبوعہ لندن 1812ء کے صفحہ 20 سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی ابتدا وہاں سے ہوئی ہے اور تاریخ ابو الفدا کے بعض مقامات کے غلط ترجمہ سے بھی جو ڈاکٹر پوکاک نے لیٹن زبان میں کیا ہے اس کی بناء معلوم ہوتی ہے یہ ترجمہ مع اصل عبارت عربی کے پوکاک کے مسودہ سے 1722ء میں بمقام آکسفورڈ چھپا تھا۔ اول ہم اس چھاپہ سے اس عبارت کو نقل کرتے ہیں اور پھر اس کی عبارت کی اور نیز اس کے ترجمہ کی متعدد غلطیاں بتاتے ہیں۔

اس چھاپہ میں عبارت مذکورہ اس طرح پر لکھی ہے:

فقال زوج حليمة لها قد خشيت ان هذا الغلام قد اصيب بالحقية باهله فاحتملته حليمة وقدمت به الى امه.

اردو میں اس طرح پر ہوتا ہے ”تب حلیمہ کے شوہر نے کہا کہ مجھ کو بہت خوف ہے کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے اس واسطے اس کو حلیمہ سے لے کر اس کی ماں آمنہ کے پاس لے گیا اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع کا

عارضہ یا بے ہوش کرنے والی بیماری مراد لی ہے۔"

اول تو ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کتاب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے جس لفظ کو امیب پڑھا ہے وہ اصیب ہے اور پھر ہم بتاتے ہیں کہ کتاب مذکورہ بالا کے مصنف نے جس لفظ کو بالحقیۃ پڑھا ہے وہ بھی غلط پڑھا ہے وہ لفظ فالحقیہ ہے اور ترجمہ میں یہ غلطی کی کہ جب مترجم نے دیکھا کہ لفظ بالحقیہ کے معنی عبارت کے مناسب نہیں ہو سکتے تو اس کا ترجمہ بالکل چھوڑ دیا اور جب لفظ اصیب پر پہنچا تو اس کا ترجمہ اخذ کیا اور جب کہ عبارت میں نہ کسی شے ماخوذ کا ذکر تھا اور نہ اس کا ذکر تھا جس سے اخذ کیا اور بلحاظ قواعد نحوی اور ربط عبارت کے ان دونوں کا ہونا ضرور تھا اس لیے مترجم نے اٹکل پچو لفظ باہلہ سے الفاظ "کسی اپنے ساتھی سے" اور لفظ "دماغی بیماری" کو یا "بے ہوش کرنے والی بیماری" کو بڑھا دیا حالاں کہ وہ اصل عبارت میں نہیں ہیں۔

اگر عبارت مذکورہ کو صحیح طور پر پڑھا جاوے تو صحیح ترجمہ اس کا یوں ہوتا ہے "تب حلیمہ کے شوہر نے اس سے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے پس اس کو اس کے لوگوں کے پاس پہنچا دے پس اٹھا لیا اس کو حلیمہ نے اور لے آئی اس کو اس کی ماں کے پاس۔"

اہل عرب ایسے مبہم کلمات کو ایسی بیماریوں کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے جن کا سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا تھا اور غالباً ان کا خیال تھا کہ کسی مخفی قویٰ یا ارواح کا اثر ہے اور جن بیماریوں کا سبب ان کو نہ معلوم ہوتا تھا ان کو شیطان کے اثر کی طرف بھی منسوب کرتے تھے۔

قدیم اہل یونان اپنے توہمات مذہبی سے صرع کی بیماری کو جو ایک عجیب وغریب قسم کی بیماری ہے یقین کرتے تھے کہ دیوتاؤں یا خبیث ارواحوں کے اثر سے ہوتی ہے اسی بناء پر عیسائی مصنفوں نے لفظ اصیب سے بالتخصیص صرع کی بیماری سمجھ لی حالاں کہ ایسا سمجھنا

عرب کے محاورہ کے برخلاف ہے کیوں کہ عرب صرف صرع ہی کی بیماری کو لامعلوم اثر کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ایک چیز کو جس کا سبب ان کو نہ معلوم ہوتا تھا مخفی قویٰ یا شیطان یا جن کے اثر کی طرف منسوب کرتے تھے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ لفظ اصیب سے صرع کا عارضہ مراد لیا جاوے۔

اس بیان کی تائید میں ہم ایک نہایت ذی علم اور ذی فہم غیر متعصب مصنف کی رائے کو نقل کرتے ہیں جو کہتا ہے کہ ''یہ متواتر بیان کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق تھا یونانیوں کی ایک ذلیل اختراع ہے جنہوں نے عارضہ کے لحوق کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس غرض سے منسوب کیا ہوگا کہ ان کے اخلاقی چال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کی طرف طعنہ زنی اور تنفر کا مستوجب ہو۔''

نہایت مشہور اور لائق مورخ یعنی گبن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صرعی حملوں کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''یونانیوں کا ایک نامعقول اتہام ہے'' اور ایک اور مقام پر بھی اسی مورخ نے لکھا ہے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عارضہ صرع یا بے ہوش کر دینے والی بیماری کو تھبوفینز زونارش اور یونانیوں نے بیان کیا ہے اور ہالنجر اور پریڈو اور مارکشی نے اپنے سخت تعصب کے سبب اس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر نگل لیا ہے قرآن میں جو دو سورتیں ہیں جن میں سے ایک کا نام مزمل اور ایک کا نام مدثر ہے ان سے صرع کی بیماری کی تاویل کرنی مشکل ہے مسلمان مفسروں کا سکوت اور صرع کی بیماری سے ناواقفیت ان کے قطعی انکار کی نسبت زیادہ تر قاطع اور مرجع ہے اور آزادانہ رستہ آکلی گیگنیر اور سیل نے اختیار کیا ہے۔''

اب ہم اس غلط اور بے اصل اتہام پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عارضہ صرع لاحق تھا بلحاظ طب کے غور کرتے ہیں چیمبرز سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ''صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں دفعۃً بے ہوشی طاری ہو اور اعصاب تنفس کے تشنج اور سانس لینے کے منفذ

کے بند ہونے سے اعصاب اختیاری بے اختیار شدت سے پھڑکنے لگیں اور کبھی کبھی سانس بالکل بند ہو جائے اس بیماری کا مریض اکثر پاگل وہ جاتا ہے اور بسا اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے اور اس میں تیزی اور چستی نہیں رہتی اور ایسی مردہ دلی اس پر چھا جاتی ہے جو اس کو دنیا کے بے قاعدہ کاروبار سے معذور کر دیتی ہے بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے اور تمام قوئے جسمانی میں ضعف اور ناطاقتی گھر کر جاتی ہے جس کی وجہ سے مصروع کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ اسی کے ساتھ مصروع کے ذہن میں اپنے ضعف و نقاہت کا یقین بخوبی جم جاتا ہے اور مشقت طلب اشغال سے نفرت ہو جاتی ہے بالخصوص ایسے اشغال سے جن میں اس پر عام اندازہ سے زیادہ نظر پڑیں۔''

اب ہمارا یہ کام ہے کہ اس امر کی تنقیح کریں کہ آیا یہ سب آثار یا ان میں سے کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے کسی حصہ میں طفولیت سے لے کر وفات تک پائے گئے تھے یا نہیں۔

کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا کہ منجملہ آثار مرقومہ بالا کے ایک بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا گیا تھا بلکہ برخلاف اس کے سب کے سب متفق اللفظ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرستی اور قوی تھے خود سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ''دو برس کے سن میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھٹایا اور ان کے گھر لے گئیں اور آمنہ اپنے لڑکے کی تندرستی اور قوی ہیئت کو دیکھ کر جو آپ سے دو چند عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتا تھا اس قدر خوش ہوئیں کہ حلیمہ سے کہا ''اس کو پھر صحرا کو لے جا'' لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت مضبوط و تندرست اور قوی الجثہ تھے۔ وہ بہت تیز چلا کرتے تھے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے تھے تمام عمر بھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اور ان سب کو انہوں نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ

برداشت کیا انہوں نے خدائے واحد کی پرستش وعبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی نظیر ومثال نہیں پائی جاتی اور علم الہیات کو ایسے پختہ ومعقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے انہوں نے قوانین تمدن واخلاق کو ایسے کامل پر پہنچا دیا جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا انہی کی وساطت سے انسانوں کی بہبودی اور رفاہ کے واسطے وہ ملکی ومالی ودینی ودنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنی نوع میں یکتا و بے نظیر ہے۔ آنحضرت ہی وہ ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرہ عرب کو فتح کیا اور مختلف قبیلوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط اور طاقتور عظیم الشان قوم بنا دیا جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے ایک جزو اعظم کو ایک عرصہ قلیل میں مفتوح ومسخر کر لیا۔ کیا اس بات کا خیال کرنا قرین عقل وانصاف ہے کہ ایسے کارہائے نمایاں ایک لاچار اور ناتواں مصروع شخص سے عمل میں آئے ہوں گے؟ ایسے کارہائے نمایاں کا عمل میں آنا بجز اس شخص کے جس کے قوائے روحانی وجسمانی کامل صحیح وسالم ہوں اور کسی شخص سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے اور اس کی ماہیت تائید ربانی پر دلالت کرتی ہے۔‘‘

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ’’حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پو سایہ افگن دیکھ کر متوحش ہوئی اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لیے روانہ ہوئی‘‘ اس فقرہ پر صاحب موصوف یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اس روایت میں کچھ صدق ہو تو غالباً عارضہ سابق کو یعنی صرع کے آثار کے عود سے مراد ہو گی تعجب ہے کہ بادل کے سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سر ولیم میور صاحب نے اس سے آنحضرت کے عارضہ صرع کے آثار کا عود خیال کیا اگر حلیمہ کی نسبت آثار صرع کا خیال فرماتے تو شاید زیادہ مناسب ہوتا پھر دوسرے مقام پر صاحب موصوف بیان فرماتے ہیں کہ ان کے دوروں سے جن کو حلیمہ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں ان مضطر

حالتوں اور بے ہوش کنندہ غشوں کے صریح آثار نمودار تھے جو نزول وحی کے وقت ہوتے تھے اور شاید جن کے سبب ان کے دل میں نزول وحی کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور ان کے متبعین نے ان اضطرابوں اور غشوں کو نزول وحی کا شاہد قرار دیا تھا۔

سر ولیم میور صاحب نے تمام اپنی کتاب میں ایسی روایتوں کو اپنی کتاب کی بنیاد ٹھہرایا ہے جن کی صحت خود اہل اسلام کے نزدیک مشتبہ اور غیر ثابت ہے یہ روایت کہ آنحضرت پر بادل کا سایہ رہتا تھا محض باطل ہے۔ اگر ایسا امر فی الحقیقت واقع ہوا کرتا تو آنحضرت کے اکثر صحابہ و رفقاء اس کا تذکرہ کرتے اور احادیث مستندہ میں اس کا ذکر ہوتا۔ حالاں کہ یہ بات نہیں ہے تمام معتبر حدیثوں میں اس کا کچھ ذکر نہیں ہے، بلکہ برخلاف اس کے بعض حدیثوں میں جو نماز کے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اطہر پر مثل دیگر اشخاص کے دھوپ کا پڑنا ثابت ہوتا ہے، غلط روایت کی اشاعت کے بے شمار اسباب میں سے ایک یہ سبب بھی ہے کہ شے مرویہ کا اتفاق وقوع ہونا لہٰذا یہ امر از قبیل ممکنات ہے کہ کسی شخص نے پیغمبر صاحب کو اتفاقیہ ایک بادل کے ٹکڑے کے سایہ میں دیکھا ہو اور یہ ماجرا دوسرے شخص سے بیان کیا ہو اور دوسرے نے تیسرے سے کہا ہو اور اس طرح رفتہ رفتہ عام شہرت ہو گئی ہو اور آخر الامر عام اعتقاد ہو گیا ہو کہ بادل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ہمیشہ سایہ ڈالے رہتا تھا۔ اس قسم کی روایتیں جن کی صحت کی کوئی سند نہیں ہے محققین اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کی ہیں۔

نزول وحی کے وقت اضطرار اور غشی کی روایتیں ویسی ہی نا معتبر اور بے سند ہیں ان روایتوں میں خود راویوں کے خیالات اور توہمات ہیں ہم نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیوں کا اتہام آنحضرت کو بیماری صرع کے ہونے کا صدق سے محض معرا ہے تاہم سر ولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرعی غشوں نے ان کے ذہن

میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا تھا اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا۔ تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو لیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر شخص مصروع جانتا ہو اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے جو اپنی قوم کی بت پرستی کے استیصال کے واسطے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ جو اس کی اس بیماری سے واقف ہوں اس کے عزیز اور اقارب اور جمیع اکابر عرب اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں اور ہر شخص اپنے دین آبادئی سے منحرف ہو کر اس کے قول وفعل پر ایمان کامل لے آوے۔

جن نامعتبر روایتوں پر عیسائیوں نے اہتمام عارضہ صرع آنحضرت کی نسبت قائم کیا ہے وہ روایتیں زیادہ تر شق صدر کی روایتوں سے علاقہ رکھتی ہیں ہم نے حقیقت شق صدر کو اپنے ایک خطبہ میں بیان کیا ہے اور جو غلطیاں واقعات کے بیان کرنے میں راویوں کو واقع ہوئی ہیں ان سب کو دیکھایا ہے۔ پس ان کے جاننے کے بعد عیسائیوں کا یہ اتہام سر کے بل گر پڑتا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے جانے کا حال لکھ کر اپنی والدہ کے لیے بخشش کی دعا مانگنے کا ذکر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ''یہ بات یعنی ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے احکامات کی سختی اور شدت کی ان لوگوں کے حق ہیں جو دین سے جہالت کی حالت میں مرے ہوں ایک عجیب مثال ہے'' ہم اس روایت کی صحت اور غیر صحت کی بحث کو چھوڑ کر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں۔ کسی طرح کی سختی اور

شدت نہیں ہے بلکہ زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لیے کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے۔ پس جو شخص کہ ایسا کرے اس پر سختی کا الزام نہیں ہوسکتا، مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا امر کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے تو رحیم عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے واسطے جو گو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں مگر حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں کون سا نرم فیاضانہ اور ترحم آمیز سلوک کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی ہمارے خلاف توقع رحیم مذہب عیسائی میں غیر معتقدین کے لیے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اتھینیسین خطبہ جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں بروز ہائے معین پڑھا جاتا ہے اور تمام اہل کلیسا کی منظوری سے منظور ہوا ہے ان سب عقائد کے بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر خواہ نخواہ فرض ہے، بالتصریح یہ لکھا گیا ہے کہ ”یہ عیسوی عقیدہ ہے جس پر بدوں اعتقاد رکھنے کے کوئی آدمی نجات نہیں پا سکتا۔“ پس جب کہ رحیم مذہب عیسوی کے بموجب ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے اور اس لیے کسی کی دعائے مغرب بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے تو عیسوی مذہب کو اس باب میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے؟

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں کسی منشاء سے اس روایت کو بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پر موجود نہ ہوتے تھے تو تمام خاندان اپنے کفایت شعار کھانے سے بھوکا اٹھتا تھا، لیکن جب پیغمبر صاحب بھی کھانے میں شریک ہوتے تھے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا اور یہ فرماتے ہیں کہ اس سے عروج پذیر نبی کی بڑائی مظنون ہوتی تھی مگر اہل اسلام تو ایسی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے اور نہ ان کے معتبر ہونے کی کوئی کافی سند موجود رکھتے ہیں لیکن ہم کو تعجب آتا ہے جب کہ عیسائی ایسی روایتوں کو کسی اشارہ آمیز ارادہ

سے نقل کرتے ہیں کیوں کہ ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جب کہ وہ متی کے باب 24 ورس 9,20 کے اس بیان پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ ''اس نے (یعنی حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی اور ان کو توڑا اور روٹیاں اپنے حواریوں کو دیں اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں اور ان سب نے پیٹ بھر کر کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اٹھالیا۔''

اس کے بعد سر ولیم میور صاحب ایک اور روایت لکھتے ہیں کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ملک شام کو گئے تو بحیرہ راہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جماعت میں سے اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ ان کے سر پر ایک بادل سایہ ڈالے ہوئے چلتا تھا اور درختوں کی شاخیں ان کی دھوپ روکنے کے واسطے جھک جاتی تھیں اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کیے اور بتلاش مہر نبوت ان کے جسم کا معائنہ کیا۔

جس اشارہ سے کہ سر ولیم میور صاحب نے اس روایت کو لکھا ہے اس کی نسبت ہم بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ یقین کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع اپنے چچا ابو طالب کے ہم راہ ملک شام کو بغرض تجارت گئے تھے تو یہ بات ہرگز قابل تعجب کے نہیں ہے کہ بحیرہ نے ایسا خیال کیا ہو۔ کیوں کہ اس وقت یہود اور نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے، مگر افسوس ہے کہ محققین علمائے اسلام اس روایت کو معتبر روایتوں میں نہیں سمجھتے وہ روایت جس میں بحیرہ کا حال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانے کا ذکر ہے اس میں یہ بیان بھی ہے کہ ابو طالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ ہیئت ونگرانی حضرت ابو بکر اور بلال کے شام سے واپس بھیج دیا تھا۔ بخاری اور مسلم میں جو سب سے زیادہ معتبر حدیث کی کتابیں ہیں یہ روایت مذکور نہیں ہے، مگر ترمذی اور دیگر

کم محتاط محدثوں نے بشوق تمام اس روایت کو اپنی کتابوں میں لکھا ہے منجملہ ان بہت سی وجہوں کے جن سے اس روایت کی نامعتبری کا کافی ثبوت ملتا ہے ہماری رائے میں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کے قول کا جس کو خود سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے اور جس سے اس روایت کی نامعتبری بخوبی ثابت ہوتی ہے اس جگہ بجنسہ نقل کرنا کافی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ترمذی کی یہ روایت کہ ابوطالب نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوبکر اور بلال کے ہم راہ شام سے واپس بھیجا تھا اس لیے لغو اور مہمل معلوم ہوتی ہے کہ ابوبکر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دو سال چھوٹے تھے اور بلال اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہم راہ بیان کرنے کے بعد جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 12 برس کی تھی اور جس کی نسبت ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ''زمانہ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مکانوں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب وغریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کو صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ کرنے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خوض کنندہ دل ودماغ پر ایک گہرا نقش اور پائدار اثر کر دیا تھا۔''

ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک ''مصروع شخص'' کا دل ودماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک ''مصروع شخص'' خوض کنندہ دل ودماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم میور صاحب کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی کو دیکھ کر اس قدر اثر پذیر ہوا تھا۔ بعد کو ان ہی چیزوں سے مخالفت اختیار کی صلیب کو توڑا مورتوں کو پھوڑا۔ ان کی پرستش سے منع کیا اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا

نہیں ہے تثلیث کے عقیدے کو جھٹلایا خدا کو وحدہ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر پیدا کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گذرتی تھی، پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے، گرجاؤں اور صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل و فہم و ذکاء سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے ان کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے بحالی خیالات مستنبط کر سکا۔ وہ لڑکا بلا شبہ مادر زاد پیغمبر برحق تھا۔ جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لیے ضرور ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط (یعنی احمد مصطفیٰ) تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

ختم شد۔-------------------------TheEnd